مسلسل اشاعت کے ۵۱ سال

# اردو ڈائجسٹ

نومبر
2011

## دنیا کا پہلا سائبر بم چل گیا

ایرانی ایٹمی مرکز کی ایک ہزار سے زائد مشینوں کی تباہی

PDFBOOKSFREE.PK

دل کی بیماریوں سے

ایک ان پڑھ
## پاکستانی الیکٹریشن؟
اپنی ذہانت اور محنت سے ارب پتی بن گیا

دنیا کی بڑی کمپنیوں سے
## صارفین کا انوکھا انتقام

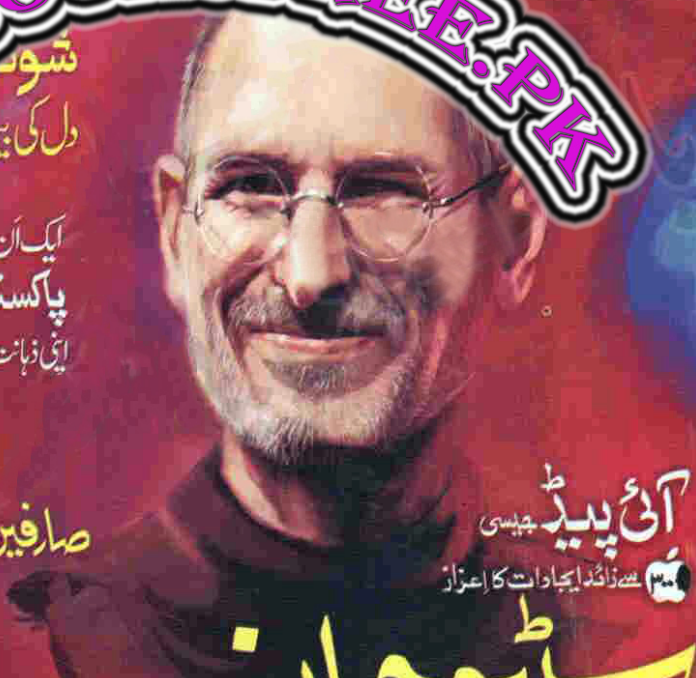



آئی پیڈ جیسی
۳۰۰ سے زائد ایجادات کا اعزاز

## سٹیو جابز
دنیا کو بدل کر چلا گیا

## ریلوے سے اونٹ بہتر
"بے کمال لوگ، لاجواب سروس"

# فرمانِ الٰہی

بے شک ایمان والے مراد کو پہنچے۔ وہ جو اپنی نمازوں میں گڑگڑاتے ہیں۔ عجز و نیاز کرتے ہیں اور وہ جو کسی بے ہودہ بات کی طرف دھیان نہیں دیتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔

(سورہ مومنون ۲۳)

جو نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچے۔

(سورہ لقمان ۴، ۵)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

(سورہ اعلیٰ ۱۴، ۱۵)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# فرمانِ رسولؐ

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ''جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے یا کھیتی اُگاتا ہے تو اس میں سے کوئی پرندہ یا چوپایہ (جانور) جو کچھ کھاتا ہے وہ اس لگانے والے کی طرف سے صدقہ ہوتا ہے اور اسے اس کا ثواب ملتا ہے۔''

(بخاری کتاب ۴۱۔ باب ۱: مسلم کتاب المساقات باب ۲)

حضرت ثابت بن ضحاکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''مومن پر لعنت بھیجنے کا گناہ مومن کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ نیز مومن پر کفر کی تہمت لگانے یعنی کافر کہنے کا گناہ مومن کو قتل کرنے کے برابر ہے۔''

(بخاری کتاب ۷۸۔ باب ۴۴: مسلم کتاب الایمان۔ باب ۴۵)

## جلوہ ہائے نور بار

رحمتوں کی جگہ کا تذکرہ بھی اور...... راہنمائی اور آگاہی بھی

نوید اسلام صدیقی

43

مشاہدات سعودی عرب

## ۳۶۵ دن لگاتار ایک سا حسن انتظام

سعودی عرب کی دکانوں پر ترازو کیوں نہیں ہوتے

رضی الدین سید

51

## اقبال کو اقبال کیسے ملا؟

۹ نومبر - ۹ یادیں ، ۹ یادوں کا گلدستہ

ماہ نور فضل

143

## شافعی آپ کیوں روتے ہیں؟

دو جلیل القدر اماموں کی محبت بھری ملاقات

ڈاکٹر اختر حسین عزمی

33



سید عاصم محمود

## اکیسویں صدی کا پہلا سائبر بم

اسرائیل کے پہلے سائبر بم کا خوفناک ماجرا
ایران کی ایٹمی تنصیبات کے سو سے زائد
کمپیوٹر کیسے تباہ ہوئے

225

## صارفین کا انوکھا انتقام



ووڈا فون کو اپنا نیٹ ورک
اپ ڈیٹ کرنے کے لیے
۵۰ کروڑ ڈالر خرچ کرنا پڑے

100



## ہم کسی سے کم نہیں

ہمت بندھانے والے
بے مثال پاکستانیوں
کے بے مثال کارنامے

تحریم حنا صدیقی

84








## سمے کا بندھن

ایک البیلے افسانہ نگار کی جادو بیانی

ممتاز مفتی

161

## انجام ڈنڈے کا

ڈنڈے کی افادیت جانیے

اعتبار ساجد

120

## کوکون

ایک معصوم بچے کی سحرانگیز داستان

اسد محمد خاں

168

## سوشل نیٹ ورکس کی دنیا

سوشل نیٹ ورک کے بنا زندگی ادھوری رہے گی

96




## ۲۳ / انقلابی افریقی خواتین



عالیہ فاطمہ

58


سات ملک، سات کہانیاں ..... 65
بابو ..... 129
میرا قیمہ بنا دو ..... 92
آ شیر مجھے مار ..... 112
انسان نے وقت کو قابو کرلیا ..... 140
بابیہ ..... 176


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امریکی صدر
تھامس جیفرسن نے قرآن مجید کیوں خریدا
241

سٹیو جابز
ہمت اور ذہانت کی علامت
153

خیالیے
خواجہ مظہر صدیقی
فکر و احساس میں ڈوبے مختصر افسانچے
193

خونی بھالو
مہم جو باپ بیٹی کا سچا واقعہ
203

ریلوے سے اونٹ بہتر
بے کمال لوگ لاجواب سروس
214

ترقی کرنے والی قومیں کھیلوں میں آگے کیوں ہوتی ہیں
پروفیسر ارشد جاوید
246

چھوٹی سی زندگی بڑی کامیابی
لاہور بورڈ میں اول آنے والی سائرہ عباس کی کہانی
248

شوگر ہے دل ہو تو دل کے دورے کا خطرہ نہیں رہتا
ڈاکٹر جاوید اقبال
256

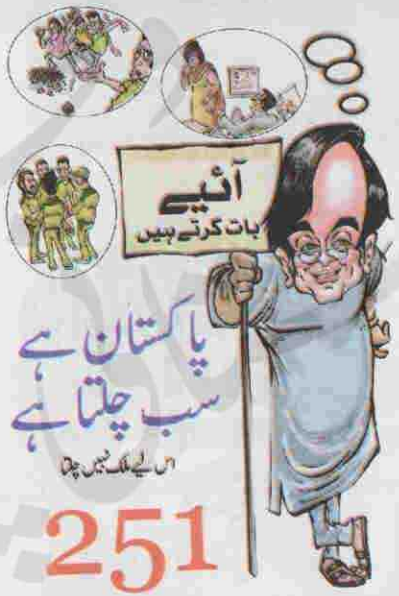


پاکستان ہے سب چلتا ہے
اس لیے ملک نہیں چلتا
251

حوالہ میری پسند کا ..... 261
لوگوں کی بھوک کیوں کم نہیں ہوتی ..... 265
تبصرۂ کتب ..... 269
مشورہ حاضر ہے ..... 275
چمن خیال ..... 279
در دل پہ دستک ..... 286




# صحت مند تبدیلی میں نوجوانوں کا کردار

تبدیلی کی آرزوئیں اور ہوائیں تیز تر ہوتی جارہی ہیں اور یہ شعور بھی گہری معنویت کے ساتھ پھیل رہا ہے کہ تبدیلی جمہوری طریقے سے آنی چاہیے کیونکہ بلٹ کے بجائے بیلٹ کا استعمال ایک صحت مند تبدیلی کو جنم دیتا ہے۔ اِس بنیادی اُصول سے اتفاق کے باوجود عوام یہ سوال کرتے ہیں کہ ماضی میں جتنے بھی انتخابات ہوئے، اُن کے نتیجے میں زیادہ تر نااہل، کرپٹ اور عوام کے حقیقی مینڈیٹ سے محروم حکومتیں بنتی رہی ہیں۔ دراصل انتخابی عمل کو شفاف اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے بنیادی نوعیت کی قانونی، سیاسی، سماجی اور معاشی اصلاحات کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی ورنہ ہمارا وطن کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی جگہ چکر لگاتا رہے گا۔ سٹیٹس کو کا جمود اُس وقت ٹوٹے گا جب ہمارے نوجوان میدانِ عمل میں اُتریں گے اور عوام کا خون چوسنے والے مفادات کے عفریت کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ نوجوان قوم کے مقدر کا ستارہ ہوتے ہیں اور وہی بتانِ رنگ و بو کو پاش پاش کرتے ہیں۔

حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر ہم اُردو ڈائجسٹ میں نوجوانوں کے جذبات اور میلانات کی ترجمانی کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ انتخابی عمل کو شفاف اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے ہمیں قابلِ عمل تجاویز بھی ارسال کریں اور اپنے اندر مطالعاتی حلقے بھی بنائیں تاکہ ہم مفاد پرست سیاسی کلچر سے نجات پاسکیں۔ ہم اپنے نوجوانوں کے شعور، اُن کی جرأت کردار پر یقین رکھتے اور یہ اُمید کرتے ہیں کہ پاکستان کے اُفق پر ایک شاندار مستقبل طلوع ہونے والا ہے کیونکہ اب اخلاق و کردار کی پیاس حیرت انگیز طور پر تیز ہوگئی ہے اور عوام کے اندر خیر کی جستجو ہمارے لیے ایک مژدہ جاں فزا کی حیثیت رکھتی ہے۔

الطاف حسن قریشی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم کہاں کھڑے ہیں

# منظّم ہو کر عوام قیادت سنبھالیں

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

عوام نے ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں جن جماعتوں اور افراد کے سر پر نمائندگی کا تاج رکھا تھا، ان میں سے بیشتر اصحاب شہریوں کی جان و مال کی حفاظت، زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی فراہمی اور وطن کی سربلندی میں بُری طرح ناکام رہے ہیں۔ وہ اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے محلاتی جوڑ توڑ، اپنے قریبی رشتہ داروں، جیل کے ساتھیوں اور غیر ملکی ریستوران کے منیجروں پر بڑے بڑے مناصب کی فیاضانہ بخشش اور ملکی دولت کی لوٹ کھسوٹ میں شبانہ روز مصروف رہے۔ اُن کے ذریعے کرپشن، نااہلی، بدنظمی اور عوامی اُمنگوں اور مسائل سے بے تعلقی کا خوفناک وائرس حکومت کی پوری مشینری میں سرایت کرتا گیا؛ چنانچہ قومی سیاست، ملکی معیشت اور انتظامی ڈھانچہ شدید انتشار کا شکار ہیں اور ہماری قومی خودمختاری اور ملکی سلامتی شدید خطرات میں گھری ہوئی ہے جبکہ ہمارے بہادر اور جفاکش عوام بدترین حکمرانی کے ہاتھوں بلبلا اُٹھے ہیں۔ سالہا سال سے مشکلات برداشت کرتے، ذلت و رسوائی سے دوچار ہوتے اور ظلم کی چکی میں پستے ہوئے رہنے سے ان کے اندر یہ شعور پیدا ہوا ہے کہ انھیں اپنی قسمت سنوارنے کے لیے خود آگے بڑھنا اور اپنی اجتماعی قوت کا منظّم اظہار کرنا ہوگا۔

وہ حضرات جو اسمبلیوں میں بیٹھے ہیں، وہ اشرافیہ جو ملکی وسائل کے بڑے حصے پر قابض ہے وہ منصب دار جو حادثے کے طور پر ایوانِ ہائے اقتدار میں براجمان ہیں، وہ غالباً ملک اور عوام سے انتقام لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ ادارے اور وہ محکمہ جو عام شہریوں کو آسانیاں فراہم کرنے اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے کا فریضہ بڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوش اسلوبی سے ادا کرتے آئے تھے، سب سے پہلے ان ہی میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا گیا اور ان کے معاملات انتہائی نااہل اور بدعنوان افراد کے سپرد کر دیے گئے۔ نتیجہ یہ کہ جو شعبے ہر سال اربوں کا منافع کمانے کے علاوہ اعلیٰ درجے کی قومی خدمات سرانجام دے رہے تھے، وہ قرضوں کے بوجھ تلے ہانپ رہے ہیں۔ پاکستان ریلوے کا دردناک انجام ہمارے سامنے ہے۔ یہ غریب اور کم آمدنی والے شہریوں کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک جانے کا سب سے محفوظ اور سب سے کم خرچ ذریعہ تھا۔ مال گاڑیوں کے ذریعے تجارتی درآمد شدہ اربوں کا ساز و سامان ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچتا تھا۔ ہماری افواج کے لیے بھی پاکستان ریلوے سب سے قابل اعتماد نظامِ مواصلات کی حیثیت رکھتا تھا۔ جناب غلام احمد بلور نے جب سے اس وزارت کا قلم دان سنبھالا ہے، مسافر گاڑیاں بند ہوتی جا رہی ہیں، ریلوے انجن دم توڑ چکے ہیں اور ایک روز اُنھوں نے مژدہ سنایا کہ انھیں فوری طور پر چالیس ارب نہ دیئے گئے، تو چند ہی روز میں تمام ٹرینیں چلنا بند ہو جائیں گی۔

اُن کے اس روح فرسا بیان پر اُن کی سخت گرفت ہونے کے بجائے جناب وزیراعظم نے انھیں قسط وار مالی وسائل فراہم کرنا شروع کر دیے، کیونکہ ان کی بدترین نااہلی، بدعنوانی اور عوام دشمنی میں وفاقی حکومت بھی اس اعتبار سے برابر کی شریک ہے کہ پیپلز پارٹی جسے اسمبلی میں سادہ اکثریت بھی حاصل نہیں، اُسے اقتدار پر قابض رہنے کے لیے اے۔ این۔ پی کی حمایت درکار ہے، اس لیے اس نے اپنے سیاسی حلیفوں کے سنگین جرائم سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور اس امر کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ ملک میں احتساب کا ایک مؤثر نظام قائم نہ ہونے پائے۔ غضب خدا کا کہ ہماری پارلیمنٹ نے بھی ریلوے کی گرتی ہوئی صحت پر کسی تشویش کا اظہار کیا نہ اس امر کی تحقیقات کرائی اور یہ مواخذہ بھی نہیں کیا کہ چین سے غیر معیاری انجن کیوں خریدے گئے اور جو خراب ہوتے گئے ان کی فوری مرمت کا ایک قابل اعتماد نظام کیوں قائم نہیں کیا گیا۔ قومی مفادات اور عوامی ضرورتوں سے اس درجہ بے حسی اور سفاکانہ بے اعتنائی سے یہ ثابت ہوا کہ ہمارے اربابِ اختیار عوام کے مینڈیٹ سے محروم ہو چکے ہیں۔ بھارت نے اس سال اپنے ریلوے کے ذریعے ۶۵ ارب کا منافع کمایا ہے جبکہ ہمارے ناخداؤں نے اسی معیار کے ہمارے ریلوے سسٹم کو بالکل ناکارہ بنا دیا ہے۔ اس تباہی کے ذمہ دار اہل منصب پر عوامی طاقت اور قومی سلامتی کے ادارے مضبوط ہاتھ ڈالنے والے ہیں کیونکہ جنگ کی صورت میں ہماری افواج



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو نقل و حرکت میں بڑی دشواری کا سامنا ہوگا جبکہ بھارت راجستھان میں بڑے پیمانے پر جنگی مشقیں کر کے پاکستان کو ایک سخت پیغام دے رہا ہے۔

یہ اعزاز بھی موجودہ حکومت کے حصے میں آیا ہے کہ وہ پی۔ آئی۔ اے جو ایک زمانے میں دنیا کی اچھی فضائی کمپنیوں میں شمار ہوتا تھا اور جس نے گلف اور سنگاپور کی فضائی کمپنیوں کے قیام اور ہوابازوں کی تربیت میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، آج زوال کی ایک اندوہناک تصویر پیش کر رہا ہے۔ اس کی ورکشاپ اور اس کے انجینیر ایسی کمال شہرت اور صلاحیت کے مالک تھے کہ شرقِ اوسط کے علاوہ مشرقی ایشیا کی فضائی کمپنیاں اپنے جہاز مرمت کے لیے کراچی بھیجتی تھیں اور بہت ساری فضائی کمپنیوں کو پی۔ آئی۔ اے کیٹرنگ سروس فراہم کرتا تھا۔ اب اُس کے زیادہ تر طیارے آئے دن ٹیکنیکل خرابی کی وجہ سے اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتے اور مسافروں کے لیے ناقابل تصور مشکلات کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ آج حالت یہ ہے کہ اس کے طیارے ایک ایک کر کے ناقابل استعمال ہوتے جا رہے ہیں اور اعلیٰ مناصب پر نااہل، بدقماش اور کرپٹ افسروں کی بڑے بڑے مشاہروں پر تعیناتی اور سال سال بھر کی تنخواہوں اور مراعات کی پیشگی ادائی اور شاہ خرچیوں کے باعث پی۔ آئی۔ اے قرضوں کے بوجھ تلے بیٹھ گیا ہے اور پاکستان کی رسوائی کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس رسوائی کا جناب آصف علی زرداری اور اُن کی حکومت کی صحت پر کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا اور وہ مطمئن ہیں کہ ان کے ذاتی جاں نثاروں کو اربوں کمانے کا خوب موقع ملا ہوا ہے۔ اخلاقی پستی اور ڈھٹائی کی انتہائی شرمناک اور منحوس مثالیں قائم ہو رہی ہیں جن سے ملکی معیشت کے پیندے میں بہت بڑا سوراخ ہو چکا ہے۔

پاکستان میں صنعتوں کے فروغ کے لیے مسٹر بھٹو نے روس کے ساتھ کراچی میں اسٹیل مل لگانے کا معاہدہ کیا تھا جو یقینی طور پر ایک بہت بڑا بریک تھرو ثابت ہوا تھا۔ امریکہ پاکستان میں فولاد کا کارخانہ لگانے کا سخت مخالف تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے ماہر معاشیات پروفیسر اشفاق علی خاں اس خیال کا بڑی استقامت کے ساتھ پرچار کرتے رہے کہ وطن میں صنعتوں کا جال بچھانے کے لیے اسٹیل مل ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے جو پاکستان میں بہت جلد لگنا چاہیے۔ کراچی میں پاک اسٹیل مل کا افتتاح ہوا تو قومی حلقوں میں خوشی اور امید کی لہر دوڑ گئی۔ اس ادارے کو جب تک دیانت دار اور اچھے منتظمین میسر آتے رہے اُس وقت تک ملکی اقتصادیات کو تازہ خون ملتا رہا، مگر بدقسمتی سے ایم۔ کیو۔ ایم اور پیپلز پارٹی کے مصاحبین اسے کھوکھلا کرنے میں لگے رہے، چنانچہ جناب شوکت

عزیز کی حکومت نے ۲۰۰۶ء میں اسے نجی شعبے میں دینے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کے ایم۔ڈی لیفٹیننٹ جنرل (ر) عبدالقیوم خاں نے سپریم کورٹ میں یہ بیان داخل کیا کہ پاک اسٹیل مل کے ۲۳ ارب کے اثاثے ہیں اور اس کی توسیع کے منصوبے زیرِ تکمیل ہیں۔ سپریم کورٹ نے حکومت کے فیصلے کو کالعدم قرار دیا۔ اس کے بعد ایم۔ڈی میجر جنرل (ر) جاوید حالات میں مزید بہتری لے آئے۔ زرداری حکومت نے قومی اہمیت کا یہ ادارہ حریص، بدنیت اور نااہل افراد کے سپرد کر دیا جو اس کا جسم گدھوں کی طرح نوچتے رہے۔ وہ اب اربوں کا مقروض ہے اور ملکی معیشت پر ناقابلِ برداشت بوجھ بن چکا ہے۔ شاید اب اس کا پبلک سیکٹر میں چلتے رہنا محال ہو گیا ہے۔ اب صرف اقربا پروری اور بدعنوانی کے کارخانے دن رات عوام کی ہڈیوں سے نکالے ہوئے تیل سے چل رہے ہیں۔

روزمرّہ کی بنیادی ضرورتوں کی فراہمی اور ترقی اور خوشحالی کی منزلوں تک رسائی کے لیے توانائی ایک لازمی عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت ۲۰۰۸ء میں قائم ہوئی اور اس نے پیداوار اور طلب میں بڑھتے ہوئے فاصلے پر قابو پانے پر کوئی سنجیدہ توجہ نہیں دی اور فقط ان منصوبوں پر کام کیا جن سے بھاری کمیشن حاصل ہو سکتا تھا۔ رینٹل پاور اسٹیشن کے معاہدے بڑی عجلت میں کیے گئے اور اربوں کی پیشگی ادائیاں ہو گئیں لیکن ان سے اب تک ایک میگاواٹ بجلی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ بجلی اور پانی کے وزیر جناب راجہ پرویز اشرف نے اعلان کر دیا کہ دسمبر ۲۰۰۹ء سے لوڈ شیڈنگ ختم ہو جائے گی لیکن اس میں ہوشربا اضافہ ہوتا گیا مگر دُکھ کی بات یہ ہے کہ عوام کو فریب دینے کے جرم پر انھیں کوئی سزا نہیں دی گئی اور وہ اپنی آنے والی نسلوں کے لیے بہت سا مال بنا کر ایک طرف ہو گئے۔ منصوبہ بندی کے فقدان اور نااہل افراد کو امانتیں سپرد کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اکتوبر ۲۰۱۱ء میں پنجاب کے بیشتر شہروں میں بیس گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ ہونے لگی اور کراچی بھی زد میں آ گیا۔ سی۔این۔جی کی شدید قلت کے پیشِ نظر اس کے اسٹیشن ہفتے میں تین روز کے لیے بند کر دیئے گئے اور اسی طرح سوئی گیس کی عدم دستیابی سے فیصل آباد میں ٹیکسٹائل کے کارخانے آخری دموں پر ہیں۔ کراچی کی صنعت بیٹھ گئی ہے اور پیداوار کا پہیہ سست، بے روزگاری اور مہنگائی کا عفریت پھیلتا جا رہا ہے اور عام آدمی کا سکون نگلتا جا رہا ہے۔ ملک میں اگر معاشرتی عدل کا نظام قائم ہوتا تو ہماری اشرافیہ سخت ترین سزا کی سزاوار قرار پاتی اور عوام دشمنی پر حکمرانوں کو سرِ عام کوڑے لگائے جاتے۔ اب یہ وقت آن پہنچا ہے کہ کڑے احتساب کی تلئیاں لگنے والی ہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ حکومتیں جو بنیادی اشیا کی قیمتیں مقرر کرنے اور ان کی کوالٹی کنٹرول میں بری طرح ناکام رہیں، بازار میں جعلی دوائیاں فروخت ہو رہی ہیں، تعلیم اور صحتِ عامہ کے حالات ناگفتہ بہ ہیں، اچھی حکمرانی کے سارے نشانات مٹا دیئے گئے ہیں، آج ان کے خلاف عوام کے اندر ناقابلِ بیان حقارت اور نفرت پھیل رہی ہے۔ ان دنوں دراصل حکومت میں معمول کے فرائض ادا کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رہی کیونکہ جمہوری انداز سے معاملات چلانے کے بجائے ایک مافیا نے اقتدار پر قبضہ جما رکھا ہے۔ سندھ کے وزیرِ اعلیٰ جناب قائم علی شاہ کے پاس ایک درجن کے لگ بھگ وزارتیں ہیں جو پیر پگاڑا کے ارشادات کی رو سے بھنگ پیئے رہتے ہیں۔ اسی طرح پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ جناب شہباز شریف وزارتوں سے لدے پھندے ہیں اور یہ تاثر عام ہے کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی وزیر اپنے اختیارات استعمال نہیں کر سکتا۔ ہر مہذب معاشرے میں حکومت امنِ عامہ کے بعد سب سے زیادہ توجہ تعلیم، صحت اور پبلک ٹرانسپورٹ پر دیتی اور اُن میں بہتری لانے کے لیے تحقیق اور منصوبہ بندی کرتی رہتی ہے۔ پنجاب کے وزیرِ تعلیم پر غالباً چار پانچ غیر متعلقہ وزارتوں کا بار ہے جس میں ٹرانسپورٹ کی وزارت بھی شامل ہے۔ اس لیے تعلیم کا محکمہ زبوں حالی کا شکار ہے اور پنجاب کے چار سیکنڈری بورڈز نے گیارویں جماعت کے امتحانات کے نتائج میں جس بے عقلی، بے بصیرتی اور مافیا گردی کا مظاہرہ کیا ہے اس کے ردِعمل میں طلبہ سڑکوں پر نکل آئے اور ذمہ دار اتھارٹی پانچ روز تک اپنے غلط اقدامات کے دفاع میں دلائل دیتی اور نوجوانوں کے اشتعال میں اضافہ کرتی رہی اور جب یہ احتجاج طوفان کی شکل اختیار کرنے لگے تو وزیرِ تعلیم نے چار بورڈز کے نتائج منسوخ کیے جبکہ اگلے روز حکومت نے تمام بورڈوں کے نتائج منسوخ کر کے دو ماہ بعد دوبارہ نتائج کے اعلان کا یقین دلایا اس جرم کی سزا کسی کو تو ملنی چاہیے جو لاکھوں طلبا کو اذیت پہنچانے اور ان کا قیمتی وقت ضائع کرنے کا باعث بنا ہے۔

پنجاب میں وزارت صحت کا بار بھی وزیرِ اعلیٰ اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ اپنی گوناگوں مصروفیات میں اس طرح پھنسے رہتے ہیں کہ انھیں حفظانِ صحت کے لیے ایک دو رس منصوبہ بندی کے لیے وقت نہیں ملتا۔ پی۔ایم۔اے لاہور نے جون میں سپرے کرانے کی ضرورت پر زور دیا تھا اور ڈینگی بخار کے خطرے سے بروقت آگاہ کیا تھا مگر حکومت کی عدم دلچسپی کے باعث سپرے وقت پر نہ ہو سکا اور کڑی نگرانی کی عدم موجودگی میں چھڑکاؤ کے لیے جو دوا استعمال کی گئی وہ غیر معیاری اور غیر مؤثر ثابت ہوئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کہرام سا مچ

گیا اور ہسپتال مریضوں سے بھر گئے۔ روزانہ دس پندرہ اموات کی خبریں نشر ہونے لگیں۔ بلاشبہ جناب وزیراعلیٰ نے اس دوران غیر معمولی قوتِ کار اور انتظامی صلاحیت کا ثبوت دیا، عوام کے اندر زبردست آگاہی پیدا کی اور ہسپتالوں میں آسانیاں فراہم کرنے پر توجہ دی مگر یہ سوال پوچھا جارہا ہے کہ ہم ایک خودکار نظام کیوں قائم نہیں کر پاتے اور وقتی اچھل کود کو حقیقی اور دیرپا کامیابی کیوں تصور کر لیتے ہیں اور ایک وزیرِ صحت کا تقرر کیوں عمل میں نہیں آتا ہے؟

آبادی کے لحاظ سے سندھ پاکستان کا دوسرا بڑا صوبہ ہے۔ صوفی شاعر بھٹائی کے محبت بھرے نغموں سے معمور اس خطے میں کراچی سالہا سال سے قتل و غارت کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور موجودہ حکومت کے عہد میں خون ریزی اور غارت گری میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سندھ حکومت میں جو سیاسی جماعتیں شامل ہیں، وہ سپریم کورٹ کے مشاہدات کی رو سے ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری، اغوا اور تشدد کی کارروائیوں میں ملوث ہیں جو اقتدار کی خاطر آپس میں تعاون بھی کر رہی ہیں۔ اقتدار کا کھیل خوفناک بھی ہے اور سفاک بھی۔ پیپلز پارٹی کا زیادہ تر وقت اپنے سیاسی حلیفوں کی ناز برداری میں گزرتا ہے کہ ان کی حمایت کے بغیر وہ ایک لمحے کے لیے اقتدار میں نہیں رہ سکتی۔ ایم۔ کیو۔ ایم وقفے وقفے سے روٹھ کر حکومت سے باہر آجاتی ہے۔ یہ اہلِ اقتدار کی سنگ دلی کی انتہا تھی کہ جب امریکی ہیلی کاپٹر اسامہ بن لادن کو گرفتار کرنے ایبٹ آباد میں اترے تھے، تقریباً اسی وقت ایوانِ صدر میں پیپلز پارٹی اور قاف لیگ کے درمیان ہونے والے معاہدے پر جشن منایا جارہا تھا اور اسامہ بن لادن کی ہلاکت سے امریکہ کو عظیم فتح کا پیغام دیا جارہا تھا۔

اس پُراسرار اور ڈرامائی کھیل میں حکومت کے اہم ادارے اپنے فرائض سے غافل ہو گئے جس کے نتیجے میں سندھ کے وسیع و عریض علاقوں میں بارشوں کے پانی نے تباہی مچادی جو گزشتہ سال کے ہلاکت خیز سیلاب سے کہیں زیادہ ہے۔ اس بار میرپور خاص، نواب شاہ، بدین اور ٹھٹھہ مہینوں سے پانی کے اندر ڈوبے ہوئے ہیں اور ہماری حکومت کا اعتبار اٹھ جانے سے غیر ملکی ممالک نے امداد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ میاں نواز شریف کی قیادت میں پنجاب سے امدادی سامان اندرونِ سندھ پہنچ جاتا ہے جو قومی یک جہتی کے لیے ایک اچھا شگون ہے۔ حکومت سندھ اور وفاقی حکومت پریشان حال اور بے کس آفت زدگان کی امداد اور بحالی میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لے رہیں جس کے سبب عوام کے اندر ان کے خلاف سخت بے زاری بڑھتی جارہی ہے۔ سندھ کی فلاحی تنظیمیں اپنے ہم وطنوں کی خدمت کے لیے سرگرم دکھائی دیتی ہیں اور جماعت اسلامی اور جماعت الدعوہ بھی امدادی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹیموں کے ساتھ پہنچی ہوئی ہیں جبکہ فوج نے مختلف مقامات پر امدادی کیمپ لگا رکھے ہیں۔ کئی مہینوں پر محیط اس عذاب نے سندھ کے سیاسی کلچر پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے اور پیپلز پارٹی کی جڑیں اکھڑنے لگی ہیں۔ ڈاکٹر ذوالفقار مرزا نے ایم۔ کیو۔ ایم اور پیپلز پارٹی کے مفاد پرست گروہ پر کاری ضرب لگائی ہے اور غالباً سندھ حکومت میں کوئی بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔ اخبارات میں اس نوع کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں کہ جناب قائم علی شاہ کی جگہ صدر زرداری اپنی بہن فریال تالپور کو وزیراعلیٰ مقرر کرنے والے ہیں جو پہلے ہی سے تمام فیصلے کر رہی تھیں۔ اب عوام کے اندر خاندانی موروثیت کا تاثر مزید گہرا ہو جائے گا۔

پاک امریکہ تعلقات میں جو ایک سخت مرحلہ آیا ہے، اس میں ہماری حکومت کی چالاکیوں اور دوعملیوں کا بھی خاصا عمل دخل ہے۔ جناب یوسف رضا گیلانی نے آئی۔ ایس۔ آئی کو وزارتِ داخلہ کے ماتحت کرنے کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا جبکہ کیری لوگر بل کے ذریعے پاک فوج کو امریکی مفادات کے زیر اثر لانے کی کوشش کی گئی، مگر عسکری قیادت نے سخت مزاحمت کی اور قومی سوچ کو اپنے حق میں ہموار کیا۔ اس پر امریکہ نے بڑی مہارت سے سیاسی و عسکری قیادت میں پھوٹ ڈالنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے، تاہم ۲۹ ستمبر کو منعقد ہونے والی اے۔ پی۔ سی نے فوجی قیادت اور آئی۔ ایس۔ آئی کو بڑی تقویت پہنچائی اور قوم کی متفقہ آواز نے امریکی قیادت کا غرور متزلزل کر ڈالا۔ ہیلری کلنٹن جو اعلیٰ فوجی قیادت کے ساتھ اسلام آباد آئیں، انھیں ماضی کے سخت مؤقف سے پیچھے ہٹتے ہوئے یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہم اب امن کو موقع دیں گے اور الزام تراشی کے بجائے باہمی احترام اور مشترکہ مقاصد کی بنیاد پر آپس میں تعاون کریں گے۔ انھیں جنرل کیانی کے اس بیان کے ساتھ بھی اتفاق کرنا پڑا کہ پاکستان کسی بھی طور عراق اور افغانستان نہیں اور اسے اپنے مفادات کے تحفظ کا پورا حق پہنچتا ہے۔

دونوں ملکوں کی قیادت کے مابین جو مذاکرات ہوئے، ان سے ناتجربے کار حنا ربانی کے وزیرِ خارجہ بنا دینے کی غلطی کے منفی اثرات سامنے آئے ہیں۔ جناب صدر زرداری نے ایک انتہائی نازک موڑ پر ہماری خارجہ پالیسی کو ایک بڑے خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ محترمہ حنا ربانی کھر دہلی گئیں تو بھارتی میڈیا نے انھیں چٹکیوں میں اُڑا دیا اور اُن کی آرائش و زیبائش پر طرح طرح کے افسانے شائع کیے۔ وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرنے گئیں، تو اس شکایت کے ساتھ گھر لوٹیں کہ ان کی باتوں کو غلط معانی پہنائے گئے۔ امریکی

وزیرِ خارجہ ہیلری کلنٹن کے ساتھ مشترکہ پریس کانفرنس میں اُن کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ ایک منجھی ہوئی، دوربین اور عالمی سطح پر بہت قدآور امریکی خاتون وزیرِ خارجہ کے سامنے ہوٹل مینجمنٹ کی شُدبُد رکھنے والی ہماری وزیرِ خارجہ بہت بے وزن محسوس ہوئیں۔ جناب صدر زرداری کو اپنی انا سے باہر آ کر خارجی امور ایک بالغ نظر اور معتبر شخصیت کے حوالے کرنے چاہئیں کیونکہ ہمیں اس وقت اپنی بقا کا مسئلہ درپیش ہے۔

اس مرحلے پر مسٹر بھٹو مرحوم کی اہلیہ اور بے نظیر بھٹو شہید کی والدہ محترمہ نصرت بھٹو کے انتقال پُرملال نے سیاسی واقعات کے بہاؤ کا رخ وقتی طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کو اپنی گرتی ہوئی ساکھ اور اپنی سیاسی قوت کو بحال کرنے کا موقع ملے گا یا اسے ایک نئی آزمایش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ ایک بہادر اور پُرعزم سیاسی بصیرت کی حامل شخصیت تھیں اور مزدوروں، سیاسی کارکنوں اور اپنے عوامی رابطوں کی بدولت خواتین سے بہت قریبی تعلق رکھتی تھیں۔ عوام کے ساتھ اس گہرے روابط نے آمریت کے دور میں پیپلز پارٹی کو بڑی حد تک متحد اور منظم رکھا۔ یہ بیگم نصرت بھٹو کی سیاسی بصیرت اور اعلیٰ فراست ہی تھی کہ انھوں نے ۱۹۸۱ء میں جناب مفتی محمود، ایئر مارشل اصغر خان، مولانا احمد شاہ نورانی، خان عبدالولی خان اور غوث بخش بزنجو کے ساتھ مل کر بحالیٔ جمہوریت کی تحریک (ایم۔آر۔ڈی) کی بنیاد رکھی اور سیاست کی شمع کو گل ہونے نہیں دیا۔ اس کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کو ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل ہوئی اور اُن کی صاحبزادی بے نظیر بھٹو پاکستان کی وزیراعظم بنیں۔ محترمہ نصرت بھٹو جس قدر بلند ہمت اور پُرعزم خاتون تھیں، اسی قدر انھیں پہاڑ جیسے صدمے برداشت کرنا پڑے۔ اُن کے بیٹے شاہ نواز کی پُراسرار موت کے بعد ستمبر ۱۹۹۶ء میں اُن کے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو کو ۷۰ کلفٹن کے بالکل سامنے جس طرح گولیوں سے چھلنی کیا گیا، اس حادثے نے ان کے اعصاب شل کر دیئے تھے اور انھوں نے اپنی بیٹی کی نااہل حکومت پر کڑی تنقید کی تھی جس نے ان سے پارٹی کی قیادت بھی چھین لی تھی۔ اس جان لیوا صدمے کے بعد اُن کی صحت گرتی گئی، دُبئی میں سالہا سال بے ہوش رہیں اور ۲۳/اکتوبر ۲۰۱۱ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمارے سیاست دانوں کو ان کی خوبیاں اپنانے کی توفیق عطا کرے۔

اس تلخ حقیقت کے باوجود جاگیرداروں، تنگ نظر منصوبہ سازوں، بے رحم سرمایہ داروں، خودغرض سیاست دانوں اور اسلام کی حقیقی روح سے نابلد مذہبی پیشواؤں نے ہمارے عوام کو فروعی اختلافات اور نسلی، لسانی اور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صوبائی تعصّبات میں تقسیم کیے رکھا اور ان کی جسمانی، ذہنی اور تخلیقی نشوونما پہ بہت کم توجہ دی گئی مگر وہ بلا کے ذہین، جفاکش اور قومی مفادات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ ہمارے عامۃ الناس گزشتہ ایک سال سے عالمِ عرب میں اُٹھنے والی آزادی کی تحریکوں اور ان سے اُبھرنے والے مناظر ٹی۔وی پر دیکھ رہے ہیں اور ان کے اندر بھی اپنے بے حس، بے لگام اور پرلے درجے کے نااہل اور بدعنوان حکمران طبقے کے خلاف بغاوت کا رجحان پرورش پا رہا ہے۔ لوگ بجلی کی لوڈشیڈنگ، پولیس کے مظالم اور بدترین حکمرانی کے خلاف مظاہرے بھی کرنے لگے ہیں اور انقلاب کی بات بلند آہنگ میں کرنے لگے ہیں۔ میاں نواز شریف، جناب عمران خان، جناب منور حسن اور اب ڈاکٹر ذوالفقار مرزا اور جناب ممتاز بھٹو بھی ایک عظیم تبدیلی کی نوید سُنا رہے ہیں۔ جلسے ہو رہے ہیں اور مختلف شہروں میں ریلیاں نکالی جا رہی ہیں جن میں ''گوزرداری گو'' کا عوامی کورس شروع ہے۔ ہمارے بیشتر سیاسی قائدین قوم کو اُمید کی روشنی دینے اور اس کے اندر فکری اور سیاسی وحدت پیدا کرنے کے بجائے آپس ہی میں ایک دوسرے پر جھپٹ رہے ہیں۔ عوام جلد سے جلد تبدیلی چاہتے ہیں مگر وہ ابھی تک انارکی پھیلانے کے حق میں نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سیاسی عمل اور فیصلہ سازی میں اُنھیں بھرپور کردار ادا کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے۔

اس سے قبل کہ عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور وہ بے قابو ہو کر مصر اور تیونس کی طرح عوام لاکھوں کی تعداد میں سڑکوں پر نکل آئیں، اس لیے ہمارے حکمرانوں، مذہبی راہنماؤں، ہمارے سیاست دانوں اور ہمارے مذہبی زعماء کو سر جوڑ کر بیٹھنا اور قومی اور ملکی امور میں عوام کی مؤثر نمائندگی اور عملی تقاضوں کے قابلِ عمل خدوخال مرتب کرنا ہوں گے۔ اس ضمن میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ سیاسی جماعتیں جو ملک میں جمہوریت کو پائیدار دیکھنے کی آرزومند ہیں، وہ اپنے اندر جمہوریت کو فروغ دیں اور نچلی سطح تک اندرونی انتخابات کے ذریعے پارٹی کے عہدے دار چنے جائیں اور انہی کے ذریعے صوبائی اور قومی اسمبلی کے انتخابات کے لیے اُمیدواروں کا چناؤ کیا جائے۔ اس طرح سوسائٹی کے پڑھے لکھے اور سیاسی شعور سے مالا مال افراد سیاسی جماعتوں کا حصہ بننے میں ایک اعزاز محسوس کریں گے اور سیاسی جماعتیں جواب خاندانی وراثت کا نمونہ پیش کر رہی ہیں، عوام کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کر سکیں گی۔

آج کے تناظر میں اس بات کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ تمام پبلک اداروں کے کلیدی عہدوں پر تقرریاں ایگزیکٹیو پر چھوڑنے کے بجائے اُن کا اختیار ایک پارلیمانی کمیٹی کو دیا جائے جس میں تمام پارٹیوں کی

نمائندگی موجود ہو اور وہ حکومت کی طرف سے نامزد افراد کی پوری طرح چھان بین کرے اور پبلک ہیرنگ (Public Hearing) کے ذریعے مجوزہ افراد کے کوائف معلوم کیے جائیں۔ اس کمیٹی کی سفارش پر وزیراعظم تقرری کا نوٹیفیکیشن جاری کریں۔ آج بڑے عہدے حاصل کرنے کا نرخ پچاس کروڑ تک جا پہنچا ہے۔ اس کرپشن کی فوری روک تھام وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

نواز شریف کی یہ تجویز صائب معلوم ہوتی ہے کہ قومی پالیسیاں حکومت اپوزیشن اور عسکری قیادت کے باہمی مشورے سے بنائی جائیں اور جن پر پوری یکسوئی اور ہم آہنگی سے عمل درآمد کیا جائے۔ اس تجویز کی عملی شکل یہ بنتی ہے یہ کہ وزیراعظم کی سربراہی میں ایک نیشنل سیکورٹی کونسل قائم کی جائے جس میں قومی سلامتی کے علاوہ اہم عہدوں پر تقرریوں کے معاملات اور اقتصادی اور خارجی امور باہمی رضامندی سے طے کیے جائیں۔ اس کونسل کا ایک مضبوط سیکرٹریٹ ہونا چاہیے جو اُبھرنے والے مسائل پر تحقیقی کام کرتا اور اہل امراء سے مشورے حاصل کرتا رہے۔ یہی کونسل یہ بھی طے کرسکتی ہے کہ اچھی حکمرانی کن کن اقدامات اور طویل المیعاد منصوبوں کے ذریعے فروغ پاسکتی ہے۔

سیاسی جماعتوں، حکومت اور پارلیمنٹ کو راہ راست پر رکھنے کے لیے سول سوسائٹی کو ایک فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔ پروفیشنل اپنے اپنے شعبوں کی بہتری کے لیے رائے عامہ ہموار کریں، تعلیم اور صحت پر خصوصی توجہ دیں اور میڈیا اور عدلیہ کے ذریعے اور حکمرانوں، بیوروکریٹس اور منصوبہ سازوں کے موثر احتساب کو یقینی بنائیں۔ اس طرح قیادت عوام کی طرف منتقل ہوجائے گی اور یوں قائم ہوگی عوام کی حقیقی جمہوریت۔

بداعمالیوں کے گھپ اندھیرے میں چند اچھی خبریں منظرِ عام پر آئی ہیں جن سے اُمید بندھتی ہے کہ پاکستان ایک روشن مستقبل کی طرف پیش قدمی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پہلی اچھی خبر یہ ہے کہ ہمارا ملک اقوامِ متحدہ کی سیکورٹی کونسل کا غیر مستقل ممبر منتخب ہوا ہے۔ جو اس حقیقت کا مظہر ہے کہ اُسے اقوامِ عالم میں معقول حمایت حاصل ہے۔ دوسری اچھی خبر یہ ہے کہ انٹیلی جنس بیورو جو انٹیلی جنس کا ایک مقتدر سول ادارہ ہے اُس کی سربراہی پولیس کے نہایت دیانت دار، فرض شناس اور بااُصول اعلیٰ پولیس افسر جناب آفتاب سلطان کے سپرد کی گئی ہے۔ اس سے یہ تاثر قائم ہوا ہے کہ حکومت میں اعلیٰ سطح پر ایک ذہنی تبدیلی آرہی ہے۔

# کراچی میں سجی ادیبوں اور دانشوروں کی کہکشاں

زبان کی تاریخ گویا قوم کی تہذیب، ارتقا اور ثقافت کی ترویج کا عکس ہوتی ہے

اُردو عصر حاضر میں
ایکسپریس میڈیا گروپ کے زیراہتمام
بین الاقوامی کانفرنس کا آنکھوں دیکھا احوال
وہاں کئی حیرتیں ہماری منتظر تھیں

اختر عباس

**کراچی** ہوائی مستقر پہ اس وقت اترنے والی یہ واحد پرواز تھی۔ کبھی یہاں اٹھارہ اٹھارہ جہاز اترا کرتے تھے۔ مسافر اپنا سامان لے جا چکے تھے اور میں ہوائی اڈے کے اندر بیٹھا اپنے میزبان کا انتظار کر رہا تھا۔

آدھا گھنٹہ ہونے کو آیا، سارے ماحول کا جائزہ مکمل ہوگیا تھا۔ آتے جاتے چہروں سے شناسائی بھی ہوگئی تھی۔ جب رابطہ کیا تو علم ہوا کہ ہمارے عزیز دوست اور میزبان سلیم مغل صاحب کا ڈرائیور تو کب کا نکل چکا۔ اُردو ڈائجسٹ کے مقامی ڈسٹری بیوٹر محمد ارشد صاحب ایکسپو سنٹر پہ منتظر تھے اور ایکسپو ایکسپریس میڈیا گروپ کے زیراہتمام ''اُردو اور عصرِ حاضر'' کے عنوان سے دو روزہ انٹرنیشنل کانفرنس کا آغاز ہوچکا تھا۔ اسی میں شرکت کے لیے میں لاہور سے یہاں پہنچا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوائی اڈے سے باہر نکلا تو ڈرائیور صاحب گاڑی کے شیشے پہ نام چپکائے سکون سے سیٹ لمبی کر کے لیٹے تھے۔ متوجہ کرنے پر موصوف باہر تشریف لائے اور سامان رکھنے لگے۔ پوچھا آپ کو تو ''اندرون ملک آمد والے دروازے'' پہ ہونا چاہیے تھا۔ بولے ''سوچا، آپ خود ہی تشریف لے آئیں گے، کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔'' مجھے وہ پورا انقلابی لگا جو پورے سکون سے لیٹے انقلاب کے منے منے سے پوسٹر لگا کر انتظار کرتے ہیں کہ انقلاب آ کر خود ہی ان کے دروازوں پہ دستک دے دے گا۔

☆☆☆

ایکسپو سینٹر کا ہال نمبر دو بڑی خوبصورتی سے سجا اور ڈھکا ہوا تھا۔ دروازے پہ الیکٹرانک ڈینکٹر لگے ہوئے تھے۔ دروازے کے ساتھ کتابوں کے سٹال تھے۔ ذرا آگے کھانے کے لیے مخصوص کی گئی جگہ تھی اور پھر بڑا سا ہال جس میں دو بڑی بڑی سکرینیں سٹیج پہ بیٹھے مہمانوں اور مقرر کے چہرے اور خیالات کو آخر تک پہنچا رہی تھیں۔

جوں ہی وقفہ ہوا تو مہمان اور حاضرین چائے کی طرف لپکے اور ہم نے تاک تاک کر مہمانوں کو ڈھونڈنا اور ملنا شروع کیا۔ احفاظ الرحمن صاحب ایکسپریس کے میگزین ایڈیٹر کہ میزبان بھی تھے اور اپنے صحافی دوست اور دنیائی۔ وی کے ظہیر بابر سے اُن کی بڑی تعریف بھی سن رکھی تھی۔ جناب امجد اسلام امجد اور ایوب خاور سے بھی ملاقات ہوئی۔

> ''بینرز تک زبان اور اہل زبان دونوں کی شائستگی کا عکس لیے تھے''

یہ ماہ اکتوبر کا آخری دن تھا، مہمانوں کو ارشد صاحب اور ان کے ساتھ آئے معاون کی مدد سے اُردو ڈائجسٹ کا تحفہ پیش کیا جسے بے حد سراہا گیا۔ اسے سب نے بروقت اور برموقع جانا کہ اُردو ڈائجسٹ کا اُردو زبان سے ہی نہیں اس کی سادگی، تازگی اور شگفتگی سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بلاشبہ ہزاروں پڑھنے والوں اور اُن کی تیسری نسل کو گزشتہ پچاس سالوں سے اُردو سے جوڑے رکھنے کا خوشگوار اور قابلِ قدر فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔

کوئی بھی زبان، محض رابطے کا ذریعہ تھوڑی ہوتی ہے۔ یہ تو کسی بھی خطے، قوم کی تمام تر مادی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل، ترتیب اور تہذیب کرتی ہے۔ زبان ہی انسانوں کے شعور اور خیال کی نگہبان ہوتی ہے۔ زبان کی تاریخ گویا قوم کی تہذیب، ارتقاء اور ثقافت کی ترویج و ترقی کی غماض ہوتی ہے۔

جو صاحبانِ عقل و دانش اس بات سے انکاری تھے، اب انگریزی کی عمل داری اور اثر پذیری سے بخوبی اندازہ کر رہے ہیں کہ زبان اپنے ساتھ کیا کچھ لے کر آتی ہے۔ یہی تاریخ تو اس کی قوت ہوتی ہے۔ الحمد للہ! اُردو زبان اِس لحاظ سے ایک توانا زبان ہے۔

کانفرنس کے فلیکس بہت بڑے بڑے اور سادہ تھے اور ان پہ سوچے سمجھے جملے تحریر تھے۔ عام طور پہ سٹیج کے پس منظر میں لگے ''بیک ڈراپس'' پہ جو جملوں کی ہڑبونگ مچی ہوتی ہے، وہ اس کیفیت سے بالکل مبرّا اور پاک تھے۔ اچھا لگا۔ زبان اور اہلِ زبان دونوں کی شائستگی کا عکس نظر آیا۔

ابھی مہمانوں سے ملاقاتوں کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ پہلا سیشن اُردو کے عالمی مراکز (نواحی بستیاں) اور ان کی صورتحال پہ ہندوستان سے زبیر رضوی، کینیڈا سے اشفاق حسین، ناروے سے فیصل قریشی، برطانیہ سے رضا علی عابدی، چین سے ڈاکٹر ٹھانگ منگ شنگ، ترکی سے ڈاکٹر خلیل طوقار اور امارات سے محمد کبیر خان نے اظہارِ خیال کیا۔ ان میں سے دو اصحاب نے تو خوب دھواں دھار تقاریر کیں۔ باقی نے اپنے اپنے ڈھنگ سے موضوع کا احاطہ کیا۔ جناب جمیل الدین عالی اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اس یادگار کانفرنس کی صدارت کے لیے تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم جو خوش لباسی اور خوش مزاجی کا امتزاج ہیں، انھوں نے ابتدائیہ کہا اور سب نے سُنا۔



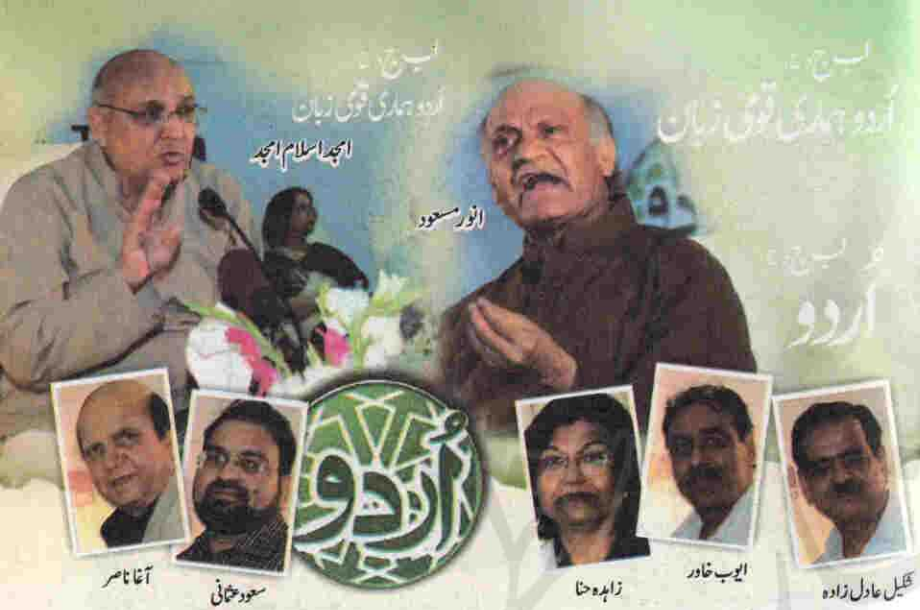


(چند ہفتوں بعد ایک یہ وقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب، وزیرِ داخلہ جناب رحمٰن ملک کو گورنر کے ہاتھوں کراچی یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دلوا بیٹھے ہیں اور یونیورسٹی کے سارے استاد بھی ناراض بیٹھے ہیں اور طلبا بھی کہ جناب ملک کو کسی علمی کارنامے کی بنا پر ایسی دستار فضیلت پہنا دی۔ سیاسی دباؤ اور مصلحتوں کے تحت کیے گئے ایسے فیصلے نیک نام شخصیات ہی نہیں اداروں کے لیے بھی بے حد نقصان کا باعث بنتے ہیں اور ان کی کریڈیبلٹی پہ بھی نشان لگا دیتے ہیں۔)

دوسرا سیشن اُردو اور ذرائع ابلاغ کا تھا۔ جناب رضا علی عابدی، امجد اسلام امجد، غازی صلاح الدین، امینہ سید، زبیر رضوی، اشفاق حسین اور احفاظ الرحمن کے اظہارِ خیال سے مکمل ہوا۔ اس کی خوبصورتی آغا ناصر کی گفتگو تھی۔ آغا ناصر اپنے عہد میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی دنیا کے امام رہے ہیں۔ اچھی گفتگو میں بھی کسی سے کم نہیں۔ دلچسپ واقعات اور باتوں سے سجی گفتگو نے خوب مزہ دیا۔

کھانے اور نمازِ ظہر کا وقفہ ہوا تو بے شک حیرت نے آن لیا کہ کھانے کا اس قدر عمدہ انتظام تھا کہ بہت دیر یقین نہیں آیا۔ میں باہر کھانے پہ مدعو تھا۔ اس لیے کافی دیر مجیب ظفر انوار حمیدی کے ساتھ (جو اپنے نام کی طرح خوب پھیلے ہوئے ملے) صرف کھانے کے سلیقے، حسنِ انتظام اور ورائٹی کو دیکھتے اور سراہتے رہے بالآخر خود بھی کھانے لگے۔ ایک دنیا تھی جو کھانا لے کر زمین پہ ہی بیٹھ کر کھا رہی تھی۔ ان کے لیے کوئی اچھا انتظام بھی ہو سکتا تھا۔ تازہ جوسز کے سٹال پہ پہلے تو لوگ اس لیے نہ گئے کہ شاید خوبصورتی کے لیے ہے۔ بھلا دو سو لوگوں کے لیے کیسے انتظام ہوگا مگر جونہی اندازہ ہوا کہ سب انہی کے لیے ہے تو پھر تو عالم یہ تھا کہ ہم نے ایک دو لوگوں کو سٹال پہ لٹکے سیبوں کو بھی اُڑاتے دیکھا۔

یہ کھانا کسی بہترین ہوٹل کے بوفے کے انداز میں چنا گیا تھا۔ نفاست، نزاکت، عمدہ سروس اور کھانے کا بہترین انتخاب۔ مجھے لگا..... اُردو کانفرنس کے منتظمین نے اس حوالے سے بھی ایک عمدہ روایت اور معیار قائم کر ڈالا۔

☆☆



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کانفرنس تو اگلے روز شام تک بلکہ رات تک جاری رہی۔ اگلے روز ہم نے ایک مزے کا کام کیا کہ جس ہال میں پروگرام ہو رہا تھا۔ اس کی دیوار کے پار، جو فلیکس کی بنی تھی، ہم نے دو کرسیاں رکھ لیں اور اپنا مُنا سا ٹیپ ریکارڈر لے کر بیٹھ گئے۔ مہمان کو اٹھا کر وہاں لے آتے اور پھر گفتگو کا آغاز ہو جاتا۔ دلی سے آئے ہوئے عازم کوہلی، ناروے سے آئے ہوئے فیصل ہاشمی، کینیڈا سے آئے اشفاق حسین، انڈیا سے آئے شمیم حنفی سے ملاقاتیں اور باتیں وہیں ہوئیں۔ البتہ ترکی سے مہمان ڈاکٹر خلیل طوقار اور چین سے آئے ڈاکٹر تھانگ منگ شنگ، انڈیا سے تشریف لائی جیلانی بانو سے ملاقاتیں پروگرام کے وقفوں میں ہوئیں۔ ان کی روداد آئندہ ماہ سنائیں گے)۔ فی الحال تو یہ بتاتے چلیں کہ ایکسپریس میڈیا گروپ کی یہ کانفرنس دونوں دن بھرپور اور خوب رہی۔ حاضرین کی کمی ایسی کانفرنسز میں اکثر تنگ کرتی ہے مگر منتظمین نے بڑی دانش مندی سے کام لیتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے مقامی اداروں سے اساتذہ اور طلبہ کو بلا رکھا تھا۔ یوں رونق کم نہ ہوئی۔

**شیریں بیاں داستاں گو رضا علی عابدی سے انٹرویو کی تفصیلات آئندہ شمارے میں**

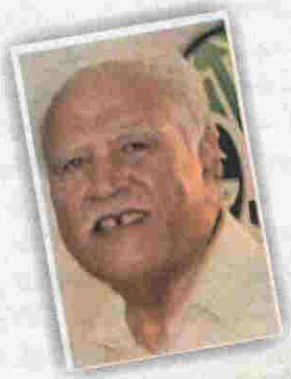

سب رنگ کے مدیر جناب شکیل عادل زادہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہم نے ان کی قسط وار کہانی بازی گر کی تکمیل کی فرمائش کی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ جونہی موقع ملا اسے مکمل کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیں گے۔

☆☆

کانفرنس کے دوسرے روز پروفیسر محمد بابر ہمارے ساتھ رہے۔ وہ حال ہی میں آغا خاں یونیورسٹی سے فارغ

**سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے**

اِس کامیاب اور بے حد مفید کانفرنس کے اِنعقاد پر بلاشبہ ایکسپریس میڈیا گروپ اور اُس کے سی او اعجاز الحق مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اپنی زبان، اُس سے وابستہ دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور ملکوں ملکوں بسنے والے اہلِ فکر و نظر کو جمع کیا۔ اِتنے اہلِ علم کا اجتماع نہ تو کوئی آسان کام تھا اور نہ اِس قدر سادہ۔

اِس کانفرنس کے باعث ایکسپریس کو بطور گروپ خوب سراہا گیا اور اُس کی ٹیم کی جس نے احفاظ الرحمٰن کی قیادت میں اِتنا عمدہ کام کیا، تحسین کی گئی۔ دورانِ کانفرنس اہم موضوعات پہ تبادلۂ خیال کے مواقع فراہم کرنے سے کتنے ہی دریچوں سے آنے والی روشنی بڑھ گئی اور ملک کے سیاسی و سماجی حالات کی تلخیوں سے پیدا ہونے والی گھٹن کو کم کرنے میں کافی مدد ملی اور سب سے بڑھ کر اپنی زبان اُردو، پیاری زبان اُردو پر چاروں طرف سے پڑتی اور اڑتی گرد صاف ہوئی۔

ہوئے ہیں اور یونیورسٹی سے کافی ناراض تھے کہ انھوں نے ملازمین میں قائم توازن ختم کر کے ایک ہی فرقے یعنی صرف آغا خانی کمیونٹی کے لوگوں کو رکھنا شروع کر رکھا ہے۔ پروفیسر مجیب ظفر انوار نے عصرانہ دیتے دیتے مغربانہ کھلا دیا اور وہ بھی Nando لے جا کر۔ دوسرے

روز ہم نے خاص خاص مہمانوں کو نومبر کے شمارے دیئے۔ ایک دو نے کہا کل تحفہ ملا تھا مگر جونہی ٹائٹل پر نظر پڑی تو بولے یہ اُردو والوں نے راتوں رات ڈائجسٹ چھاپ دیا کیا! کھانے کا وقفہ ہونے کو تھا جب جناب زاہد علی خاں پہنچ گئے۔ یہ زمانۂ طالب علمی میں ایم ڈی کے انچارج ہوا کرتے تھے۔ اِتنے سالوں بعد مل کر بہت اچھا لگا۔ اب ہماری منزل فیڈرل بی ایریا میں واقع اسلامک ریسرچ اکیڈمی تھی، جہاں ممتاز دانشور جناب شاہد ہاشمی نے کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کافی احباب جمع تھے۔ جناب راشد سلیم سے لے کر ڈاکٹر معراج الحری صدیقی، سید سرفراز، اجمل سراج سمیت کتنے ہی احباب سے ملاقات ہوئی۔ اُردو ڈائجسٹ کے حوالے سے سوال و جواب کی طویل نشست ہوئی جس کا اختتام ملکی حالات پہ تبادلہ خیال سے ہوا۔ وہاں سے رُخصت لے کر جناب سلیم مغل کے ساتھ ایکسپو سنٹر پہنچے تو اعجاز احمد اعجاز بھی ساتھ تھے۔ مشاعرے کی تیاریاں زوروں پہ تھیں، اِسی دوران ہم نے مقامی تعلیمی اداروں کی طالبات سے گفتگو بھی ریکارڈ کر لی۔ حیدر آباد سندھ سے پرانے ساتھی وقاص باقر نقوی نے اچانک آن لیا، وہ اپنی پوری فیملی کے ساتھ مشاعرہ سننے آئے ہوئے تھے۔ ایکسپو کے قریب ہی اُن کے میٹرو ون ٹی وی کا آفس تھا جہاں وہ ہمیں لے گئے۔ وہاں کنٹرولر نیوز معروف صحافی جناب صفدر علی سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ وہ پیر پگاڑا کے خاص دوستوں میں سے سمجھے جاتے ہیں اور کراچی اور سندھ کے حالات پر اُن کی گہری نظر ہے۔ اِس حوالے سے اُن کے ساتھ سیر حاصل گفتگو رہی۔ واپس پہنچے تو مشاعرہ شروع تھا اور حاضرین پورے ذوق و شوق سے ہر اچھے شعر پہ داد دے رہے

**اُردو ہے جس کا نام ہمی جانتے ہیں داغ**
**سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے**



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے، البتہ شاعروں کا کرسیوں پہ بیٹھ کے مشاعرہ پڑھنا ہمیں زیادہ نہیں بھایا۔

شائستہ مزاج و وضع دار جناب احفاظ الرحمٰن کے ساتھ علی معین اور خالد معین نے خوب ہاتھ بٹایا۔ خالد معین نے سٹیج سنبھالا اور علی معین پس پردہ رہ کر انتظامات سنبھالتے بلکہ ڈوریاں ہلاتے رہے۔ مشاعرے کی میزبانی جاوید صبا نے کی۔ مشاعرہ رات گئے تک جاری رہا۔ ہم گھر پہنچے تو ایک بجنے کو تھا۔

## کراچی کا سکون دیکھ کر سکون ہوا

ائیر پورٹ سے ایکسپو سنٹر جاتے ہوئے ہم نے کافی حراساں نظروں سے آس پاس دیکھا۔ لاہور سے آتے ہوئے کئی عزیزوں، دلداروں نے سمجھایا کہ کراچی کے حالات اچھے نہیں، کل اخبار میں کانفرنس کا احوال پڑھ لینا۔ کراچی کا سکون دیکھ کر بہت سکون ہوا۔ مولا اِن گھروں، لوگوں اور بستیوں کو شاد و آباد رکھے۔ اِن سب سے لاکھوں زندگیوں کی خوشیاں جڑی ہوئی ہیں۔ جتنے لوگوں سے بات ہوئی، سب کراچی میں امن کی بحالی پر خوش تھے مگر تھوڑے خوفزدہ بھی کہ سیاسی قیادت کی ذرا سی بے احتیاطی اور بے اعتدالی کتنے ہی گھروں کو اُجاڑنے کا باعث بنتی ہے۔ کراچی میں زیادہ گھومنے پھرنے کا موقع تو نہ ملا لیکن جتنے پلوں اور سڑکوں سے گزرے، صفائی کی حالت کو بہت برا پایا۔ پلوں کو دیکھ کر تو یوں لگتا تھا، جانے کتنی دہائیاں پہلے یہاں صفائی ہوئی ہوگی۔

انور مسعود نے حسب معمول مشاعرہ لوٹ لیا اور اس قدر لوٹا کہ ہمیں تو مشاعروں میں اُن پہ پابندیاں لگنے کے امکانات نظر آنے لگے۔ صدر مشاعرہ ظفر اقبال کی باری آئی تو سامعین کے ریسپانس سے بدمزہ ہوئے۔ مشاعرہ میں امجد اسلام امجد کی اپنے بیٹے کے لیے کہی گئی نظم بہت خاصے کی شے تھی۔ عباس تابش کو کافی داد ملی۔ سعود عثمانی، بشریٰ اعجاز، ایوب خاور کے علاوہ عطاالحق قاسمی لاہور سے بطورِ خاص آئے تھے۔ قاسمی صاحب سے اگلے روز ائیر پورٹ پہ ملاقات ہوئی تو ویل چیئر پہ بیٹھے تھے۔ ان کو ہمیشہ ہنستے مسکراتے اور زندہ دلی سے جیتے دیکھا ہے۔ بھاگ کر ان کے پاس پہنچا تو پتا چلا صبح صبح اٹھتے ہوئے مسئلہ ہوا اور اس قدر شدید کہ چلنا دوبھر ہوگیا۔ میری فلائیٹ لیٹ تھی اور میں تازہ تازہ مبلغ پانچ ہزار گنوانے کے صدمے سے دوچار تھا جو خدا جانے کہاں گرے۔ کسی نے مہارت سے میری جیب سے نکالے یا اپنی بے دھیانی میں کہیں مجھ سے گرے (جو بات آنکھوں دیکھی نہ ہو اور دل کی کیفیت پہ مطمئن نہ ہو تو وہاں قولِ فیصل دینے سے پرہیز ہی بہتر ہے۔ واللہ عالم) قاسمی صاحب کی موجودگی نے افسوس کی کیفیت سے بچائے رکھا۔ اُن کا بورڈنگ کارڈ بنوا کر پی۔آئی۔اے کے منیجر کے آفس گیا اور ان سے لاہور فون کروایا تاکہ قاسمی صاحب جہاز سے اتریں تو ویل چیئر فوراً مل جائے۔

> "کھانے کا اس قدر عمدہ انتظام تھا کہ بہت دیر تک یقین نہیں آیا"

واپسی کا سفر شاہین ایئر لائین پہ تھا اور پی۔آئی۔اے کے اثرات ان پہ کافی نمایاں تھے۔ بغیر وجہ کے پورے دو گھنٹے لیٹ۔ لاہور پہنچا تو اہلیہ اور دونوں بیٹیاں ایئر پورٹ پہ منتظر تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد مدیر منتظم جناب طیب اعجاز قریشی کا فون آ گیا جو واپسی میں اِس قدر تاخیر سے پریشان تھے۔ اِس سفر کے محرک بھی وہی تھے اور اب کامیاب واپسی پہ زیادہ خوش بھی وہی تھے۔ کراچی سے خیر کی خبریں آتی رہیں اور مسافر خیریت سے لوٹتے رہیں تو چہرے اور دل کس قدر خوش ہوتے ہیں، کراچی والوں کو شاید خبر بھی نہ ہو۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

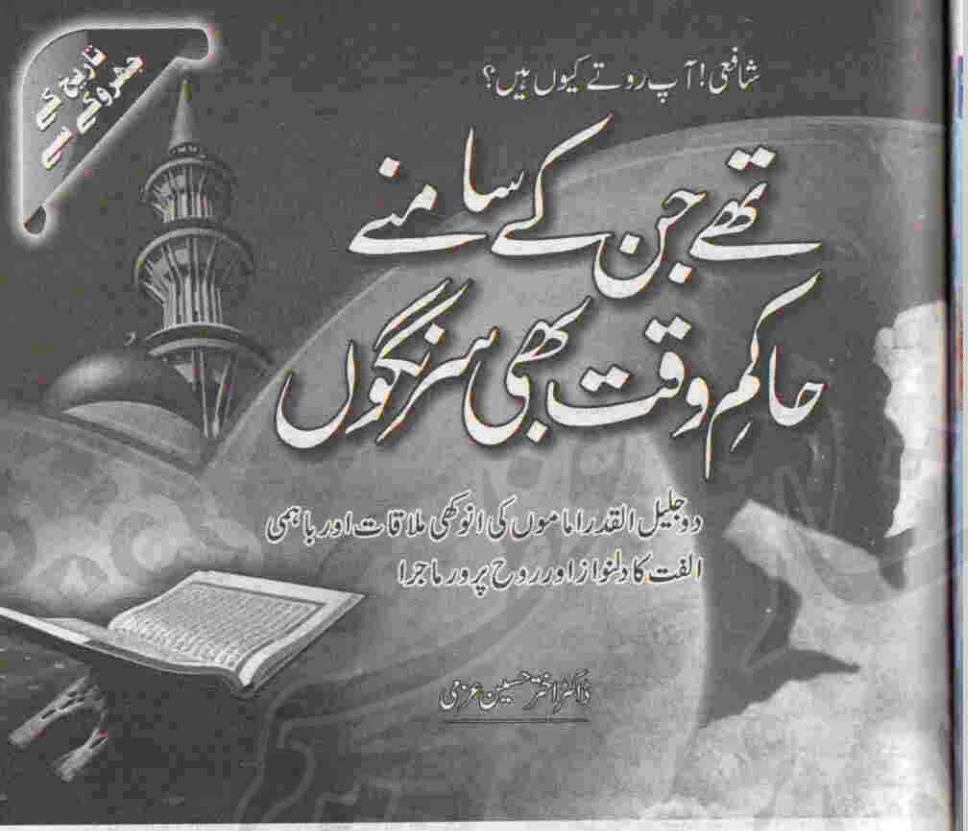

تاریخ کے جھروکے سے

شافعی! آپ روتے کیوں ہیں؟

# تھے جن کے سامنے حاکمِ وقت بھی سرنگوں

دو جلیل القدر اماموں کی انوکھی ملاقات اور باہمی الفت کا دلنواز اور روح پرور ماجرا

ڈاکٹر اختر حسین عزمی

مسجد نبویؐ پر نظر پڑتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لرزیدہ جسم کے ساتھ وہ مسجد میں داخل ہوا۔ نماز پڑھی، روضہ رسول ﷺ پر حاضری دی اور شاہ انبیاء کے حضور سلام پیش کیا۔ جب وہ روضہ رسولؐ سے پلٹا تو دیکھا کہ مسجد میں ایک بزرگ نورانی صورت انتہائی تواضع اور وقار کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ اردگرد نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد سر جھکائے مؤدب بیٹھی درس سن رہی ہے۔ بزرگ کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہے۔ وہ ایک چادر بطور تہبند باندھے اور ایک اوڑھے ہوئے ہیں اور بڑے جوش اور بلند آواز سے فرما رہے ہیں:

''مجھ سے نافع نے اور نافع نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ فرمایا مجھ سے اس قبر کے مکین نے......'' یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے اپنے دائیں ہاتھ سے روضۂ رسولؐ کی طرف اشارہ کیا اور پوری حدیث سنائی۔ جب بھی کوئی نئی حدیث سناتے اور سند کا سلسلہ جب نبیؐ کی ذات تک پہنچتا تو وہ پھر روضۂ رسولؐ کی طرف اشارہ کرتے اور شائقین علم نئے جذبے سے سرشار ہو جاتے۔

یہ منظر دیکھ کر اس کے دل پر رعب سا طاری ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے یقین ہو گیا کہ یہ بزرگ امام مالکؒ ہیں۔ وہ سفر کی تکان بھول گیا اور مجلس کے اختتام تک وہیں بیٹھا رہا۔

اگلے دن وہ والیٔ مدینہ کے محل پہنچا، اسے والیٔ مکہ کا وہ تعارفی خط پیش کیا جس میں والیٔ مدینہ کو سفارش کی گئی تھی کہ وہ محمد بن ادریس کو امام مالکؒ کے درس حدیث میں باقاعدہ شرکت کی اجازت دلوانے میں اس کی مدد کرے۔ والیٔ مدینہ نے خط نہایت غور سے پڑھا اور گویا ہوا:

''صاحبزادے! میرے لیے حضرت امام مالکؒ بن انس کے دروازے پر حاضر ہونے کی نسبت مدینے سے مکے تک پاپیادہ گشت کر جانا زیادہ آسان ہے۔ مجھ میں ان کی بارگاہ میں بات کرنے کا یارا نہیں''۔ مدینے کا گورنر امام مالکؒ کی علمی وجاہت، مرتبے اور وقار کی ہیبت سے مرعوب نظر آ رہا تھا۔ نوجوان محمد امام مالک کی علمی شہرت سے تو آگاہ تھا لیکن اس کے لیے یہ تجربہ نیا تھا کہ مدینے کا حاکم بھی ان کے تصور سے کانپ رہا تھا۔

''لیکن میری نسبت آپ کے لیے ان سے بات کرنا آسان ہے.....'' نوجوان نہایت لجاجت بھرے انداز میں بولا۔ ''خدا آپ کا بھلا کرے۔ آپ مشکل حل کرنے میرے ساتھ چلیے۔ اللہ آپ کی مشکل آسان کرے گا''۔

یہ بات سن کر والیٔ مدینہ ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں امام مالکؒ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ والیٔ مدینہ نے خود دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد ایک سیاہ فام خادمہ دروازے پر آئی۔ والیٔ مدینہ کا نام پوچھ کر اندر چلی گئی اور پھر کافی دیر بعد برآمد ہوئی اور کہنے لگی:

''میرے آقا نے آپ کو سلام کہا اور فرمایا ہے کہ اگر کوئی مسئلہ پوچھنا ہے تو رقعہ پر لکھ دیجیے، اس کا جواب مل جائے گا۔ اگر حدیث کے بارے میں پوچھ گچھ کرنی ہے تو آپ کو حدیث کی مجلس کا دن یاد ہی ہے۔ لہٰذا آپ تشریف لے جا سکتے ہیں''۔

وہ حیران تھا کہ یہ کیسی عالمانہ وجاہت ہے کہ جس کے سامنے حاکم وقت بھی سرنگوں ہے۔ خادمہ مڑنے ہی والی تھی کہ والیٔ مدینہ نے لجاجت بھرے انداز میں اس سے کہا:

''جا کر عرض کرو کہ والیٔ مکہ کا ایک نہایت اہم خط لے کر حاضر ہوا ہوں''۔ یہ سن کو خادمہ پھر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک کرسی لیے برآمد ہوئی۔ مناسب جگہ کرسی رکھی ہی تھی کہ پیچھے پیچھے امام مالکؒ باہزار شان و وقار و تمکین جلوہ فرما ہوئے۔ کشیدہ قامت، نورانی صورت، نہایت نفیس عبا زیب تن کیے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔ والیٔ مدینہ نے والیٔ مکہ کا خط خدمت میں پیش کیا۔ امام مالکؒ خط پڑھتے پڑھتے جب اس مقام پر پہنچے: ''اس شائق علم محمد بن ادریس سے گفتگو کر لیجیے، اس سے حسن سلوک کا برتاؤ کیجیے اور اس کی آرزو پوری کیجیے۔'' تو انھوں نے وہ خط ہاتھ سے پھینک دیا اور کہا:

''سبحان اللہ! کیا حضور ﷺ کا علم اب اس قابل رہ گیا کہ وہ حکمرانوں کے وسائل اور رسائل کے ذریعے حاصل کیا جائے؟''

اس نے دیکھا کہ امامؒ کے رعب اور ان کے غصے کی ہیبت کے باعث والیٔ مدینہ کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تو آگے بڑھ کر خود معذرت پیش کرتے ہوئے کہا ''حضرت! میں مکہ کا ایک مطلبی ہاشمی مگر مفلس و بے نوا انسان ہوں۔ ذوق علمی کی تسکین کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

امام مالکؒ یہ سن کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ سر سے پیر تک اسے دیکھا اور پھر پوچھا:

''تمھارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام محمد ہے''۔

''اپنا سلسلہ نسب بیان کرو''۔

''محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائبؓ بن جنید بن عبد یزید بن ہاشم بن عبدالمطلب بن عبدمناف۔ میرے جد امجد شافعؓ اور ان کے والد سائبؓ دونوں صحابیٔ رسول تھے۔''

امام مالک بڑی توجہ سے سنتے رہے اور جب محمد بن ادریس نے اپنی بات مکمل کر لی تو اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

خدا سے ڈرتے رہنا، تمھاری شان بڑی نمایاں ہو گی۔ اللہ نے تمھارے قلب پر نور کا القاء کیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گناہوں کے ارتکاب سے یہ نور بجھ جائے۔'' کچھ توقف



کے بعد کہنے لگے: ''اچھا! کل آنا اور اپنے ساتھ ایک آدمی لیتے آنا جو تمھارے لیے قرأت کرے''۔

مختلف اساتذہ کے درس کے مختلف طریقے تھے۔ اکثر شیوخ کا یہ دستور تھا کہ وہ خود کسی اونچی جگہ بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے، طلباء سامنے صف بستہ بیٹھتے۔ استاد پڑھتا جاتا یا روایت بیان کرتا، شاگرد اسے لکھتے جاتے لیکن مدینہ منورہ کے اکثر شیوخ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی جمع کردہ احادیث و فتاویٰ کو خود ہی لکھتے اور پھر کسی ذہین اور سمجھ دار طالب علم کو دے دیتے۔ جب درس شروع ہوتا تو وہ شاگرد اس کو پڑھتا جاتا اور جہاں وضاحت کی ضرورت ہوتی، شیخ اس کی وضاحت کرتا رہتا۔ یہی طریقہ امام مالکؒ کا تھا۔

مسجد نبویؐ میں حدیث کی مجلس برپا تھی۔ امام مالکؒ دیکھتے کہ جب بھی کوئی حدیث بیان کرتا تو محمد بن ادریس ہاتھ میں پکڑے ایک تنکہ منہ میں ڈالتا اور پھر اپنی بائیں ہتھیلی پر اس سے کھیلتا رہتا۔ امام مالکؒ یہ حرکت بار بار دیکھ رہے تھے لیکن اسے احساس تک نہ ہوا۔ آخر کچھ دیر بعد مجلس برخاست ہوئی۔ سب لوگ اٹھ کر جانے لگے۔ امام مالکؒ دیکھتے رہے کہ وہ بھی اٹھ کر جاتا ہے یا نہیں۔ سب لوگ چلے گئے اور وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ امام مالکؒ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ نہایت ادب سے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر امام مالکؒ اسے بڑے غور سے دیکھتے رہے اور پھر سوال کیا:

''تم حرم کے رہنے والے ہو؟''

''جی ہاں'' محمد بن ادریس نے کہا۔

''مکی ہو؟'' ''جی ہاں''

''قریشی ہو'' ''جی میں قریشی ہوں۔''

''اوصاف تو سارے موجود ہیں لیکن تمھیں ایک بے ادبی کرتے دیکھا ہے''۔

''حضرت! میری کس بے ادبی سے آپ کو تکلیف پہنچی؟'' محمد بن ادریس نے امام مالکؒ کی طرف انتہائی ادب سے متوجہ ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

''میں تو سید المرسلین ﷺ کے فرامین سنا رہا تھا اور تم سننے کے بجائے اپنی ہتھیلی پر تنکے سے کھیل رہے تھے۔''

''حضرت! میں کھیل نہیں رہا تھا.....'' محمد بن ادریس نے نہایت سنجیدگی اور ادب سے کہا: ''بلکہ آپ سے جو سنتا تنکے سے اپنی ہتھیلی پر لکھتا جا رہا تھا تاکہ یاد رہے۔ چونکہ میرے پاس لکھنے کے لیے قلم دوات تھی نہ کاغذ اس لیے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔''

امام مالکؒ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی، وہ بولے:

''اچھا سب حدیثیں تو نہیں تم ایک ہی حدیث پوری سنا دو۔''

''مجھ سے مالکؒ نے نافع اور ابن عمر کے واسطے سے روایت کی ہے کہ فرمایا اس قبر کے مکین نے.....'' یہ کہتے ہوئے محمد بن ادریس نے اپنے شیخ امام مالکؒ کی طرح ہاتھ دراز کر کے روضۂ رسول ﷺ کی طرف اشارہ کیا اور اس طرح وہ پچیس حدیثیں زبانی سنا دیں جو امام مالکؒ نے مجلس میں سنائی تھیں۔ امام مالکؒ نے جب پوری حدیثیں صحیح متن کے ساتھ سنیں تو وہ نوجوان کی ذہانت اور حافظے پر حیران ہوئے اور خوش بھی۔ گفتگو ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مسجد نبویؐ اذانِ مغرب سے گونجنے لگی۔ نماز سے فراغت کے بعد امام مالکؒ نے اپنے خادم کو بلایا اور محمد بن ادریس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ امام مالکؒ خود تشریف لے آئے۔ خادم ہاتھوں میں خوان اٹھائے تھا۔ قریب آ کر امام مالکؒ نے نہایت گرمجوشی سے سلام کیا، خادم سے خوان لے کر فرش پر رکھا اور خادم سے کہا:

''چلو ہاتھ دھلواؤ''۔

ہاتھ دھونے کے بعد میزبان اور مہمان دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ امام مالکؒ نے خوان کھولا تو اس میں دو برتن تھے۔ ایک میں دودھ اور دوسرے میں کھجوریں تھیں۔ میزبان نے بسم اللہ کی تو مہمان نے بھی کھانا شروع کیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد امام مالکؒ مہمان کے پاس بیٹھے دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ رات گئے تک اہل مکہ کے حالات پوچھے اور پھر اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا:

''رات کافی بیت چکی، اب آپ آرام کیجیے''۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ لیٹتے ہی بے خبر ہوگیا۔ آخر رات کسی نے دروازے پر دستک دی اور بڑی شفقت آمیز آواز میں کہا:

''آپ پر خدا کی رحمت ہو، نماز کا وقت ہوگیا''۔

وہ فوراً اُٹھ بیٹھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خود امام مالکؒ ہاتھ میں پانی بھرا لوٹا لیے کھڑے ہیں۔ علم و عرفان کے وہ امام جن کے سامنے بڑے بڑے حکمران سہمے کھڑے ہوتے ہیں، وہ اس کے لیے پانی کا برتن اُٹھائے ہوئے تھے۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی شرم آئی۔ امام مالکؒ اس کی کیفیت کو تاڑ گئے اور نہایت محبت آمیز لہجے میں بولے:

''اے ابوعبداللہ! کچھ خیال نہ کرو۔ مہمان کی خدمت کرنا تو میزبان کا فرض ہے۔ پھر اس مہمان کی خدمت جو حقیقت میں رسولؐ اللہ کا مہمان ہے، فضیلت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔''

اس نے محسوس کیا کہ امام مالکؒ بہت بڑے انسان ہیں اور بڑے انسانوں کی بڑائی چھوٹے چھوٹے کاموں ہی سے عیاں ہوتی ہے۔ اس نے چستی کے ساتھ نماز کی تیاری کی اور مسجد نبویؐ کے صحن میں پہنچ گیا۔ سنتیں ادا کیں اور جماعت کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں امام مالکؒ مصلے پر پہنچ گئے۔ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو کافی اندھیرا تھا۔ اُنھوں نے سکون کے ساتھ نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ذکر و تسبیح میں مشغول ہوگئے اور وہ بھی بیٹھا رہا۔ جب مدینے کی پہاڑیوں پر دھوپ چمکنے لگی تو امام مالکؒ آج پھر اسی شان کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے جیسے کل بیٹھے تھے اور اپنی حدیث کی کتاب موطا محمد بن ادریس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا:

''پڑھو!''

اس نے ادب کے ساتھ کتاب پکڑی اور بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دی۔ طلبہ لکھنے میں مصروف ہوگئے۔ امام کی ہیبت سے مرعوب ہو کر جب بھی وہ ارادہ کرتا کہ قرأت کا سلسلہ منقطع کر دے تو امام مالکؒ اس کی قرأت اور اعراب پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے:

''صاحبزادے اور.....اور''

اب یہ روزانہ کا معمول بن گیا۔ محمد بن ادریس نے اسی طرح پورے آٹھ مہینے گزارے اور پوری موطا اسے حفظ ہو گئی۔ اس عرصے میں وہ امام مالکؒ سے اتنا قریب ہوگیا کہ انجان آدمی ان کے درمیان بے تکلفی کو دیکھ کر اسے امام مالکؒ کے گھر کا ہی فرد سمجھنے لگتا۔ اس دوران نوجوان نے امام مالکؒ کے علاوہ مدینہ کے دیگر اہل علم سے بھی استفادہ کیا اور حدیث و فقہ میں پختگی حاصل کی۔

☆☆☆

''میں قُمر یوں کا تاجر ہوں'' ایک دن حلقۂ درس میں شریک خوش وضع شخص نے امام مالکؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فتویٰ طلب کرنے کی غرض سے بات شروع کی۔ ''میں نے ایک شخص کو قُمری فروخت کی اور یہ بھی کہا کہ یہ خوب بولتی ہے۔ سودا طے پایا اور وہ شخص قُمری لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شخص واپس آیا اور کہنے لگا کہ یہ قُمری تو نہیں بولتی۔ اس دوران میری اور اس کی تکرار ہوگئی۔ دورانِ بحث میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ میری قُمری کبھی خاموش نہیں رہتی۔ اگر خاموش رہے تو میری بیوی پر طلاق ہو۔ اب آپ فرمایئے میری بیوی پر طلاق تو نہیں ہوئی کیونکہ قُمری ہر وقت تو نہیں بولتی تھی۔''

''تیری بیوی کو طلاق ہوگئی''۔ امام مالکؒ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ وہ شخص رنجیدہ و آزردہ مجلس سے اُٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔ محمد بن ادریس خاموشی سے اُٹھا اور اس شخص کے پیچھے ہولیا۔ تھوڑی دور پہنچ کر اس نے اس شخص کو آواز دی۔ وہ رک گیا تو اس نے اس سے دریافت کیا:

''ایک بات بتاؤ تیری قُمری اکثر بولتی یا اکثر چپ رہتی ہے''؟

''وہ اکثر بولتی اور کبھی کبھی خاموش بھی رہتی ہے'' تاجر نے کہا:

''مطمئن رہو تیری بیوی کو طلاق نہیں ہوئی''۔ یہ کہہ کر محمد بن ادریس واپس آکر پھر سے حلقۂ درس میں شریک ہوگئے۔ وہ سائل بھی پیچھے پیچھے واپس آیا۔ اور امام مالکؒ سے کہنے لگا۔

''جناب والا میرے معاملے پر پھر سے غور فرمایئے!''

''تیرے حق میں میرا وہی فتویٰ ہے''۔ امام مالکؒ نے پھر وہی جواب دیا۔



''لیکن آپ کے حلقۂ درس میں شریک اس نوجوان نے ابھی ابھی مجھے اطمینان دلایا ہے کہ طلاق نہیں ہوئی''۔ سائل تاجر نے محمد بن ادریس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے یہ غلط فتویٰ کیوں دیا''؟ امام مالکؒ نے عتاب آمیز لہجے میں محمد بن ادریس سے پوچھا۔

''میں نے اس سے دریافت کیا تھا.....'' اس نے انتہائی ادب مگر اعتماد کے ساتھ استاد کو جواب دیتے ہوئے کہا: ''آیا تیری قُمری زیادہ بولتی ہے یا زیادہ تر خاموش رہتی ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ زیادہ تر بولتی اور کبھی کبھی خاموش بھی رہتی ہے۔ اس لیے میں نے یہ فتویٰ دیا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔''

یہ سن کر امام مالکؒ اور زیادہ غضبناک ہوگئے اور کہنے لگے:

''یہاں کثرت و قلت کی بحث کہاں سے آگئی''۔

''استادِ مکرم! آپ ہی نے عبیداللہ بن زیاد کے واسطے سے یہ روایت بیان فرمائی ہے کہ فاطمہ بنت قیس حضورؐ کے پاس آئیں اور عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ معاویہؓ اور ابوجہمؓ نے مجھے شادی کا پیغام بھیجا ہے۔ آپ مشورہ دیں کہ ان دونوں میں سے کس کے پیغام کو قبول کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، معاویہ تنگ دست ہے اور ابوجہمؓ کبھی کندھے سے لاٹھی نہیں اتارتا۔ یعنی بیویوں کو اکثر مارتا رہتا ہے حالانکہ حضور ﷺ خوب جانتے تھے کہ ابوجہمؓ سوتا ہے اور دیگر فطری حوائج ضروریہ میں بھی مصروف رہتا ہے۔ ظاہر ہے، اس وقت تو وہ اپنی لاٹھی کندھے پر نہ رکھتا تھا۔ اس سے میں نے قیاس کیا کہ حضور ﷺ کا منشائے مبارک یہ تھا کہ وہ اکثر کندھے پر لاٹھی رکھے رہتا ہے۔ اسی بناء پر میں نے اس کو یہ فتویٰ دیا کہ قُمری چونکہ اکثر بولتی ہے لہٰذا طلاق نہیں ہوئی''۔

''ہاں بھائی جاؤ! امام مالکؒ نے تاجر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''واقعی تمھاری بیوی کو طلاق نہیں ہوئی، محمد بن ادریس کا استدلال معقول ہے''۔

محمد بن ادریس کی یہ باریک بینی اور نکتہ رسی دیکھ کر امام مالکؒ نے اسے کہا: اب تم میں فتویٰ دینے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے''۔

محمد بن ادریس کی عمر ابھی پندرہ سولہ سال ہی ہوئی تھی کہ امام مالکؒ کے علاوہ دیگر محدثین و فقہا نے متفقہ طور پر انھیں دینی مسائل میں فتویٰ دینے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

مسجد نبویؐ کے منبر اور روضۂ رسول ﷺ کے درمیان ایک خوبصورت اور خوش پوش نوجوان نہایت سکون اور سلیقے کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ دیر تک اسے تکتا رہا۔ جب اس نے نماز ختم کر لی تو اس نے آگے بڑھ کر اجنبی سے پوچھا:

''یا اخی! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں''؟

''میرا وطن عراق ہے''۔ اجنبی نوجوان نے نہایت شائستگی سے جواب دیا۔

''عراق کا کون سا علاقہ؟'' ''کوفہ''

کوفے کا نام سنتے ہی محمد بن ادریس کے ذہن میں کچھ باتیں تازہ ہوگئیں۔ اس نے اجنبی سے پوچھا:

''آپ جانتے ہیں کہ آج کل کوفہ میں کتاب و سنت کا سب سے بڑا عالم کون ہے؟''

''امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد محمدؒ بن حسن اور ابو یوسفؒ..... یہ دونوں کوفے کے قابل اعتماد مفتی ہیں''۔

''کیا آپ مجھے بتا سکیں گے کہ کوفہ کو آپ کی واپسی کب ہوگی؟''

''جی! ہم کل صبح سویرے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے''۔

جونہی یہ بات اسے معلوم ہوئی، وہ سیدھا امام مالکؒ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی:

''استادِ مکرم! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں گھر سے صرف اس لیے نکلا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ علم حدیث حاصل کروں۔ سنا ہے، کوفہ میں بھی حدیث اور فقہ کے بڑے بڑے علما موجود ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان سے بھی کسب فیض کروں۔ ایک طرف میری والدہ مکے میں میری واپسی کی منتظر ہیں دوسری طرف تحصیل علم کا ایک موقع بھی ہاتھ آیا ہے کہ کل ہی یہاں سے عراق کا ایک قافلہ روانہ ہو رہا ہے۔ میں اہل قافلہ کی رفاقت میں آسانی سے عراق پہنچ سکتا ہوں، فرمایئے کہ واپس والدہ کی خدمت میں پہنچ جاؤں یا علم کی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طلب و جستجو میں آگے بڑھوں؟''

''برخوردار علم کے فائدے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ تم تو جانتے ہو کہ طالب علم کے لیے فرشتے بھی پر بچھاتے ہیں۔ تم کوفہ ضرور جاؤ۔ ہماری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔''

استاد کی حوصلہ افزا باتیں سن کر محمد کی بہت ہمت بندھی اور اس نے اہل قافلہ کے ساتھ عراق روانہ ہونے کا پختہ عزم کرلیا۔

صبح سویرے جب وہ روانگی کے لیے تیاری کر رہا تھا، امام مالکؒ اس کے کمرے میں آئے۔ ان کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی پوٹلی اور دوسرے میں ایک بہت بڑی گٹھڑی تھی۔ اُنھوں نے پوٹلی محمد بن ادریس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''بیٹے اس میں تمھارے لیے کھانا ہے اور گٹھڑی میں سفر کا دیگر سامان ہے۔''

اس نے انتہائی تشکر آمیز نظروں سے سامان تھام لیا۔ اس کا رُواں رُواں امام مالکؒ کا ممنون اور متشکر دکھائی دیتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ امام مالکؒ جن کی ہیبت اور علمی وجاہت کے سامنے بڑے بڑے حکمرانوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے، وہ ایک غریب الوطن بے نوا طالب علم کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کس قدر فکرمند ہیں کہ رات کو ہی اس کا سامان سفر اور کھانا تک تیار کروادیا۔

امام مالکؒ اپنی تمام جلالتِ علمی اور وقار و احترام کے ساتھ اپنے شاگرد کو وداع کرنے مقام بقیع تک آئے جہاں اہل قافلہ روانگی کے لیے تیار کھڑے تھے۔ اہل قافلہ بصد شوق و احترام مدینہ کی علمی سلطنت کے تاجدار کو حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک امام مالکؒ کی آواز بلند ہوئی:

''کیا کوفہ جانے کے لیے کوئی کرایہ پر اونٹ دیتا ہے؟''

کسی طرف سے جواب نہ پا کر امام مالک نے پھر وہی بات دہرائی۔ کچھ دیر توقف کے بعد آپؒ نے پھر ہانک لگائی تو محمد بن ادریس سے نہ رہا گیا، جو بڑے تعجب سے ان کی یہ ندا سن رہا تھا اور آگے بڑھ کر امام مالکؒ سے کہا:

''حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ نہ تو میرے پاس کوئی درہم و دینار ہے اور نہ آپ کے پاس۔ آپ کی جو مالی حالت ہے وہ بھی میرے علم میں ہے۔ آپ میرے لیے کرایہ پر اونٹ لے رہے ہیں تو یہ آپ پر ایک ناروابوجھ ہوگا۔''

شاگرد کی یہ بات سن کر امام مالک مسکرائے اور پھر بڑی رازداری کے انداز میں گویا ہوئے:

''اللہ مسبب الاسباب ہے۔ رات عشاء کی نماز کے بعد جب تم میرے پاس سے اُٹھ کر گئے تو کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں باہر آیا تو دیکھا کہ عبدالرحمٰن بن قاسمؒ ہاتھ میں ایک تھیلی پکڑے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تھیلی میری طرف بڑھاتے ہوئے منت سماجت بھرے لہجے میں کہنے لگے کہ میں یہ ہدیہ لے کر آیا ہوں۔ آپ اسے ضرور قبول کرلیں۔ تھیلی لے کر جب میں اندر آیا اور اسے کھول کر دیکھا تو اس میں سو دینار تھے۔ پچاس دینار میں نے بال بچوں کے لیے رکھ لیے اور پچاس تمھارے لیے لے آیا ہوں۔''

کسمپرسی کی حالت میں بھی امام مالکؒ کی دریا دلی اور سخاوت دیکھ کر محمد بن ادریس بہت متاثر ہوا اور اس کے دل نے کہا کہ یہ کتنا بڑا انسان ہے۔

تھوڑی دیر میں ایک اونٹ چار دینار کرایہ پر طے ہوگیا۔ امام مالکؒ نے چار دینار اونٹ والے کو دیئے اور باقی رقم محمد بن ادریس کے حوالے کردی۔

☆☆☆

بغداد میں رہتے ہوئے اسے تین سال ہو چکے تھے۔ اس کے علم اور صلاحیت کے باعث خلیفہ ہارون الرشید کا اصرار بہت بڑھ گیا کہ وہ کوئی نہ کوئی عہدہ ضرور قبول کرے اور اپنی صلاحیتوں سے اُمت کو فائدہ پہنچائے۔ چنانچہ ایک دن امیرالمومنین نے اسے علاقہ نجران میں زکوٰۃ کی وصولی کے لیے تحصیلدار مقرر کیا مگر اس کی تمام تر دلچسپیاں پڑھنے پڑھانے سے متعلق تھیں، اسے دیگر کاموں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ حاجی لوگ حج کر کے حجاز سے واپس آنے لگے۔ اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ چل کر ان سے اپنے محسن اور مدینے کے امام مالکؒ اور وطن مکہ کا بھی کچھ حال معلوم کرے۔ یہ سوچ کر وہ حجاج کرام کو ملنے گھر سے نکلا۔

شہر کے دروازے پر پہنچا۔ حجاج کے مختلف قافلے بغداد



شہر میں اُتر رہے تھے۔ ایک نوجوان حاجی کو اشارے سے سلام کیا۔ اس نے شتربان سے اونٹ روکنے کے لیے کہا۔ محمد بن ادریس نے جب اسے اپنی طرف متوجہ پایا تو اس کے قریب ہوا اور امام مالکؒ اور مکہ و مدینہ کے حالات پوچھنا شروع کیے۔

''خدا کے فضل سے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے''۔ نووارد حاجی نے کہا۔ اس جواب سے محمد بن ادریس شافعی کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے امام مالکؒ کے بارے میں سوال کیا۔ نوجوان حاجی نے کہا:

''مختصر جواب دوں یا مفصل؟''

''مختصر ہی بتائیے!''

''امام مالکؒ خیریت سے خوب ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں خوب نوازا ہے۔''

''کیا امام مالکؒ دولت مند ہو گئے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں بڑی شان و دبدبے کے دولت مند اور بڑے شاہانہ وقار کے ساتھ مسجد نبویؐ میں درس حدیث دیتے ہیں۔''

حاجی کا جواب سن کر اس کے دل میں شوق ملاقات نے ہل چل مچادی۔ اس نے سوچا کہ فقر و فاقہ کی حالت میں تو بندۂ مومن کو دیکھا تھا، اب دولت کی ریل پیل میں بھی دیکھا جائے کہ بندۂ خدا کا کیا حال ہے۔ محمد بن ادریس کی خاموشی اور چہرے کے اضطراب سے نوجوان حاجی تاڑ گیا کہ وہ امام مالکؒ سے ملاقات کرنے کو بے چین ہے۔ وہ بولا:

''حضرت! آپ کی جدائی اہل عراق کو بہت گراں گزرے گی اور خود میں تو آپ کی جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن آپ جانا چاہتے ہیں تو سفر کے انتظامات فرمالیجیے، میرے پاس جو کچھ بھی ہے، سب آپ ہی کا ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے رقم سے بھری تھیلی محمد بن ادریس شافعی کی طرف بڑھاتے ہوئے اصرار کیا:

''اسے قبول فرمائیے!''

''یا اخی! سب کچھ مجھے دے دیا تو خود کیا کرو گے؟ تمھاری بھی تو آخر ضرورتیں ہیں۔'' اس نے تھیلی لوٹانے کی کوشش کی۔

''آپ فکر نہ کیجیے! میں اپنی کاروباری ساکھ اور اثر سے بہت کچھ حاصل کرلوں گا۔'' محمد بن ادریس کو رقم کی تو ضرورت شدید تھی لیکن خودداری اسے رقم لینے سے روک رہی تھی۔

''اچھا اپنی ضرورت بھر ہی لے کر مجھ پر احسان فرمائیے۔'' نوجوان حاجی نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ اس نے تھیلی سے آدھی رقم لے لی اور حجاز کی لیے عزم سفر کیا۔

محمد بن ادریس کے پاس دولت کے انبار ضرور تھے لیکن دل میں لمحہ بھر کے لیے بھی مال کی محبت پیدا نہ ہوئی۔ وہ سیم و زر کے بوجھ اٹھانے کا عادی نہ تھا۔ اس لیے درہم و دینار کا یہ ذخیرہ کچھ دیر تک ہی اس کا ساتھ دے سکا۔ راستے میں جو بھی ضرورت مند نظر آیا، اسے اس کی ضرورت کے مطابق دے ڈالا۔ کوئی اہل علم ملا تو اس پر زیادہ مہربانی کردی۔

راستے میں اسے احمدؒ بن حنبل، سفیانؒ بن عیینہ اور امام اوزاعیؒ اور دیگر علمائے حدیث ملے تو اس نے ان کی ضروریات پر وہ سب کچھ خرچ کر دیا جو حجاز کے رئیس نے دیا تھا۔ جب وہ رملہ شہر میں داخل ہوا تو اس کے پاس چالیس ہزار کی رقم میں سے صرف دس دینار باقی رہ گئے تھے لیکن خدا کی ذات پر اس مردِ قلندر کے یقین و توکل کا یہ عالم تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی آنے والے حالات کی سنگینی کا خوف نہ تھا۔ طویل اور دشوار گزار سفر میں مادی وسائل سے یہ بے نیازی اسی کی شان تھی۔ ورنہ انسان تو اپنی گردن میں دولت کا طوق ڈالنے کے لیے ہر موسم اور زمانے میں بے چین رہتا ہے۔

جب مسجد نبویؐ پہنچا تو نماز عصر سے لوگ فارغ ہو چکے تھے۔ نماز کی پڑھنے کے بعد اس نے مسجد میں دیکھا کہ لوہے کی ایک شاندار اونچی کرسی رکھی ہے۔ اس پر نہایت خوبصورت گدی پڑی ہے اور ایک بیش قیمت مصری تکیہ جما ہوا ہے۔

وہ ابھی کرسی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ باب النبی کی طرف جو اس کی نظر اُٹھی تو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے محسن اور استاد، امام مالکؒ بن انس شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ آرہے تھے۔ پیچھے پیچھے شائقین حدیث تھے جن کی تعداد چار سو سے زائد ہوگی۔ مسجد خوشبوؤں سے مہک گئی۔ امام مالکؒ نہایت وقار کے ساتھ مسند پر بیٹھ گئے۔ ایک نظر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجمع پر ڈالی اور درس حدیث شروع ہو گیا۔ آج کے درس کا موضوع تھا ''جرح عمد'' یعنی اگر کوئی ارادتاً کسی کو زخمی کر دے تو کیا مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی مجلس کے ایک گوشے میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔

امام مالکؒ نے ''جرح عمد'' کا ایک سوال پوچھا، طلبہ سوچنے لگے۔ محمد بن ادریس کے قریب ہی ایک ان پڑھ آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے ان پڑھ آدمی کو بتایا کہ مسئلہ کا جواب یہ ہے۔ اس نے اونچی آواز سے امام مالکؒ کو مخاطب کر کے جواب دے دیا۔ امام صاحب خاموش رہے اور طلبہ کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ طالب علموں نے جواب تو دیئے لیکن سب غلط تھے۔

''سب جواب غلط تھے، صرف پہلے شخص کا جواب صحیح ہے۔'' امام مالکؒ نے بلند آواز سے پکارا اور جواب بھی اپنی زبان سے دہرا دیا۔ یہ دیکھ کر وہ شخص بہت خوش ہوا۔ اب امام مالک نے دوسرا مسئلہ پیش کیا۔ طلبہ سوچنے لگے، وہ ان پڑھ آدمی پھر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے اسے آہستہ سے پھر جواب بتا دیا۔ ان پڑھ آدمی نے اونچی آواز میں پھر جواب بیان کیا۔ دیگر طلبہ نے بھی اپنی اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیئے۔ امام مالکؒ نے سب جوابات غور سے سنے اور کہا:

''سب کے جواب غلط ہیں، صرف اسی پہلے شخص کا جواب صحیح ہے۔''

اب تو وہ شخص بہت ہی خوش ہوا۔ امام مالکؒ نے تیسرا مسئلہ پیش کیا تو پھر یہی صورت پیش آئی۔ اب تو اس ان پڑھ شخص کی طرف لوگوں کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ حتیٰ کہ امام مالکؒ بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور بڑے پیار سے کہا:

''یہاں میرے قریب آئیے! آپ کی جگہ یہاں ہے وہاں نہیں۔''

وہ شخص چاروں طرف نظر ڈالتا امام کے قریب پہنچا اور بیٹھ گیا۔ امام مالکؒ اس کے علمی جوابات سے متاثر نظر آ رہے تھے۔ اُنھوں نے اس سے پوچھا:

''کیا آپ نے میری حدیث کی کتاب کا مطالعہ کیا ہے؟''

''جی نہیں! میں نے موطا نہیں دیکھی۔'' اس شخص نے امام مالکؒ کے سامنے نظریں جھکائے ہوئے جواب دیا۔

''کیا ابن جریج کے علم پر آپ کی نظر ہے؟''

''جی نہیں! میں نے ابن جریج کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔''

''کیا آپ جعفرؒ ابن صادق سے ملے ہیں؟''

''جی نہیں میں نے ان سے کچھ نہیں پڑھا۔''

''پھر یہ علم میں رسوخ اور گہرائی آپ کو کیسے حاصل ہوئی؟'' امام مالکؒ نے حیرت سے اسے تکتے ہوئے پوچھا۔ وہ شخص خود بڑا حیران پریشان ہوا اور پھر نہایت سادگی سے بولا:

''حضرت! یہ سب جوابات اس نوجوان نے بتائے تھے جو اپنی عالمانہ شان چھپائے بیٹھا ہے''۔ اس نے محمد بن ادریس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ پیچھے کافی دور بیٹھا ہوا تھا۔ امام مالکؒ نے جب اسے دیکھنے کی کوشش کی تو شاگردوں نے بھی گردنیں اُٹھا اُٹھا کر پیچھے دیکھنا شروع کر دیا۔

''اچھا تم جاؤ اور اس نوجوان عالم کو میرے پاس بھیج دو''۔ امام مالک نے اس شخص کو بڑے پیار سے رخصت کرتے ہوئے کہا۔ اس شخص نے آ کر اسے امام مالکؒ کا پیغام دیا تو وہ فوراً مسند کے قریب جا کر ادب سے بیٹھ گیا۔

امام مالکؒ کچھ دیر اسے تکتے رہے جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں اور پھر گویا ہوئے:

''آپ محمد بن ادریس شافعی تو نہیں؟''

''جی ہاں خادم شافعی ہے''۔ اس نے سر جھکائے ہوئے نہایت دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ یہ سنتے ہی امام مالکؒ نے اسے گھسیٹ کر گلے لگا لیا اور اپنی کرسی سے نیچے اتر پڑے۔ پھر بڑی بے تکلفی سے فرمایا:

''اُٹھئے اب آپ مسند پر بیٹھئے اور علم کے اس باب کی تکمیل کیجئے جو میں نے شروع کیا ہوا ہے''۔ امام مالکؒ نے نہایت پرجوش انداز اور محبت سے کہا۔ اس نے کچھ جھجک کا مظاہرہ کیا تو امام مالکؒ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے مسند پر بٹھا دیا۔ اب اس کے لیے حکم کی تکمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے ''جرح عمد'' کے چار سو مسائل پیش کیے۔ طلبہ پر اس کے درس کا رعب طاری ہو گیا۔ مجلس ختم ہوئی تو امام مالکؒ نے اس کے درس کی خوب تحسین کی اور دُعائیں دیں۔



سورج ڈوب چکا تھا۔ مغرب کی اذان ہوئی۔ نماز کی ادائی کے بعد امام مالکؒ نے بڑی شفقت و محبت سے اس کا ہاتھ پکڑا اور گھر چلنے کی دعوت دی۔ فرزند قریش کی تو آمد کا مقصد ہی یہ تھا۔ امام مالکؒ نے عزت افزائی کی تو اس نے سر جھکا دیا۔ راستے میں زیادہ تر خاموش ہی رہا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک محل نما شاندار مکان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ امام مالکؒ اس کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہو گئے۔ وہ ایک چھوٹے باغیچے میں سے گزر کر مختلف راہداریوں میں سے گزرے۔ مختلف کمرے قیمتی آرائشی سامان، فرنیچر سے سجے اور فانوسوں سے چمک رہے تھے۔ سب کچھ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس نے حیران ہو کر امام مالکؒ سے پوچھا:

''حضرت! وہ پرانا مکان کس جگہ تھا؟''

''اسی مکان کی زمین پر تو یہ عمارت تعمیر کروائی ہے''۔ امام مالکؒ نے آراستہ و پیراستہ مہمان خانے میں اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔

''ایک عالم دین کی یہ سجاوٹ و بناوٹ اور دولت کی ریل پیل اسے اس کے اصل فرض منصبی سے غافل بھی تو کر سکتی ہے۔ اگر اہل علم بھی دولت کی بھول بھلیوں میں کھو گئے تو نبیؐ کی وراثت کی نگہبانی کون کرے گا؟'' یہ تصور ہی اس کے لیے سوہانِ روح بن رہا تھا۔ دل کا یہ حزن و ملال بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت بہہ نکلا۔ یہ دیکھ کر امام مالکؒ پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولے:

''شافعی آپ روتے کیوں ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں دنیا کا طالب بن گیا اور آخرت کو میں نے دنیا پر قربان کر دیا؟''

''حضرت! اسی اندیشے نے میری حالت غیر کر دی اور میرا دل دہل رہا ہے۔'' اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''شافعی! آپ واقعی سچے دوست ہیں اور مجھے توقع ہے کہ جب تک آپ جیسے دوست میسر ہیں، انشاء اللہ میں دنیا کی فانی لذتوں میں پھنس کر آخرت کو نہ بھول سکوں گا۔'' امام مالکؒ نے کچھ لمحے توقف کیا اور پھر بولتے گئے: ''یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، محض خدا کا فضل ہے، میری کاوشوں کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ یہ شائقین علم کے تحفے ہیں جو خراسان، مصر اور دنیا کے دور دراز گوشوں سے برابر چلے آ رہے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارے اور آپ کے آقا ﷺ ہدیہ رد نہیں فرماتے تھے اور میں نے بھی سنت کی پیروی میں کوئی تخفہ رد نہیں کیا۔''

''تحفوں میں دوست احباب نے سب ہی کچھ بھیجا۔ اس وقت آپ چل کر دیکھئے، مصر اور خراسان کے ایک سے ایک بڑھ کر نفیس تین سو جوڑے بکسوں میں رکھے ہوئے ہیں اور ہدیوں اور تحفوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اب یہ جوڑے آپ کے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ یہ دوستانہ ہدیہ قبول کر لیں اور یہ جو صندوق رکھے ہیں.....'' امام مالکؒ نے ساتھ والے کمرے میں رکھے صندوقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''ان میں پانچ ہزار سونے کے دینار ہیں۔ میں پورے اہتمام سے ہر سال ان کی زکوٰۃ ادا کرتا ہوں، اس میں بھی آدھی رقم آپ کی ہے''۔ یہ کہتے ہوئے امام مالکؒ کے چہرے سے خلوص اور مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ امام مالکؒ کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ اس کے دل کا گوشہ گوشہ امامؒ کی عظمت محسوس کر رہا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ امام مالکؒ واقعی بہت بڑے انسان ہیں، ایسے شخص پر ذلیل دنیا کبھی پنجے نہیں گاڑ سکتی۔

''حضرت میں آپ کی مخلصانہ پیش کش کیسے رد کر سکتا ہوں؟'' اس نے امام کی پیش کش قبول کرتے ہوئے کہا: ''میں حیران ہوں کہ آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ آپ نے علم دین کی دولت تو مجھے دی ہی تھی، دولت دنیا سے بھی مالا مال کر دیا مگر میری بھی ایک گزارش ہے.....''

''وہ کیا صاحبزادے!'' امام مالکؒ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''وہ یہ کہ جو کچھ آپ مجھے دے رہے ہیں، شریعت کی ہدایت کے مطابق اس کی تحریر بھی ہو جائے تو اچھا ہے۔ وارث آپ کے بھی ہیں اور میرے بھی۔ اگر میں مر گیا تو میرے وارث اسے اپنا حق سمجھیں گے اور آپ کے وارث کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں گے۔ اگر خدانخواستہ آپ نے وفات



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پائی تو یہ مال میرا ہوگا اور آپ کے وارث مطمئن ہوں گے۔''

''بھئی بڑے ہوشیار ہو، یہاں بھی اپنے علم سے کام لے ہی لیا۔'' امام مالکؒ نے مسکراتے ہوئے کہا:

''حضرت! علم سے کام لینے کا اس سے بہتر موقع اور کون سا ہوگا۔'' اس نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ امام مالکؒ نے اسی رات قانونی تحریر لکھ کر اس کے حوالے کر دی۔

یوں مکہ سے صرف ایک کملی چادر اوڑھ کر حصول علم کے لیے نکلنے والا بے نوا فقیر لڑکا آج رات اس حال میں سویا کہ وہ مدینہ کا ایک دولت مند شخص تھا۔

نماز فجر کے بعد کے معمولات سے فارغ ہو کر وہ امام مالکؒ کے ساتھ مسجد سے نکلا۔ امام مالکؒ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بڑی بے تکلفی سے اسے اپنے گھر لے جا رہے تھے۔ وہ بھی ان کی عقیدت و محبت سے سرشار باتیں کرتا ہوا ساتھ چل رہا تھا۔ گھر کے دروازے پر پہنچے تو وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک طرف خراسان کے سجیلے گھوڑے کھڑے ہیں اور دوسری طرف مصر کے خوبصورت خچر۔ انھوں نے ان پر طائرانہ نظر ڈالی اور پھر اندر چلے گئے۔ اندر پہنچتے ہی بے اختیار اس کی زبان سے نکلا:

''حضرت! گھوڑوں کی کونچیں کیا بتاؤں، کتنی خوبصورت ہیں۔ میں نے تو ایسے گھوڑے کبھی دیکھے ہی نہیں۔'' اس کی زبان سے ابھی یہ جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ امام مالکؒ نے کہا:

''یہ سب بھی میں آپ کو ہدیہ کرتا ہوں''۔

''حضرت! آپ سب کچھ مجھے دے رہے ہیں، کم از کم ایک گھوڑا تو اپنی سواری کے لیے رکھ لیجیے۔'' یہ سنتے ہی امام مالک پر رقت طاری ہو گئی اور پھر رندھی ہوئی آواز میں گویا ہوئے ''شافعی! مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میری سواری اپنی ٹاپوں سے اس زمین کو روندے جس کے نیچے اللہ کے رسولؐ آرام فرما رہے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے ان کی آواز گھٹنے لگی اور پھر دیر تک روتے رہے۔ اس کا رواں رواں امام مالکؒ کی عقیدت سے سرشار تھا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ امام مالکؒ تو بہت ہی عظیم انسان ہیں، ان پر دنیائے فانی کے حملے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

محمد بن ادریس کو مدینے میں رہتے تین دن بیت چکے تھے۔ اب اسے رہ رہ کر وطن کی یاد اور بوڑھی ماں کی یاد ستا رہی تھی۔ اسے گھر سے نکلے آٹھ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ ماں سے زندگی میں ملاقات ہو جائے اور وہ اپنی کمزور آنکھوں سے یہ دیکھ لے کہ آرزوؤں کا جو شجر طیب اس نے لگایا تھا اور جس کی شادابی کے لیے اس نے رات کی تنہائیوں میں اپنے رب کے حضور دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگی تھیں، آج وہی پودا خدا کے فضل اور اس کی مقبول دعاؤں کی برکت سے دین و دنیا کے برگ و بار سے لدا ہوا ہے۔ یہ شوق اس قدر فراواں ہوا کہ اس نے امام مالکؒ سے مکہ جانے کی اجازت طلب کی۔

امام مالکؒ نے نہ صرف اسے اپنی ماں کی خدمت میں پہنچنے کی اجازت دی بلکہ فوراً سفر کی تاکید فرمائی اور ایک آدمی پہلے سے مکہ کی طرف روانہ کر دیا تاکہ وہ اس کی آمد کی اطلاع اس کے گھر پہنچا دے۔

وہ مدینہ سے اس شان کے ساتھ روانہ ہوا کہ اس کے آگے پیچھے خراسانی گھوڑے اور مصری خچر غلوں، کپڑوں اور درہم و دینار سے لدے ہوئے تھے۔ سفر تو وہ برسوں سے کر رہا تھا لیکن آج کا سفر بہت طویل محسوس ہوا۔ کبھی اسے بوڑھی ماں کی مامتا بھری آواز کا خیال آتا تو کبھی مکے کی گلیوں میں گزرے ہوئے بچپن کے دن اور اپنے ساتھی یاد آتے۔ انھی یادوں میں مگن وہ مکہ کے قریب ہوتا چلا گیا۔

ڈاکٹر اختر حسین عزمی ان دنوں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد میں اُستاد ہیں۔ اللہ نے ان کے قلم میں کچھ ایسی تاثیر اور خوبصورتی رکھ دی ہے کہ ان کے لکھے تاریخی واقعات پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے آپ کے سامنے ہو رہے ہیں۔ دو کتابوں ''نیل کا مسافر'' اور ''امام شافعی کے دو علمی سفر'' کے مصنف ہیں۔ دونوں کتابیں منشورات، منصورہ ملتان روڈ لاہور نے شائع کی ہیں اور دونوں ہی کیا خوب کتابیں ہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رحمتوں اور برکتوں کی جگہ کا تذکرہ بھی،
اس مہینے سے جڑی یادیں راہ نمائی اور آگہی بھی

پوری دنیا کے مسلمانوں کے دل و نگاہ کے مرکز کی باتیں
اسلام کا پانچواں رکن، حج، اس کی ادائیگی،
مراحل، کیفیات اور معلومات

نوید اسلام صدیقی

## حج

ایسا بابرکت فریضہ ہے کہ ہر سال دُنیا بھر کے مسلمان جسماً شامل نہ ہوں تب بھی قلبی اور روحانی طور پر لازماً اس میں شریک ہوتے ہیں۔ آیئے! ہم بھی حجاج کرام کے ساتھ ساتھ تمام مراحل سے گزرتے ہیں۔

مسلمان دن میں پانچ مرتبہ اپنا رُخ خانہ کعبہ کی طرف کر کے کھڑا ہوتا اور اسی رُخ پر اپنی جبین نیاز بارگاہِ الٰہی میں سربسجود کرتا ہے۔ لیکن حج کے موقع پر پوری دُنیا کے حاجی براہِ راست خانہ کعبہ کے دیدار سے اپنی آنکھیں منور کرتے اور دلوں کو سکون پہنچاتے ہیں جس کے بارے میں خالق کائنات نے ارشاد فرمایا:

''بے شک سب سے پہلا گھر جو مقرر ہوا لوگوں کے واسطے، یہی ہے جو مکے میں ہے، برکت والا اور دُنیا بھر کے لوگوں کے لیے مرکز ہدایت ہے۔'' (آلِ عمران: ۹۶)

مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب، سیرت النبیؐ میں خانہ کعبہ کے متعلق لکھا ہے ''خانہ کعبہ اس دُنیا میں عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی

رحمتوں اور برکتوں کا مرکز ہے۔ یہی وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت کی صفتیں تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہ وہ منبعِ نور ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ اُبلا اور اس نے تمام دُنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جس کی کرنوں نے زمین کے ذرے ذرے کو درخشاں کیا۔ یہ وہ جغرافیائی بندھن ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے، مختلف لباس پہنتے، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر وہ سب کے سب باوجود اُن فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے، ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے اور ایک ہی قبلے کو اپنا مرکز مانتے ہیں۔

حج کے موقع پر تمام مسلمان ایک مقام پر، ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں، دوش بدوش، ایک قوم اور برادری کے طور پر اپنی مساوات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

دُنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

## مراحلِ حج

۱۔ میقات سے آگے جانے سے قبل نیت کرنا اور احرام باندھنا ہے۔

۲۔ طوافِ زیارت۔

۳۔ ۸ ذوالحجہ کو حج کی نیت کر کے احرام باندھنا ہے اور مکہ سے منیٰ جانا ہے۔

۴۔ وقوفِ عرفات کے لیے منیٰ سے عرفات جانا۔

۵۔ عرفات سے مزدلفہ، مزدلفہ میں قیام اللیل۔

۶۔ مزدلفہ سے منیٰ۔

۷۔ طوافِ افاضہ۔

۸۔ طوافِ افاضہ کے بعد منیٰ میں واپسی۔

۹۔ منیٰ سے مکہ واپسی۔ مکہ چھوڑتے ہوئے طوافِ وداع

## حج، عالم اسلام کی یگانگت و مساوات کا عملی مظہر

حج، اسلام کی بڑی نرالی اور امتیازی شان والی عبادت اور مالی و بدنی دونوں عبادتوں کا مجموعہ ہے۔ دُنیا کا کوئی مذہب اور کوئی بھی تہذیب اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ عبادت اُن لوگوں پر عمر بھر میں ایک مرتبہ فرض ہے جو بیت اللہ شریف تک پہنچنے کے اسباب اور وسائل رکھتے ہوں اور جنھیں زادِ سفر اور زادِ عمل دونوں حاصل ہوں۔ حج کی فرضیت قرآن و حدیث، دونوں سے ثابت ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے نہایت تاکید کے ساتھ ارشاد فرمایا "لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ جو کوئی بیت اللہ تک آنے کی قدرت رکھتا ہو، وہ حج کے لیے آئے اور جس نے کفر کی روش اختیار کی تو وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ تمام دُنیا والوں سے بے نیاز ہے۔" (آل عمران)

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "لوگو، تم پر حج فرض کیا گیا ہے، پس تم ضرور حج کرو۔" (صحیح مسلم)

جو شخص قدرت رکھنے کے باوجود حج نہ کرے، آپؐ نے اس کے لیے سخت وعید بیان فرمائی ہے۔ صحیح مسلم میں آپ کا یہ ارشاد درج ہے: "جسے کسی بیماری نے یا کسی واقعی ضرورت نے یا کسی ظالم حکمران نے روک نہ رکھا ہو اور اس کے باوجود حج نہ کرے، تو چاہے وہ یہودی ہو کر مرے چاہے نصرانی۔"

(از سعید احمد صدیقی)

## احرام باندھنا (میقات میں)

حج کی نیت کر کے حج کا لباس پہننے اور تلبیہ پڑھنے کو احرام کہتے ہیں۔ احرام باندھنے کے بعد حج شروع ہو جاتا ہے۔ اب بہت سی چیزیں جن کا احترام بجالانا احرام سے پہلے جائز اور مباح تھا، حالت احرام میں ان کا بجالانا حرام اور ممنوع ہو جاتا ہے، اسی لیے اسے احرام کہتے ہیں۔

احرام باندھنے کا مقصد حاجیوں کو یاد کروانا ہے کہ وہ اسی طرح ایک دن دُنیا کا لباس بدل کر ایک کفن میں ملبوس ہو



کر دُنیائے فانی سے کوچ کریں گے۔ ایرانی مفکر اور عمرانی سائنسدان ڈاکٹر علی شریعتی اپنی کتاب حج (HAJJ) (مطبوعہ ہیوسٹن) میں احرام کے متعلق لکھتے ہیں "میقات میں احرام پہن کر دراصل حاجی اپنے آپ کو دفن کر کے میدانِ عرفات کی طرف اسی طرح جاتے ہیں جیسے روزِ قیامت لوگ حشر کے میدان کی طرف جائیں گے۔" اس لحاظ سے احرام دراصل ہماری "فطرہ" یعنی گناہوں سے پاک حالت کی طرف واپسی ہے۔ علاوہ ازیں لباس بدل کر احرام باندھنے کا مقصد لوگوں کی انا (Ego) ختم کرنا ہے کیونکہ لباس دراصل معاشرے میں طبقاتی تقسیم کی نشاندہی کرتا ہے جبکہ حج پر سب لوگ اللہ کے ہاں ایک ہی حالت میں حاضر ہوتے ہیں۔

(مناسک حج کی حکمتیں، ڈاکٹر مشتاق گوہر)

## کعبہ کے گرد طواف

طواف کے لغوی معنی کسی چیز کے اردگرد چکر لگانا ہے۔ اصطلاح میں طواف سے مراد ہے بیت اللہ کے گرد والہانہ گھومنا اور چکر لگانا۔ طواف زیارت حج کے ارکان میں سے ایک رُکن ہے۔ ڈاکٹر محمد امین عباسی بتاتے ہیں:

"زندگی کی سب سے بڑی خواہش آج پایۂ تکمیل کو پہنچنے والی تھی۔ ہم نمازِ فجر ادا کر کے جدہ ہوائی اڈے سے روانہ ہوئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہماری بس کچھ ہی دیر بعد بیت اللہ تک پہنچنے والی ہے۔ ہوٹل میں سامان رکھا، نمازِ ظہر کا وقت قریب تھا۔ جلدی جلدی کھانا کھایا اور نمازِ ظہر ادا کرنے چلے۔ ہوٹل سے مسجد احرام کا فاصلہ نصف کلومیٹر تھا۔ ہم عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہوئے کیونکہ حج تمتع کرنے والوں پر عمرہ واجب ہے۔ پھر احرام کھول دیتے ہیں۔ نصف کلومیٹر کا سفر ورد تلبیہ کے ساتھ طے کرتے گئے۔ خوشی کی انتہا تھی کہ چند ہی لمحوں میں ہم مسجد احرام (بیت اللہ) میں داخل ہوا چاہتے ہیں:

نہ کوئی اضطراب ہے نہ کوئی انتشار ہے
سکون ہی سکون ہے، قرار ہی قرار ہے
نظر کے سامنے زہے نصیب وہ دیار ہے
لطافتوں پر جس کی جانِ عاشقاں نثار ہے
اگر نگاہ تیز ہے تو دل سرور خیز ہے
ہوا بھی عطر بیز ہے، فضا بھی خوشگوار ہے
بگولے راہِ عشق کے بلند ہوئے کہ بول اُٹھے
خزاں نہیں خزاں نہیں، بہار ہی بہار ہے

پہلے نمازِ ظہر ادا کی، پھر دو رکعت نمازِ نفل برائے طواف ادا کی۔ طواف کی نیت کی۔ خانہ کعبہ پر نظر پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑنے پر جو دُعا مانگی جائے، قبول ہوتی ہے۔ میں نے دُعا مانگی کہ تیرے حضور حاضری کے لیے آئے ہیں، ہماری حاضری قبول فرما، تو راضی ہو جا۔ الحمدللہ! سکونِ قلب نصیب ہوا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔

سکونِ قلب کی لہروں سے یہ نصیب ہوتا ہے
کوئی ہے مائل کرم پوشیدہ پوشیدہ

اب ہم حجرِ اسود کے بالکل سامنے تھے۔ حجرِ اسود کا استلام کر کے طواف شروع کرنا تھا مگر ہجوم کی وجہ سے ممکن نہ تھا۔ ہجوم کی وجہ سے سنگِ اسود پر بھی اشارے سے استلام ہوتا ہے۔ دائیں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ بسم اللہ، اللہ اکبر کہا اور پہلا چکر طواف کا شروع کیا۔ پہلے تین چکروں میں رمل یعنی اکڑ اکڑ کر اور تیز قدموں سے چلنا ضروری ہے۔ رُکنِ یمانی کے سامنے سے گزرے اور سلام کیا، ہاتھ لگانا ممکن نہ تھا۔ بہرحال سات چکر مکمل کیے اور یوں طواف مکمل ہوا۔

ملتزم سے چمٹ کر اپنے گناہوں کی بخشش، اُمت مسلمہ اور جن اصحاب نے دُعاؤں کا کہا تھا، سب کے لیے دُعا کی اور مقامِ ابراہیم پر آ کر دو رکعت نمازِ نفل ادا کر کے دُعا کی۔ یہاں بھی دُعا قبول ہوتی ہے۔ پھر آبِ زم زم کی طرف چل پڑے۔ یہ وہ مبارک آبِ زم زم ہے جو حضرت اسماعیلؑ کی ایڑیاں رگڑنے سے نکلا تھا اور پھر سیدہ ہاجرہ نے حضرت اسماعیلؑ کو پلایا تھا۔ آبِ زم زم پر پہنچے تو ہجوم کافی تھا۔ لوگ پانی پی رہے اور ہاتھ منہ دھو رہے تھے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہجوم عام رہے کیوں نہ چاہ زم زم پر
یہیں پر سیر ہر ایک تشنہ کام ہوتا ہے

آبِ زم زم پی کر سعی کرنے کے لیے صفا و مروہ کی جانب چل پڑے۔ صفا و مروہ کے درمیان سات چکر لگائے جاتے ہیں۔ یہ سات چکر تقریباً تین کلومیٹر کا فاصلہ بنتا ہے۔ صفا پہاڑی پر چڑھ کر کعبہ کی طرف رُخ کر کے تین بار الحمدللہ اور اللہ اکبر پڑھ کر دُعا کی اور مروہ کی طرف چل پڑے۔ درمیان میں رمل کرنے کی جگہ بھی تھی جہاں سے سیدہ ہاجرہ مروہ کی طرف جاتے ہوئے تیز دوڑی تھیں۔ ہم بھی اس جگہ سے تیز دوڑے۔

سعی مکمل کر کے حلق/قصر (بال کٹوانے کا عمل) کروانا تھا۔ وہاں کئی حجام پھر رہے تھے۔ ہم بھی ایک صاحب کے پاس بیٹھ گئے۔ ہم نے حلق یعنی اُسترے سے بالوں کی صفائی کروائی۔ وہاں سے فارغ ہوئے اور اس طرح عمرہ مکمل ہوگیا۔

پھر ہوٹل پہنچے، احرام اُتارا اور نہا دھو کر مغرب کی نماز کے لیے حرم کی طرف دوڑ پڑے۔ عشا تک حرم میں رہے۔ دو دن مزید مکہ المکرمہ میں رہے۔ حج کی ادائیگی میں ابھی خاصے دن تھے۔ ہم ہادیِ اعظم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے شہر مبارک مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ بار بار زبان پر بچپن میں پڑھے اشعار آرہے تھے:

سلام اُس پر کہ جس نے بے کسوں کی دست گیری کی
سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اُس پر کہ جس کے پاس چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اُس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا

## آبِ زم زم

مکہ شہر آباد ہونے کی بنیاد وہ چشمہ ہے جو ایک معجزہ خداوندی کے طور پر وجود میں آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اللہ تعالیٰ کے حکم پر اپنی بیوی ہاجرہ اور بیٹے اسماعیلؑ کو اس وادی تبیز ذی زرعہ میں چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ اُن کی بیوی اور بیٹے کو پانی اور خوراک کہاں سے میسر آئے گی لیکن یہ یقین کامل تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز مہیا کرے گا۔

مارٹن لنگس (ابوبکر سراج الدین) آبِ زم زم کی تاریخی اہمیت واضح کرتے ہوئے اپنی کتاب، "Muhammad Based on Earliest Sources" میں لکھتے ہیں "حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہ اور اسماعیلؑ کو اللہ کے حوالے کیا اور فرشتوں کی امان میں دیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ سب کچھ اُن دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔ ہاجرہ غیبی اشارے کے تحت اس وادی میں رُک گئیں۔ کچھ ہی دیر میں ماں بیٹے پر پیاس کی شدت کا غلبہ ہوا۔ تشنگی ایسی غالب تھی کہ ہاجرہؑ کو یوں لگا، اسماعیلؑ دم توڑ رہے ہیں۔ وہ ریت پر پڑے تھے۔ ماں ایک قریبی ٹیلے کے دامن میں واقع ایک چٹان پر کھڑی ہر سمت نگاہ دوڑا رہی تھی کہ کہیں سے مدد ملنے کی کوئی صورت نظر آجائے۔ دُور تک کوئی نظر نہ آیا تو ایک مقام سے دوسرے مقام پر جا کھڑی ہوئیں، جہاں سے دُور تک نگاہ دوڑائی جاسکتی تھی۔ نیم بدحواسی کے عالم میں دونوں مقامات کے درمیان سات چکر کاٹے۔

ساتویں چکر کے اختتام پر جب وہ تھک کر ذرا دم لینے بیٹھیں تو دیکھا کہ اسماعیلؑ پڑے ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ وہاں اللہ کے حکم سے ایک چشمہ جاری ہوگیا اور اتنی تیزی سے پانی اُبل رہا تھا کہ اسے روکنے کے لیے حضرت ہاجرہؑ نے اپنے دونوں ہاتھ اس پر رکھ دیے اور "زم زم" کہہ کر روکنے کی کوشش کی۔

حضرت ہاجرہؑ کی مضطربانہ دُعا اور حضرت اسماعیلؑ کی معصومانہ ٹھوکر نے پانی کو ایسی فضیلت بخشی جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے مقدس پانی کی برکت سے اس وادی پر ایسا مقدس و متبرک شہر آباد کیا جو "اُم القریٰ" کہلاتا ہے۔ جس کی فضیلت کرۂ ارض کے تمام شہروں سے بڑی ہے۔ جو کروڑوں انسان کا قبلہ ہے، جہاں ہر سال لاکھوں انسان حضرت ہاجرہؑ کی طرح صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان بے تابی سے دوڑتے یعنی سعی کرتے ہیں۔

آبِ زم زم کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ



کے دور سے آج تک سوائے چند مواقع کے پانی کی مقدار میں کمی نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ پانی کی سطح بھی نیچے نہیں گئی۔

## حج کا احرام اور منیٰ روانگی

سنت یہ ہے کہ آٹھ ذوالحجہ کی صبح مکہ میں اپنی قیام گاہ ہی سے احرام باندھ لیتے ہیں۔ حج کا احرام باندھنے کے لیے بیت اللہ یا کسی دوسری جگہ جانا ضروری نہیں۔ اگر میسر ہو تو احرام سے پہلے غسل کرنا اور خوشبو لگانا بہتر ہے۔ احرام کی ایک چادر تہہ بند بنا کر دوسری دونوں کندھوں پر اوڑھ لیتے اور کہتے ہیں، اللھمہ لبیک حجا (اے اللہ میں حج کے لیے حاضر ہوں)۔ پھر بلند آواز سے تلبیہ پڑھتے ہوئے منیٰ روانہ ہوجاتے ہیں۔ اس وقت بیت اللہ کا طواف نہیں کیا جاتا۔

آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والی فاطمہ بتا رہی ہیں کہ مکہ سے منیٰ کیسے پہنچے:

"الحمدللہ! ہم بخیر و عافیت مکہ سے منیٰ پہنچ گئے۔ وہاں ہماری ملاقات ایک خوبصورت اُردنی جوڑے سے ہوئی۔ پھر حج کے باقی مراحل میں ہم ساتھ رہے۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہوا کہ مجھے ایک اور سہیلی مل گئی جبکہ ہم سہیلیوں کو دو محافظ (ہم دونوں کے شوہر) مل گئے جو زیادہ بھیڑ والی جگہوں مثلاً جمرات وغیرہ میں ہماری حفاظت کرتے۔

منیٰ میں پہلی رات ہم ایک قریبی پہاڑی پر چڑھے۔ اردگرد دیکھا تو ایک دُنیا آباد نظر آئی۔ لاکھوں لوگ چل رہے تھے۔ کاریں اور بسیں لوگوں کے جمِ غفیر کے درمیان راستہ بنا رہی تھیں۔ ایک طرف اُن لوگوں کے خیمے آباد تھے جو کاروباری تھے۔ یہ لوگ حجاج کرام کو بیچنے کے لیے مختلف اقسام کی تیار شدہ چیزیں لے کر آئے ہوئے تھے۔ منیٰ کا نظارہ انتہائی متاثر کن تھا۔ وہاں ہم جس طرف بھی دیکھتے، خیموں کی ایک کثیر تعداد نظر آتی۔

الحمدللہ! ہماری رہائش سادہ اور مناسب تھی۔ فرش پر چھوٹے چھوٹے قالین اور دریاں بچھائی گئی تھیں۔ مناسب فاصلوں پر پنکھے لگے ہوئے اور وضو کے لیے بے شمار مقام بنائے گئے تھے۔"

## وقوفِ عرفات

۹ ذوالحجہ کا سورج طلوع ہونے کے بعد تمام حاجی منیٰ سے عرفات روانہ ہوتے ہیں۔ عرفات کے میدان میں کہیں بھی ٹھہرا جاسکتا ہے۔ اس لیے ضروری نہیں کہ آدمی جبلِ رحمت نامی پہاڑی یا کسی دوسری جگہ جانے کی مشقت اُٹھائے۔ یومِ عرفات ایسا دن ہے جب ربِ ذوالجلال آسمانِ دُنیا پر آکر اہلِ عرفات کی طرف جھانکتا اور اپنے فرشتوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

"گواہ ہوجاؤ کہ میں نے انہیں بخش دیا ہے۔"

غروبِ آفتاب تک عرفات کی حدود میں حجاج کرام ٹھہرے رہتے ہیں۔ ایک امریکی مسلمان، میر اسد اللہ عرفات میں اپنے قیام کے متعلق کچھ یوں بتاتے ہیں:

"منیٰ میں ایک روز قیام کر کے، اگلے دن ہم عرفات کی طرف چل نکلے۔ وہاں پہنچنے میں کوئی دُشواری نہ آئی۔ ٹریفک جام تھی نہ ہی لوگوں کو بسوں کی چھتوں کے اوپر چڑھ کر سفر کرنا پڑا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت محمد ﷺ نے ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھیں۔ آپؐ نے ایسا اس لیے کیا تھا کہ دن کے باقی حصے میں اللہ تعالیٰ سے اپنے پیروکاروں یعنی ہمارے لیے رحمتیں طلب کرسکیں۔

حضور اکرم ﷺ نمازیں ادا کر کے جبلِ رحمت کے اوپر کھڑے ہوگئے اور اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے دُعائیں مانگتے رہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضورؐ نے اپنا آخری اور تاریخی خطبہ حج ارشاد فرمایا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہمیں روزِ جزا کی یاد آتی ہے۔

میں میدانِ عرفات میں واقع مسجد نمرہ میں نماز ظہر اور عصر ادا کرنے چلا گیا۔ اس مقام پر حضرت ابراہیمؑ نے مسجد تعمیر کی تھی۔ اب وہاں ایک عالیشان مسجد ہے۔ جونہی میں مسجد کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ہر کوئی اسی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جب سیڑھیوں پر پہنچا تو لوگوں نے ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھنا شروع کردیا۔ مجبوراً ہمارے پاس بھی ایسا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، ورنہ ہم آگے نہ بڑھ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاتے۔ اللہ تعالیٰ اُس بھائی کو جزا دے جس نے اپنی جائے نماز پر مجھے جگہ دے دی۔

میں وہ وقت ہمیشہ یاد رکھوں گا جو میں نے نماز کے انتظار میں گزارا تھا اِن شاء اللہ۔ میرے پسینے نے میرے سارے کپڑوں کو بھگو دیا۔ پسینہ اُس تھیلے میں بھی جذب ہونے لگا جو میں نے اُٹھا رکھا تھا۔ اِس کی وجہ سے وہاں قرآن مجید اور دُعاؤں کے کتابچے بھی بھیگ گئے۔ پسینے کے نشانات آج بھی قرآن مجید کے اوراق پر موجود ہیں اور یہ نشانات مجھے اُس دن کی یاد دِلاتے ہیں جب میں اُس روز زندگی میں پہلی بار سورج کی دھوپ میں جھلس گیا تھا۔

میں اُس روز کو بخوبی یاد رکھوں گا اور میرا جسم بھی۔ روزِ قیامت سورج آج کی دُنیا کی نسبت زیادہ ہمارے قریب اور گرم ہوگا۔ میں روزِ قیامت کی تپش کو نہیں بھول سکتا، اللہ ہمیں محفوظ رکھے۔

گزشتہ رات میں صحیح طور پر سو نہیں سکا تھا۔ میں خاصا تھک گیا تھا۔ نمازوں سے فارغ ہو کر میں نے خیمے میں جا کر تھوڑا سا آرام کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بہت زیادہ فضل و کرم کیا کہ مجھے جبلِ رحمت پر لے گیا۔ میں نے جبلِ رحمت کے اِرد گرد کچھ دیر چہل قدمی کی تاکہ میں بھی رحمتوں کا حقدار بن سکوں۔

چودہ سو برس قبل وہاں کھڑے ہو کر حضرت محمد ﷺ نے فرمایا تھا ”اے لوگو! میری بات غور سے سنو۔ ممکن ہے اِس سال کے بعد پھر اِس مقام پر میری ملاقات تم سے نہ ہو سکے، لہٰذا میری باتیں غور سے سنو اور پھر اِن لوگوں تک میری یہ باتیں پہنچا دو جو اِس محفل میں شریک نہیں۔“

میں مغرب تک جبلِ رحمت ہی پر اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کرنے میں مصروف رہا۔ اُس وقت مجھے تنہائی کا احساس ہونے لگا، چنانچہ میں اُترا اور اپنے گروہ کے ساتھ جا ملا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ اندھیرا ہونے سے پہلے بس نہیں چلے گی۔ چنانچہ بس کے انتظار میں کچھ دیر زمین پر لیٹا رہا۔ آخر بس چلی اور ہم مزدلفہ پہنچے۔“

## مزدلفہ میں قیام الیل

سورج غروب ہونے کے بعد تلبیہ کہتے ہوئے عرفات سے مزدلفہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ مزدلفہ پہنچ کر تین رکعت مغرب اور دو رکعت عشا کی نماز اور وتر پڑھتے ہیں۔ حضور ﷺ کی سنت ہے کہ اِس رات میں سو کر آرام کیا جائے۔ وہاں صبح فجر کی نماز کے بعد اچھی طرح روشنی ہو جانے تک دُعا اور ذکر و اذکار کرتے اور پھر سورج طلوع ہونے سے قبل ہی منیٰ کو روانہ ہو جاتے ہیں۔

محترمہ ربیعہ رحمان عرفات سے مزدلفہ روانگی اور مزدلفہ میں رات گزارنے کا احوال بیان کر رہی ہیں:

”وادیٔ عرفات میں سورج غروب ہو چکا تھا مگر مغرب کی نماز وہاں پڑھنے کا حکم نہیں۔ مزدلفہ میں مغرب اور عشا کی نمازا کٹھے پڑھی جاتی ہے۔ ہم لوگ دُعاؤں سے فارغ ہو کر مزدلفہ روانگی سے پہلے وضو کر کے تازہ دم ہو گئے۔ اپنے کیمپ سے باہر نکلے۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، تاحدِ نگاہ انسان ہی انسان تھے۔ اُس وقت دل نے گواہی دی کہ یہ میرے اللہ کی شان ہے کہ اُس نے اِس چٹیل اور بے آب و گیاہ میدان کو مرجع خلائق بنا دیا اور ساری دُنیا کے گوشے گوشے سے لوگ یہاں کھنچے چلے آئے ہیں۔ خدایا میرے نصیب اور تیری عنایات بے پایاں کہ تو نے مجھے یہاں آنے کی سعادت بخشی، میرے اعمال تو اس قابل نہ تھے کہ میں یہاں قدم دھرتی اور ان رحمتوں اور برکتوں سے اپنا دامن بھرتی۔ اپنی خوش بختی پر میری آنکھیں جھلملا گئیں۔

پھر ہم سب اپنے حضور ﷺ کی پیروی میں مزدلفہ جانے کے لیے بس کی تلاش میں لگ گئے کیونکہ اُس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور شفق کی سرخی زائل ہونے لگی تھی۔ کافی انتظار کے بعد بس ملی۔ بھیڑ کی وجہ سے بس جگہ جگہ رُک رہی تھی۔ آخر چلتے چلتے بس ہمیں مزدلفہ کے وسیع و عریض میدان میں لے آئی۔ چاروں طرف روشنیاں جگمگا رہی تھیں، ایک جگہ ہم اُتر گئے۔ چاروں طرف خلقت جمع تھی، جیسے سفید پوش روحیں ہوں۔ ہم وضو کر کے ایک اذان اور دو



اقامتوں کے ساتھ مغرب اور عشا کی نماز کی ادائیگی کے لیے رب کے حضور کھڑے ہو گئے۔ ایک مقدس فضا نے ہمیں اپنے ہالے میں لے لیا۔

چاروں طرف وسیع میدان اور سر پر کھلا آسمان جہاں ستارے جھلملا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی سی ہوا ہمارے جسموں کو چھوتی گزر رہی تھی۔ انتہائی رُوح پرور سماں تھا۔ دل کی عجیب کیفیت تھی جسے الفاظ میں پرونا ممکن نہیں۔ جذبات اُمنڈ پڑ رہے تھے۔ اشک بن کر آنکھوں میں اُتر رہے تھے۔ پیارے رسول ﷺ اور آپؐ کے جلیل القدر صحابہ بھی یہاں اِس میدان میں ٹھہرے تھے۔ میں نے بھی خالق و مالک کے حضور بہت سی دُعائیں کیں اور پھر ذکر و اذکار اور استغفار میں مصروف ہو گئے۔ میری نیند بس میں ہی پوری ہو گئی تھی، اب تھوڑی ہی رات بچی تھی، فجر کا وقت قریب تھا۔ میں ایک بات کی یاد دہانی کرانا چاہوں گی، مزدلفہ بیداری والی رات نہیں اور یہ بات ہادیٔ برحقؐ سے ثابت ہے۔

مزدلفہ کا سارا میدان مؤقف ہے۔ یہیں وہ مسجد واقع ہے جسے مشعرِ حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام ہے۔ اِس لیے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر قیام کرنا اور طلوعِ فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ سورۃ البقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ”تو جب عرفات سے چلو تو مشعرِ حرام کے پاس خدا کو یاد کرو اور اِس طرح یاد کرو کہ جس طرح اُس نے تم کو بتایا اور تم اُس سے پہلے حق کی راہ کو بھولے ہوئے تھے۔“

ہم نے مزدلفہ سے ستر ستر کنکریاں چن کر اِس چھوٹی سی تھیلی میں رکھ لیں جو ہمیں اِسی مقصد کے لیے مہیا کی گئی تھی۔“

## منیٰ میں قیام

۱۰ ذوالحجہ کو سورج نکلنے سے پہلے ہی حجاج کرام منیٰ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ اِسے یومِ النحر (قربانی کا دن) کہتے ہیں۔ اِس دن درج ذیل اہم اُمور سرانجام دیے جاتے ہیں:

۱۔ منیٰ میں آ کر جمرۃ العقبہ (جسے بڑا شیطان کہا جاتا ہے) کو سات کنکریاں مارنا۔ ۱۰ ذوالحجہ کو کنکریاں مارنے کا وقت طلوعِ فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک ہوتا ہے۔ کنکریاں مارنے کو رمی جمار کہتے ہیں۔

۲۔ کنکریاں مارنے کے بعد قربانی کا جانور ذبح کیا جاتا ہے۔

۳۔ مرد حلق یا قصر کرواتے ہیں جبکہ عورتیں صرف قصر کرواتی ہیں۔ مردوں کے لیے حلق افضل اور قصر جائز ہے۔ نبی اکرمؐ نے حلق (سر کے بال منڈوانا) کرانے والے کے لیے تین بار دُعا فرمائی ہے اور قصر (سر کے بال کٹوانا) کرانے والوں کے لیے صرف ایک مرتبہ۔

حلق یا قصر کے بعد احرام کی تمام پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ حاجی احرام اُتار دیتے ہیں البتہ بیوی کے پاس جانے پر پابندی برقرار ہے۔

(از مولانا طارق محمود)

## طوافِ افاضہ

منیٰ میں احرام اُتار اور نہا دھو کر نیا لباس زیب تن کر

## پُراثر باتیں

☆..... جو ایمان ہمیں گھر سے مسجد تک نہیں لے جا سکتا بھلا وہ ہمیں قبر سے جنت تک کیسے لے جائے گا؟

☆..... اپنی زبان اور دل کی سختی اس ماں کو مت دکھاؤ جس نے تمہیں بولنا سکھایا۔

☆..... غموں کو خاک پر لیکن خوشیوں کو ہمیشہ سنگ مرمر پر لکھئے۔

☆..... عزت دل میں ہونی چاہیے، لفظوں میں نہیں جبکہ ناراضگی لفظوں میں ہونی چاہیے، دل میں نہیں۔

☆..... حیران ہوں اُس شخص پر، جو بیماری کے ڈر سے حلال کھانا چھوڑ دیتا ہے لیکن اللہ کے ڈر سے حرام کھانا نہیں چھوڑتا۔

☆..... کوشش کیجئے کہ وہ شخص آپ کو ہمیشہ خوش ملے جسے آپ روزانہ آئینے میں دیکھتے ہیں۔

(قاری عبدالمجید، بہاولپور)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے حاجی مکہ معظمہ روانہ ہوتے اور طوافِ زیارت کرتے ہیں۔ اِسے طوافِ افاضہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ طواف فرض اور حج کا رُکن ہے۔ طواف اور سعی سے فارغ ہوکر حاجی واپس منیٰ آجاتے ہیں۔

۱۱ر اور ۱۲ر ذوالحجہ کو تین جمرات (چھوٹا شیطان، درمیانی شیطان اور بڑا شیطان) کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ ۱۲ر ذوالحجہ کو حاجی منیٰ سے نکل کر مکہ آسکتے ہیں لیکن اگر منیٰ میں ہی سورج غروب ہو جائے تو پھر رات وہیں گزارنا ضروری ہے۔ پھر ۱۳ر ذوالحجہ کو رمی کے بعد مکہ آسکتے ہیں۔ اِس طرح تمام مناسک پورے ہوگئے۔ صرف ایک واجب باقی ہے اور وہ یہ کہ جب حاجی مکہ چھوڑیں، تو طوافِ وداع کریں گے۔

منیٰ میں قیام کی یہ تفصیلات مولانا طارق محمد نے انتہائی اختصار اور خوبصورتی سے بیان کی ہیں۔ اب طوافِ وداع کے بارے میں حاجی فیاض احمد سے حال احوال سنیے:

## طوافِ وداع

''الوداعی طواف مکمل ہوا۔ دُعاؤں کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔

اے دُعا ہاں عرض کر عرشِ الٰہی تھام کے
اے خدا اب پھیر دے رُخ گردشِ ایام کے
رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن تیرے محبوبؐ کی اُمت میں ہیں
خلق کے راندے ہوئے، دُنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب در پہ تیرے ہاتھ پھیلائے ہوئے

یہ ایسا مقام ہے کہ نہ رونے والوں کے بھی آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ بڑی عاجزی سے عرض کر رہا ہوں، خیالات ابوبکرؓ کے ہیں اور زبان میری۔ ''یارب تیرے دروازے کے بغیر اور جائے پناہ کہاں ہے، اگر آج تو نے اپنے در سے ٹھکرا دیا تو پھر مجھے پناہ کہاں ملے گی۔ یارب! جیسے تو نے کرم فرمایا، خاص مہربانی سے مجھے یہاں لایا، میرے گناہ، میرے تمام گناہ معاف کردے۔ تیرے سوا خطائیں اور قصور معاف کرنے والا کون ہے؟ یااللہ میں تیرا مجرم ہوں، تیرے احکام کی خلاف ورزیاں کرتا رہا، مجھے معاف فرما اور آئندہ سیدھی راہ پر چلا۔''

## الوداع اے شہر مکہ

مکہ کے مبارک شہر کو الوداع کہیے۔ خدا سے دُعا ہے کہ ہمیں دوبارہ یہاں لائے۔ ہوائی اڈے جاتے ہوئے یہ اشعار زبان پر آگئے۔

الوداع اے شہر مکہ! اے سعادت کے دیار
الوداع اے خانہ کعبہ! بچشم اشک بار
مولا ختم الرسل، مولائے کل، نور ہدیٰ
اور کس بستی کو حاصل ہے یہ رُتبہ یہ وقار
رُخصت، اے میزابِ رحمت، رُخصت اے ابوابِ عشق
اب کہاں ہم اور کہاں یہ جلوہ ہائے نور بار

نوید اسلام صدیقی کا قلم ویسے تو ہر موضوع پر خوب چلتا ہے چاہے وہ معلومات ہوں، تحقیق ہو یا جستجو، مگر جہاں دل و روح کی کیفیات کا تذکرہ ہو وہاں تحریر میں تاثیر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایم کام کیا اور پیشے کے اعتبار سے مختلف کمپنیوں کے اکاؤنٹس کو سنبھالتے ہیں۔ اسلامک پبلی کیشنز میں کام کیا۔ سیارہ ڈائجسٹ سے وابستہ رہے۔ سب سے اہم حوالہ یہ کہ نامور ادیب اور شاعر جناب نعیم صدیقی کے صاحبزادے ہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مشاہداتِ سعودی عرب، ایک نئے زاویۂ نگاہ سے

# ۳۶۵ دِن لگاتار ایک سا عُمدہ حُسنِ انتظام

- کیا سفاک جمہوریت سے مہربان ملوکیت بہتر ہے؟
- سعودی عرب میں دکانوں پر ترازو کیوں نہیں ہوتے
- پورا سعودی عرب بڑے بڑے ہورڈنگز پہ تصویروں سے پاک ہے

رضی الدین سید

## گزشتہ

دنوں عمرے کی سعادت کی خاطر ہمیں سعودی عرب جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے انتظامات اور دیگر سماجی اور ترقیاتی پہلوؤں کو دیکھ کر دل بہت بے قرار ہوا کہ ان پہلوؤں سے بھی سعودی عرب پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر روز، ہر مہینے اور ہر سال ہزاروں اور لاکھوں افراد کو دنیا بھر سے اپنے اندر سمونا اور پھر ان کے انتظامات میں ذرہ برابر بھی کمی بیشی نہ ہونے دینا، صبح و شام کے تمام معاملات کا حسبِ دستور پُرسکون طور پر جاری رہنا، ازدہام کے باوجود

حرمین شریفین میں برائے نام بھی گندگی نہ ہونا، ٹھنڈے زم زم کے پانی کا پلاسٹک اور مشینی کولروں میں چوبیس گھنٹے مسلسل موجود رہنا اور شرک و بدعت کے افعال سے روکنے کے علاوہ سعودی حکام کا زائرین کو مطلق تنگ نہ کرنا، ایسی صفات ہیں جن پر نگاہ ڈال کر ہر مسلم، سعودی حکومت کے حُسنِ انتظام پر اش اش کر اٹھتا ہے۔ حرمین شریفین میں سیکڑوں غیر ملکی کارکنوں کا ہمہ وقت چوکنا اور فعال رہنا، بیسیوں صفائی مشینوں کا وسیع و عریض مساجد الحرمین کو ہر وقت دھوتے اور سُکھاتے رہنا، ان گنت طہارت و وضو خانوں میں ہمہ وقت صفائی کے ساتھ اور بلا کسی ناگوار بدبو کے ہر وقت پانی کا دستیاب رہنا اور خود کار زینوں (Escalators) اور اے سی پلانٹس کا مسلسل و ہمہ دم متحرک رہنا جیسے وہ اقدامات ہیں کہ انسان کی عقل انھیں دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے۔ ہم نے وہاں قیام کے دوران بارہا سوچا کہ الٰہی! سال کے ۳۶۵ دنوں تک لگاتار اس طرح کا حسن انتظام رکھنا کہ نہ کبھی اوقات میں فرق آئے نہ کبھی کام میں رکاوٹ آئے نہ کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہو اور نہ کبھی کوئی ہلکا سا جھگڑا یا کوئی بدتمیزی سامنے آئے، کیا یہ اسی دنیا کے انسانوں کا کارنامہ ہوسکتا ہے؟ خانۂ کعبہ کے گرد طواف کے دوران عموماً اور حرمین میں نمازوں کے دوران خصوصاً دنیا جہان کی مسلم خواتین و مرد حضرات ایک ساتھ گردش کرتے اور نمازیں ادا کرتے ہیں لیکن آج تک کی تاریخ میں ۳۰۔۴۰ لاکھ لوگوں کے ازدہام کے باوجود اگر مرد و خواتین میں کوئی ایک واقعہ بھی بدتمیزی کا پیش نہیں آیا، اسے اللہ کے فضل کے سوا اور کس چیز کا نام دیا جائے گا؟ اسلام پر اپنی زبانیں دراز کرنے والوں کی کیا نگاہیں نہیں ہیں کہ وہ اللہ کے اس فضل کو بھی نہ دیکھ سکیں؟

## کھانے پینے کی اشیا۔ کال کیوں نہیں پڑتا

سعودی عرب کی سرزمین دنیا کی دیگر سرزمینوں کے مقابلے میں اس لحاظ سے بالکل منفرد ہے کہ جدّہ ہوائی اڈے پر دنیا کے ہر خطے سے سیکڑوں ہزاروں افراد عمرے کی نیت سے ہر روز اترتے اور پرواز کرتے ہیں مگر مجال ہے کبھی کسی نے یہ سنا ہو کہ اس سال یا اُس دن مکے اور مدینے میں آٹے، چینی، دہی، دودھ، پانی، چائے یا خورونوش کی کسی بھی دوسری شے کا کال ہوگیا ہے اور لوگ اپنی بھوک اور پیاس بجھانے کے لئے مارے مارے پھر رہے ہیں؟

ٹھیک ہے کہ یہ سب کچھ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی اُس دعا کا نتیجہ ہے کہ پروردگار اس وادیٔ غیر ذی زرع میں انھیں اپنی کسی بھی نعمت کی کمی نہ ہونے دینا (مفہوم)، مگر اس کی دوسری بڑی وجہ وہاں کے حکام، عمّال اور اراکینِ سلطنت کا ہے جن کے دل حاجیوں اور زائرین کی خدمت کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہتے اور اس ضمن میں وہ خدا خوفی کا رویہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے بدقسمت ملک کے حکمرانوں کی طرح نہیں کرتے جو دنیا کی حسین، جدید اور پُرآسائش اشیا کو دیکھ کر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ سعودی بادشاہ جب خود کو ''خادم الحرمین والشریفین'' قرار دیتے ہیں تو دل گواہی دیتا ہے کہ فی الحقیقت وہ ''خادم الحرمین وشریفین'' ہی ہیں!

## سعودی عرب کے ہورڈنگز تصویروں سے پاک

مملکتِ سعودیہ کی ایک اور نمایاں خوبی شہروں کی اندرونی سڑکوں اور مکانوں کی چھتوں کا اشتہارات سے پاک ہونا ہے۔ ہمارے ملک کے برعکس وہاں جگہ جگہ ہیبت ناک ہیون سائنیز، اشتہاری بورڈ اور کاروباری بینر شاذونادر ہی کہیں نظر آتے ہیں۔ اس ''کمی'' کا احساس حرمین کے علاوہ ہمیں جدّہ میں بھی ہوا، جو ہیں ان پر تصویر نہیں ہے۔ نہ جانے اس طرح کی مشہوری کے بغیر سعودی صنعت کار آخر اپنے کاروبار کو اس قدر برق رفتاری سے کس طرح فروغ دے دیتے ہیں؟ شاید بہترین معیار اور مناسب قیمت وجہ ہو حالانکہ ہمارے پاکستانی کاروباری حضرات تو یہی سمجھتے ہیں ''نہ ہوں دیوہیکل اشتہاری بورڈ تو



عبث ہے یہ کارِ صنعت کاری!'' ہمارا خیال ہے کہ پورا مشرقِ وسطیٰ اس ''وبا'' سے پاک ہے! طوفانِ بادوباراں کے دوران پاکستان میں ان بورڈز کے گرنے سے کئی قیمتی انسانی جانوں کی ہلاکتوں کی خبریں عام طور پر شائع ہوتی ہی رہتی ہیں مگر ملک میں انسانی جانوں کی اہمیت کا احساس کسے ہے؟ نہ صنعت کاروں کو اور نہ حکومتی کارپردازوں کو!

## برقع کی لازم پابندی

سعودی عرب میں خواتین کے لیے لازم ہے کہ وہ برقعے میں رہیں۔ اس کے بغیر وہ سڑکوں پر نہیں اسکتیں۔ البتہ اس میں نقاب کی چھوٹ ہے۔ یہ پابندی اتنی لازمی ہے کہ غیر مسلم عورتیں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ جدّہ میں ہم نے لاتعداد عیسائی اور ہندو عورتوں کو بھی برقعے میں گھومتے پایا جسے دیکھ دل میں ایک عجیب قسم کی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور میں جبکہ مغرب میں مسلم خواتین سے قانونی طور پر ''نقاب کشائی'' کروائی جا رہی ہے۔ ویسے سعودیہ میں مقامی خواتین تنہا اتنی آزادانہ نقل و حرکت نہیں کرتیں، جتنی ہماری خواتین بازاروں میں بے محابا گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

## افریقی عورتوں کے چلتے پھرتے کاروبار

افریقی عورتوں کو وہاں ہم نے چھوٹا موٹا روزمرّہ کا کاروبار کرتے ہوئے بہت پایا۔ برقعے، سامانِ آرائشِ حُسن، چپل، چادریں اور عبایا وغیرہ۔ ''ہاکری'' کا روبار ان حبشی خواتین کے ہاتھوں میں بہت زیادہ ہے اور وہ پورے ملک میں فٹ پاتھوں پر جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ باوجود سیاہ فام رنگت اور گرمی کی شدت کے وہ نقاب کے ساتھ مکمل برقعے میں ہوتی ہیں، شاذونادر ہی ان کی خواتین چہروں سے اپنے نقاب ہٹاتی ہیں۔ پردے پر ناک منہ سکیڑنے والی ہماری مادر پدر آزاد روشن خیال خواتین کے منہ پر یہ ایک طمانچہ ہے۔ اس حالت کے برقرار رکھتے ہوئے بھی وہ دن بھر میں اکثر اوقات ہزار ہزار ریال کا کاروبار کر لیتی ہیں اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہم نے ان کے ساتھ کبھی کوئی ''حادثہ'' ہوتے ہوئے بھی نہیں سنا۔ واضح رہے کہ ان افریقی خواتین میں ایک بڑی تعداد نوجوان باپردہ لڑکیوں کی بھی ہوتی ہے!

## دکانوں پر ترازو بھی نہیں

پورے سعودی عرب میں دکانوں پر ترازو کا عام طور پر کوئی کام نہیں ہے۔ وہاں آدھا پاؤ یا کلو ڈیڑھ کلو کا سامان تول کر نہیں بکتا بلکہ ہر چیز مستند وزن کے ساتھ اچھی پیک شدہ حالت میں فروخت کی جاتی ہے۔ تولنے اور ناپ تول میں کمی کے جھنجھٹ سے وہاں کے دکاندار اور شہری دونوں آزاد ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ ہم کوئی پیک شدہ چیز ۲۰۰ گرام لے جا رہے ہوں اور گھر جا کر وہ ۱۹۰ گرام نکل آئے۔ اسی طرح ہر شے وہاں خالص اور اصلی بھی ہوتی ہے۔ خریدار کو عموماً ذہنی سکون ہوتا ہے کہ اس نے جس معیار اور وزن کے لئے رقم خرچ کی، وہی اصل چیز اس کے ہاتھ آئی ہے۔ سَودوں کی اس سے بڑھ کر خوبی اور کیا ہو گی! آخر پاکستانی ''مسلمان'' تاجر اس ایمانداری کی طرف کیوں نہیں آتے اور کیوں اپنے ہر سَودے کو ''حرام'' کی صفت سے رنگ دیتے ہیں؟ کیا ان کا ایمان یہی ہے کہ جائز و حلال خرید و فروخت انھیں بھی دولت کا ڈھیر نہیں مہیا کرسکتی؟

## سعودی ''مغربیانے'' سے کیسے بچ نکلے

اس دور میں جب کہ ہر مسلم ملک خود کو بری طرح ''مغربیانے'' پر حد سے زیادہ بے تاب ہے، عرب ممالک وہ واحد جزیرے ہیں جنھیں اپنی عربیت پر حد سے زیادہ ناز ہے۔ دوسرے عرب ممالک کی طرح سعودی عرب کے حکام، شاہانِ مملکت اور عام شہری اپنے عربی لباس اور اپنی عربی زبان کو بری طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ مجال ہے کہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کا کوئی فرد آپ کو مغربی لباس میں لپٹا اور فر فر انگریزی بولتا ہوا نظر آجائے! اکثر اوقات راقم نے سوچا کہ نہ جانے یہ کون سی دنیا کے لوگ اور کس مٹی کے بنے ہوئے افراد ہیں کہ مغربی چکا چوند کو وہ ہلکی سی بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں! پھر مزید حیرت اس پر بھی ہوتی ہے کہ انگریزی کے بغیر آخر وہ اس اکیسویں صدی میں ترقی کیسے کر لیتے ہیں کیونکہ پاکستان میں تو یہ تقریباً سمجھا گیا ہے کہ انگریزی کے بغیر دھیلے کے برابر بھی ترقی نہیں ہو سکتی۔ انگریزی زبان نہ اپنانے پر ایک خدشہ ہمیں یہ بھی لاحق رہتا ہے کہ آخر ہم مغربی سائنسی و ٹیکنالوجیاتی اصطلاحات سے کس طرح نبرد آزما ہوں گے؟ لیکن یہ بھی محض ایک عذر لنگ ہے کیونکہ معروف مغربی کہاوت ہے کہ "جب عزم راسخ ہو تو پھر راستے نکل ہی آتے ہیں۔" تاہم اس دوران مختلف قومی اداروں اور مقتدرہ قومی زبان نے ڈھیر ساری مترادف عربی و اردو اصطلاحات ٹکسال میں ڈھال بھی لی ہیں۔ تاہم سعودیوں کو اس پہلو نے بھی کچھ زیادہ پریشان نہیں کیا۔ انھوں نے طے کر لیا ہے کہ بہر حال عربی زبان ہی حاوی رہے گی۔ اس لئے انھوں نے آنا فانا نوے فی صد اصطلاحات کو عربی قالب میں ڈھال دیا مثلاً ملاحظہ فرمائیں:

پارکنگ =مُوقف (وقفے سے)، Floor (منزل) = طابق (طبق سے)، بجلی= کُہرباء، کاریں =سیّارات (گردشی اشیا)، لیڈیز=سیّدات، ہوٹل=فُندق، گروپ= مجموعہ (مجموعہ بن لادن)، کمپنی = شرکۃ، ٹیلی فون= ہاتف، روڈ = طریق، پرچیزیز (خریداریاں) = مشتریات، بیٹریز = بطاریات، لفٹ = رافعات (بلندی پر لے جانے والی)، ڈورز = ابواب، نمبر= رقم، سپروائزر =مُشرّف، اور پاسپورٹ =جوازالسفر وغیرہ۔

## سگریٹ کے ساتھ والد خان خبیث کیوں؟

عربی زبان کی اس شدت کے باعث وہاں ایک لطیفہ بھی ہمارے ساتھ ہو گیا۔ وضو خانے پر ایک جگہ سگریٹ نوشی سے اجتناب کا ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر تحریر تھا "وَیُحَرِّمُ علَیْھِمُ الخبائث" اور اس کے آگے لکھا تھا "والد خان خبیث" جب کہ اس کے ساتھ ہی ایک جلتے ہوئے سگریٹ پر کراس کا نشان تھا۔ بورڈ دیکھ کر ہم بڑے حیران ہوئے کہ الٰہی یہ "والد خان خبیث" یہاں کیوں لکھا ہے۔ ہم نے سوچا کہ یہ ہمارے کسی خان بھائی کی کارستانی ہے کیونکہ ان کے نام مذکورہ قسم کے بھی ہوتے ہیں یعنی "خستہ خان و سمندر خان" وغیرہ۔ مگر پھر فوراً ہی خیال آیا کہ یہ تو سرکاری بورڈ ہے اور حرم میں تو کسی کو ذاتی بورڈ لگانے کی اجازت ہی نہیں ہے اور پھر اگر یہ کسی نے اپنے والد کا نام بھی لکھا ہے تو پھر اس کے آگے خبیث کیوں لگایا ہے؟ اپنے والد کو تو کوئی بھی اعلانیہ خبیث نہیں کہہ سکتا اور پھر وہ بھی مسجد نبوی میں؟ سوچتے سوچتے بہت دیر ہو گئی تب خود ہی سمجھ میں آیا کہ یہ اصل میں "وَالدُّخَانُ خَبِیْثٌ" ہے جس کے معنی ہیں "اور سگریٹ بھی ایک خبیث شے ہے۔" عرب حضرات چونکہ اپنی تحریروں میں اعراب کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور اصطلاحاً دُخان کو وہ لوگ سگریٹ کے معنوں ہی میں لیتے ہیں۔ یہ شدید مغالطہ ہمیں اسی باعث پیش آیا تھا۔ اس پر ہمیں معروف مرحوم ادیب عظیم بیگ چغتائی کی مزاحیہ تحریر "الشذری" یاد آگئی جس میں اپنا یہ نام ایک "چودھری" صاحب نے عربی میں تجویز کیا تھا اور پھر سعودیہ میں اس سے لاتعداد لطیفے وجود میں آئے تھے۔

نہ جانے سارا احساسِ کمتری اور احساسِ غلامی صرف ہمارے اندر ہی کیوں سمایا ہوا ہے؟ آخر ہمیں مزید کتنی صدیاں چاہئیں جب ہمیں بھی اپنی زبان اور اپنے لباس پر فخر ہونے لگے گا؟ اگر اردو زبان واقعی اتنی ہی ناقص اور از کار رفتہ ہوتی تو آج کی دنیا کی اہم یونیورسٹیوں میں اس کے لئے خصوصی شعبہ جات کیوں قائم کیے جاتے؟ ہمیں معلوم ہے کہ اس سوال کا جواب ہمارے "خسروان" کبھی نہ دے سکیں گے!



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## صرافوں کی بھری دکانیں اور گارڈ کوئی نہیں

مکہ اور جدہ میں ہم نے صرافوں کی سونے سے بھری دکانیں بھی بہت دیکھیں۔ یہ وہ دکانیں تھیں جن میں سونے کے اتنے بھاری زیورات تھے کہ ان جیسے بھاری زیورات ہم نے پاکستان میں بھی نہیں دیکھے۔ مکے میں ہزاروں آدمیوں کے کھوے سے کھوا اچھلتے چوبیس گھنٹوں کے دوران بھی ہم نے اپنے قیام کے دوران کبھی یہ دکانیں لٹتی ہوئی نہیں دیکھیں نہ ہم نے کبھی یہ محسوس کیا کہ پاکستان کی طرح ہر صراف کی دکان پر نجی سیکیورٹی گارڈز یا سرکاری سپاہی پہرے دے رہے ہیں۔ اسی طرح ہم نے سعودیہ میں اے ٹی ایم کے مراکز بھی بالکل کھلے ہوئے دیکھے، کہیں نہ کوئی کمرا نما ڈربہ تھا اور نہ کوئی دھندلا سا شیشے کا دروازہ۔ ہر مشین بر سر عام تھی اور لوگ سب کے سامنے رقمیں نکال رہے تھے۔ ہزاروں لاکھوں افراد کا ہر وقت کا ہجوم، لاکھوں روپے کے زر و جواہرات اور کوئی سپاہی بھی موجود نہیں۔ مگر اس کے باوجود وہاں چوری کی ایک بھی واردات نہیں ہوتی! تو یہ ہے نا انتہائی حیرت کا مقام۔ وہاں ہر سعودی اور بیرونی فرد کو پتا ہے کہ اگر خدانخواستہ ان کے ہاتھوں کوئی چوری یا ڈکیتی کی واردات ہو گئی تو پھر سیدھے سیدھے ان کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔ وہاں ان کے سامنے ہر وقت جلاد کا بغدا اور قاضی کی تلوار لہراتی رہتی ہے۔ حدود کی سخت سزائیں بڑے بڑے پڑھے لوگوں کو بھی سیدھا کر دیتی ہیں۔

لیکن افسوس کہ پاکستان کے لادین حکمرانوں کو حدود کی سزائیں وحشیانہ نظر آتی ہیں۔ پرویز مشرف نے اس موضوع پر کبھی کہا تھا کہ کیا میں پورے پاکستان کو ٹنڈوں (ہتھ کٹوں) کا ملک بنا دوں؟ اس کا دوسرا مطلب اس کے سوا کیا تھا کہ پورا پاکستان ہی گویا چوری کے جرم میں ملوث رہتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر شرعی سزائیں نافذ ہو جائیں تو سب سے پہلے ہمارے ان حکمرانوں ہی کے ہاتھ کٹیں گے اور انھی کی پیٹھیں کوڑوں کی ضربوں سے نشان آلود ہو جائیں گی جن کی وجوہات ہم سب کو معلوم ہیں۔

## نہ اغوا نہ کوئی بھتے کی واردات

ہم نے سعودیہ میں نہ کبھی اغوا برائے تاوان کی واردات کا ذکر سنا، نہ کبھی بھتے وصول کرنے کی خبریں پڑھیں، نہ لسانی تعصب کے جوش میں مخالفین کی دکانیں جلتی ہوئی دیکھیں اور نہ کبھی کسی ویران علاقے میں بوری بند لاشیں نظر سے گزریں۔ سعودی عرب بھی ایک اسلامی ملک ہے اور پاکستان کو بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان کہا جاتا ہے لیکن وہاں ہر طرف سکون ہی سکون ہے، محبت کے زمزمے بہہ رہے ہیں اور صفائی ستھرائی کے اعلیٰ معیار قائم ہیں لیکن اِدھر پاکستان میں ڈاکے، قتل اور بھتے ہیں، نفرتوں کی آگ لوگوں کے ریشے ریشے میں لپک رہی ہے اور غلاظت و تعفن کی بدترین سدا بہار کیفیت موجود رہتی ہے۔ آخر کیوں؟ دونوں اسلامی ممالک میں زمین و آسمان کا اتنا فرق کیوں پایا جاتا ہے؟ اس کی وجہ وہاں کے حکمرانوں کا مذہب کے ساتھ اخلاص، قانون کا بلا تخصیص نفاذ اور عوام کے ساتھ ان کی سنجیدگی ہے۔

## کتوں سے پاک شہر

سعودی عرب کی حکومتوں نے ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ مملکت کے تمام بڑے شہروں کو کتوں سے پاک کر دیا ہے۔ آپ کو وہاں کسی بھی بڑے شہر میں کوئی کتا نظر نہیں آئے گا۔ ہمیں بھی کئی دنوں کے بعد جبکہ ہم بذریعہ بس ایک دیہات سے گزر رہے تھے، تب جا کر کہیں کتے کے بھونکنے کی آواز آئی جس پر ہمیں بہت ہی اچنبھا ہوا۔ پتا لگا کہ سعودی حکومت نے اپنے شہروں کو "کتوں سے پاک" بنا دیا ہے۔ اس اقدام سے وہاں کے شہری جراثیم اور کتوں کے کاٹنے کی وارداتوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے ہیں۔ سعودیہ میں ہمارا قیام اٹھارہ دن کا رہا لیکن ہمیں وہاں کہیں غلاظت یا مٹی نظر نہیں آئی۔ وجہ یہ تھی کہ حکام نے کچی مٹی کہیں باقی رہنے نہیں دی بلکہ ہر فٹ پاتھ، بیکار

زمین اور پلوں کے نیچے کی زمین کو پختہ اور سیمنٹ کی ٹائلوں والا کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے وہاں تین چار دن پیدل چلنے کے باوجود چپل اور جوتے گندے نہیں ہوتے۔ نیز دیکھنے میں بھی شہر آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔ ہم نے وہاں پرانے کرنسی نوٹ بھی دیکھے جو زیر استعمال تھے مگر مجال ہے کہ وہ کہیں سے گندے اور مُڑے تُڑے نظر آئیں۔ تھے تو وہ پرانے نوٹ مگر ان سے ہمیں گھن نہیں آتی تھی۔ اس کے برعکس ہماری حکومتوں کی نااہلی کا حال یہ ہے کہ ۶۵ سالوں میں نہ تو آج تک ہمارے شہر اور گلیاں کچی مٹی سے آزاد ہو سکیں، نہ کتوں سے ہمارا کوئی علاقہ پاک ہو سکا (بلکہ ہر ہفتے کتوں کی تعداد مزید ہی بڑھ جاتی ہے) اور نہ ہمارے کرنسی نوٹوں کے صاف ستھرے کیے جانے کی طرف کسی حاکم کی نظر گئی ہے۔ حالانکہ یہ سارے کام بہت چھوٹے پیمانے کے ہیں جن کے لیے نہ تو بہت بڑی ٹیم کی ضرورت ہے، نہ کوئی آئینی ترمیم درکار ہے اور نہ کسی ''نیب'' کے ادارے کی ضرورت لاحق ہے۔ بس ایک دو سخت احکام کا اجرا اور پھر ان کے مستقل نفاذ ہی میں سارا حل پوشیدہ ہے۔ پھر یہاں بھی ان معاملوں میں تو کم از کم سعودی عرب کی مماثلت ہونے لگے گی۔ اگر ہمارے وزرا اتنے معمولی سے اقدامات کا نفاذ بھی نہیں کر سکتے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نہ تو ان کے اندر کوئی سنجیدگی پائی جاتی ہے، نہ ان کے دلوں میں عوام کا کوئی درد ہے اور نہ ان کے دماغ پاکستان سے کوئی محبت رکھتے ہیں۔

## ناشتے پر ۱۶/ چیزیں

سعودی عرب میں ہم اپنے جس دوست اور بھائی کے گھر ٹھہرے، ہر ناشتے اور کھانے پر ان کے ہاں وافر اشیائے تواضع موجود ہوتی تھیں۔ ہمیں کہا جاتا تھا کہ یہ لیجیے جوس، دہی، لسی، جام، پنیر، مکھن، شہد، بالائی، چاول، پراٹھا، سبزی، چکن، کولڈ ڈرنک، کسٹرڈ، روسی سلاد اور عربی سلاد وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاں بلا مبالغہ ۱۵۔۱۶ اشیائے خورونوش ہر کھانے پر ایک ساتھ موجود ہوتی تھیں۔ اس سے قبل جب ہم ۱۹۹۹ء میں دبئی گئے تھے، تب بھی اپنے تحریکی ساتھی کے گھر پر ہر وقت اتنی ہی اشیا موجود ہوا کرتی تھیں۔ اس پر ہم نے موازنہ کیا کہ اتنی عیاشی یہاں تقریباً ہر پاکستانی کو دستیاب ہے جو اللہ کا ایک بہت بڑا انعام ہے جبکہ پاکستان میں غربت کے باعث ہمارے ہاں عام متوسط خاندان کو بھی دودھ اور چینی پوری طرح میسر نہیں ہے تو وہ بھلا ۱۵۔۱۶ اشیا کے بیک وقت استفادے کے بارے میں کس طرح تصور کر سکتا ہے؟ اسی طرح ہم نے وہاں گزشتہ دس پندرہ سالوں سے موجود بیشتر پاکستانیوں کے ہاں ''پراڈو'' قسم کی ایک جیپ اور ایک بڑی کار ضرور استعمال میں دیکھی۔ سعودی کرنسی کی قوتِ خرید بہت زیادہ ہے جبکہ پاکستانی کرنسی کی قوتِ خرید دیکھ کر دل رونے لگتا ہے۔ اس وقت تقریباً ۲۳/ پاکستانی روپے خرچ کریں تب جا کر محض ایک ریال ہاتھ آتا ہے۔ کوئی تماشا سا تماشا ہے!!

## حج کے لیے کوٹے سے کم درخواستوں کی وجہ

حاجیوں اور زائرین سے بس، ٹیکسی، ہوٹل، سر مونڈنے اور قربانی کرانے والے بہت بھاری رقمیں وصول کرتے ہیں جو زائرین کے لیے خاصی پریشانی کا سبب ہے کیونکہ وہ بڑی مشکل سے پیسے بچا کر یہاں آتے ہیں۔ ان کاروباریوں کے نزدیک یہ ایام کمانے کے ہیں، خواہ زائرین انھیں برا بھلا ہی کیوں نہ کہیں۔ چھوٹے اور اوسط درجے کے ہوٹلوں کو یکا یک توڑ کر چھ اور سات ستارہ کثیر منزلہ ہوٹلوں میں تبدیل کرنا تاکہ حاجیوں اور زائرین سے قیام کے بھاری کرائے وصول کیے جائیں، ایک خاصا تشویشناک امر ہے۔ آج مکے اور مدینے میں جا کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فی زمانہ ہوٹل سازی ہی اصل کاروبار بن گیا ہے۔ اسی طرح ایئر لائنز کے کرائے بھی ہوش اڑا دینے والے بنتے جا رہے ہیں جس کے ساتھ شرحِ مبادلہ میں تیزی سے اضافہ بھی بڑی مشکلات کا سبب بن رہا ہے۔ موجودہ مہنگائی اور کاروباری صورتِ حال دیکھ کر



اندازہ ہو رہا ہے کہ مستقبل قریب میں دنیا کے متوسط طبقوں کے لیے حج کرنا تو درکنار ''چھوٹا حج'' یعنی عمرہ کرنا بھی ان کے بس سے باہر کر دیا جائے گا۔ اس کی ایک واضح مثال اس سال حج کے لئے کوٹے سے بھی کم درخواستیں موصول ہونے کی ہے۔ گزشتہ سال تک لاتعداد اضافی درخواستوں کے باعث وزارتِ حج کے حکام کو قرعہ اندازی کرنی پڑتی تھی۔ اس وقت حج کے اخراجات فی فرد تقریباً ۳/ لاکھ روپے جبکہ عمرے کے اخراجات فی فرد تقریباً ۸۰/ ہزار روپے تک رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد لوگ حج کے بجائے محض عمرہ کرنے ہی پر اکتفا کیا کریں گے۔ صرف طبقۂ امراء ہی کے افراد اس فرض و نفل سے استفادہ کر سکیں گے جو پاکستانی و سعودی حکومتوں کے لئے خاصا توجہ طلب پہلو ہونا چاہیے۔

## کفیل کے رحم و کرم پر

عرب ممالک میں عموماً اور سعودی عرب میں خصوصاً آج جو کچھ بھی ترقی کا دور دورہ ہے اور وہاں کے ریگستان آج جھلملاتے ہوئے عظیم الشان پلازا اور مال بنے ہوئے ہیں تو اس میں سو فی صد حصہ ان لاکھوں غیر ملکی کارکنوں کا ہے جو اپنے گھر بار چھوڑ کر یہاں عرصہ دراز سے مقیم ہیں۔ اگر یہ غیر ملکی افرادی قوت عرب ممالک میں نہ آتی تو شاید عرب ممالک آج اکیسویں صدی میں بھی صحرا و پہاڑ سے زیادہ کچھ نہ ہوتے۔ پچیس یا تیس سالوں سے یہاں محنت کرنے کے باوجود محنت کشوں کے لیے مخصوص ''اقامہ'' ہے شہریت نہیں۔ کتنا اچھا ہوتا کہ ان کی طویل خدمات مدنظر رکھتے ہوئے ایک خاص مدت کے بعد انھیں بھی عرب شہریت عطا کر دی جاتی جیسا کہ مغربی ممالک میں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ تیس تیس سالوں کے بعد بھی یہ مظلوم پیشہ ور مسلم افراد محض ''اجنبی'' ہی کہلائے جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ تو انسانی اور اسلامی دونوں بنیادوں پر ہی توجہ کا مستحق ہے۔

سعودی عرب میں ملازمت کا ایک ہی آئینی طریقہ کہ فرد کلی طور پر کفیل کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ چاہے وعدہ شدہ سہولتوں اور مقام سے کچھ برعکس کر دے۔ اس نے اگر کفیل سے تکرار کی کوشش کی یا ادھر ادھر بھاگنے کی نیت کی، تو یا تو اسے سیدھے سیدھے زندان میں جانا پڑے گا یا اسے اسی وقت ملک بدر (خروج) کر دیا جائے گا۔

## سفاک جمہوریت سے مہربان ملوکیت بہتر

سعودی عرب کی لاجواب خوشحالی، دنیا جہان کی نعمتوں کی موجودگی، ارزانی و فراوانی، خوشگوار و پُرسکون ماحول، امن و امان کی مثالی صورت حال اور ہر ایک فرد کو تمام حقوق کی فراہمی کے بعد پھر کون سا سعودی شہری مطالبہ کرے گا کہ اسے اپنے ملک کے لیے ایک پارلیمنٹ چاہیے، انتخابات کا تسلسل چاہیے اور حکومت کے مقابلے میں ایک طاقتور حزبِ اختلاف چاہیے؟ انھیں جب موجودہ نظام ہی سے وہ سب کچھ میسر ہے جو اچھی اچھی جمہوریتیں بھی اپنے عوام کو نہیں دے سکتیں تو پھر کیسی خواہ مخواہ کی جمہوریت اور کہاں کی بے درد سیاسی جماعتیں؟ اگر عرب ممالک میں بھی یہی روایتی ولایتی جمہوریت رواج پا جائے جس میں خون خرابے، ضمیروں کی خرید و فروخت، عوام کا استحصال اور کرفیو اور مارشل لاء ہو اور جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے تو پھر ان ممالک کا بھی وہی حشر ہو گا جو پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور افریقی ممالک کا ہوا۔ اس سفاک جمہوریت سے تو پھر یہ مہربان ملوکیت ہی بہتر ہے۔

**رضی الدین سید**

رضی الدین سید کراچی میں رہتے اور وہاں کے حالات و واقعات کے علاوہ بھی کافی سوچتے اور پڑھتے ہیں۔ سفر میں ہوں تو آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں۔ لکھنے پر آئیں تو یہودیت، اُن کے ادارے اور منصوبے ان کے محبوب موضوعات ہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اپنی ہمت و ذہانت سے مسائل اور محرومیوں کا شکار
براعظم افریقہ کی تقدیر
بدل رہی ہیں

# ۲۳ انقلابی افریقی خواتین

جنھیں ناممکن کو ممکن کر دکھانا آتا ہے

عالیہ فاطمہ

## بیس

سالہ گیپا پٹینا زمبابوے یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ ایک دن اس نے ساتھی طلبہ و طالبات کے ساتھ یونیورسٹی انتظامیہ کے خلاف جلوس نکالا جس نے ان کے کچھ مطالبے پورے نہیں کیے تھے۔ جلوس کے سبھی شرکا پُر امن تھے لیکن اچانک ان پر مخالف گروپ کے لڑکوں نے حملہ کر دیا۔ وہ ڈنڈوں سے لیس تھے۔ ایک ڈنڈا پٹینا کے سر پر لگا اور اسے خونم خون کر گیا۔

اس حادثے سے پٹینا کے سارے خواب بھی کرچی کرچی ہو گئے۔ پہلے وہ یہی سمجھتی تھی کہ یونیورسٹی میں سبھی لڑکے تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں، لہٰذا وہ خواتین کی عزت و احترام کرتے ہیں لیکن جلوس میں لڑکوں نے لڑکیوں کے ساتھ بڑا بُرا سلوک کیا۔ اس واقعے نے پٹینا کو یہ احساس دلایا کہ یونیورسٹی میں یہ حال ہے تو مرد کارخانوں، گھروں اور کھیتوں میں خواتین کے ساتھ مزید ناروا رویہ رکھتے ہوں گے۔

براعظم افریقہ میں خواتین کئی مسائل کا شکار ہیں۔ انھیں اٹھتے بیٹھتے عدم مساوات، تعصب، جہالت اور مصائب کا سامنا ہے۔ افریقہ میں ویسے ہی دنیا کے غریب ترین باشندے بستے ہیں لیکن تکلیف دہ امر یہ ہے کہ عورتیں، مردوں سے زیادہ غریب ہیں اور وہی غربت کا عذاب بھی سہتی ہیں۔ انھیں روزگار کے مواقع بھی کم میسر ہیں۔ مائیکرو فنانس اور چھوٹا کاروبار بھی انھیں پیروں پہ کھڑا ہونے میں خاطر خواہ مدد نہیں دے سکا۔

یہ سچ ہے کہ افریقہ میں غریب عورت ہونا خطرناک بات ہے۔ چونکہ عورتوں میں جہالت کا دور دورہ ہے، اس لیے وہ حفظانِ صحت کے اصولوں سے واقفیت نہیں رکھتیں پھر گھر ہو یا کام کی جگہ، عورت کو کسی نہ کسی شکل میں تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سرمائے اور علم سے محروم یہ عورتیں قیادت سنبھالنے اور سیاست میں آنے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔

### اُمید کی کرن

لیکن اب حالات رفتہ رفتہ نیا رُخ لے رہے ہیں۔ سیاست، صنعت و تجارت، تعلیم، کھیل، غرض ہر شعبے میں خواتین اوپر آ رہی ہیں۔ یہ خواتین جوش و جذبے سے لبریز ہیں اور اپنی کوششوں سے براعظم کے تمام مرد و زن کی تقدیر بدلنا چاہتی ہیں۔ انھیں ناممکن کو ممکن کر دکھانا آتا ہے اور وہ اپنی قسمت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہیں۔

ذیل میں آپ ایسی ہی باصلاحیت، محنتی اور جفاکش خواتین کے متعلق پڑھیں گے۔ یہ وہ افریقی خواتین ہیں جو نمایاں ہو کر سامنے آئیں ورنہ ایک عام عورت اپنے دائرے میں رہتے ہوئے ابھی افریقہ کو تبدیل کرنے میں بھرپور ساتھ نہیں دے پا رہی۔ عام عورتیں محنت کرتیں، ٹیکس ایمان داری سے ادا کرتیں اور چھوٹی چھوٹی قربانیاں دیتی ہیں تاکہ اپنے بچوں کو اسکول بھیج سکیں مگر بڑی سوچ سے محروم ہیں۔

آزاد ذرائع ابلاغ کی بدولت ایک تبدیلی یہ آئی ہے کہ اب عام افریقی خواتین اپنے حقوق سے آگاہ ہو رہی ہیں۔ لہٰذا انتخابات میں وہ اسی امیدوار کو ووٹ دیتی ہیں جو پارلیمنٹ میں ان کے حقوق کی آواز بلند کر سکے۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک اچھے مستقبل کے خواب دیکھنے لگی ہیں تاکہ ان کے بچے خوشحال زندگی گزار سکیں۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ افریقی حکومتیں اپنی ذمے داری ادا کریں۔ مثلاً ایسے قوانین تشکیل دیں کہ ظالم مرد خواتین کا استحصال نہ کر سکیں، بجٹ کا بڑا حصہ غریبوں کی فلاح و بہبود کے لیے مخصوص کریں تاکہ قومی دولت سے سبھی یکساں طور پر مستفید ہو سکیں۔ نیز معاشرتی رویے بدلنے کے اقدامات کریں تاکہ خواتین کو مردوں سے کمتر نہ سمجھا جائے۔ آئیے! اب افریقہ کی جانی پہچانی خواتین سے ملیے جو اپنے وجود سے دوسری عورتوں کو بھی ہمت و توانائی بخش رہی ہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## جو خبروں میں ہیں

### لیمہا گبوی..... لائبیریا

لائبیریا کی ۳۹ سالہ معاشرتی کارکن کو حال ہی میں نوبل امن انعام ملا ہے۔ لائبیریا دنیا کے غریب ترین ممالک میں سے ایک ہے اور وہاں اقتدار حاصل کرنے کی خاطر ماضی میں بارسوخ گروہوں کے مابین لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ گبوی نے جب شعور پایا تب بھی ملک میں خانہ جنگی جاری تھی۔ اس نے پھر ٹروما کونسلر یعنی صدمے سے بے حال لوگوں کو ذہنی سہارا دینے والے کارکن کی حیثیت سے تربیت پائی۔

دورانِ خانہ جنگی گبوی نے بچوں کو قتل ہوتے دیکھا اور ان خواتین سے بھی ملی جن کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ انسانیت پر ٹوٹنے والے مظالم نے اس کا دل زخم زخم کردیا لیکن تبھی اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ معاشرے میں امن لانے کے لیے عورتوں خصوصاً ماؤں کو میدان عمل میں اترنا پڑے گا۔

چنانچہ ۲۰۰۲ء میں لیمہا گبوی نے ایک معاشرتی تنظیم، وومن آف لائبیریا ماس فار پیس کی بنیاد رکھی۔ گبوی نے پھر احتجاج کا انوکھا انداز اپنایا۔ وہ اپنی چند ساتھیوں کے ہمراہ دارالحکومت، مونرویا کی سب سے پُرہجوم جگہ، مچھلی منڈی پہنچیں اور وہاں دعائیہ گیت گانے لگیں..... ایسے نغمے جو ملک میں امن و محبت کے پھول کھلا دیں۔ مرد وزن نے شروع میں تو بڑے تعجب سے ان خواتین کو دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ محبت کی جوت ان میں بھی جل اٹھی۔

امن کی متلاشی اس عوامی تنظیم میں پھر عیسائی اور مسلمان خواتین یکجا ہوگئیں۔ انھوں نے تمام اختلافات بھلا کر عزم کیا کہ وہ خانہ جنگی کا خاتمہ کر کے رہیں گی۔ تنظیم کی قوت پھر اتنی بڑھی کہ وہ متحارب گروہوں کی طاقت پر غالب آگئی۔ گویا محبت نے نفرت کو شکست دے ڈالی۔ اب لائبیرین والدین نے جنگی سرداروں پر زور ڈالا کہ وہ معاہدہ امن کر کے خانہ جنگی کا خاتمہ کریں۔ سردار یہ دباؤ برداشت نہ کر سکے اور یوں ۲۰۰۳ء میں خانہ جنگی انجام کو پہنچی۔ اس کے بعد انتخابات ہوئے جن میں ایک خاتون اور دوسری امن نوبل انعام یافتہ ایلن سرلیف منتخب ہوئیں۔

جب لیمہا گبوی کو نوبل انعام ملا تو انھوں نے کہا ''اب ثابت ہوگیا کہ خواتین..... دنیا کی آدھی آبادی کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی ان کی زبردست صلاحیتوں سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔''

### میری کیٹنی..... کینیا

کینیا نے ماضی میں کئی بڑے ایتھلیٹ (دوڑ میں حصہ لینے والے) پیدا کیے ہیں اور اب بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ اس کے نامور ایتھلیٹوں میں ۲۹ سالہ میری کیٹنی سرفہرست ہے۔ طویل فاصلے کی دوڑ میں حصہ لینے والی اس ایتھلیٹ کے متعلق ماہرین کا کہنا ہے کہ اولمپکس ۲۰۱۲ء میں وہی طلائی تمغہ جیتے گی۔ میری اپنے شعبے میں نئے ریکارڈ بنا کر اپنا اور ملک و قوم کا نام روشن کرنا چاہتی ہے۔

### غزالہ بن عمر..... مراکش

سال رواں کے آغاز میں جب ''عرب بہار'' کا آغاز ہوا تو مراکش میں جمہوریت پسند تنظیموں نے بادشاہت کے خلاف مظاہرے کیے۔ یہ طویل عرصہ سے چلی آرہی گھٹن میں ہوا چلنے کی نوید تھی۔ ۲۹ سالہ غزالہ اسی جمہوری تحریک کے دوران نمایاں ہوئی۔ اس نے خصوصاً ٹیلی ویژن میں شاہ پرست سیاست دانوں کے سامنے جمہوریت کی زبردست وکالت کی اور جوشیلے انداز میں آمروں کے پرخچے اُڑا دیئے۔ وہ اب بھی ہر فورم پر عوام کی آواز دلیری سے بلند کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے: ''بادشاہ ہو یا آمر، وہ کبھی عوام کے حقوق نہیں دبا سکتا۔''



### مونا سیف..... مصر

مصر کے آمر، حسنی مبارک کا تختہ الٹنے میں انٹرنیٹ نے اہم کردار ادا کیا کیونکہ مظاہرین بذریعہ سوشل میڈیا سائنس باہم رابطہ کر کے خصوصاً تحریر چوک میں جلسے جلوس نکالتے تھے۔ مظاہرین کو متحد و منظم کرنے میں ۲۵ سالہ بلاگر، مونا سیف پیش پیش رہی۔ جیسے ہی فروری میں فوجی حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے، مونا نے تحریر چوک میں ڈیرہ جمالیا اور وہیں اپنی پچیسویں سالگرہ بھی منائی۔

مونا سیاسی کارکن، احمد سیف کی دختر ہیں جنھوں نے مبارک حکومت کے خلاف ماضی میں کئی مظاہرے ترتیب دیئے تھے۔ والدہ لیلی قاہرہ یونیورسٹی میں ریاضی کی پروفیسر ہیں۔ مونا نے دورانِ انقلاب ''تحریر ڈائیلوگ'' کے نام سے ایک بلاگ لکھا۔ اس میں مونا نے بڑی بہادری سے ظلم و ستم کا شکار انقلابیوں کی داستانیں بیان کیں۔ اس بلاگ کو پوری دنیا میں شہرت ملی۔ مونا آج مصری فوج کے سامنے ڈٹی ہوئی ہے جو حقیقتاً اقتدار کی مالک ہے۔ اس کی استقامت دیکھ کر دوسرے جمہوریت پسند بھی ہمت پکڑتے ہیں۔

## جو اثر و رسوخ رکھتی ہیں

### نگوزی اکونجو آئیولا..... نائیجیریا

افریقہ کے سب سے بڑے ملک، نائیجیریا کی طاقتور ترین خاتون..... ایسی خاتون جس کی پاکستان کو بھی اشد ضرورت ہے۔ نگوزی سابق صدر اولیگن اوباسانجو کے دورِ حکومت میں وزیر خزانہ بنیں تو نائیجیریا منی لانڈرنگ کرنے والے ممالک میں شامل تھا۔ پھر اسی پر ۳۰ ارب ڈالر کا قرضہ چڑھا ہوا تھا۔ وزیر خزانہ بنتے ہی نگوزی نے محض تین سال میں ایسا کرشمہ دکھایا کہ ملک پر سے ۲۰ ارب ڈالر کے قرضے ختم ہو گئے۔ نیز وہ منی لانڈرنگ والی فہرست سے بھی نکل آیا۔

نگوزی اکونجو پھر عالمی بنک چلی گئیں اور وہاں بھی اپنی محنت، لیاقت اور ذہانت سے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے۔ جلد ہی وہ بینک کی دوسری بڑی شخصیت بن گئیں۔ اب حال ہی میں نائیجیریا کی نئی حکومت نے انھیں دوبارہ وزیر خزانہ بنایا ہے۔ وہ نئی امنگیں لے کر واپس وطن پہنچی ہیں اور سیاسی بکھیڑوں سے الگ ہو کر کام کرنا چاہتی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے: ''ایک درخت کو جنگل نہیں کہا جا سکتا۔'' لیکن نگوزی کی خداداد صلاحیتوں کے معترف کہتے ہیں: ''انھوں نے کرشمہ کر دکھایا تھا، اب بھی دکھائیں گی۔'' حقیقتاً بیش بہا صلاحیتوں کی مالک ایسی خواتین کسی بھی ملک کا سرمایہ ہیں۔

### گل مارکس..... جنوبی افریقہ

جنوبی افریقہ کے سرکاری بینک، ساؤتھ افریقن ریزرو بنک کی گورنر ہیں۔ یہ بینک سونے اور زرمبادلہ کی شکل میں ۵۰ ارب ڈالر (چار کھرب چالیس ارب روپے) کے اثاثہ جات کا مالک ہے۔ گل مارکس بڑی کامیابی سے بنک کے معاملات چلا رہی ہیں اور اسے ایک مستحکم مالیاتی ادارہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ بنک ملک کی تعمیر و ترقی میں خوب حصہ لے رہا ہے۔

### چیمیندا نگوزی اڈیشی..... نائیجیریا

نائیجیریا کی مقبول مصنفہ، ۲۹ سالہ اڈیشی سب سے کم عمر ناول نگار ہے جس نے ۲۰۰۶ء میں اپنے ناول، ہاف آف اے یلو سن (Half of a Yollow Sun) پر مشہور ادبی انعام اورنج پرائز جیتا۔ اڈیشی کے ناولوں اور افسانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ افریقہ کے متعلق مغربی تصورات کو نشانہ بناتی ہیں..... وہ تصورات جن میں افریقہ کو پس ماندہ، جاہل اور وحشی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## کیرولین موٹوکو..... کینیا

ایک زمانے میں ریڈیو کے فنکار وصداکار پاکستان میں بہت مشہور ہوا کرتے اور عوام پر خاصا اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ چونکہ کینیا میں ریڈیو آج بھی مقبول ترین میڈیا ہے، لہٰذا وہاں اسی سے متعلق فنکار ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں کیرولین ''ملکہ ریڈیو'' کہلاتی ہے۔

کیرولین ایک پروگرام ''دی بگ بریک فاسٹ شو'' کی پیش کار ہے۔ وہ پروگرام میں ضرورت مندوں کو مشورے دیتی، خبروں پر کھٹے میٹھے تبصرے کرتی اور سننے والوں کو باشعور بناتی ہے۔ اپنی ذہانت اور پُرکشش ہنسی کے باعث بھی سامعین کو پسند ہے۔ کیرولین کے پرستار اُسے کینیائی عورت کے لیے ''اوّل ماڈل'' قرار دیتے ہیں۔ کیرولین کا فلسفۂ حیات سادہ مگر جاذبِ نظر ہے:

''میں اپنا ہر کام کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہوں۔ میں صبح چار بجے اس لیے نہیں اٹھتی کہ شکست کھا جاؤں۔''

## پروفیسر رشیحہ ال رعدی..... مصر

پروفیسر صاحبہ قاہرہ یونیورسٹی میں علمِ مامونیات (Immunology) کی استاد ہیں۔ علمِ مامونیت میں امراض سے محفوظ رکھنے والے طریقوں پر تحقیق کی جاتی ہے اور پروفیسر رشیحہ اسی سلسلے میں بین الاقوامی شہرت رکھتی ہیں۔ آپ نے ۲۰۰۹ء میں ''بل ہرزیا'' (Bilharzia) کی ویکسین تیار کی۔ یہ چھوتی مرض ترقی یافتہ ممالک میں ہر سال بیس کروڑ مرد وزن کو نشانہ بناتا ہے۔

ویکسین کی ایجاد پر آپ کو ۲۰۱۰ء میں خواتین کے لیے ممتاز فرانسیسی سائنسی اعزاز ''ایل اوریل'' (L'Oreal) سے نوازا گیا۔ پروفیسر صاحبہ کا کہنا ہے:

''زندگی کے تجربات نے مجھے بتایا ہے کہ خواتین مردوں کی نسبت کم مسابقتی جذبہ رکھتی اور اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں، چنانچہ وہ جلد سائنسی مسئلہ حل کر لیتی ہیں۔''

افریقہ کو آج زیادہ سے زیادہ خواتین سائنس دانوں کی ضرورت ہے اور عورتوں کے لئے پروفیسر رشیحہ مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

## اشا روز میگیرو..... تنزانیہ

عالمی سطح پر تنزانیہ کا سب سے مشہور چہرہ۔ ۵۵ سالہ اشا نے تنزانیہ کی جدوجہد آزادی میں سرگرم حصہ لیا۔ جب ملک آزاد ہوا، تو پہلی وزیر خارجہ مقرر ہوئیں۔ بعدازاں وکالت کی تعلیم پائی اور معاشرتی کارکن بن کر خواتین میں صحت وتعلیم کی سہولیات عام کرنے میں متہمک رہیں۔ اس وقت وہ اقوامِ متحدہ کی ڈپٹی سیکرٹری جنرل اور ملک میں سب سے اعلیٰ عہدہ رکھنے والی خاتون ہیں۔

## جو اقتدار میں ہیں

## ایلن جانسن سریلف..... لائبیریا

اپنے ملک کی ''خاتونِ آہن'' جن کی خواہش ہے کہ افریقہ میں خواتین سیاست میں حصہ لیں اور اپنے اپنے ملک کی تعمیر وترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ ۷۳ سالہ سریلف ۲۰۰۵ء کے صدارتی انتخابات میں لائبیریا کی صدر منتخب ہوئیں۔ آپ یہ منصب بلند پانے والی پہلی افریقی خاتون ہیں۔ اس سے قبل ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۰ء ملک کی وزیرِ خزانہ رہیں۔ ۱۹۸۰ء میں بغاوت ہوئی تو بیرونِ ملک چلی گئیں اور مختلف بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے منسلک ہوئیں۔

صدر سریلف نے اپنے چھ سالہ دور میں خاصے ترقیاتی کام کرائے۔ سڑکیں، ہسپتال اور اسکول تعمیر کرائے۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں سے ۱۶ ارب کے آرڈر لیے۔ تاہم ملک میں بیروزگاری کا دور دورہ ہے اور بیشتر آبادی غربت کے پنجوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ لیکن صدر سریلف کا دعویٰ ہے کہ اگر قوم نے انھیں دوبارہ منتخب کیا تو وہ اگلے چھ برس میں تمام مسائل پر قابو پالیں گی۔



صدر سریلف کو لیمہا گبوی اور یمن کی توکل کرمان کے ساتھ ۲۰۱۱ء کا نوبل امن انعام ملا ہے۔ انھوں نے نوبل انعام ملنے پر صحافیوں کو بتایا: ''پچھلے نو برس سے لائبیریا میں امن وامان ہے۔ اس کامیابی کا سہرا قوم کے ہر فرد خصوصاً خواتین کے سر بندھتا ہے۔ انھوں نے تمام تر مشکلات کے باوجود امن کا پرچم بلند رکھا۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقت میں دیگر افریقی ممالک میں بھی خواتین صدر اور وزیراعظم بنیں گی۔''

## مریم قدیمہ مدبی..... مالی

۶۳ سالہ مریم اعلیٰ سرکاری افسر ہیں۔ انھوں نے پچھلے چالیس برس کے دوران مختلف عہدوں پر فائز رہ کر ملک وقوم کی خدمت انجام دی۔ اس سال ماہ اپریل میں صدر احمد وطورے نے انھیں مالی کا وزیراعظم مقرر کیا۔ وہ اس عہدے پر فائز ہونے والی ملک کی پہلی خاتون ہیں۔

## جوائس موجورو..... زمبابوے

ملک کی سب سے طاقتور خاتون اور نائب صدر ہیں۔ آپ کو بیمار صدر رابرٹ موگابے کی جانشین سمجھا جاتا ہے۔ شوہر ریٹائر فوجی جرنیل ہیں۔ تاہم موگابے کے بعد حکومت سنبھالنے میں انھیں سخت اپوزیشن کا سامنا کرنا پڑے گا۔

## جوائس بام فورڈیڈو..... گھانا

سپریم کورٹ کی سابق جج جو ۲۰۰۹ء میں پارلیمنٹ کی سپیکر منتخب ہوئیں۔ آپ مغربی افریقہ میں یہ عہدہ پانے والی پہلی خاتون ہیں۔ سچائی اور اصولوں پر چلنے والی خاتون ہیں۔ ابھی ماہ مئی میں جب حکمران جماعت کے ارکان نے ناروا رویّے کا مظاہرہ کیا تو آپ پارلیمنٹ سے واک آؤٹ کر گئی تھیں۔

## حنا ٹیٹی..... گھانا

وزیرِ تجارت جو ماضی میں وکیل تھیں۔ انھوں نے وکالت کی صلاحیتیں آزمائیں اور چینیوں سے ملکی المونیم کی صنعت میں سرمایہ کاری کروالی۔ ان کی کامیابیوں کا سفر جاری رہا تو ایک دن گھانا کی حاکم بھی بن سکتی ہیں۔

## ماتھا کاروا..... کینیا

ایک دیانت دار اور بہادر سیاست داں جو ''کینیا کا ضمیر'' کہلاتی ہیں۔ ۵۳ سالہ مارتھا پیشے کے لحاظ سے وکیل مگر پچھلے بیس سال سے سیاست میں ہیں۔ ان کا مشن قومی سیاست اور حکومت کو کرپشن سے پاک کرنا ہے۔ فی الوقت رکن پارلیمنٹ ہیں۔ آج کل سوشل میڈیا نیٹ ورکس اور بیرونِ ملک مقیم کینیوں کے ذریعے مہم چلا رہی ہیں کہ مقامی سیاسی جماعت، نیشنل رین بو کولیشن، انھیں اگلے سال صدارتی انتخابات میں اپنا امیدوار نامزد کردے۔

مارتھا سمجھتی ہیں کہ کینیا کی صنعت اسی وقت مضبوط ہوگی جب تمام لوگ اپنے حصے کا ٹیکس ادا کریں۔ ۲۰۰۹ء میں وزیرِ انصاف تھیں۔ جب وزیرِ زراعت پر کرپشن کا الزام لگایا اور حکمران جماعت سے الگ ہوگئیں۔ کینیا کے ان گنے چنے سیاست دانوں میں شامل ہیں جو کرپشن سے پاک ہیں۔ آپ اگلے سال کینیا کی پہلی خاتون صدر بن سکتی ہیں۔

## جو عالمی سطح پر نمایاں ہوئیں

## نوانیتھم پلے..... جنوبی افریقہ

بس ڈرائیور کی صاحب زادی جو آج اقوامِ متحدہ کی ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق ہیں۔ پلے نے ۱۹۷۳ء میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بحیثیت وکیل شہرت پائی جب انھوں نے عدالت عالیہ سے یہ امر تسلیم کرایا کہ سیاسی قیدی اپنے وکلاء سے مل سکتے ہیں۔ اس جیت نے انھیں پورے جنوبی افریقہ میں مشہور کر دیا۔ پھر ۱۹۹۵ء میں صدر نیلسن منڈیلا نے آپ کو جنوبی افریقن ہائی کورٹ کی پہلی سیاہ فام جج مقرر کیا۔

نوا نیتھم ۲۰۰۸ء سے ہائی کمشنر چلی آ رہی ہیں۔ اس سال مشرق وسطی میں ''عرب بہار'' نے جنم لیا تو آپ نے کھل کر عوام کی حمایت کی اور آمرانہ حکومت کو ظلم و ستم کرنے پر لتاڑا۔

## جو ابھر رہی ھیں

### لاوزے حانون......الجزائر

اپنے ملک کی واحد خاتون جنھوں نے الجزائر کے صدارتی انتخابات میں حصہ لیا۔ سیاست داں ہونے کے علاوہ وکیل، سماجی کارکن اور ٹریڈ یونینسٹ ہیں۔ فی الوقت اپوزیشن جماعت، پارٹی ڈیس ٹراویلریس کی سیکرٹری جنرل ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ سیاسی بحث ومباحثے میں بشمول اسلام پسند تمام سیاسی جماعتیں حصہ لیں۔ چاہتی ہیں کہ الجزائر کی تمام خواتین تعلیم یافتہ ہو جائیں۔

### فاطمہ زہرہ منصوری......مراکش

شہر مراکش کی ۳۴ سالہ نوجوان میئر۔ مراکشی تاریخ میں یہ عہدہ پانے والی دوسری خاتون ہیں۔ حزب اختلاف سے تعلق ہے مگر سب کو ساتھ لے کر چلنے کے فلسفے پر یقین رکھتی ہیں۔

## جو مالیات سے متعلق ھیں

### ایلینی گابری مدہین......ایتھوپیا

ماہر معاشیات جو افریقی ممالک کی زرعی منڈیوں میں انقلابی تبدیلیاں لائی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۷۲ء اور ۱۹۸۴ء میں قحط اس لئے آئے کہ ایتھوپیا کے جن علاقوں میں فصل اچھی ہوئی، وہاں سے اناج بھوکے لوگوں تک نہیں پہنچ سکا۔ چناچہ ڈاکٹر ایلینی نے ۲۰۰۸ء میں ایک کمپنی، کموڈیٹی ایکس چینج کی بنیاد رکھی۔ یہ کمپنی کسانوں اور خریداروں کو مل بیٹھنے کا موقع دیتی ہے تاکہ معیار کی بنیاد پر دیانت داری سے سودے ہو سکیں۔ یہ کمپنی اب تک ایک ارب ڈالر (۸۸ ارب روپے) کے سودے کرا چکی۔ ایلینی کہتی ہیں: ''جب کسانوں کو کھلی منڈیوں میں اپنی مصنوعات فروخت کرنے کو موقع ملے تو وہ زیادہ منافع کماتے ہیں۔ یوں وہ زیادہ کھیتی باڑی کریں گے اور ایتھوپیا قحط سے محفوظ ہو جائے گا۔''

### نونکولولیکو نیامبزی ہیٹا......جنوبی افریقہ

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اسٹیل بنانا اور فروخت کرنا صرف مردوں کا کام ہے لیکن یہ مقولہ اب کارآمد نہیں رہا، کم از کم افریقہ میں! آرسیلور متل جنوبی افریقہ براعظم میں سب سے بڑی اسٹیل کمپنی ہے۔ اب اس میں دس ہزار افراد ملازم ہیں اور اس کی سربراہ ایک خاتون، نونکولولیکو ہے جو ''نکو'' کہلاتی ہے۔ اس نے یہ دعوے جھوٹ کر دکھائے کہ ایک عورت اتنی بڑی کمپنی نہیں چلا سکتی۔ وہ کامیاب ہی نہیں بلکہ کمپنی کا منافع دن بدن بڑھ رہا ہے۔

### سلوا ادریسی اخنوچ......مراکش

اپنے ملک کی امیر ترین خواتین میں سے ایک اور گروپ آکسال نامی کمپنی کی سربراہ ہیں۔ یہ کمپنی مراکش میں عام استعمال کی اشیا کے بڑے بڑے اسٹور کھولتی ہے۔ ماہ اکتوبر میں کمپنی نے کاسابلانکا میں ''دی مال'' کھولا۔ یہ افریقہ کا سب سے بڑا شاپنگ سینٹر ہے۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

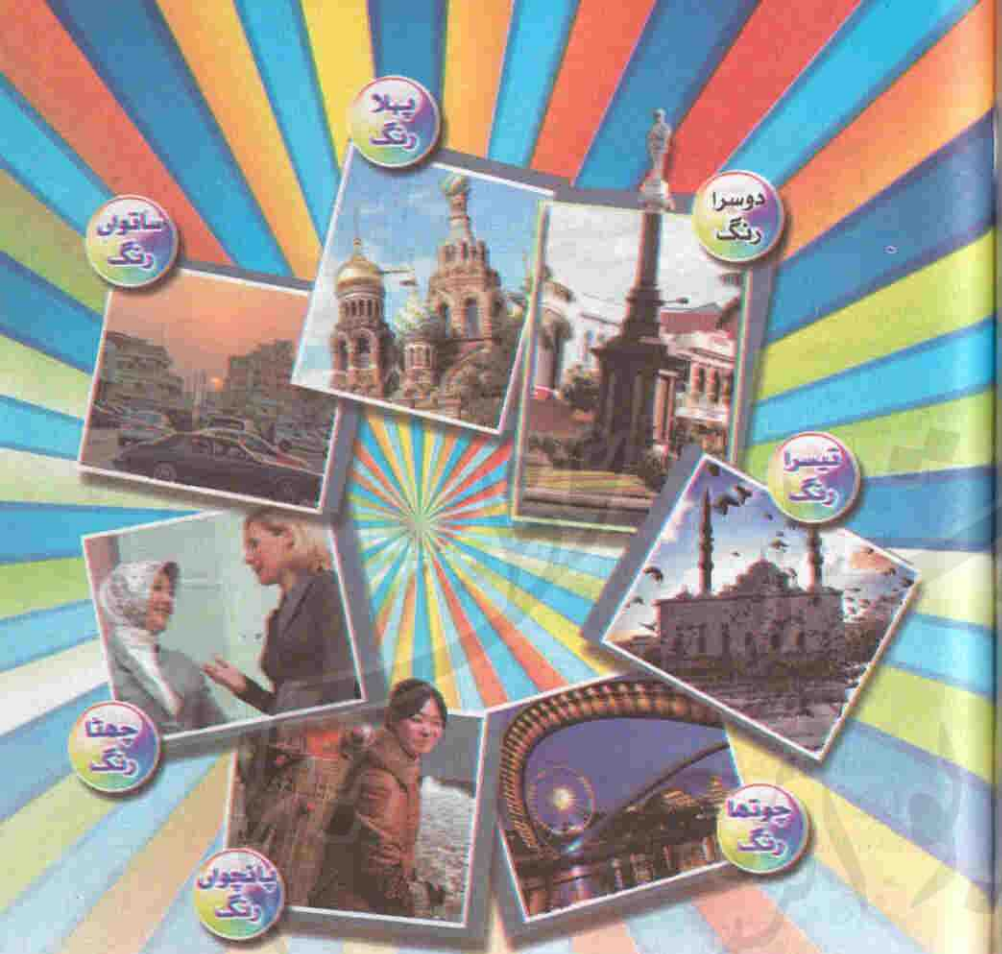




اُردو ڈائجسٹ کا ایک مقبول سلسلہ ست رنگ، سات تحریریں زندگی کی خوبصورتیوں اور حقیقتوں کو مختصر مختصر آپ تک پہنچانے کی یہ کوشش اپنی تازگی، ندرت اور جستجو کے باعث پسند کی جاتی ہے

نوید اسلام صدیقی

# گوشہ ست رنگ

(پہلا رنگ)

## روسی ملوکیت کے جاہ و جلال کا مظہر

# سینٹ پیٹرز برگ

روس کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کے سب سے بڑے لیڈر پیٹر دی گریٹ نے ۱۷۰۳ء میں سمندر کے پہلو میں ایک نیا شہر آباد کیا اور ۱۷۱۲ء میں دارالحکومت وہیں منتقل کر لیا۔ ۱۷۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک روس کا دارالحکومت رہنے والا شہر سینٹ پیٹرز برگ عالیشان محلات، پرشکوہ گرجوں اور وسیع عجائب گھروں کا شہر ہے۔ کمیونسٹ انقلاب کے بعد روس کے گرد آہنی پردے تن گئے اور دنیا کے لئے یہ ملک ایک معما بن گیا، پردے ہٹ گئے تو دنیا نے دیکھا کہ سینٹ پیٹرز برگ روسی ملوکیت کے جاہ و جلال کا مظہر اور قدیم عیسائیت کا مرکز ہے۔ زاروں کی شوکت و حشمت کے مقابلے میں مغربی یورپ کی بادشاہتیں ہیچ تھیں۔ روس کے عظیم فاتح، بلڈر، ریفارمر اور بانی نے شہر کے تابنے سے بنے مجسمے کو دیکھا (جس میں وہ ہوا سے باتیں کرنے والے برق رفتار گھوڑے پر سوار ہے) تو اس کے چہرے پر فخر و انبساط نمایاں تھا کہ اس کی سلطنت کے نمونے اور علامتیں دیکھنے کے لئے دنیا بھر سے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ ٹکٹ خرید کر دیکھنے والی عمارتیں ہی بے شمار ہیں۔ پیٹر اعظم کا تعمیر کردہ ونٹر پیلس، سمر پیلس، بیلوسلسکی، بیلوز وسکی پیلس، سٹرو گانوو پیلس، پیٹر اینڈ پال قلعہ، چرچ آف ریسرکشن آف کرائسٹ، نیول کیتھڈرل، ایساق چرچ، ہمیولنی کیتھڈرل کے علاوہ بادشاہوں، وزراء اور روساء کے زیر استعمال رہنے والے سیکڑوں محلات ہیں۔ محل اور گرجا گھر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بلکہ ایک دوسرے کو کندھا دیتے ہوئے نظر آتے ہیں (یورپ میں صدیوں تک بادشاہت اور پاپائیت ایک دوسرے کو تحفظ دیتے رہے)۔ سیکڑوں کی تعداد میں گرجا گھر اور عجائب گھر ہیں۔ وسطِ ایشیا کے طرزِ تعمیر کی نیلی ٹائلوں کے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گنبد والی مسجد بھی قابلِ دید ہے۔

ونٹر پیلس کے سامنے پیلس چوک میں پہنچے تو ۱۹۰۵ء کا خونی اتوار یاد آ گیا جب امن اور انصاف کی فریاد لے کر آنے والے عوام پر زار کے محافظوں نے فائرنگ کر کے ایک ہزار بے گناہ لوگوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ ان بے گناہ انسانوں کے خون نے ہی انقلاب کی بنیادیں مستحکم کیں۔

ونٹر پیلس کو ایک عظیم الشان (دنیا کے سب سے بڑے) عجائب گھر سیٹ ہرمی ٹیج میں بدل دیا گیا ہے جہاں دنیا کے چوٹی کے سنگ تراشوں، مجسمہ سازوں اور آرٹسٹوں کے فن کے شاہکار لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ Hermitage ایک حیرت کدہ ہے جسے دیکھنے کے لیے کم از کم دو ہفتے درکار ہیں اور ہمارے پاس صرف دو دن تھے۔ ہرمی ٹیج کئی منزلوں پر محیط عمارت کے ۳۵۰/ ہال ہیں جن میں پتھر سے تراشے ہوئے فن پاروں کی تعداد ۱۲۰۰۰/ ہے، پینٹنگز اور ڈرائنگ بھی ہزاروں میں ہیں۔

سیاحوں کا کوئی گروہ مائیکل اینجلو کے تراشے ہوئے مجسمے Crouchingboy کا مشاہدہ کر رہا تھا تو کوئی لیوناردو ڈوونچی کی پینٹنگ کے سامنے کئی گھنٹوں سے فن کی باریکیاں تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ بادشاہوں اور ملکاؤں کی آرام گاہیں آج سیاحوں کی سیرگاہیں ہیں۔ چار پانچ گھنٹوں میں صرف ایک ہال کے فن پارے نہ دیکھے جا سکے مگر تھکاوٹ نے پسپائی پر مجبور کر دیا اور ہم کافی پینے کے لئے کینٹین پر آ گئے۔

شام کو شہر سے باہر واقع سمر پیلس دیکھنے گئے۔ سبز مخملیں گھاس کی چادر اوڑھے وسیع و عریض لان، ہر موڑ پر لگے خوبصورت فوارے، دیوہیکل مجسمے اور ایک ہی طرح کے کٹے ہوئے پتوں اور تراشی ہوئی شاخوں والے پودوں اور دیدہ زیب قطعوں اور روشوں نے محل کے حسن و جمال کو بے حد دلکش بنا دیا ہے۔ یورپی اقوام تاریخی عمارات کا مصرف خوب جانتی ہیں۔ شاہی محلات کو اس کے جانشینوں نے کھنڈرات میں تبدیل نہیں ہونے دیا بلکہ ان کا بناؤ سنگھار کر کے انھیں ذریعۂ آمدن بنا دیا ہے۔

علی الصباح شہر کے بیچ میں سے گزرتے دریا، نیوا کے کنارے سیر کرتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ کس طرح انسان طاقت حاصل کر کے اپنے جیسے انسانوں کو غلام بنا لیتا ہے۔ مدت تک غلامی برداشت کرنے کے بعد وہ زنجیریں توڑنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ آگے بڑھ کر جانیں قربان کرتے ہیں۔ رعایا کا خون بادشاہت کو بھی ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ ایک بادشاہ سے نجات ملتی ہے تو عوام کو قربانی پر اکسانے والا لیڈر آگے بڑھ کر کسی اور نام اور ٹائٹل کے ساتھ خود حکمران بن جاتا ہے اور عوام پھر غلامی کی دلدل میں دھنس جاتے ہیں۔ غلامی، قربانی اور حکمرانی کا یہ چکر صدیوں سے چل رہا ہے مگر انسانوں کی اکثریت آج بھی غلامی سے نجات نہیں پا سکی۔

رات کو کروز (بحری جہاز) پر سمندر کی سیر بھی یادگار تھی۔ جہاز مختلف پلوں کے پاس پہنچتا تو پل کے پشتے برقی بیٹری کی طرح اوپر اٹھ جاتے اور جہاز کو راستہ دے دیتے۔ برابر کی نشست پر بیٹھے ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ اس شہر کا نام کئی بار تبدیل کیا گیا۔ پیٹرز برگ سے پیٹر گراڈ اور پھر انقلاب کے بعد لینن گراڈ۔ ۱۹۹۱ء کے نئے انقلاب کے بعد نام کے بارے میں یہاں ریفرنڈم کرایا گیا۔ ۵۰/ لاکھ آبادی کے اس شہر کی بہت بڑی اکثریت نے ایک انقلابی رہنما (لینن) کے مقابلے میں ایک شہنشاہ (پیٹر) کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ شہر کی شناخت اِسے لوٹا دی گئی اور لینن گراڈ کے بجائے اسے پھر سے سینٹ پیٹرز برگ بنا دیا۔

رات کے کھانے پر روس میں پاکستانی سفارت خانے کے خوش اخلاق، ذہین اور مستعد سیکنڈ سیکرٹری قمر عباس نے کچھ اور پاکستانیوں سے بھی ملوایا۔ کئی پاکستانی وہاں کامیابی سے کاروبار کر رہے ہیں۔

(سینٹ پیٹرز برگ، ذوالفقار چیمہ)

(دوسرا رنگ)

**خوبصورت اور دل فریب شہر**

# بنڈا برگ (آسٹریلیا)

ڈاکٹر روبینہ شمس اور ان کے شوہر ڈاکٹر اسلم تنویر پچھلے پانچ سالوں سے بنڈا برگ (آسٹریلیا) میں قیام پذیر ہیں۔ دونوں اپنے مریضوں میں بہت مقبول ہیں۔ اس قصبے کی آبادی ایک لاکھ سے کچھ ہی کم ہے۔ یہاں کی آب وہوا، نظارے، دریا کا کنارہ، لوگوں کی سادگی، کھلی کھلی سڑکیں، کم ٹریفک، خوبصورت پارک، ہریالی اور معتدل موسم نے اسے رہنے کے لیے ایک مثالی جگہ بنا دیا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں ۱۲/ پاکستانی ڈاکٹر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر روبینہ ہمارے شہر ملبورن تشریف لائی تھیں تو جاتے ہوئے پرخلوص دعوت دے گئیں کہ میں ان کے پاس بنڈا برگ ضرور آؤں۔ ہم نے سوچا اور ان سے پوچھا کہ کون سا موسم آنے کے لیے مناسب رہے گا۔ انھوں نے نہ صرف مارچ کا آخری ہفتہ تجویز کیا بلکہ مزید یقینی صورتِ حال کے لیے جہاز اور ٹرین کی سیٹیں بک کروا کر ٹکٹ بذریعہ ای میل روانہ کر دیا۔

اب ٹالنے کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ ۲۲/ مارچ ۲۰۱۱ء کو صبح پانچ بجے ایولان ہوائی اڈے (جو کہ بنڈا برگ سے ۲۰/ کلو میٹر دور ہے) کے لیے روانہ ہو گئے۔ ملبورن سال میں ۹/ ماہ شدید سردی کی لپیٹ میں رہتا ہے، بارش کثرت سے ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ سبزہ، پھل اور پھول کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر خوبانی، سیب، لوکاٹ، آلو بخارا، لیموں کے درخت پھلوں سے لدے ہوتے ہیں اور یہ کمال کے لوگ ہیں کہ کبھی ان پھلوں کو پتھر مار کر نہیں گراتے۔ ہم تو بیری کا بھی حشر کر دیتے ہیں بہرحال اپنی اپنی عادت ہے۔

سڈنی آسٹریلیا کا سب سے بڑا اور پُرہجوم شہر ہے۔ ٹریفک، مہنگائی، کرائے کے مکانوں کی کمیابی، فاصلے زیادہ، شہر کے اندر ہی ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتے جاتے تین گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ لیکن اسی حساب سے ملازمت اور تعلیم کے مواقع بھی زیادہ ہیں۔

تیسرا شہر برزبن ہے۔ ملبورن صوبہ وکٹوریہ میں ہے، سڈنی نیو ساؤتھ ویلز میں اور برزبن کوئینز لینڈ میں واقع ہے۔ ہماری پرواز کی منزلِ مقصود یہی تھی۔ فلائٹ دو گھنٹے پندرہ منٹ کی تھی۔ دلچسپ بات یہ دیکھی کہ سرے سے کوئی مہمان نوازی نہیں ہے۔ ٹرالی آتی ہے، اس پر کھانے پینے کی تمام اشیا بھی موجود ہیں لیکن ساتھ ہی پیسے لینے والی مشین بھی نصب ہے۔ کھٹا کھٹ ڈالر گر رہے ہیں۔ برگر چھ ڈالر، چائے کا کپ تین ڈالر، کافی، جوس پانچ ڈالر۔ ہم بھی چائے کی ایک پیالی کا آرڈر دے کر شہیدوں میں شریک ہو گئے۔

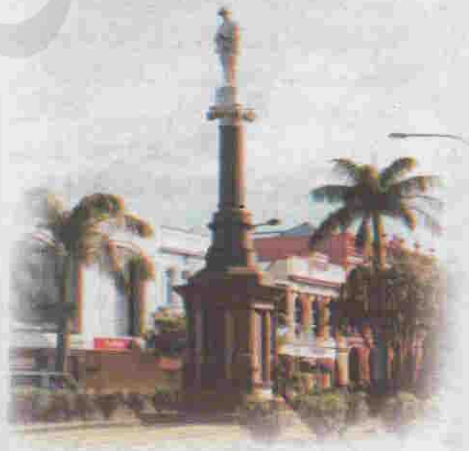



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صبح صبح بڑی ٹھنڈ تھی لیکن جہاز کے اندر درجۂ حرارت مناسب تھا۔ باہر کا منظر ہمیشہ کی طرح بہت خوبصورت تھا۔ ہم بادلوں سے اوپر محوِ پرواز تھے۔ سفید سفید بادل روئی کے گالے نہیں بلکہ روئی کے پہاڑوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ انھوں نے زمین کو پوری طرح ڈھانپ لیا تھا۔ کہیں کہیں سبزہ، پانی، درخت نظر آجاتے۔

ٹھیک وقت پر جہاز لینڈ کر گیا۔ اب یہاں سے بنڈا برگ کی ٹرین لینی تھی۔ ہوائی اڈہ چھوٹا سا تھا۔ ایک جگہ معلومات کی تختی دیکھ کر پوچھا کہ روما سٹریٹ کا اسٹیشن کتنی دور ہے اور وہاں جانے کا کیا طریقہ ہے؟

پہلے تو انفارمیشن آفیسر نے مسکرا کر حال پوچھا کہ سفر کیسا گزرا۔ پھر پہلی دفعہ برزبن آنے پر خوش آمدید کہا (میں سوچتی رہی کہ ایک اجنبی کے لیے یہ دو جملے کس قدر ضروری اور تسکین بخش ہوتے ہیں، یقیناً ان کی ترقی میں ان کی ظاہری خوش اخلاقی کا بھی بڑا اہم کردار ہے۔)

انھوں نے بتایا کہ یہاں سے دائیں ہاتھ باہر نکلیں، سامنے برقی سیڑھیاں ہیں۔ اوپر جائیں، وہاں سے سکائی ٹرین (آسمانی ٹرین یا ہوائی ٹرین) کا ٹکٹ لیں، وہ آپ کو روما سٹریٹ اسٹیشن پر لے جائے گی۔ وہاں سے بنڈا برگ کی ٹرین ملے گی۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو اس نے مجھے خوشگوار قیام کی دعا دی (یہ دعا کی بجائے نیک خواہش کا اظہار کہتے ہیں۔) ایسے لگا جیسے ساری تھکن اتر گئی ہے۔ یہ تو اسلام کا وتیرا تھا۔ ہم اپنی شناخت اور ثقافت کہاں بھول گئے۔

بیگ وصول کیا اور منزل کی طرف قدم بڑھایا۔ لوگ آجا رہے تھے۔ ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ کوئی جدا ہو کر گیا ہوگا اور کسی کی ملاقات اپنوں سے ہوئی ہوگی۔

ٹکٹ خاصی مہنگی تھی۔ ہوائی ریل فوراً ہی مل گئی۔ صاف ستھری، ائیر کنڈیشنڈ اور مسافروں سے لدی ہوئی۔ جب ریل اسٹیشن سے باہر نکلی تو سمجھ آئی کہ یہ ہوائی ریل کیوں کہلاتی ہے۔ نیچے لوہے کے ستون لگا کر ان پر ریل کی پٹری ہے اور ہم زمین سے بلند، ہوا میں معلق سفر کر رہے ہیں، جیسے پرندوں کی پرواز۔ ہر اسٹیشن آنے سے پہلے مائیک پر اعلان ہوتا ہے کہ کون سا اسٹیشن ہے اور کس طرف پلیٹ فارم آئے گا۔

چائے پینے کا پروگرام بن رہا تھا۔ چائے کے کھوکھے کے سامنے لمبی قطار بنی ہوئی تھی۔ آسٹریلیا قطاروں کا ملک ہے۔ بینک ہو یا اسٹیشن، شاپنگ سینٹر ہو یا دفتر، کلینک ہو یا سینٹرلنک، لوگ اطمینان سے قطار میں لگے اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ نہ غصہ، نہ بے زاری، نہ بدزبانی، نہ جھگڑا، نہ جانے انھوں نے صبر کا کون سا پیالہ پی رکھا ہے جبکہ تیز رفتاری کا یہ عالم ہے سڑکوں پر بھاگتے ہوئے برگر کھا رہے ہوں گے کہ وقت کی کمی ہے، ساتھ کتا بھی بھاگ رہا ہے۔

جب گیارہ بج گئے اور گاڑی نہ آئی تو خیال آیا کہ وقت کی پابندی کا شہرہ بہت سنا تھا، پھر آج کیا ہوا؟

ایک خاتون جو اطمینان سے بیٹھی تھی، اس سے پوچھا ''کہاں جانا ہے؟'' پتا چلا اسی ریل پر۔ لیکن اس نے بتایا کہ برزبن میں وکٹوریہ کی نسبت وقت ایک گھنٹہ پیچھے

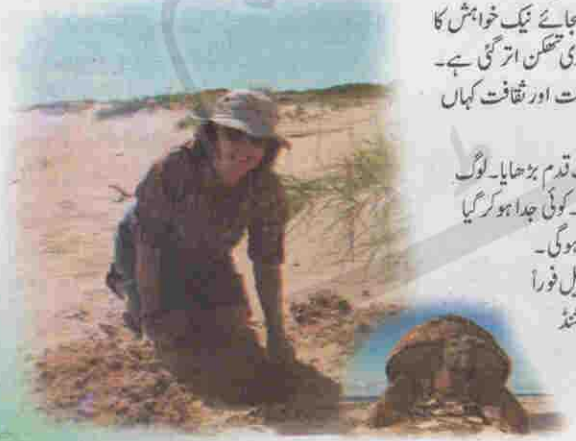

ہے۔اوہ! تو یہ بات ہے۔

گاڑی آئی، ہم اپنی بک نشست پر جا بیٹھے۔ پہلے دو وردی مردنما خواتین ٹکٹ چیک کرنے آئیں۔ اس کے بعد کھانے کا آرڈر لینے دو نوجوان لڑکیاں آئیں۔ ٹھیک ...یک بجے کھانے کی ٹرالی آگئی۔ کھٹا کھٹ ڈالر دیتے جائیں اور کھانا لیتے جائیں۔ ہنسی، مذاق، شوخی، بذلہ سنجی، فقرہ بازی، جیسے دنیا پھولوں کی سیج ہو۔ نہ غم، نہ فکر، نہ تردد، نہ پریشانی، نہ خوف، نہ رنج ...... یہ کیسی قوم ہے......!

اگلی صبح جھیل جو ساتھ ہی واقع تھی، وہاں پیدل سیر کرنے گئے کیونکہ اس محلے کا نام ہی لیک ویوڈرائیو ہے۔ پروردگارِ عالم نے نہایت فیاضی سے اس خطے کو برگ و بار سے نوازا ہے اور پھر انسانی دماغ اور ہاتھوں نے اپنی مہارت، نفاست، محنت، جدت میں بھرپور کمال دکھایا ہے۔

آخر میں اگر SISSLEE ریسٹورنٹ کا ذکر اور اس کے کھانے کی تعریف نہ کی جائے تو حق ادا نہ ہوگا جس کا آئیڈیا بھی شاندار ہے۔ ۵۱ رقسم کے سلاد، سبز پتے، کھیرا، ابلے آلو، لوبیا، پودینہ، گاجر، چقندر، شکرقندی، بند گوبھی کی چار قسمیں، پھول گوبھی، شملہ مرچ، سیب، انناس، ناشپاتی، آڑو، پپیتہ، دال سویاں، بادام، مونگ پھلی، انگور، انار، مکئی، نوڈلز، اورنج اور پھر ان کے مختلف امتزاج سے ملا جلا سلاد۔ فطرت کے نزدیک، جتنا مرضی کھائیں، خوش رہیں، میٹھا کیک، چاکلیٹ کافی اور چائے تھی۔

انھوں نے پل سے گزرتے ہوئے بتایا کہ حالیہ سیلاب میں دریا کا پانی اس پل کے اوپر سے بہہ رہا تھا اور دونوں طرف کے تمام علاقے زیرِ آب تھے۔ اسی پل پر ڈاکٹر اسلم کی گاڑی پانی میں پھنس کر چلنے سے انکاری ہوگئی۔ انھوں نے موبائل پر ایمرجنسی کو فون کیا۔ گاڑی کی چھت کھل سکتی تھی۔ پہلے ہیلی کاپٹر نے ڈاکٹر اسلم اور زینیا کو باہر نکالا پھر انھیں گھر پہنچایا گیا۔ پانی گاڑی بہا کر لے گیا تھا۔ اتنے محنتی اور حوصلہ مند لوگ کہ ساتھ ہی بحالی کا کام شروع کر دیا۔ اب وہاں سیلاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔

(ملبورن سے ہنڈا برگ کا سفر۔ ڈاکٹر شگفتہ نقوی)

(تیسرا رنگ)

## عالمی ورثہ ۔ آیا صوفیہ

# استنبول (ترکی)

ترکی کا شہر استنبول اپنی ایک جداگانہ شناخت رکھتا ہے۔ دارالحکومت نہ ہونے کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار کسی طور ممکن نہیں۔ کم و بیش تین ہزار مساجد کے شہر استنبول کے درودیوار ہزار ہا سالہ تاریخ کو اپنے اندر سموئے کھڑے ہیں۔ آپ چاہیں تو اس گزرے ہوئے وقت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ اس شہر میں لاتعداد تاریخی عمارات موجود ہیں جن میں محلات، قلعے اور اسلامی نوادرات سرفہرست ہیں، لیکن اگر سیاحوں کے اس پسندیدہ شہر کی تاریخی عمارات کا ذکر ہو تو آپ ''آیا صوفیہ'' کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ماضی بعید کا گرجا، ماضی قریب کی مسجد اور حالیہ میوزیم سیاحوں کی پسندیدہ جگہ ہے۔

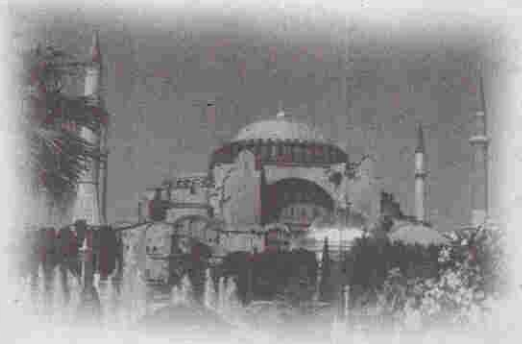





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس عمارت کی تاریخ بھی بہت دلچسپ اور پیچ در پیچ موڑ کاٹتی نظر آتی ہے۔ مشہور زمانہ توپ کاپی محل کے قریب واقع ترکی کا یہ میوزیم دراصل پہلے ایک مسجد تھی اور اس سے پہلے یہ چرچ تھا، جسے سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں فتح کی نشانی کے طور پر مسجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ بعدازاں کمال اتاترک کے دور میں اسے میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں مختلف تبدیلیوں کے بعد اس میوزیم کو سیاحوں کے لیے کھول دیا گیا۔ اپنی ساخت اور قدامت کے باعث یہ میوزیم دنیا کے آٹھ عجائبات میں سے ایک ہے۔ اقوام متحدہ کی جانب سے اس میوزیم کو ''عالمی ورثہ'' قرار دیا گیا ہے۔

آیا صوفیہ کی ساخت میں ایک خاص قسم کی جاذبیت اور وقار ہے۔ گنبد کے نیچے سامنے کا حصہ سنگِ سرخ سے تعمیر شدہ ہے جو نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ زمانے کے اتنے سرد و گرم دیکھنے کے باوجود اگر اس میں یہ دلکشی باقی ہے تو اندازہ لگائیے کہ جب یہ عمارت اپنے جوبن پر ہوگی اور آدھی دنیا کے عیسائیوں کی روحانی توجہ کا مرکز ہوتی ہوگی، تو اس وقت اس کی دلکشی کا کیا عالم ہوگا۔ اس کا مرکزی حصہ ایک بلند و بالا گنبد پر مشتمل ہے۔ گنبد پر اندر کی طرف بہترین نقش و نگار کندہ ہیں اور چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے ہیں جن پر چڑھنے کے لئے سیڑھیوں کے بجائے سنگِ مرمر سے بنی ہوئی ایک ڈھلوان سطح کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہر منزل پر مختلف قسم کی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی تصویر ''موزائک آرٹ'' میں بنی ہوئی ایک دیوار پر نصب تھی۔ اس فن میں پتھر کے مختلف رنگ کے چھوٹے چھوٹے دانوں کی مدد سے تصویر بنائی جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک شاہکار تصویر تھی، ایسی اور دیگر کئی تصاویر جا بجا دیواروں پر کندہ نظر آتی ہیں، بعض تصاویر میں بی بی مریم بھی موجود ہیں۔

ایک منزل پر چند کمرے تعمیر تھے، جہاں عیسائی پادریوں کی بیٹھک ہوا کرتی تھی۔ خاص خاص مواقع پر اجلاس کے لئے الگ کمرے بنے ہوئے تھے۔ گویا اس وقت پورے عیسائی مذہب کا دفتر اور گڑھ یہیں تھا۔ تقریباً ایک ہزار سال تک یہ گرجا، رومی گرجے کے بعد عیسائیوں کی دوسرے بڑی عبادت گاہ رہا۔ مغرب میں پاپائے روم عیسائیوں کے مذہبی پیشوا تھے اور مشرق میں بطریرک، جن کا مرکز یہی گرجا ''آیا صوفیہ'' تھا۔ اس گرجے کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ یہ گرجا کبھی عیسائیوں کے قبضے سے نہیں نکل سکتا۔ اگر کبھی کسی نے اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو آسمانی بلائیں اس کا راستہ روک لیں گی۔

جب سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ میں داخل ہوئے تو تمام عیسائیوں نے اس گرجے میں پناہ لے لی اور غیبی امداد کا انتظار کرنے لگے۔ سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ میں داخل ہونے کے بعد سیدھے ''آیا صوفیہ'' آئے، دیواروں پر بنی تصاویر مٹانے کا حکم دیا، اذان دی اور ظہر کی نماز ادا کی۔ اس دن کے بعد تقریباً پانچ سو سال تک یہ گرجا مسجد کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ ۱۹۳۵ء میں کمال اتاترک نے اسے ایک عجائب گھر کی حیثیت دے دی۔

مشہور آن لائن انسائیکلو پیڈیا، وکی پیڈیا اور استنبول کی سرکاری ویب سائٹ پر اس میوزیم کے بارے میں جاری کردہ معلومات سے پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلے چوتھی صدی عیسوی میں بازنطینی بادشاہوں نے یہاں ایک چھوٹا سا چرچ تعمیر کیا تھا۔ اس وقت اس چرچ کا نام صوفیہ رکھا گیا تھا۔ بعد ازاں یہ چرچ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد ۴۱۵ء میں تھیوڈوسس II نے اس چرچ کو نئے سرے سے تعمیر کیا تھا لیکن یہ بھی ایک چھوٹی سی عمارت پر مشتمل تھا اور اس کی تعمیر میں لکڑی استعمال ہوئی تھی۔ ۵۳۲ء میں ایک مرتبہ پھر یہ عمارت جل کر تباہ ہوگئی۔ لکڑی کی اس عمارت میں استعمال کی جانے والی باقیات اب بھی اس میوزیم کے آس پاس دیکھی جا سکتی ہیں۔ دوسری عمارت کے آگ سے جل کر تباہ ہو جانے کے بعد اس وقت کے بازنطینی بادشاہ نے عمارت نئے سرے سے تعمیر کروائی۔ یہ عمارت ۵۳۲ء سے ۵۳۷ء کے درمیان تعمیر ہوئی۔ اس عمارت کی تعمیر میں بادشاہ Justinian نے

اپنے خزانے کا بڑا حصہ خرچ کر دیا۔ اس کی تعمیر میں دس ہزار مزدوروں نے حصہ لیا۔ عمارت کا ڈیزائن تیار کرنے کے لیے اس دور کے مشہور ماہر طبیعات اور ریاضی دان کا انتخاب کیا گیا تھا۔ تعمیر کے دوران ان دونوں کی ہدایات پر عمل کیا گیا۔

سلطان محمد فاتح ۱۴۵۳ء میں یہاں آئے تو انھوں نے اس چرچ کو فتح کی نشانی کے طور پر مسجد میں تبدیل کر دیا اور اسے ''آیا صوفیہ مسجد'' کا نام دیا۔ جس وقت اس عمارت کو مسجد میں تبدیل کیا گیا، تو اس کی حالت خاصی خراب تھی حتیٰ کہ اس کے اکثر دروازے گر چکے تھے۔ سلطان کے حکم پر اس کی فوری مرمت کی گئی اور پنج وقتہ نماز کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ سلطنت عثمانیہ کے دور میں اس مسجد میں مختلف تعمیراتی کام ہوتے رہے اور اسی دوران اس کے چار منار تعمیر کیے گئے۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد جمہوریہ ترکی کے بانی اور ملک کے پہلے صدر مصطفیٰ کمال اتاترک کے حکم پر ۱۹۳۵ء میں اس مسجد کو جب میوزیم میں تبدیل کیا گیا تو مسجد میں بچھا قالین اٹھا کر اس کی جگہ ماربل فرش بنایا گیا۔ مصطفیٰ کمال نے یہ سوچ کر اس کو میوزیم میں تبدیل کروایا کہ یہ ایک عالمی ورثہ ہے اور اس تک دونوں مذاہب کے لوگوں کی رسائی ممکن ہو۔ (روشن خیالی پرانی بیماری ہے)

(عالمی ورثہ..... آیا صوفیہ۔ شبینہ فراز)

(چوتھا رنگ)

## عدل اور عدلیہ کی حکمرانی

# ٹورنٹو (کینیڈا)

میں نے اخبارات میں پڑھا کہ تین ہفتے قبل لندن میں وزیراعظم کیمرون ایک ہسپتال میں اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ کسی سے ملنے پہنچ گئے۔ اتفاق سے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہسپتال کے انچارج سرجن اور ڈاکٹروں کی ٹیم بھی اپنے مریضوں کا روزانہ کی چیکنگ کے لیے معائنہ کر رہی تھی۔ انھوں نے وزیراعظم کے ساتھ جو اتنے بندے دیکھے تو سرجن نے آگے بڑھ کر وزیراعظم کو اُن کے بغیر اطلاع آنے پر ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے ہسپتال سے چلے جانے کو کہا۔ جواب میں وزیراعظم کیمرون نے بھی فراخدلی سے اپنی غلطی تسلیم کی۔ اُس وقت مریضوں سے ملنے کا وقت نہیں تھا اور وہ خوشی خوشی واپس چلے گئے۔

ایک قابل ذکر واقعہ ایک ماہ قبل کینیڈا کے شہر وین کور میں پیش آیا جب آئس ہاکی کی مقامی ٹیم ۳۹ سال بعد مہمان ٹیم سے ہار گئی تو وہاں موجود اسٹیڈیم سے نکلنے والے افراد اپنی ٹیم کی ہار برداشت نہیں کر سکے، انھوں نے چند گھنٹوں میں وین کور کی سڑکوں، تجارتی مراکز پر غصے کی حالت میں توڑ پھوڑ شروع کر دی اور پورا شہر دہشت گردی کا شکار ہو گیا مگر فوری طور پر وہاں پولیس اور ہنگامی دستے پورے شہر میں پھیل گئے اور لوٹ مار کرنے والوں اور توڑ پھوڑ کرنے والوں کو گھیر کر گرفتار کر لیا اور صرف دو دن میں پورے شہر کو ان توڑ پھوڑ کرنے والوں سے نجات دلا دی اور شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کو یقینی بنا کر عوام کا اعتماد بحال کر کے پولیس کی کارکردگی کا نمونہ پیش کر دیا۔ وہاں کے عوام ایسی دہشت گردی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے مگر وہاں بھی ایسا واقعہ ہو سکتا ہے، اس کے لیے انھوں نے دہشت گردی سے نمٹنے کے لئے فورس بنا رکھی ہے جو صرف ایسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔

پچھلے سال جی۔۲۰ کا اجلاس جو کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں منعقد ہوا، اُس میں جی۔۲۰ سے تمام اہم ارکان ٹورنٹو آئے تھے جس میں صدر اوباما بھی تھے۔ اِس موقع پر کینیڈین پولیس نے بہت زبردست حفاظتی انتظامات کیے تھے، یہاں تک کہ ٹورنٹو کے ڈاؤن ٹاؤن شہر کو سیل کر کے تین دن تک آنے جانے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ مگر وہاں کی ایک تنظیم کے لوگوں نے جو اس جی۔۲۰ کے خلاف تھے، آگے آنے کی کوشش کی تو ایک شخص کو پولیس والا جو ہیلمٹ سے چہرہ چھپائے ہوئے تھا، بہت بے دردی سے مار کر واپس جانے پر مجبور کرتا رہا۔ چونکہ پولیس والے نے چہرہ ہیلمٹ میں چھپایا ہوا تھا، اِس لیے اُس کی نشاندہی نہیں ہو سکی۔

وہاں کا میڈیا ہمارے میڈیا کی طرح پولیس والے کی اس وحشیانہ حرکت کو بار بار دکھاتا رہا۔ ایک سال بعد اس پولیس والے کی نشاندہی بھی میڈیا نے اپنے ذرائع سے کی اور اس کو اب عدالتی کارروائی سے گزرنا پڑ رہا ہے کیونکہ وہاں پولیس ایسا وحشیانہ لاٹھی چارج نہیں کر سکتی۔ وہ بھی عوام اور قانون کو جواب دہ ہے۔

انسان تو کجا کینیڈا میں آپ کسی جانور کو بھی نہیں مار سکتے، کسی درخت کو نہیں کاٹ سکتے، کسی عام پرندہ کو اپنے گھر سے بچے ہوئے کھانے یا اجناس نہیں ڈال سکتے۔ اگر آپ نے ایسی غلطی کر دی اور گھر سے بچے ہوئے چاول پرندوں یا جانوروں کو ڈال دیئے اور پولیس کو کسی نے فون

کر دیا تو آپ کو سزا ہو سکتی ہے۔

اگر آپ نے کینیڈا میں اپنے ہی چھوٹے بچے کو گھر میں محفوظ نہیں رکھا اور وہ کسی طرح دروازہ کھول کر باہر نکل جائے اور کوئی پولیس کو فون کر دے کہ کوئی بچہ باہر گھوم رہا ہے تو فوراً مقامی پولیس کی گاڑی حرکت میں آجائے گی اور بچے کو اپنے ساتھ لے جائے گی، پھر والدین کی تلاش ہو گی اور والدین سے سوال ہوگا کہ یہ بچہ آپ کے گھر سے باہر کیسے آیا، آپ نے اس کی حفاظت کیوں نہیں کی وغیرہ وغیرہ۔ پھر والدین کو تاکید کر کے بچہ واپس کر دیا جاتا ہے۔ اگر پھر کبھی ایسا واقعہ پیش آئے تو پولیس بچے کو بچوں کی نگہداشت کے اداروں کے حوالے کر دیتی ہے۔ پھر بچہ اٹھارہ سال تک وہیں پرورش پاتا ہے۔ جوان ہونے پر اس کے والدین کو بتایا جاتا ہے۔ اگر بچہ واپس جانا چاہے تو ٹھیک ورنہ وہ پھر مادر پدر آزاد ہو جائے گا۔ اگر اس کے پاس کوئی روزگار نہیں تو پھر حکومت اس کی کفالت کرتی ہے جب تک اس کو روزگار اور گھر نہ مل جائے۔

(عدل اور عدلیہ کی حکمرانی۔ خلیل احمد نینی تال والا)

(پانچواں رنگ)

**شہر اور دیہات خوبصورتی ہی خوبصورتی**

# بیجنگ سے شنگھائی

۲۱ مئی ۱۹۵۱ء کو پاکستان وہ واحد ملک تھا جس نے باقاعدہ طور پر چین کو تسلیم کیا۔ جس روز پاکستان نے چین کو ایک آزاد ملک کے طور پر تسلیم کیا، اسی دن سے پاک چین دوستی کا آغاز ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے ہمیں جولائی ۲۰۱۱ء میں چین جانے کا اتفاق ہوا۔

چین جانے سے پہلے میرے ذہن میں چین کے حوالہ سے مختلف سوالات اور اَن دیکھے خاکے تھے۔ سوچتا تھا کہ چین صنعتی، تجارتی اور معاشی اقتصادی محاذ پر بے مثل ترقی کی منزلیں طے کر چکا ہے مگر یہ سوچ کبھی بھی ذہن میں نہیں آئی تھی کہ چین کے شہر، دیہات اور تمام علاقے اس قدر خوبصورتی کا نمونہ بنا دیے گئے ہوں گے۔ یہ بھی کبھی دل و دماغ کے دامن میں خیال نہیں اترا تھا کہ چین کے لوگ محبت کا مجسمہ ہیں پاکستان اور، پاکستانیوں کے لئے ان کی محبت بہت گہری ہے۔

ہم ہوائی جہاز سے بیجنگ ہوائی اڈے پر اُترے۔ ہوائی اڈے سے باہر آئے اور ایک سپیشل بس میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ ہوائی اڈے سے ہوٹل جاتے ہوئے ۴۵ منٹ کے سفر میں ہم نے بیجنگ جو کہ چین کا دارالحکومت ہے، کی سڑکوں، عمارتوں، ہریالی اور سڑکوں پر رواں دواں گاڑیوں کے ذریعے بے پناہ ترقی کا مشاہدہ کیا۔ ۲۵ سے ۳۰ کلومیٹر کے اس سفر میں سڑکوں کے دونوں اطراف آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارتیں، درختوں، پودوں، گھاس اور پھولوں نے چین کی ترقی کا اعلان کر دیا۔ بیجنگ کی آبادی ۲۰ ملین تک پہنچ چکی ہے اور اس شہر میں ۵ ملین سے زائد گاڑیاں موجود ہیں۔ بیجنگ کی کشادہ اور صاف ستھری سڑکوں کے باوجود ٹریفک کا بہاؤ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت زیادہ ہے، جسے کنٹرول کرنے کے لیے حکومت نے گاڑیوں کو خصوصی کوڈ لگا رکھے ہیں اور کوئی بھی گاڑی ہفتے میں چار روز سے زیادہ سڑکوں پر آمدورفت نہیں کر سکتی۔

بیجنگ کی سڑکوں پر نجی گاڑیوں کا بہاؤ کم سے کم کرنے کے لئے وہاں کی حکومت نے بسوں اور پبلک ٹرانسپورٹ کے کرایوں کو بہت کم رکھا ہوا ہے جبکہ سڑکوں پر بیشتر الیکٹرانک بسیں بھی چلتی نظر آتی ہیں۔ پٹرول پاکستانی روپے کے مطابق ۱۰۸ روپے فی لیٹر ہے۔ چین میں سی این جی گاڑیاں نہ ہونے کے برابر ہیں اور سب سے حیران کن اور خوش آیند بات یہ ہے کہ وہ گیس کی بجائے اپنے گھروں اور عمارتوں میں سولر سسٹم پلانٹ نصب کرواتے ہیں جس سے گیزر، چولہے وغیرہ جلائے جاتے ہیں۔

ہوٹل میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم فاربیڈن سٹی اور سمر پیلس دیکھنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ فاربیڈن سٹی چین کی تاریخ کا ایک اہم مقام ہے۔ یہ ان کے ماضی کے بادشاہوں کا محل ہے جہاں منگ دور اقتدار سے چنگ اقتدار تک کے بادشاہ قیام پذیر رہے۔ یہ بیجنگ کے وسط میں واقع ہے۔ یہ پانچ ہزار سالوں تک بادشاہوں کے لئے رہائش گاہ، سیاسی مرکز اور باشاہوں کے وزیروں، مشیروں کے استعمال میں رہا۔ موجودہ عمارات ۱۴۰۶ء سے ۱۴۲۰ء کے درمیان تعمیر ہوئیں۔ اس کمپلیکس میں ۹۸۰ عمارتیں اور ۸۷۰۷ کمرے ہیں۔ اسے چین کی تاریخی تہذیب کا اہم شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔

اس کمپلیکس میں ۲۴ حکمران قیام پذیر رہ چکے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں اسے عام لوگوں کے لیے کھول دیا گیا۔ فاربیڈن سٹی میں آثار قدیمہ، ماضی کے بادشاہوں کے طور طریقے اور اُن کے طرز تعمیر انسان کو سوچ میں گم کر دیتے ہیں۔

فاربیڈن سٹی اور سمر پیلس کے بعد ہمیں دیوار چین دیکھنے کا موقع ملا۔ دیوار چین آج بھی دنیا کا بہترین عجوبہ ہے، اس کے بارے میں مختلف آراء مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ ۶۸۰۰ کلومیٹر لمبی ہے اور بعض ۷۰۰۰ کلومیٹر سے زیادہ طویل بتاتے ہیں۔ جو بھی ہو، دیوار چین کے حسن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بہت بلند ہے اور اس کی سیڑھیاں چڑھنا آسان کام نہیں۔ یہ آسمان کے رخ میں بلند اور انسان کے لئے صبر و زور آزما ہے۔ اس کے مختلف مقامات سے منظر کشی خاصی دل فریب اور جداگانہ ہے۔ دیوار چین کے مختلف حصوں میں متعدد اشیا کے سٹالز اور کولڈ ڈرنک کارنر بھی بنے ہوئے ہیں۔ جس طرح بیجنگ میں صبح کے اوقات میں سڑکوں کے کنارے استعمال شدہ گھریلو اشیا فروخت کرنے کے لیے فٹ پاتھ بازار لگتے ہیں، اُسی طرح دیوار چین کے مقام پر مختلف اشیا کے بازار لگے نظر آتے ہیں۔

سی چھوان صوبہ میں زلزلے کی تباہی اور تعمیر نو کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہم پانڈا ریسرچ اینڈ بریڈنگ سنٹر دیکھنے گئے۔ چین کا یہ پانڈا ریسرچ سینٹر دنیا کا واحد مرکز ہے۔ اس وقت چونکہ پوری دنیا میں پانڈا کی تعداد میں کمی کا سلسلہ جاری ہے اس لیے چین کی حکومت پانڈا نسل کی افزائش اور دیکھ بھال کے لیے اہم اقدامات اٹھا رہی ہے۔ اس سینٹر کے دورہ کے دوران ہمیں معلوم ہوا کہ دنیا میں پانڈا کی تعداد ۳۱۷ ہے، جن میں سے تیس سے چالیس کے قریب پانڈا چین سے باہر آباد ہیں۔ اس وقت سینٹر میں ۹۶ پانڈا رہ رہے ہیں۔

شنگدو سے ہم راکٹ ریل پر سوار ہوئے۔ راکٹ ریل اس وقت دنیا کی تیز ترین ریل ہے۔ یہ ریل ۳۰۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ ہم نے اس ریل میں شونگ چنگ تک کا راستہ سوا دو گھنٹوں میں طے کیا۔ ریل بہت خوبصورت اور جدید ساز و سامان سے آراستہ تھی۔ شونگ چنگ، چین کا تین ہزار سال پرانا تاریخی شہر ہے۔ اس شہر میں بھی ہریالی بہت دلفریب ہے۔ یہ ایک بڑی آبادی کا گنجان آباد شہر ہے۔ چین کا بڑا ہوائی اڈہ ادھر ہے۔ اس شہر میں بدھا کے مجسموں کا علاقہ خاصا بڑا ہے اور ہر طرف مجسمے ہی مجسمے نظر آ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ مجسمے آٹھ سو سال قدیم ہیں جہاں بدھا کے پیروکار عبادت کے لیے آتے ہیں۔

شونگ چنگ سے پی چانگ کا سفر ساری رات ٹرین

میں طے کیا۔ بی جانگ پہنچنے کے بعد ہوٹل میں کچھ دیر آرام کر کے ہم تھری گوجز ڈیم کی سائٹ وزٹ کرنے چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ تقریباً پورے Huangpu دریا کو ڈیم کی شکل دے دی گئی ہے۔ تھری گوجز دنیا کا سب سے بڑا ہائیڈرو پراجیکٹ ہے۔ تھری گوجز ۳۸۰۰ رکلومیٹر لمبے دریا پر محیط ہے۔ اس پراجیکٹ کی پیداواری صلاحیت ۲۲۵۰۰ رمیگاواٹ ہے۔ اس کی تعمیر میں ماہرین کے ساتھ ۱۲ رلاکھ افراد نے حصہ لیا۔ یہ پراجیکٹ اپنے مقررہ وقت اور تخمینہ لاگت سے کم میں تیار کیا گیا، کام ابھی بھی ہو رہا ہے۔ پروگرام یہ ہے کہ اس پراجیکٹ سے مزید ۴۰ ر ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کی جائے۔

بی جانگ سے بذریعہ ہوائی جہاز ہم شنگھائی پہنچے۔ شنگھائی چین کا صنعتی شہر ہے۔ اس شہر میں رونق خوب تھی۔ بازاروں اور سڑکوں پر لوگ گھومتے پھرتے اور سیر و تفریح کرتے نظر آتے ہیں۔ ویسے تو پورے چین میں آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں (سکائی سکریپرز) موجود ہیں مگر شنگھائی ہر طرف سے ان عمارتوں سے اٹا پڑا ہے۔ نیویارک سے زیادہ سکائی سکریپرز شنگھائی میں تعمیر ہو چکے ہیں۔ اکثر یورپی اور امریکی شنگھائی کی سڑکوں پر گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ شنگھائی ٹیلی ویژن سنٹر بھی خوب تھا۔ ۲۰۰۹ء میں گینز ورلڈ ریکارڈ نے اسے دنیا کا سب سے بلند ترین سنٹر قرار دیا۔ یہ ۴۹۲ ر میٹر بلند سنٹر ہے۔ اس وقت یہ چین کا بلند ترین سکائی سکریپر ہے اور ایشیا کا دوسرے نمبر پر بلند ترین ہے۔ اس کی سب سے بالائی منزل پر شیشے کا فرش ہے اور اس پر چلنے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ آسمان پر چل رہے ہیں۔ اس سنٹر سے پورا شنگھائی نظر آتا ہے۔ شنگھائی میں ایک رات اور ایک دن گزارنے کے بعد دوبارہ بیجنگ پہنچے۔

معلوم ہوا کہ چین کی اپنی کوئی تہذیب نہیں ہے۔ دوسرے ممالک اور معاشروں سے ان کو اپنایا جاتا رہا۔ چین کے عوام کا کوئی مذہب نہیں اور بدھ ازم چین میں بھارت سے آیا۔ چین آبادی کے لحاظ سے دنیا میں پہلے نمبر پر ہے۔ اس وقت چین میں ون چائلڈ پالیسی ہے لیکن اگر کسی کے گھر میں بیٹی پیدا ہو جائے تو میاں بیوی کو پانچ سال بعد دوسرے بچے کی اجازت ہے۔

(چلنا ہے تو چین کو چلیے۔ احمد جمال نظامی)

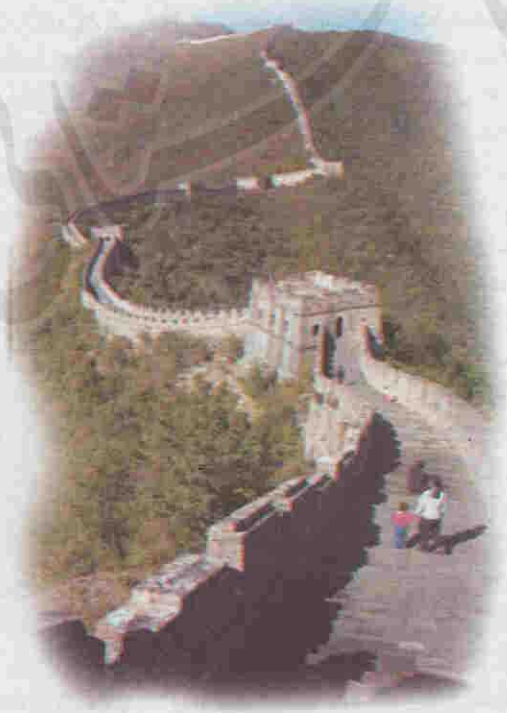





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

(چھتارنگ)

## جرمنی میں مسلم نوجوان نسل

# فرینکفرٹ (جرمنی)

میرے میاں محمد علی نیشنل بنک آف پاکستان فرینکفرٹ میں تھے۔ شادی کے بعد ہم ۱۹۷۷ء میں جرمنی چلے گئے تھے۔

۹/۱۱ سے قبل جرمن ہمیں بہت اچھی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ ہمارے پردہ کرنے پر کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ کئی لوگ پابندی سے نماز پڑھتے اور پارک میں یا کسی اور پبلک جگہ نماز پڑھتے تو لوگ انھیں عزت سے جگہ دیتے تھے۔ اب اُن کا رویہ بدل گیا ہے اور وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہمیں کہتے ہیں تم لوگ کنزرویٹو ہو۔ خاص طور پر عورتوں کے معاملے میں بہت تنقید کرتے ہیں کہ تم انھیں دبا کر رکھتے ہو، ان پر ظلم کرتے ہو، چار چار شادیاں کرتے ہو، وہاں کا میڈیا بیشتر وقت مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے، انھیں دہشت گرد کہا جاتا ہے۔ پھر پاکستان میں جو دھماکے خودکش حملے وغیرہ ہوتے ہیں اس چیز کو بھی وہاں میڈیا اس طرح پیش کرتا ہے کہ مسلمان ہی ساری دہشت گردانہ کارروائیاں کرتے ہیں۔

دینی اجتماعات کی اجازت صرف محدود مقامات پر ہے، جیسے مساجد وغیرہ میں۔ اس کے لیے ایک کوڈ آف کنڈکٹ بنا دیا گیا ہے، جس کے تحت کہا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کے خلاف، مغربی کلچر کے خلاف بات نہ کی جائے، دہشت گردی پر ابھارنے والی گفتگو نہ کی جائے۔

خواتین کے حجاب کے بارے میں جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے جرمنی میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا لیکن جب سے فرانس میں اسکارف کے خلاف مہم چل رہی تھی، اُس کے اثرات جرمنی میں بھی ہو رہے ہیں۔ سرکاری طور پر تو نہیں البتہ عام زندگی میں کئی لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ جرمنی میں سب سے زیادہ تعداد ترکش مسلمانوں کی ہے اور ترکی کی تقریباً تمام خواتین اسکارف پہنتی ہیں۔ اس طرح ایک کثیر تعداد کے اسکارف پہننے کی وجہ سے وہاں حکومتی سطح پر اب تک اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا بلکہ ۹/۱۱ کے بعد زیادہ تر مسلمان عورتوں نے خصوصاً پاکستانی اور مراکش کی خواتین نے اسکارف اوڑھنا شروع کر دیا ہے۔

مسلم نوجوان نسل دینی باتوں کے بغیر پلی بڑھی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری یہ نوجوان نسل خود اسلام کے خلاف بات کرنے میں ہچکچاتی نہیں۔ حال ہی میں، میں نے دیکھا کہ ٹی وی پر ٹاک شو میں ترک نوجوان لڑکے لڑکیاں اسلام اور اسلامی کلچر کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ ترکش لڑکی کہہ رہی تھی نعوذ باللہ قرآن پاک میں بہت پابندیاں ہیں۔ جب مسلمان خود اپنی کتاب، اپنے کلچر کے خلاف بات کر رہے تھے تو پروگرام کے شرکاء خوب تالیاں بجا رہے تھے۔ پاکستان میں جب دھماکے یا دہشت گردی وغیرہ ہوتی ہے تو نوجوان کہتے ہیں کہ یہ مسلمان ہی تو ہیں جو یہ سب کام کر رہے ہیں، ہمارے بچے گھروں میں آ کر کہتے ہیں کہ کالج، یونیورسٹی میں غیر مسلم طالب علم ہمیں طعنے دیتے ہیں کہ دیکھو مسلمان کیا کر رہے ہیں۔ وہ کہتے

ہیں تم کہتے ہو اسلام امن کی تعلیم دیتا ہے تو یہ بم دھماکے کرنے والے بھی تو مسلمان ہیں، تم کہتے ہو قرآن بھائی چارہ سکھاتا ہے تو کیا یہ قرآن نہیں پڑھتے۔ ہمارے نوجوان جب غیر مسلموں سے اس قسم کی باتیں سنتے ہیں تو وہ بہت دل برداشتہ ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے کئی بچے اپنے دین سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے کلچر سے دُور ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جسم ڈھانپ لینے یا سر پر رومال باندھ لینے سے مسلمان نہیں ہو جاتے، جب تک کہ خیالات بھی امن پسند نہ ہوں۔

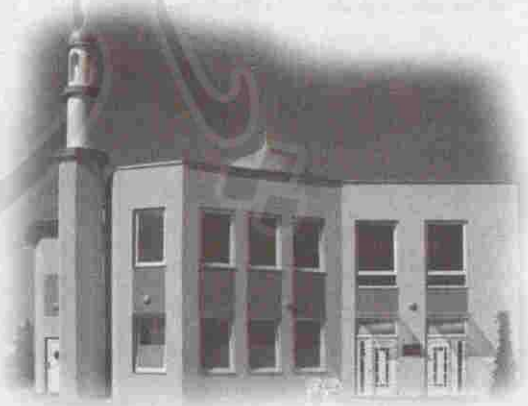

ایک اور رجحان جو وہاں نئی نسل میں نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ ۵۰ر فیصد پاکستانی لڑکے جرمن لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں جس کی وجہ وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ پاکستانی لڑکیوں کی خواہشات اور مطالبے بہت ہوتے ہیں۔ انہیں اچھے کپڑے، زیورات مہیا کرنے کے علاوہ گھر بٹھا کر کھلانا پڑتا ہے، جبکہ جرمن لڑکیاں شوہر کے ساتھ مل کر برابر کا کام کرتی ہیں اور محنتی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں لڑکیوں کے عریاں فیشن دیکھ کر بھی وہ کہتے ہیں کہ جب مسلمان لڑکیاں بھی اتنی ہی آزاد خیال ہیں تو پھر ہم یہاں جرمن لڑکیوں سے ہی کیوں نہ شادی کر لیں۔ یہاں چند پاکستانی لڑکیوں نے جرمنوں سے بھی شادی کی ہے۔ ماں باپ مجبور ہوتے ہیں کیونکہ اولاد ان کی بات ہی نہیں سنتی، زبردستی نہیں کر سکتے۔

۹/۱۱ کے بعد بہر حال ایک تبدیلی آئی ہے وہاں غیر مسلموں کے علاوہ مسلمانوں کی نوجوان نسل میں بھی اسلام کے متعلق جاننے کا رجحان بڑھا ہے۔ دینی محفلوں میں نوجوان نسل کم ہی شریک ہو پاتی ہے کیونکہ جرمنی میں طالب علموں کے لئے پڑھائی کا شیڈول اتنا سخت ہے کہ ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ صبح ۹ر بجے سے لے کر رات ۸ر بجے تک یونیورسٹی یا ملازمت میں ایک ایسے ماحول میں ہوتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ اسلامی اقدار کے مطابق نہیں بلکہ بچوں کے دماغ کو پراگندہ کرنے کا سبب بھی بنتا ہے۔

آخر میں جرمن معاشرے کی خوبیاں بھی بیان کرتی چلوں۔ وہاں کے معاشرے میں حرام کاری کے سوا باقی سب خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے، امانت میں خیانت نہیں کرتے، کسی کی کوئی چیز پڑی مل جائے تو پولیس کو دے دیں گے، پولیس لوگوں کی نہایت مددگار اور دوست ہے، مجرم کو بھی پکڑتے ہیں تو تمیز سے پیش آتے ہیں، ہر بچہ بڑے کو سلام کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے، خواہ لفٹ میں ملے یا راستہ چلتے ہوئے، چوری چکاری، چھینا جھپٹی جیسے ہم پاکستان میں سنتے ہیں کہ گن پوائنٹ پر موبائل چھین لیے، عورتوں کے زیورات اتروا لیے، اس قسم کے جرائم کا وہاں تصور نہیں۔

وہاں حکومت شہریوں کو ہر طرح کی سہولتیں دیتی ہے مثلاً مرد عورت سب کے لیے دسویں تک تعلیم لازمی ہے۔ اگر معلوم ہو جائے کہ کوئی بچہ کنڈر گارٹن کی عمر کا گھر میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موجود ہے اور سکول نہیں جا رہا تو حکومت کی طرف سے حکم آ جاتا ہے کہ یا تو بچے کو اسکول بھیجیں ورنہ ملک چھوڑ دیں۔ ۲۷ر سال تک تعلیم مفت ہے یعنی جب تک ایک طالب علم کا مستقبل نہیں بن جاتا، حکومت اس کی ذمے دار ہے۔ ۱۹۷۷ء سے لے کر آج تک میں نے نہیں دیکھا کہ وہاں بجلی چلی جائے یا پانی نہ آئے۔ ٹیکسی والا کبھی آپ سے زائد کرایہ نہیں لے گا، کبھی بدتمیزی سے پیش نہیں آئے گا۔ یہی خوبیاں ہیں کہ اگر ایک مرتبہ کوئی پاکستانی یورپی ممالک میں پانچ سال رہ لے تو کبھی واپس نہیں آنا چاہتا۔

(جرمنی میں ۳۵ سال۔ صوفیہ علی)

(ساتواں رنگ)

### حضرت صالحؑ کے مزار تک

# صلالہ (اومان)

اومان کے جنوبی خطے میں صلالہ شہر واقع ہے۔ ہم نے وہاں سے حضرت صالحؑ کے مزار پر جانے کا پروگرام بنایا۔ صلالہ سے ہم طاقہ کی طرف روانہ ہوئے۔ طاقہ اور ارابط شہروں کے پاس سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے۔ وقت کم تھا اور منزل کے متعلق اندازہ نہ تھا کہ کتنی دور ہے۔ دل میں ارادہ کیا کہ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس برگزیدہ ہستی کے پاس ضرور حاضری دیں۔ ہماری منزل سداء اور حربیین شہروں سے آگے تھی۔ شاہراہ پر بورڈ آویزاں تھے، جس کی مدد سے ہم شاہراہ پر گاڑی آگے بڑھا رہے تھے۔

ارابط شہر سے ذرا آگے گئے تو بورڈ لگے ہوئے نظر آئے کہ یہ پانی کی گزرگاہ ہے اور اگر پانی زیادہ اور تیز ہو تو آپ آگے نہ جائیں۔ پانی شدید بارش کے وقت پہاڑوں سے تیزی سے نیچے آتا ہے اور یہ جگہ بتا رہی تھی کہ پانی کا یہ رستہ بنا ہوا ہے جو شاہراہ پر سے گزر کر دوسری طرف جاتا ہے۔ شاید ڈھلوان کی وجہ سے ایسا تھا مگر اس وقت پانی کی بہت پتلی سی لکیر شاہراہ سے گزر کر دوسری طرف جا رہی تھی اور ایسی لکیریں کئی جگہ تھیں۔

ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، پہاڑی موڑوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شاہراہ چونکہ بہت بہترین حالت میں تھی لہٰذا گاڑی بہت سبک رفتاری سے چل رہی تھی۔ ڈھلوانوں اور اونچائیوں کا اندازہ جگہ جگہ بورڈوں سے ہو رہا تھا۔ آپ کو ہر چیز سے باخبر رہنے کے لئے بورڈوں پر نظر رکھنا اشد ضروری تھا۔ اونٹوں کے نشان والے بورڈ بھی جا بجا نظر آئے جس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ یہاں اونٹ کھلے چر رہے ہیں لہٰذا محتاط رہیں۔ کافی دیر بعد ہمیں سمندر کی جھلک ایک پہاڑی کی اوٹ سے نظر آئی۔ شور کرتا ہوا سمندر، سبز اور نیلی رنگت کو یکجا کرتا ہوا، سفید جھاگ اُڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے بعد شاہراہ تکونے چوک پر منتج ہوئی۔ وہاں پر بزرگ ہستی شیخ العفیفؒ کے مزار کا بورڈ آویزاں تھا۔ ان کے مزار پر حاضری دی، کوئی بندہ موجود نہ تھا۔ ایک کمرا نما ہال کے اندر آپ کی آرام گاہ تھی۔ ساتھ کچھ فاصلے پر مسجد اور وضو کی جگہ تھی۔ البتہ کچھ دور اونٹوں کا ایک گروہ چہل قدمی کر رہا تھا۔ حاضری کے بعد ہم واپس تکونے چوک میں پہنچے اور حربیین جانے والی

# میں کامیابی تک کیسے پہنچی...؟

**ایک بے یارو مددگار لڑکی کی بے گھری سے ہارورڈ یونیورسٹی تک پہنچنے کی سچی داستان**

لزمرے

میں نے دوسروں کے لیے راستہ بنانے کو
اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے

شاہراہ پر چل پڑے۔ پہاڑوں کے سلسلے میں کبھی کبھی سمندر نمودار ہو کر غائب ہو جاتا تھا۔ پھر کافی دیر چلنے کے بعد اونچے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور کافی دور جانے کے بعد آبادی نظر آئی۔

حربیین شہر سامنے تھا لیکن فاصلہ کافی تھا۔ آخر ہم شہر تک پہنچے۔ وہاں سے حضرت صالحؑ کی آرام گاہ کے متعلق دریافت کیا تو کافی آگے جانے کا بتایا گیا۔ پہاڑوں پر فاصلے بظاہر کم ہوتے ہیں مگر وقت زیادہ لگتا ہے۔ ارادہ مضبوط تھا، شام کا وقت ہو گیا تھا اور واپسی کے سفر کے متعلق سوچ کر گھبراہٹ بھی ہوئی مگر اللہ پر یقین تھا کہ وہ لایا ہے تو واپس بھی وہی لے کر جائے گا۔ طاقہ اور اربط سے آگے شاہراہ پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ خاص طور پر حربیین شہر کی طرف تو گنتی کی دو، چار گاڑیاں گزری تھیں۔ حربیین شہر ایسا لگا جیسے لوگوں کے بغیر چھوٹا سا قصبہ ہو، تھوڑی سی عمارتیں تھیں۔

حربیین سے آگے سمندر کے ساتھ ساتھ راستہ تھا۔ ہمارے بائیں جانب پتھریلے پہاڑ تھے اور بہت خوفناک ساخت کے، جن سے مختلف اشکال بن رہی تھیں، جو ایسی تھیں جیسے جنات ہوں۔ عجیب الخلقت اشکال، حیران کن اور ڈرانے والی اور دائیں طرف سمندر کی بپھری ہوئی لہریں اپنا سر چٹانوں اور کناروں سے زور زور سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہوا کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ گاڑی ہل رہی تھی اور سمندر کا پانی کناروں سے ہوا کے زور پر اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ دور تک پھیلا ہوا سمندر، شور مچاتی لہریں، ہوا کی تیزی سے آتی سیٹیوں کی آوازیں اور پتھریلی چٹانیں۔ یہ مقام ایک عجیب خوفناک منظر کی عکاسی کر رہا تھا۔

کافی آگے جا کر ایک بورڈ شاہراہ پر نظر آیا جس سے حضرت صالحؑ کی آرام گاہ کی نشاندہی کی گئی تھی۔ پتھریلی چٹانوں کے درمیان ایک پتھریلی سڑک اندر جا رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر جا کر دیکھا تو کچھ لوگ وہاں پر کام کر رہے تھے۔ غالباً اس جگہ کو لوگوں کی آمد کے حوالے سے مزید سہولیات سے سنوارا جا رہا تھا۔ یہ مزدور اور مستری تھے جو ایک چھوٹی سی عمارت تعمیر کر رہے تھے۔ غالباً یہ لوگ پاکستانی اور بنگلہ دیشی تھے کیونکہ انھوں نے شلوار قمیصیں پہن رکھی تھیں۔ ہم نے سلام کیا اور مزار شریف کے متعلق پوچھا تو انھوں نے ہمیں اوپر جانے کو کہا۔

سڑک کے ساتھ سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں اور یہ تو تعمیر شدہ تھیں۔ اوپر پہنچے تو ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی اور اس کے ساتھ ایک عمارت نظر آئی، چھوٹی سی جس پر سفید رنگ کیا ہوا تھا۔ مسجد کے پاس پانی کا ایک ڈرم رکھا تھا جس سے ہم نے وضو کیا اور پھر اس سفید عمارت کے دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے کو اندر کی طرف کھولا تو سامنے حضرت صالحؑ کی آخری آرام گاہ تھی۔ اللہ اکبر۔ اللہ کے بندے کس طرح اور کیسے یہاں پہنچے کچھ معلوم نہیں۔ اللہ اپنے بندوں کا خود نگہبان ہوتا ہے۔ یہ ثابت ہو رہا تھا۔

آپؑ کے مزار کا طول اندازاً دس فٹ تھا، اوپر سبز چادریں پڑی تھیں جن پر قرآنی آیات لکھی تھیں۔ ہم کافی دیر مبہوت کھڑے رہے، عجیب دبدبہ اور رعب کا ماحول تھا۔ ادب سے جسم بھی جنبش سے قاصر تھا۔ کافی دیر بعد سلام فاتحہ کے بعد اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا تو قبر کی لمبائی کا اندازہ ہوا۔ کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد واپس باہر نکلے۔ مسجد میں عصر کی نماز ادا کی اور پھر واپسی کی راہ پکڑی۔ چونکہ شام کے دھندلکے اور گہرے ہو رہے تھے اور ماحول عجیب و غریب تھا۔ گاڑی پر بیٹھ کر واپس بڑی شاہراہ پر چل پڑے۔ ہوا کی شدت اب بھی ویسی ہی تھی۔ سمندر کی لہروں میں تیزی اور بڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ پتھریلی چٹانیں سورج ڈوب جانے کی وجہ سے اور بھی پراسرار لگ رہی تھیں مگر ہم اب ان سے دور جا رہے تھے، ان کی ہیبت پیچھے رہ گئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ پہاڑوں کی اترائیوں اور چڑھائیوں پر چلتے ہوئے واپس لوٹ آئے۔ کافی دیر بعد رات کی تاریکی میں اس بڑی شاہراہ پر پہنچے جو طاقہ اور اربط شہر سے ملتی تھی۔ صلالہ پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے۔

(سلطان قابوس کے دیس میں۔ چودھری غلام جیلانی)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ ۱۹۹۷ء کی بات ہے، جب میں نے خود کو ایسے حالات میں پایا جو میرے وہم و گمان میں نہ تھے۔ میں تنہا ہو چکی تھی اور نیویارک کی سڑکوں پر بھیک مانگتی پھرتی تھی۔ میری عمر سولہ سال تھی اور بے گھری کا عذاب مجھ پر سوار تھا۔ کھانے کو غذا نہیں تھی اور نہ پہننے کو کپڑا، پھر بھی میری سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ کسی سکول میں داخلہ مل جائے۔ گو میں آٹھویں جماعت پاس تھی لیکن دو برس سے بھگوڑی چلی آ رہی تھی۔

دراصل تین سال پہلے میرا مفلوک فروش باپ اپنی بیوی سے اتنا زیادہ ناراض ہوا کہ گھر چھوڑ گیا اور پھر پلٹ کر نہ آیا۔ مجھے علم تھا کہ اس نے بوڑھوں کے ایک گھر میں پناہ لے رکھی ہے مگر اب وہ اس قابل نہ تھا کہ میری کوئی مدد کر سکے۔ اُدھر چند ماہ قبل ایڈز کا موذی مرض ماں کو مجھ سے جدا کر گیا تھا۔ میں نے چند ہفتے تو ایک سہیلی کے گھر گزارے۔ جب اس کے والدین آئے تو گھر تنگ ہو گیا، لہٰذا میں علاقہ برونکس کے مختلف وسیع و عریض اپارٹمنٹوں کی سیڑھیوں کے فرش پر راتیں گزارنے لگی۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ شدید سردی کے عالم میں مجھے ٹھنڈے فرش پر لیٹنا پڑتا تھا۔ اپنے سفری تھیلے کو میں بطور تکیہ استعمال کرتی لیکن میرے پھٹے پرانے کپڑے سردی روک نہ پاتے اور میں دیر تک ٹھٹھرتی اور سسکتی ہی رہتی۔

سیڑھیوں کے مدھم بلب کی معمولی روشنی ماحول کی خنکی میں اضافہ کر دیتی۔ میں اپنی جگہ دبکی مختلف اپارٹمنٹوں سے آتی آوازیں سنتی رہتی۔ مثلاً بچوں کی باتیں، والدین کے حکم، کارٹون فلموں کا شور، برتنوں کی کھنک..... غرض وہ تمام آوازیں جو دیواروں کے ڈھانچے کو ایک گھر میں بدلتی ہیں۔

حالات کی سختی اور اپنی تنہائی سے بچنے کی خاطر میں جاگتے میں سہانے سپنے دیکھنے لگتی۔ میں تصور ہی تصور میں دیکھتی کہ میں اپنے ماں باپ اور چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھی ہوں، ہم ہنسی خوشی باتیں کر رہے ہیں۔ ماما جب ہنستیں تو ان کی آنکھوں کے اردگرد چھوٹی چھوٹی لکیریں بن جاتی تھیں جو بہت بھلی لگتیں۔ تب ہمارا چھوٹا سا خاندان ایک چھت تلے مطمئن زندگی گزار رہا تھا لیکن پھر..... میں سب سے زیادہ اپنے مستقبل کے بارے میں خواب دیکھتی۔

یہ سوچ کر میرے ذہن میں گلاب کی کلی پھوٹ پڑتی کہ میں اسکول کی جماعت میں بیٹھی تندہی سے نوٹس اتارنے میں مصروف ہوں۔ پھر میں دیکھتی کہ میں یونیورسٹی کی بلند و بالا دیواروں تلے گھوم پھر رہی ہوں۔ میرے قدموں کے نیچے خزاں کے پتے چرمرا رہے ہیں اور میں بے تابی سے جماعت کی طرف رواں دواں ہوں۔ ایسے ہی میٹھے سپنے دیکھتے اور امید کے دیے جلاتے میں نیند کی آغوش میں پہنچ جاتی۔

☆☆

آج میری زندگی ماضی کی تلخیوں اور مصیبتوں سے یکسر مختلف ہو چکی۔ میں نہ صرف ہائی سکول پاس کر چکی بلکہ اب میں ہارورڈ یونیورسٹی جیسے دنیا کے اعلیٰ ترین تعلیمی ادارے کی ڈگری رکھتی ہوں۔ ایک عمدہ ملازمت کر رہی ہوں اور میرے پاس رقم کی کوئی کمی نہیں۔ میں پھٹے پرانے نہیں خوبصورت کپڑے زیب تن کرتی ہوں۔ سیڑھیوں کے برآمدے میں نہیں سوتی، بلکہ مین ہیوسٹن میں میرا اپنا اپارٹمنٹ ہے۔ اب میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ بن چکا کہ دنیا میں جہاں بھی کوئی انسان اپنی زندگی خود بنانا چاہتا ہے، میں اس کی مدد کروں۔ مختصر یہ کہ میں اپنی سابقہ ہیت سے بالکل تبدیل ہو چکی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ میری زندگی اور ملنے والے تجربات نے مجھے یہ سبق سکھایا ہے کہ انسان کو کسی حد تک تمنائیں اور خواہشیں ضرور پالنی چاہئیں..... یہ ایک صحت مند فطری رویہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ تمنائیں ہی ہیں جو انسان کو کچھ کرنے پر ابھارتیں اور اسے آگے بڑھنے پر اکساتی ہیں۔ یہ تمنائیں ہی ہیں جنھوں نے مجھے میٹھے سپنے دکھائے، میری راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں، بلکہ منزل تک پہنچانے میں مددگار بن گئیں اور یہ خواب ہی ہیں جو ہمیشہ مجھے متحرک رکھتے ہیں۔

۱۶ برس کی عمر میں میرے پاس رہنے کا ٹھکانہ نہیں تھا، چنانچہ میں دن بھر نیویارک کی گلیوں اور سڑکوں میں گھومتی رہتی۔ دراصل مجھے ایسے سکول کی تلاش تھی جو مجھے مفت تعلیم فراہم کر سکے اور میری قسمت کا دھارا بدل سکے۔ ایسا وقت



عام انسان کے لیے بڑا اذیت ناک ہوتا ہے لیکن میں نے اسے اپنا آپ تباہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے ٹھنڈے فرش پر لیٹے لیٹے، خوشحال مستقبل کے جو خواب دیکھے ہیں، وہ ایک نہ ایک دن ضرور پورے ہوں گے۔

اگرچہ اس دور کی تلخ یادیں میں آج بھی بھول نہیں پائی اور وہ گانوں کی شکل میں آج بھی میرے پاس موجود ہیں۔ دراصل میرے پاس ایک پرانا سی ڈی پلیئر تھا۔ جب میں اداس اور مایوس ہوتی تو اس میں امنگ پیدا کرنے والے گانے، مثلاً پاؤلا کول کا ''می'' (Me) یا کیک کا ''دی ڈسٹینس'' (The Distance) سننے لگتی۔ یہ لاجواب گانے میری مایوسی دور کرتے اور مجھے اپنا مستقبل روشن اور صاف نظر آنے لگتا۔

تب میں اپنا خاندان کھو چکی تھی اور میری کل کائنات چند جوڑوں، ایک سی ڈی پلیئر، میری ماں کی تصویر اور بھیک میں مانگی گئی خوراک پر مشتمل تھی۔ اس کے باوجود میں نے مستقبل کے سپنے دیکھنے نہیں چھوڑے بلکہ اس عمل کو تب آپ میری واحد تفریح سمجھ لیجیے۔ درحقیقت میں یہ خواب دیکھ کر اتنی ہی خوش ہوتی تھی جتنی خوشی مجھے ہارورڈ میں داخل ہو کر ملی۔

ہوائی جہاز ہو یا بحری جہاز، اس کا کپتان اپنی سواری کو منزل کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ ایسے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میری منزل کہاں ہے۔ چنانچہ میری منزل ہی پھر میری روزمرہ سرگرمیوں کی راہ نما بن گئی اور میں قدم بہ قدم اس کی جانب سفر کرنے لگی۔

مجھے سب سے پہلے اندھیرے میں امید کی کرن ایک اکیڈمی، ہیومنیٹیز پری پریٹری اکیڈمی (Humanities Preparatory Academy) نے دکھائی۔ دنیا پہلے ''نہ'' سے بھری پڑی تھی، لیکن اس کی ایک ''ہاں'' نے میرے دل کی کلی کھلا دی اور میں وہاں مفت تعلیم پانے لگی۔

اسی کے بعد ''ڈور'' (Door) نامی ادارہ میری زندگی میں بہار بن کر داخل ہوا۔ اس فلاحی ادارے نے مجھے نہ صرف خوراک اور ادویہ مفت مہیا کیں بلکہ مستقبل کے متعلق مفید مشورے بھی دیے اور میری ہمت بندھائی۔ ڈور ہی نے رات کو میری رہائش کا بندوبست بھی کر دیا جہاں میں سو سکتی تھی۔

جب میں اکیڈمی سے فارغ ہوتی تو قریبی باغ پہنچ کر پڑھتی رہتی۔ شام سر پر آتی تو ریلوے اسٹیشن چلی جاتی۔ وہاں کی چکا چوند روشنیاں مجھے پڑھنے کا موقع فراہم کر دیتیں۔

لیکن مجھے حیران کر دینے والی مدد خلافِ توقع جگہ سے ملی اور خود چل کر میرے پاس آئی۔ ہوا یہ کہ بے گھری اور عالمِ کسمپرسی کے عالم کے باوجود میں نے تسلسل دو برس تک مضامین میں اے ون گریڈ حاصل کیے۔ کسی طرح دی نیویارک ٹائمز کے ایک رپورٹر کو میری جدوجہد زندگی معلوم ہو گئی۔ اس نے پھر میرے جاننے والوں اور مجھ سے میری کہانی سنی اور اخبار میں شائع کر دی۔

اس کے بعد آنے والے ہفتوں میں درجنوں مرد و زن نے مجھے فون کیے اور خط لکھے۔ خطوط میں میری حوصلہ افزائی کی گئی اور مجھے تو تعریف و توصیف سے نوازا گیا۔ پھر بعض ایسے اجنبی نمودار ہوئے جنھوں نے مجھے تحفتاً کپڑے، کتابیں اور قلم دیے اور جاتے جاتے ہم آغوش بھی ہو جاتے۔

جب درج بالا مضمون شائع ہوا تو میں ہارورڈ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ الاسکا کی ایک خاتون نے بطور خاص میرے لیے کمبل ہاتھ سے تیار کیا اور اس نوٹ کے ساتھ مجھے بھجوایا: ''یونیورسٹی کے کمروں میں بہت سردی ہوتی ہے۔ تم یہ کمبل اوڑھنا اور گرم ہو کر یہ ضرور سوچنا کہ تمھاری دیکھ بھال کرنے والے لوگ موجود ہیں۔''

یہ سب لوگ میرے لیے اجنبی تھے اور بہت سوں کے تو میں نام بھی نہیں جانتی۔ ان سے ملنے سے پہلے مجھے احساس تک نہ تھا کہ دنیا میں اچھے لوگ بھی پائے جاتے ہیں..... لیکن اب یہ بات جانتی ہوں اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ انھی لوگوں نے ہمیشہ کے لیے مجھ کو بدل ڈالا۔

آج میں ''ڈور'' کے بورڈ کی سرگرم رکن ہوں اور میں ایک وجہ سے اس تنظیم میں شامل ہوئی۔ دراصل یہ تنظیم بے گھر نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لیے ایک ہائی سکول کھولنا چاہتی ہے لہٰذا میں بھی اپنی بساط بھر کوششوں سے اس کارِ خیر میں حصہ لے رہی ہوں۔ میں نے دوسروں کے لیے راستہ بنانا اپنا مقصدِ حیات بنا لیا ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

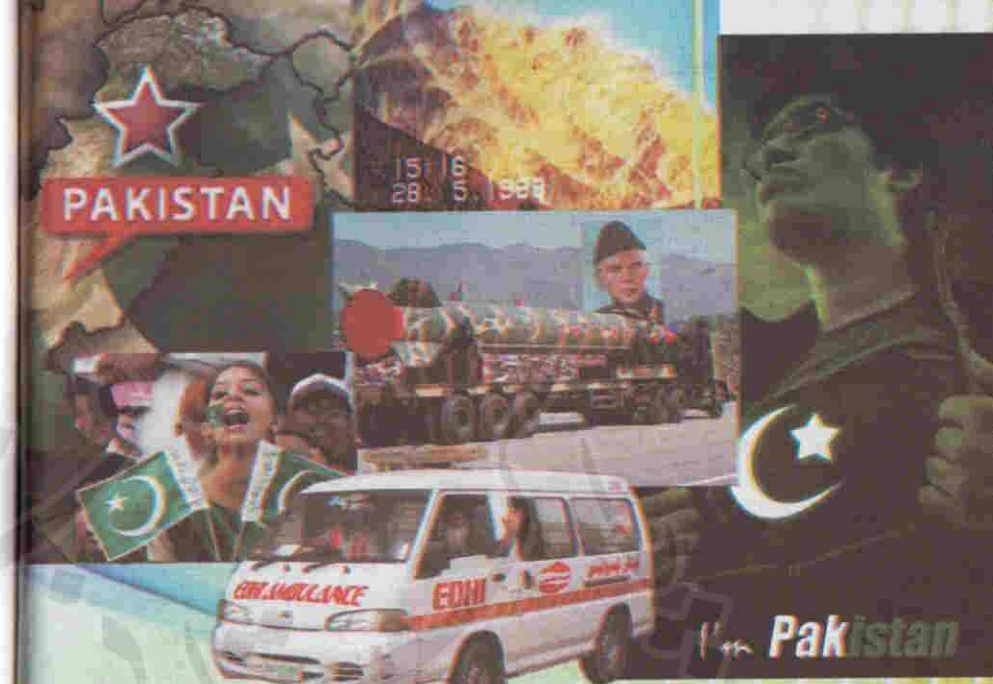


# ہم کسی سے کم نہیں

کم ہمتوں کی ہمت بندھانے والے ذہین، محنتی اور فرض شناس پاکستانیوں کے یہ مثالی کارنامے

تحریم حنا صدیقی

دُنیا میں بلحاظ آبادی چھٹے اور اسلامی دنیا کے دوسرے بڑے ملک پاکستان کو قائم ہوئے ۶۴ برس بیت چکے۔ چھ دہائیوں کے اس سفر میں جہاں پاکستانیوں کو مشکلات اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا، تو دوسری جانب بہت سی کامیابیاں بھی سمیٹیں۔ مثلاً دُنیا کی سب سے بڑی رضا کار، ایدھی ایمبولینس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سروس۔ عالمی سطح پر استعمال ہونے والے ۸۰ فیصد فٹ بال پاکستان میں بنتے ہیں۔ ایک دن میں عالمی سطح پر سب سے زیادہ پودے لگانے کا اعزاز بھی پاکستانیوں کے پاس ہے۔ ۱۴۲ سال سے کام کرنے والے امریکی ادارے گولڈمان ساچس (GOLDMAN SACHS) کے مطابق ۲۰۲۵ء تک پاکستان اٹھارویں (اب چھبیسویں) بڑی معیشت بن جائے گا۔

اسی طرح ورلڈ اکنامک فورم کی فرسٹ فنانشل رپورٹ کے مطابق پاکستانی بینکاری نظام نئی خدمات فراہم کرنے کے لحاظ سے روس، انڈونیشیا، ترکی، پولینڈ، برازیل، فلپائن اور قازقستان سے بہتر ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کے مطابق پاکستان میں گزشتہ دس سال میں فی کس آمدنی میں سو فیصد اضافہ ہوا۔ گیلپ کے عالمگیر سروے کی رو سے زراعت اور اس سے متعلق شعبوں میں پاکستان میں بہترین کاروباری ماحول ملتا ہے۔ انٹرنیٹ استعمال کرنے کے حوالے سے پاکستان کا نمبر دنیا میں پندرہواں ہے۔ اسی طرح ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے والا پہلا اسلامی ملک ہے۔

۱۹۴۷ء میں ملک میں چینی کے صرف دو کارخانے تھے، اب ان کی تعداد ۷۸ ہو چکی۔ انٹرنیشنل کاٹن ایڈوائزری کمیٹی کے مطابق دنیا میں سوتی کپڑے کی کل برآمدات میں سے آٹھ اعشاریہ ایک فیصد پاکستان کرتا ہے۔ گزشتہ آٹھ برس کے دوران ملک میں آئی ٹی انڈسٹری نے چالیس فیصد ترقی کی اور اُس کا حجم دو اعشاریہ آٹھ ارب ڈالر تک پہنچ چکا۔ یونی سیف کے مطابق ۱۵ سال سے کم عمر بچوں کی شادی کی شرح پاکستان میں ۳۲ اور بھارت میں ۴۷ فیصد ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق فی لاکھ آبادی کیلئے پاکستان میں ۸۰ اور بھارت میں ۶۰ ڈاکٹر ہیں۔ یونی سیف کے مطابق فی لاکھ ماؤں میں زچگی کے دوران شرح اموات پاکستان میں ۳۲۰ اور بھارت میں ۴۵۰ ہے جبکہ کم وزن بچوں کی شرح پاکستان میں ۳۸ اور بھارت میں ۴۹ فیصد ہے۔

ہیومن ڈویلپمنٹ رپورٹ کے مطابق پاکستانیوں کی اوسط عمر ۶۴ اعشاریہ ۲ اور بھارتیوں کی ۶۲ اعشاریہ ۴ سال ہے۔ سنٹر فار پاورٹی ریڈکشن کے مطابق پاکستان میں غربت کی شرح بھارت کی نسبت کم ہے۔ اسی طرح جینی اشارے (GINI INDEX) کے مطابق پاکستان میں امیر غریب کے درمیان خلیج بھارت کی نسبت کم ہے۔ ذیل میں ان کارناموں کا مختصر جائزہ پیش ہے جو حالیہ چند برسوں میں پاکستانیوں نے انجام دیے اور ہمارا سر فخر سے اونچا کر دیا۔

## پاکستانی مواصلاتی سیارہ

ہمارے انجینئر چین میں پاکستانی سیارچے کی تیاری کے تمام مرحلوں میں چینی ہم منصبوں کے شانہ بشانہ رہے۔ ''پاک سیٹ'' کا خلا میں پہنچنا تاریخی موقع ہے کیونکہ اس سے پاکستان ان اقوام کی صف میں شامل ہوگیا جو اپنے مواصلاتی سیارے رکھتے ہیں۔

ماہ اگست میں پاکستان نے چین کی مدد سے اپنا پہلا مواصلاتی سیارچہ، پاک سیٹ ون آر خلاء میں بھیجا۔ یہ

سیارچہ کامیابی سے اپنے مدار میں پہنچ کر زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اسے زی چانگ سیٹلائٹ لانچ مرکز سے چینی خلائی راکٹ کے ذریعے مدار میں پہنچایا گیا۔ پاک سیٹ ون آر

پہلے سے خلائی مدار میں موجود پاک سیٹ ون کی جگہ نصب کیا گیا۔ جنوبی اور مرکزی ایشیا، مشرقی یورپ، مشرقی افریقہ اور مشرق بعید تک ٹی وی نشریات، انٹرنیٹ اور ڈیٹا کمیونیکیشن کی خدمات فراہم کرے گا نیز اس سے پاکستان کے تمام علاقوں میں مواصلاتی سروسز کی رسائی ممکن ہوگی۔

## جگر کی پیوندکاری

پاکستان میں جگر کی پیوندکاری کا پہلا کامیاب آپریشن شیخ زید ہسپتال، لاہور میں رواں سال کے اوائل میں ہوا۔ اس آپریشن میں ڈاکٹر طارق بنگش اور ڈاکٹر عامر لطیف سمیت دیگر ڈاکٹروں نے حصہ لیا اور جگر کا پہلا ٹرانسپلانٹ کامیابی سے کیا۔ ٹرانسپلانٹ کے بعد ۴۲ سالہ شخص کی حالت بہتر ہے جبکہ جگر کی قربانی دینے والا ۱۵ سالہ نوجوان، ارسلان ہزاروں من مٹی تلے دفنا دیا گیا۔

ارسلان کی والدہ کا کہنا ہے، وہ اپنے بیٹے کے ساتھ شیخ زید ہسپتال آ رہی تھیں کہ راستے میں حادثہ ہو گیا۔ ان کا اکلوتا لختِ جگر ارسلان جو کیتھڈرل سکول میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا، سر پر شدید چوٹ لگنے سے بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے انہیں بتایا کہ بچے کی کلینیکل ڈیتھ ہو چکی۔ اگر آپ اجازت دیں تو ارسلان کا جگر ایک قریب المرگ مریض کو لگا کر اس کی زندگی بچالیں۔ ارسلان نے ایک بار والدین



سے کہا تھا کہ اگر میں مر گیا تو میرے اعضا عطیہ کر دینا چنانچہ والدہ نے جگر عطیہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

## دبئی کی عالمگیر ممتاز شخصیت

عالمی سطح پر چہار زاویہ نظریہ پیش کر کے تہلکہ مچانے والے پاکستانی سائنس دان، محقق اور بائیو میگنیٹک سیکٹوریل ماڈل کے موجد ڈاکٹر اورنگزیب حافی کو دبئی کی عالمگیر ممتاز شخصیت کا اعزاز دیا گیا۔ ڈاکٹر حافی کو یہ اعزاز ایک برطانوی ادارے ڈیکیڈ میرٹ سیکرٹیریٹ کے عالمی ادارہ نے



دیا۔ اس مقابلے میں دنیا کے ۱۷۹ سے زائد ممالک کے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات نے اپنے کارہائے نمایاں پیش کیے تھے۔ ان کی تعداد ۱۱۷۰۹۰ تھی۔ ان میں سے ۱۷۹۲۱ کو آخری مرحلہ کے لئے چنا گیا۔ مقابلے میں حصہ لینے والی بین الاقوامی شخصیات میں برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس، جنوبی افریقہ کے سابق صدر نیلسن منڈیلا، وکی لیکس کے جولین اسانج اور ماہر نفسیات سٹیفن سولڈز بھی شامل تھے۔

ڈاکٹر اورنگزیب حافی کو ۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۰ء دبئی میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عالمگیر سطح پر نمایاں شخصیت قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر حافی یہ اعزاز حاصل کرنے والے نہ صرف پہلے پاکستانی بلکہ پہلے مسلمان اور پہلے ایشیائی باشندے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر حافی کو شعبۂ تحقیق میں نمایاں خدمات انجام دینے پر ۲۰۰۵ء میں برطانوی حکومت کی جانب سے ''سر'' کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ وہ سال ۲۰۰۳ء کی بہترین شخصیت بھی قرار پائے تھے۔ ڈاکٹر حافی کو نوبل امن انعام کے لئے بھی نامزد کیا گیا، تاہم انہوں نے یہ انعام لینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ نوبل نے بارود بنا کر اربوں انسانوں کی ہلاکت کا سامان مہیا کیا۔ ڈاکٹر حافی نے اپنی زندگی ان خصوصی بچوں کے نام کر دی ہے جو پیدائش سے قبل ہی ماں کے پیٹ میں معذوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق پنجاب کے ضلع گوجرانوالہ سے ہے۔

## اے لیول میں عالمی ریکارڈ

علی معین نوازش ایسا نوجوان ہے جس پر پاکستان فخر کر سکتا ہے۔ اس کی اپنی تحریر میں سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

''زندگی اس سے کئی گنا زیادہ عجیب ہے جتنا ایک انسان تصور کر سکتا ہے اور میں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ تین سال قبل میں کیمبرج یونیورسٹی میں کمپیوٹر سائنس کی ڈگری لینے کا خواب حقیقت بنانے میں مگن تھا۔ میں جوان، ناسمجھ اور اپنے دیگر ہم عمروں کی طرح اصل دنیا کی حقیقت سے بے خبر تھا۔ میں اُس وقت جو خواب دیکھا کرتا تھا وہ کیمبرج یونیورسٹی میں ایک اچھے طالب علم کی حیثیت سے ڈگری لینے، پھر گوگل، ایپل اور مائیکروسافٹ جیسے کسی اچھے ادارے میں اچھی ملازمت حاصل کرنے اور امریکہ یا یورپ میں جا بسنے تک محدود تھا۔ لیکن آج سب کچھ یکسر بدل چکا۔''

''میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جب اللہ کے فضل سے میرے لیے امریکہ اور یورپ کا کم و بیش ہر دروازہ کھلا تھا، میں پاکستان واپس کیوں آیا؟ میں نے چند سال قبل جو خواب دیکھا تھا، اُسے میں کئی گنا بہتر انداز میں شرمندۂ تعبیر کرنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن اسے ادھورا چھوڑ کر ایک نئی زندگی کی طرف کیوں لوٹ آیا؟''

''دراصل اس تبدیلی کا آغاز اس اعزاز سے ہوا جو مجھے اللہ نے اے لیول میں سب سے زیادہ مضامین میں اے گریڈ لینے پر دلوایا۔ میری اس کامیابی پر پاکستانی قوم نے جس بے پناہ عزت اور محبت سے نوازا۔ میں نے کبھی زندگی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ محبتوں اور عنایتوں کا یہ سلسلہ اس قدر دراز ہوا کہ مجھے کم عمری ہی میں میڈیا، سیاستدانوں، دانشوروں اور حکمرانوں، غرض زندگی کے ہر شعبے کے لوگوں کے ساتھ ملنے کا موقع میسر آیا۔ پاکستان نے مجھے جو محبت دی، اُس نے میری زندگی، زندگی کے مقاصد، اہداف اور آئیڈیل کو یکسر بدل ڈالا۔''



''اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ یہ عزت، یہ شہرت اور یہ مواقع تو پاکستان کی برکت سے

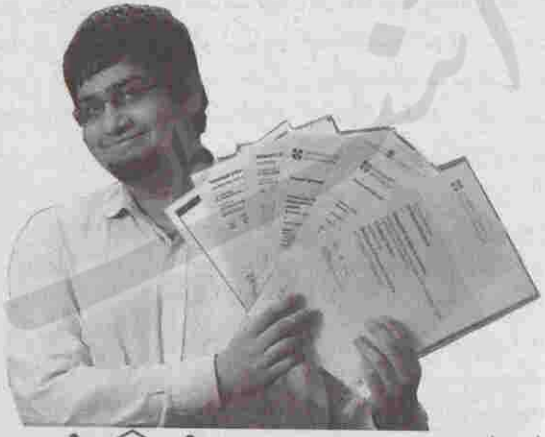

ہیں۔ میں ان نوے ہزار پاکستانی طالبعلموں میں سے ایک ہوں جنھوں نے او اور اے لیول کیا ہوا ہے اور میں ان کروڑوں پاکستانیوں میں سے ایک ہوں جنھیں اللہ نے پڑھنے اور آگے بڑھنے کے مناسب مواقع دیے۔ اللہ نے اگر مجھے اس اعزاز اور پاکستانی قوم نے اس عزت سے نوازا ہے تو کیوں نہ ذاتی خواہشات کی دنیا کا پجاری بننے اور صرف اپنی ذات کا بن کر رہنے کے بجائے پاکستان جا کر اس کی تن من دھن سے خدمت کی جائے۔"

"میں نے ایک دن کیمبرج میں اپنے پروفیسر سے پوچھا کہ ان کے نزدیک پاکستان کا مستقبل کیا ہے؟"

اُنہوں نے فوراً جواب دیا "علی اس سوال کا جواب تم دے سکتے ہو کیونکہ پاکستان کا مستقبل وہی ہوگا جو تم اور تم جیسے دوسرے نوجوان بنائیں گے۔"

## ابراہیم شاہد کا کارنامہ

علی معین نوازش کی طرح ابراہیم شاہد بھی ایک ایسا نوجوان ہے جس پر پاکستانی فخر کر سکتے ہیں۔ شاہد اپنے بارے میں کچھ یوں بتاتے ہیں:

"میں نے او لیول میں ۲۴ مضامین میں سے ۲۳ مضامین میں اے گریڈ لے کر کیمبرج یونیورسٹی میں عالمی ریکارڈ بنایا۔ میں اپنی تمام تر کامیابیوں کو اپنے وطن کے نام کرتا ہوں کیونکہ اس ملک نے مجھے ہر چیز سے نوازا ہے۔ میں اس ملک کی بدولت فخر سے سر اٹھا کر چل سکتا ہوں۔ اس ملک کے لوگوں نے مجھے جو پیار دیا، وہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

میں نے اپنا بچپن آسٹریلیا میں گزارا لیکن وہاں زندگی اتنی آسان نہیں تھی۔ وطن واپس آ کر سیکنڈری تعلیم ایک نجی تعلیمی ادارے سے شروع کی۔ ماں باپ کی دعاؤں اور اساتذہ کی محنت سے میں آج اس مقام پر کھڑا ہوں۔ اللہ نے میری محنت میں برکت ڈالی، میں نے عالمی ریکارڈ بنایا اور پھر مجھے پوری دنیا میں بحیثیت پاکستانی تسلیم کیا گیا۔ یوں مجھے اپنے وطن کا نام بلند کرنے کا موقع ملا۔ میں اپنے بزرگوں کو یقین

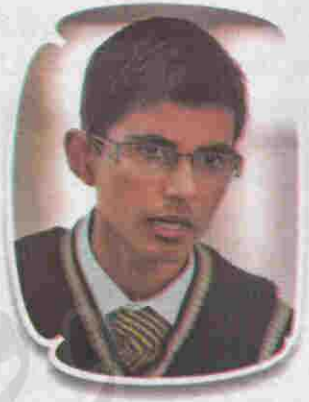

دلاتا ہوں کہ وہ آج کی نوجوان نسل سے مایوس نہ ہوں، نوجوان اس ملک کو ضرور آگے لے کر جائیں گے۔

## ادب پتی آن پڑھ پاکستانی

سلیم لاہور کا ایک معمولی سا الیکٹریشن تھا۔ یہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں لاہور کی ایک کاٹن مل میں چھوٹا سا ملازم تھا اور وہاں سوئچ، فیوز لگاتا تھا۔ یہ مل کا ایسا ملازم تھا جسے فورمین سے اوپر کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس دور میں سلیٹر مشین نئی نئی آئی تھی۔ یہ مشین رنگائی کے دوران کپڑے کی "ہیٹ سیٹنگ" کرتی تھی۔ اس مشین سے گزرنے کے بعد کپڑے کا رنگ نہیں اُڑتا تھا۔ سلیم جس فیکٹری میں کام کرتا تھا، اس کے مالک نے کوریا سے سلیٹر مشین منگوائی۔ یہ مشین اس دور میں ایک کروڑ روپے میں آئی۔

یہ پاکستان میں اس نوعیت کی پہلی مشین تھی، چنانچہ مالک کو اُسے لگانے اور چلانے کے لیے کوریا سے انجینئر بلانا پڑ گئے۔ یہ بیس لوگوں کی ٹیم تھی جس کی آمد و رفت، رہائش اور خوراک کے اخراجات مالک نے برداشت کیے۔ کوریائی انجینئروں کے لیے فائیو سٹار ہوٹل میں کمرے بک کیے گئے۔ گاڑیوں، گائیڈ اور محافظوں کا بندوبست ہوا۔ مشروبات اور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوراک کا انتظام بھی کیا گیا۔ یہ لوگ دو ماہ تک پاکستان میں رہے۔ جاوید چودھری نے اپنے ایک کالم میں سلیم کی داستانِ حیات لکھی ہے۔

سلیم کورین انجینئروں کے ساتھ بطور مقامی کارکن شامل تھا۔ کوریا کا چیف انجینئر سلیم کو جہاں تار لگانے کا کہتا، وہ لگا دیتا۔ جس جگہ سوئچ، فیوز لگانے اور جس پرزے کو جتنی وولٹیج کا کرنٹ دینے کا کہتا، یہ اُس کو اُتنا کرنٹ دے دیتا تھا۔

سلیم اُس وقت ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ اُس نے مختلف رنگ کے چاک خرید لیے۔ وہ سارا دن کوریائی انجینئروں کو مشین فٹ کرتے دیکھتا، رات کو اپنے کمرے کی بڑی دیوار پر مختلف رنگوں کے چاک سے اس مشین کا ماڈل بناتا رہتا۔ وہ دیوار پر یہ نقش کر دیتا کہ یہ لوگ کس رنگ اور کس گیج کی تار کس مشین سے نکال کر کس مشین میں لا رہے ہیں۔ مشین کے بوائلر کا سائز کیا ہے، کون سا پائپ کس جگہ فٹ کیا گیا، کس قسم کا نٹ یا بولٹ کس جگہ لگایا گیا اور کون سا پرزہ کس جگہ فٹ کیا گیا۔ وہ ایک دن نقشہ بناتا اور اگلے دن مشین کا دوبارہ معائنہ کرتا۔ اُسے اپنے نقشے میں جو کمی یا کوتاہی نظر آتی، گھر جا کر اسے ٹھیک کر لیتا۔ دو ماہ بعد جب مشین نے پیداوار شروع کی تو اس کا پورا ڈایا گرام سلیم کے کمرے کی دیوار پر ثبت ہو چکا تھا۔ سلیم نے سلیٹر مشین لگانے کا سارا عمل سیکھ لیا تھا۔

کوریائی انجینئر مشین لگا کر واپس چلے گئے۔ یہ مشین پاکستان کی کاٹن انڈسٹری میں انقلاب لے آئی۔ اس نے کپڑے کی پیداوار بھی بڑھا دی اور معیار بھی بہتر بنایا۔ یوں فیکٹری کے کاروبار میں اضافہ ہو گیا۔ لہٰذا مالک نے دوسری مشین کا آرڈر دے دیا۔ سلیم کو اس آرڈر کا علم ہوا تو یہ فیکٹری کے مالک کے پاس گیا اور اس سے عرض کیا: "حاجی صاحب آپ نے کوریا کے انجینئروں کو مشین لگانے کے کتنے پیسے دیے تھے؟"

حاجی صاحب نے اسے بتایا "وہ انجینئر ہمیں ۲۵ لاکھ روپے میں پڑے تھے۔" سلیم نے حاجی صاحب کو پیشکش کی "آپ مجھے صرف ۵ لاکھ روپے دیں، میں آپ کو یہ مشین

## منافق آلو.....

میری اماں کو آلو جمع کرنے کا خبط ہے۔ جیسے ہی گلی میں کوئی ریڑھی والا آتا ہے۔ آواز آتی ہے آلو ۵۰ر روپے کلو، آلو ۵۰ر روپے کلو۔ اماں فوراً سبزی کی ٹوکری اٹھائی اور گلی میں جا کر کہتی ہیں "بھائی ۵ر کلو دے دو۔"

ہمارے گھر میں آلوؤں کا ذخیرہ کم ہونے کو نہیں آتا۔ پھر کوئی اور ریڑھی والا آتا ہے۔ آلو ۴۰ر روپے کلو، ۴۰ر روپے کلو، اماں ٹوکری لیے منہ میں بڑبڑاتی چادر کے پلو سے پیسے کھولتی ہوئی جاتی ہیں۔ "نگوڑے پہلے کیوں نہ آ گیا" "تم سے آلو خرید لیتی۔ اچھا ۵ر کلو دے دو۔"

پچھلے دنوں ہم لاہور گئے تو ماں جی ہمراہ تھیں۔ ماموں کے گھر جا رہے تھے تانگہ سبزی منڈی کے پاس سے گزرا۔ آواز آئی آلو ۳۰ر روپے کلو، آلو ۳۰ر تین روپے کلو۔ ماں جی نے تانگہ رکوا لیا۔ میں نے پوچھا کیا ہے؟ کہنے لگیں "یہ لو تھیلا دس کلو لے آؤ....." آلو خرید لیے۔ ماموں کے ہاں پہنچے تو یہ عالم تھا بینٹ کوٹ پہنے سر پر آلوؤں کا توڑا اٹھائے، بچے خوش ہوئے کہ ہمراہ کافی مال لائے ہیں۔ لیکن جب تھیلا ٹٹولا تو بہت مایوس ہوئے۔

ایک دوپہر جب اماں سوئی ہوئی تھیں تو میں نے آلوؤں سے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کر لیا۔ اماں کے پلو سے سٹور کی چابی کھولی اور پڑوس کے ٹیپو کو بلایا اور اسے ٹوکرے میں آلو ڈال دینے اور کہا کہ گھر لے جائے۔ پھر منے کو بلایا، پھر نومی کو، یہاں تک کہ آدھے گھنٹے بعد گلی کے ہر گھر میں آلو پہنچ گئے۔ میں شام کو بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ باجی جمیلہ، جو آلو کی طرح بھاری بھرکم ہیں، تھپ تھپ کرتی آئیں۔ کہنے لگیں "بھائی جان آلو بھیجنے کا شکریہ" اماں حیران ہو کر کہنے لگیں "کون سے آلو؟" وہ سٹور میں گئیں تو انہیں میرے کارنامے کا پتا چل گیا۔ اس دن انہوں نے مجھے باقی ماندہ آلو اٹھا اٹھا کر مارے، اب گلی سے گزرتا ہوں تو کسی نہ کسی کھڑکی یا دروازے سے آتی ہے آلو.....! آلو.....!

(شہزاد حسین علوی، دبئی)

## مضحکہ خیز قوانین

امریکہ کی بعض ریاستوں میں مضحکہ خیز قوانین رائج ہیں جن کے بارے میں پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ ایسے ہی چند قوانین ملاحظہ فرمائیے:

☆.....کوئی بھی کسی تالاب یا جھیل سے ہاتھوں کے ذریعے مچھلی نہیں پکڑ سکتا۔ (ریاست انڈیانا)

☆.....باکسنگ میچ میں کسی تماشائی نے ایک کھلاڑی کی نقل اتاری یا اسے چھیڑا تو اسے جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔ (ریاست لوزیانا)

☆.....ایک شہری کسی دوسرے کی کار کا ہارن نہیں بجا سکتا۔ (یونیورسٹی سٹی، ریاست موری)

☆.....اگر کسی نے ڈوئیل لڑنے سے انکار کیا اور دوسرے نے اس کا مذاق اڑایا، تو اسے جیل میں ڈالا جائے گا۔ (ریاست ویسٹ ورجینیا)

(زاہد لطیف، لاہور)

فٹ کر دوں گا۔ حاجی صاحب کے لیے یہ پیشکش حیران کن تھی کیونکہ یہ ایک جدید ترین ٹیکنالوجی تھی اور پورے ملک میں اسے سمجھنے والا کوئی شخص موجود نہیں تھا۔

حاجی صاحب کے نزدیک سلیم ایک اَن پڑھ اور سادہ سا الیکٹریشن تھا جس کا علم تین تاروں کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ اُنہوں نے اسے طنزیہ نظروں سے دیکھا اور کہا ''اور اگر تم نہ کر سکے تو.....!''

سلیم نے سینے پر ہاتھ باندھ کر جواب دیا ''آپ مجھے اسی فیکٹری میں پھانسی دے دیجئے گا۔'' حاجی صاحب نے سلیم کو موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی دو وجوہ تھیں۔ پہلی وجہ ۲۰ لاکھ روپے کا فائدہ تھا۔ سلیم ۲۵ لاکھ کا کام پانچ لاکھ روپے میں کر رہا تھا۔ دوسرے اگر یہ تجربہ کامیاب ہو جاتا تو فیکٹری کو ریاکے انجینئروں کی محتاجی سے نکل جاتی۔ حاجی صاحب نے سلیم کی پیشکش قبول کر لی۔

حاجی صاحب کی مشین کوریا سے پاکستان پہنچی تو انہوں نے سلیم کو کام کرنے کی اجازت دے دی۔ سلیم نے دیوار پر بنائے ڈایاگرام کے مطابق مشین جوڑ ڈالی۔ اس مشین نے نہ صرف کام شروع کر دیا بلکہ پہلی کے مقابلے میں زیادہ پیداوار دینے لگی۔ یوں تین ہزار روپے ماہانہ کمانے والا معمولی الیکٹریشن ایک ماہ میں ۵/لاکھ روپے کا مالک بن گیا۔ یہ سلیم کی کامیابی کا آغاز تھا۔ اس کے بعد پورے ملک میں تمام سٹینٹر سلیم نے لگائے۔ اس کا ایک پاؤں کراچی ہوتا، دوسرا لاہور، تیسرا فیصل آباد اور چوتھا پشاور اور وہ ہر کاٹن مل کی ضرورت بن گیا۔

سلیم نے ۱۹۹۰ء کی دہائی کے آغاز میں اپنا سٹینٹر بنایا۔ یہ غیر ملکی سٹینٹر کے مقابلے میں سستا بھی تھا۔ اس کے فاضل پرزہ جات بھی دستیاب تھے اور یہ مقامی مارکیٹ کی ضرورت کے مطابق بھی تھا۔ قصہ مختصر وہ سلیم جو کبھی ہاتھ باندھ کر حاجی صاحب کے پاس گیا تھا، اب اُسی کو حاجی صاحب فون کرتے اور کہتے ''سلیم صاحب! میری مشین گڑبڑ کر رہی ہے۔ کیا آپ چکر لگا لیں گے؟'' اور سلیم انہیں جواب دیتا ''حاجی صاحب میں کراچی جا رہا ہوں تین دن بعد آپ کے پاس چکر لگاؤں گا۔'' اور حاجی صاحب اس کی منتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ یہ سلیم آج بھی لاہور میں موجود ہے۔ کاٹن کے کاروبار سے وابستہ بیشتر لوگ اس کے نام اور کام، دونوں سے واقف ہیں۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# کیا آپ جانتے ہیں؟

نوید انور، چشتیاں

اگر سمندر کی تہہ کو بھی شمار کیا جائے تو دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ماؤنٹ ایورسٹ نہیں، ماؤنٹ کیا (Kea) ہے۔ یہ پہاڑ امریکی جزیرے ہوائی میں واقع ایک آتش فشاں ہے۔ اس کی کل بلندی تقریباً ۱۰ ہزار میٹر ہے لیکن اس میں سے تقریباً ۶ ہزار میٹر بلندی پانی کے اندر ہے۔ مگر یہی بلندی ماؤنٹ کیا کو سب سے بلند پہاڑ بنا دیتی ہے کیونکہ ماؤنٹ ایورسٹ کی اونچائی ۸۸۰۰ میٹر ہے۔

☆☆

برطانیہ کے بعض ساحلوں کا ۵ء۱ میٹر علاقہ ہر سال سمندر کھا جاتا ہے۔ آپ کو علم ہوگا کہ برطانیہ کے چاروں طرف سمندر ہے۔ اگر یہ تمام ساحلوں کو ۵ء۱ میٹر کے حساب سے کھانے لگے تو اگلے ۵۰/ہزار برس میں برطانیہ کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ لیکن انگریزوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے بیشتر ساحل سمندر صرف ۱۰ سینٹی میٹر سالانہ کے اعتبار ہی سے ہڑپ کرتا ہے۔ اگرچہ عالمی گرماؤ (گلوبل وارمنگ) کے باعث سمندروں کی سطح بڑھنے سے برطانیہ کے ساحلی شہروں کو ڈوبنے کے حقیقی خطرات لاحق ہیں۔ یوں آئرلینڈ کو بھی سخت نقصان پہنچے گا جس کا چار لاکھ پینتیس ہزار ایکڑ رقبہ سمندر برد ہو جائے گا۔

☆☆

اگر ہم اسفنجوں کو بھی زندہ شے شمار کریں تو انھیں ہی کرۂ ارض پر سب سے زیادہ طویل عمر پانے کا اعزاز حاصل ہے۔ اسفنج کی ایک قسم، دیو ہیکل بیرل (Giant Barrel) اسفنج سوا دو ہزار سال تک زندہ رہتا ہے۔ مچھلیوں میں یہ اعزاز شمالی بحر اوقیانوس میں ملنے والی ایک مچھلی، آرکٹکا آئسلینڈ کا (Arctica Islandica) کو حاصل ہے۔ یہ مچھلی ۴۰۰ سال تک زندہ رہ سکتی ہے۔ ممالیہ جانوروں میں معمر ترین جانور ہونے کا اعزاز بوہیڈ (Bowhead) وہیل کے پاس ہے۔ یہ وہیل ۱۰۰ سال سے زیادہ عرصہ زندہ رہتی ہے۔

☆☆

سائنس دانوں نے تحقیق کے ذریعے دریافت کیا ہے کہ نابینا ہماری طرح خواب نہیں دیکھتے، یعنی انھیں انسان یا اشیا نظر نہیں آتی۔ تاہم وہ آواز، چھونے، ذائقے اور خوشبو سے متعلق خواب دیکھ سکتے ہیں۔ مزید براں جو مرد و زن ۷ برس کے بعد نابینا ہوں، وہ اپنے خوابوں میں شکلیں یا اشیا دیکھ سکتے ہیں۔

☆☆

ایک بالغ انسان تقریباً ایک ہزار ارب خلیوں کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح ہمارے جسم میں دس ارب جراثیم بھی ملتے ہیں لیکن ہر جرثومے کا وزن ایک خلیے کی نسبت ۱۰ ہزار گنا کم ہے۔ یہ بھی خدائی نعمت ہے کیونکہ جراثیم بھی خلیے جتنے ہوتے تو ہم موجودہ وزن سے دس گنا زیادہ وزن رکھتے۔

☆☆

کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے نشانِ انگشت (فنگر پرنٹ) ایک دفعہ مٹنے کے بعد دوبارہ نمودار ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نشانِ انگشت کی جڑیں ہماری جلد کے نیچے موجود تین تہوں تک جا پہنچتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نشانِ انگشت عموماً مجرم تک پہنچنے کا اہم ذریعہ بن جاتے ہیں۔ عموماً مستریوں یا اینٹوں کا کام کرنے والوں کے نشانِ انگشت مٹتے اور بنتے رہتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ کام چھوڑیں، ان کے ہاتھوں میں مستقل نشان ثبت ہو جاتے ہیں۔

لیکن جلد کو کسی باعث گہرائی تک نقصان پہنچے یا وہ جل جائے تو پھر نشانِ انگشت دوبارہ نہیں بنتے۔ ۱۹۳۰ء میں ایک برطانوی ڈاکو جان ڈلنگر نے سعی کی تھی کہ وہ تیزاب سے اپنے نشان مٹا ڈالے لیکن ناکام رہا۔ بچ جانے والے نشانِ انگشت ہی نے آخرکار اُسے گرفتار کروا دیا۔

☆☆

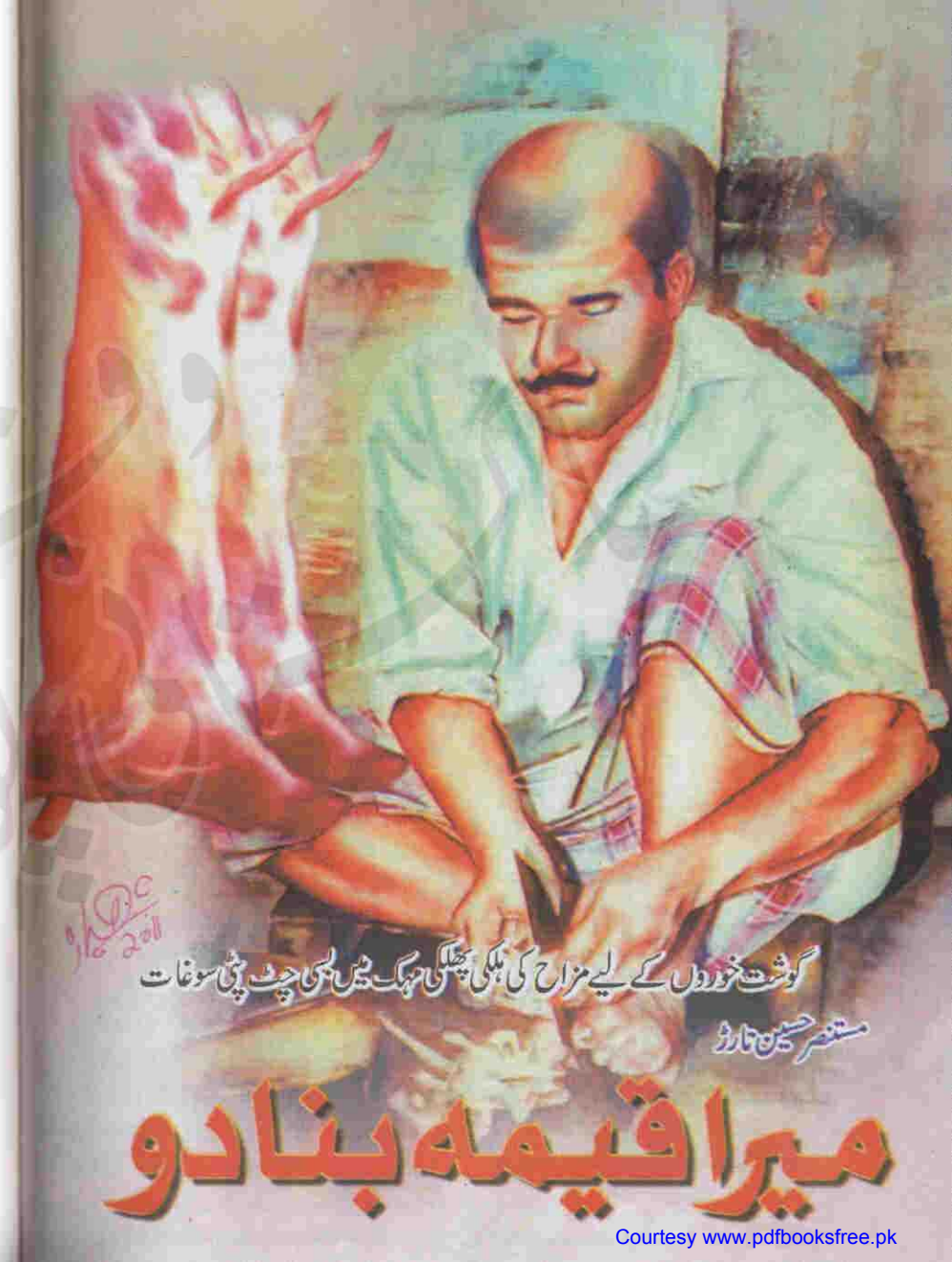

# میرا قیمہ بنادو

گوشت خوروں کے لیے مزاح کی ہلکی پھلکی مہک میں بسی چٹ پٹی سوغات

مستنصر حسین تارڑ

میں ٹولنٹن مارکیٹ میں چھوٹے گوشت کی ایک دکان پر کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا اور کچھ اس قسم کے "جذباتی" سوال جواب سن رہا تھا۔

"نسیم بھائی پہلے میرا قیمہ بنادیجیے" ایک خاتون کہہ رہی تھیں۔

"بہن جی آپ فکر ہی نہ کریں، میں آپ کا ایسا قیمہ بناؤں گا کہ آپ یاد کریں گی......!"

"ذرا جلدی کریں نسیم بھائی۔"

"بس آپ کھڑی رہیں۔ آپ کے کھڑے کھڑے میں آپ کا قیمہ بنادوں گا۔"

"قیمہ روکھا بناؤں یا موٹا......"

"روکھا ٹھیک رہے گا لیکن میں ذرا جلدی میں ہوں۔"

"بہن جی یہ قریشی صاحب کا قیمہ ہے یہ والا جو میں کوٹ رہا ہوں، اس کے بعد ان شاءاللہ آپ کا قیمہ بنے گا۔"

"نسیم صاحب...... مغز چاہیے، مل جائے گا؟" ایک صاحب دریافت کرتے ہیں۔

"کیوں نہیں جناب...... یہ ہمارے لیڈران کرام تھوڑی ہیں، بکرے ہیں۔ ان میں بہت مغز ہے، ابھی دیتا ہوں۔"

"اور میرے گردوں کا کیا ہوا؟" ایک آواز آتی ہے۔

"یہ والے!" نسیم کا بھائی جو شکل سے ہیرو لگتا ہے چند گردے فضا میں بلند کرتے ہوئے کہتا ہے، "آپ کے گردے ہیں...... ابھی نکالے ہیں، بنا کر دیتا ہوں۔"

"اور میری ران......"

"یہ رہی آپ کی ران، بالکل نرم اور تازہ تازہ"۔

"اور میری سری......"

"ابھی توڑتا ہوں......"

"ایک صاحب جو آرڈر دے کر جا چکے تھے، واپس آکر پوچھتے ہیں "یار ابھی تک میرا گوشت نہیں بنایا......"

"اوہو آپ یہ بتائیں کہ آپ کی بوٹیاں کیسے کاٹوں! چھوٹی یا بڑی...... میں پانچ منٹ میں آپ کا گوشت بناتا ہوں جناب......ہم آپ کا گوشت نہیں کاٹیں گے تو اور کس کا کاٹیں گے......"

بالآخر میری باری آتی ہے اور میں ایک مختصر سا آرڈر دیتا ہوں۔

"تارڑ صاحب" نسیم مسکراتے ہوئے کہتا ہے "اتنا گوشت تو پورے محلے کے لیے کافی ہوگا، کیا کریں گے؟ اتنے گوشت کو دیگ میں پکائیں گے؟"

"بھائی آپ براہِ کرم جگتیں نہ کریں اور گوشت بنادیں ......اور یہ والی بوٹی تو اچھی نہیں ہے! یہ نہ ڈالنا۔"

"یہ والی؟" ......وہ بوٹی اٹھا کر اس کی نمائش کرتا ہے "یہ والی بوٹی تو بڑی جذباتی بوٹی ہے تارڑ صاحب......"

نسیم اپنے گوشت کے بارے میں "جذباتی" کا لفظ بے دریغ استعمال کرتا ہے...... مثلاً "جناب یہ گردہ ملاحظہ کیجیے بالکل جذباتی ہے...... یہ چانپ جو آپ دیکھ رہے ہیں، جذباتی ہو رہی ہے آہستہ آہستہ، یہ ران تو خیر ہے ہی جذباتی ...... ویسے میرے پاس غیر جذباتی گوشت بھی ہے لیکن آپ کو مزا نہیں آئے گا...... وہ سامنے والا بکرا جو لٹک رہا ہے، وہ شہنشاہِ جذبات ہے اور بکری جو ہے، یہ ملکۂ جذبات ہے۔ اس کی ٹانگ پیش کروں؟"

گوشت کے بارے میں کالم لکھنا کچھ غیر ادبی سا فعل ہے لیکن کیا کیا جائے، یہ مہنگا ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کی "مسلمانی" کم ہوتی جا رہی ہے۔ گوشت اور مسلمان لازم و ملزوم ہیں...... ہمارے گاؤں میں تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زیادہ گوشت کھانے سے ایمان مضبوط ہو جاتا ہے، لوہے کی طرح...... ظاہر ہے اگر گوشت مہنگا ہوگا تو کم کھایا جائے گا اور اسی حساب سے "مسلمانی" کم ہوتی جائے گی۔ میں بھی اسی لیے فکر مند ہوں......

گوشت کی قیمتوں میں یک دم اضافہ ہو گیا ہے اور کہیں سے احتجاج کا ایک لفظ سنائی نہیں دیا...... سگریٹ مہنگے ہو جائیں تو چھوڑ دو، چائے مہنگی ہو جائے تو کم پیو۔ آٹا مہنگا ہو جائے تو کیک کھا لیں لیکن گوشت تو کم نہیں کھایا جا سکتا...... مجھے چونکہ گوشت کی قیمتوں میں اضافے کی خبر نہ تھی، اس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے میں نے جیب میں پڑی رقم کے مطابق آرڈر دیا اور پھر بعد میں بل زیادہ بننے پر خوب خوب شرمندہ ہوا......

آج گوشت کا بیان چل رہا ہے چنانچہ چھوٹے گوشت کی مارکیٹ سے باہر آجائیے۔ پنجاب پبلک لائبریری کے سامنے بڑے گوشت کی مارکیٹ ہے...... یہاں بھی علم اور گوشت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس مارکیٹ کے اندر بھی دکاندار تقریباً ایک ہی علاقے اور ایک ہی خاندان سے متعلق ہیں۔ ایک مرتبہ میرے والد صاحب جو انتہائی حساس طبیعت کے مالک تھے، گوشت خریدنے آئے۔ قصاب نے ایک بوٹی اٹھا کر کہا ''چوہدری صاحب، بالکل بچے کی بوٹی ہے، بھون کے کھائیے، مزا آجائے گا''۔ وہ دن اور آج کا دن والد صاحب کبھی بڑا گوشت خریدنے نہیں گئے۔ وہاں پر گوشت کے عجیب و غریب شوقین نظر آتے ہیں، ایسے شوقین جو پلاؤ کے لیے الگ گوشت منتخب کرتے ہیں اور کریلے پکانے کے لیے الگ۔ ان میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو صرف سری پایوں کی تلاش میں یہاں آتے ہیں۔

گوشت کھانا مسلمان کی اور خاص طور پر پاکستانی مسلمانوں کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ وہ خوشی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو بھنا ہوا گوشت کھائیں گے یا شکرانے کے طور پر ایک دو بکرے حلال کر دیں گے۔ اگر فوتیدگی ہو جائے تو بھی مہمانوں کی تواضع آلو گوشت سے کی جائے گی۔

میرے ماموں اللہ بخشے کہا کرتے تھے کہ بالکل گلا ہوا نرم گوشت کس کام کا جو نوچ نوچ کر کھایا جائے۔

ایک چھوٹا سا قصہ ہے، جس میں گوشت کے بارے میں ہی کچھ بیاں ہے...... میں اس وقت تقریباً ۱۵۔۱۶ برس کا تھا اور پہلی مرتبہ ولایت جا رہا تھا۔ جہاز میں میرے برابر کی نشست پر ایک مولانا براجمان تھے۔ وہ خاصے معصوم تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ کیوں چچا جان آپ کس سلسلے میں انگلستان جا رہے ہیں تو کہنے لگے! بیٹا کافروں کو مسلمان کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے پوچھا، آپ کو انگریزی آتی ہے؟ کہنے لگے نہیں، جس نے مسلمان ہونا ہوگا اسے خود بخود میری زبان سمجھ آجائے گی......

## کیا کہنے بھئی کیا کہنے!

جس دن سے یہ حکومت آئی کیا کہنے بھئی کیا کہنے
اپنے ساتھ یہ لائی نحوست کیا کہنے بھئی کیا کہنے

سب سے پہلے زلزلے نے اک قیامت ڈھائی تھی
جس کے نام پہ دنیا بھر سے ہم کو امداد بھی آئی تھی

مل جل کر یہ ساری دولت خود انھوں نے کھائی تھی
کیا کیا ان کو ملی سہولت کیا کہنے بھئی کیا کہنے

پھر اک جھیل کا سارا پانی طوفان بن کر بپھر گیا
ظالم موت کا ریلا تھا جو چاروں جانب بکھر گیا

پھر ان کی قسمت جاگی اور لصیبا نکھر گیا
کچھ کہنے کی نہیں ضرورت کیا کہنے بھئی کیا کہنے

سیلابوں نے لوٹ لیا تھا جن قسمت کے ماروں کو
آج بھی سڑکوں پر بیٹھے ہیں پوچھو ان بیچاروں سے

خود تو ڈٹ کر کھاؤ لیکن دیکھو ان لاچاروں کو
کیسے ہو اب انھیں ندامت، کیا کہنے بھئی کیا کہنے

ڈینگی کا بھی نام اے یارو کب اور کس کو آتا تھا
کیا پہلے بھی کوئی حکمران ایسے ناچ نچاتا تھا

ایسی مہلک بیماری سے کیا کوئی ہمیں ڈراتا تھا
ڈالی ہے یہ نئی مصیبت کیا کہنے بھئی کیا کہنے

جس دن سے یہ حکومت آئی کیا کہنے بھئی کیا کہنے
اپنے ساتھ یہ لائی نحوست کیا کہنے بھئی کیا کہنے

(چوہدری عبدالخالق)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُن دنوں ابھی جیٹ مسافر بردار طیارے اڑا نہیں کرتے تھے چنانچہ پنکھوں والا جہاز بڑے مزے سے ہواؤں اور بادلوں سے اٹکھیلیاں کرتا منزل کی جانب جاتا تھا۔ ہم کراچی سے چلے اور پھر طہران، قاہرہ، ایتھنز وغیرہ میں رکتے رکتے روم پہنچے۔ روم میں دو گھنٹے کا سٹاپ تھا اور ایئر لائن کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ مسافر حضرات ہوائی اڈے کے ریستوران میں جا کر اپنی پسند کا کھانا تناول فرمائیں، بل کمپنی کے ذمے ہوگا۔ اس اعلان پر مسافر حضرات بے حد خوش ہوئے۔ میں بھی خوش ہوا اور مولانا تو بے حد خوش ہوئے کیونکہ ہمیں شدید بھوک لگی تھی۔

ریستوران میں بیٹھے تو ایک خوبرو اطالوی خاتون ہاتھ میں مینو پکڑے ہمارے قریب آگئی...... مولانا کھانسے اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا، میں چونکہ ابھی بچہ تھا اس لیے مجھے کھانسی بالکل نہ آئی۔ میں نے اپنے لیے ایک عدد روسٹ چکن منگوا لیا اور اپنے ہم راہی سے دریافت کیا: ''مولانا آپ کیا کھائیں گے؟'' انھوں نے منہ بنا کر جواب دیا ''اس گوری گوری لڑکی سے کہو کہ میرے لیے صرف ابلی ہوئی سبزیاں لے آئے کیونکہ گوشت تو یہاں پر حلال نہیں ہوگا''۔

اب میں نے تو اس معاملے کے بارے میں غور نہیں کیا تھا کہ یہاں گوشت کس قسم کا ہوتا ہے اور مجھے بھوک بھی بہت لگی ہوئی تھی۔ بہرحال میں نے ان کا آرڈر بھی دے دیا۔ آدھے گھنٹے بعد ویٹرس کھانا لے آئی...... ایک ٹرالی پر میرا روسٹ مرغ ابھی تک روسٹ ہو رہا تھا۔ اس کی خوشبو پورے ریستوران میں پھیلی تھی۔ مرغ کے گرد انڈے اور آلو کے کتلے اور سلاد وغیرہ بہار دکھا رہے تھے...... یہ سب کچھ میرے آگے رکھ دیا گیا۔ پھر ویٹرس واپس گئی اور ایک چھوٹی سی پلیٹ مولانا کے آگے لا کر رکھ دی۔ اس میں ایک ابلی ہوئی گاجر اور ایک دو آلو تھے۔ سفری چچا جان نے گاجر کھانے کی کوشش کی لیکن ان کی نظریں میرے روسٹ مرغ پر سے اٹھائے نہ اٹھتی تھیں۔ میں مزے سے کھاتا جا رہا تھا اور وہ مجھے دیکھتے جا رہے تھے۔ بالآخر انھوں نے گرج کر کہا ''برخوردار''۔

''جی جناب'' میں نے گھبرا کر جواب دیا۔

''یہ ہوٹل والی زنانی کو کہو کہ میرے لیے بھی یہی مرغ لے آئے، یہ شکل سے حلال لگتا ہے''۔

کہنے کا مطلب ہے کہ گوشت کھانے کے شوق میں ہم بعض اوقات اپنی مسلمانی کو بھی خطرے میں ڈال لیتے ہیں۔

لاہور کے ایک بہت ہی معروف ڈاکٹر صاحب اکثر بازار جا کر ایک بکرا خرید لاتے۔ گھر جا کر اسے خود ذبح کرتے، گوشت بناتے خود ہی بھونتے اور پھر اپنے بیٹوں کے ہمراہ ایک ہی نشست میں اسے چٹ کر جاتے۔ موصوف فرمایا کرتے تھے کہ گوشت ہونا چاہیے، چاہے گدھے کا ہی کیوں نہ ہو......

میں نے مکان بنایا تو ایک مزدور تقریباً روزانہ شام کو مزدوری کی رقم وصول کرتا، اس کا گوشت خریدتا اور بھون کر کھا جاتا۔ میں خود اگرچہ کھانے پینے کا زیادہ شوقین نہیں لیکن گوشت کھائے ہوئے اگر دو چار دن گزر جائیں تو جمائیاں آنے لگتی ہیں اور اپنے مسلمان ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے...... لیکن اب تو قیمت زیادہ ہونے سے ایسا لگ رہا ہے کہ قیمہ بکرے کا نہیں ہمارا اپنا بن رہا ہے...... ہمارے گردے نکالے جا رہے ہیں اور مغز کھایا جا رہا ہے...... اور وہ دن دُور نہیں جب ہم گوشت کی دکان پر جا کر قصائی کے آگے لیٹ کر کہیں گے ''براہِ کرم میرا قیمہ بنا دیجیے۔''

## مستنصر حسین تارڑ



سبزیوں اور پھولوں کے بیجوں کی دُکان سے ایک ایسے سفر کا آغاز کیا کہ جس میں جپسی، پیار کا پہلا شہر جیسی خوبصورت تحریریں لکھنے سے پہلے دُنیا کا ڈھیر سارا سفر کر ڈالا۔ وطن واپسی پر صحافت، اداکاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، ٹیلی ویژن میزبانی کے ہر ہر کوچے میں قیام کیا۔ اب برسوں سے صرف کالم نگاری، سفرنامہ اور ناول لکھنے کی محبت پالے ہوئے ہیں۔ کچھ محبتیں واقعی اندر باہر سے سلامت رکھتی ہیں۔

روزانہ ۳۰۰ ملین افراد فیس بک پہ ہوتے ہیں

# سوشل نیٹ ورکس کی دُنیا

یہ محض باہم دوستی و رابطے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ کئی کاروبار بھی اِس کی مدد سے ترقی کر رہے ہیں

اب سوشل نیٹ ورکنگ کے بنا زندگی ادھوری رہے گی

عاطف مرزا

## سوشل

نیٹ ورک سے مُراد ایسی ویب سائٹ ہے جہاں آپ اپنا ایک تعارفی خاکہ (Profile) بنا سکتے ہیں۔ یہ آپ کی شخصیت کے بارے میں معلومات پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں آپ دوسرے لوگوں سے پیغامات، تصاویر، ویڈیو (Video) اور دیگر معلومات کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ پچھلے چند برسوں سے سوشل نیٹ ورکس کی مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ زیادہ معروف ویب سائٹس میں فیس بک (Face book)، ٹوئٹر (Twitter) اور لنکڈ اِن (Linked in) شامل ہیں۔

ہاورڈ بزنس سکول میں (Management practices) کے پروفیسر بل جارج کے مطابق ۳۰۰ ملین افراد ایک دن میں کم از کم ایک گھنٹہ فیس بک پہ موجود ہوتے ہیں۔ ۲۰۰ ملین افراد ٹوئٹر (Twitter) استعمال کرتے اور ۱۰۰ ملین افراد لنکڈ ان (Linked In) استعمال کرتے ہیں۔

فیس بک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر اسے ایک ملک تصور کیا جائے تو یہ آبادی کے لحاظ سے دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہوگا۔ عام طور پہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان ویب سائٹس کا استعمال غیر مفید باتوں کے آپس میں تبادلے تک محدود ہے۔ لیکن ان ویب سائٹس کے مثبت استعمال میں بھی تیزی سے اضافہ دیکھا جا رہا ہے۔ لوگوں نے ان نیٹ ورکس کو سیاسی طور پہ منظم ہونے کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ اسی طرح سماجی فلاح و بہبود کے ادارے بھی اپنے مقاصد کے لیے ان نیٹ ورکس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان نیٹ ورکس کے اثرات کاروباری دُنیا میں بھی دیکھے جا رہے ہیں۔ ان کی مدد سے بے شمار چھوٹے کاروبار بھی تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ سوشل نیٹ ورکس کی بدولت خبر کی دنیا میں اہم تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ ان کی وجہ سے قارئین کے اختیارات میں بھی اضافہ ہوا ہے اور اب وہ اپنی آراء اور تبصرے آسانی سے اخبارات اور نیوز چینلز تک پہنچا سکتے ہیں۔

## فیس بک (Facebook)

اس ویب سائٹ پر آپ کا تعارفی خاکہ (پروفائل) آپ کی شخصیت کے بارے میں معلومات پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کے لیے آپ کے تعارف یا پہچان کا کام دیتا ہے۔ یہاں پر آپ دوسرے لوگوں کے ساتھ پیغامات، تصاویر، ویڈیو اور دیگر معلومات کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ اس ویب سائٹ کا آغاز ۲۰۰۴ء میں ہوا۔ دنیا میں اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد ۷۵۰ ملین ہے۔ استعمال کرنے والوں کے حوالے سے امریکہ پہلے نمبر پہ جبکہ دوسرے بڑے ممالک میں انڈونیشیا، بھارت، ترکی اور برطانیہ شامل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں اس ویب سائٹ کے استعمال کرنے والوں کی تعداد ۵۰ لاکھ سے زائد ہے۔

## ٹوئٹر (Twitter)

اس ویب سائٹ کے ذریعے آپ دوسرے لوگوں کو مختصر پیغامات بھیج سکتے یا کسی اور کی طرف سے بھیجا گیا پیغام پڑھ سکتے ہیں۔ ان مختصر پیغامات کو ٹوئیٹس کہا جاتا ہے۔ اگر آپ ۲۰ لوگوں کے ساتھ رابطے میں ہیں تو ان کی طرف سے بھیجے گئے پیغامات آپ کو ٹوئٹر اکاؤنٹ کے مین پیج پر آئیں گے۔

ٹوئٹر کا آغاز ۲۰۰۶ء میں ہوا۔ دنیا بھر میں اس کے

ٹوئٹر استعمال کرنے والوں کی تعداد ۲۰۰ ملین ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

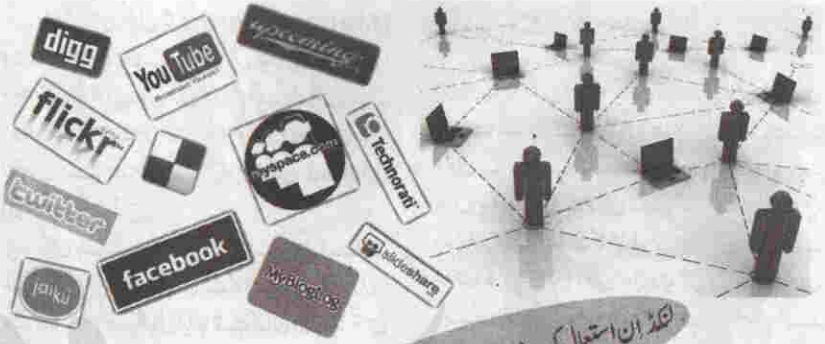


لنکڈ اِن استعمال کرنے والے ۱۲۰ ملین ہو چکے ہیں

استعمال کرنے والوں کی تعداد ۲۰۰ ملین کے قریب ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ٹوئٹر استعمال کرنے والوں کی تعداد ۹ء۱ ملین ہے۔

## لِنکڈ اِن (Linked In)

یہ پیشہ وارانہ نیٹ ورکنگ ویب سائٹ ہے جہاں آپ اپنا تعارفی خاکہ (پروفائل) بنا سکتے ہیں جو آپ کے آن لائن Resume کی طرح ہوتا ہے۔ یہ ویب سائٹ ان لوگوں کے ساتھ رابطے کا ذریعہ ہے جن کے ساتھ آپ کام کر چکے ہوں۔ اس کے علاوہ یہاں نئے لوگوں کے ساتھ رابطے کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ یہ ویب سائٹ آپ کو ملازمت کے نئے مواقع ڈھونڈنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ اس ویب سائٹ کا آغاز ۲۰۰۳ء میں ہوا۔ دنیا میں اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد ۱۲۰ ملین کے قریب ہے۔ پاکستان میں بھی اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

## صحافت کی دُنیا

اخبارات اور نیوز چینلز کی سوشل نیٹ ورکس کی موجودگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کے ذریعے خبر سے وابستہ اداروں کو اپنے قارئین اور ناظرین کے تبصرے اور آراء سے آگاہی کے بھرپور مواقع ملتے ہیں۔ خبر کی دُنیا کے بڑے ادارے بی بی سی کے نئے ڈائریکٹر نے اپنے ملازمین سے کہا کہ وہ سوشل نیٹ ورکس سے فائدہ اٹھا کر اپنے کام کو بہتر بنائیں۔

سوشل میڈیا کے آنے سے قارئین کے اختیارات میں بھی اضافہ ہوا۔ وہ آن لائن خبر پڑھتے ہوئے ایک کلک کے ذریعے اپنے دوستوں کو بھی اُس خبر کے پڑھنے کا مشورہ دے سکتے ہیں۔ عام لوگ ٹریفک کی صورتحال، کسی حادثے یا قدرتی آفت سے متعلق معلومات، کسی سوشل نیٹ ورکنگ کی ویب سائٹ کے ذریعے دوسرے لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ بعض اوقات عام لوگوں کی طرف سے ٹوئٹر پہ بھیجے گئے پیغامات اہم بین الاقوامی خبروں کی بنیاد بھی بنے ہیں۔

قدرتی آفات کے مواقع پر بھی ان نیٹ ورکس سے فائدہ اُٹھایا گیا۔ اس سال جاپان میں آنے والے زبردست زلزلے کے بعد لوگوں نے سوشل نیٹ ورکس کے ذریعے اپنی آنکھوں سے دیکھے جانے والے حالات دوسرے لوگوں تک پہنچائے۔ مین سٹریم (Main streem) میڈیا کے لیے حالات کی ایسی کوریج کسی طرح بھی ممکن نہ تھی۔ امدادی کاموں میں مصروف افراد اور ٹیموں نے بھی سوشل نیٹ ورکس پر آنے والی معلومات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

پاکستان میں اخباری صنعت کے تمام اہم ادارے



سوشل نیٹ ورکس پر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ صحافی بھی فیس بک اور ٹوئٹر جیسی ویب سائٹس کے ذریعے اپنے قارئین کے ساتھ رابطے میں رہتے اور ان سے اپنے کام کے حوالے سے فیڈ بیک حاصل کرتے رہتے ہیں۔

## سیاست اور دیگر سماجی میدانوں میں

سوشل نیٹ ورکس کے اثرات سیاست کی دنیا میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ سیاست دان اور سیاسی جماعتیں ان نیٹ ورکس کو عوام کے ساتھ اپنا رابطہ بڑھانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ امریکہ میں بارک اوباما کی صدر کے الیکشن کے لیے چلائی جانے والی مہم میں سوشل نیٹ ورکنگ کا کردار بہت اہم تھا۔

سوشل نیٹ ورکس کے اثرات بین الاقوامی تعلقات پر بھی دیکھے جا رہے ہیں۔ امریکی صدر اوباما نے جب منتخب ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد گھانا کا دورہ کیا تو انہیں براعظم افریقہ کے طول و عرض سے ٹوئٹر اور فیس بک کے ذریعے ۲ لاکھ ۵۰ ہزار سوالات موصول ہوئے۔

سماجی فلاح و بہبود سے تعلق رکھنے والے ادارے بھی لوگوں کے ساتھ رابطے اور ان تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے ان نیٹ ورکس کو استعمال کر رہے ہیں۔

ان نیٹ ورکس سے عام لوگوں کو سیاسی یا سماجی مسائل و معاملات کے حوالے سے اکٹھے ہونے اور آپس میں خیالات کے تبادلے کے مواقع ملتے ہیں۔ مکالمے (Dialogue) کی ایسی فضا جمہوریت کے مستقبل کے حوالے سے بھی خوش آیند ہے۔

سوشل نیٹ ورکس کی افادیت دیکھتے ہوئے تعلیم کے میدان میں بھی انہیں متعارف کروایا جا رہا ہے۔ سوشل نیٹ ورک کی مدد سے اساتذہ والدین اور طلبا آپس میں رابطے کے ذریعے ایک کمیونٹی کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

سوشل نیٹ ورکس سے جہاں مختلف ادارے عوام سے رابطے میں رہتے ہیں، وہاں عوام بھی ان اداروں تک اپنی آواز بھی پہنچا سکتے ہیں۔ عوام سے رابطہ بڑھانے کے لیے ممبئی پولیس نے حال ہی میں فیس بک پر اپنا صفحہ بنایا تو لوگوں نے اس پر پولیس کی کرپشن کے بارے میں ثبوت فراہم کرنا شروع کر دیے۔

## مارکیٹنگ اور ایڈورٹائزنگ

سوشل میڈیا کے آنے سے دنیا بھر میں مارکیٹنگ اور ایڈورٹائزنگ کے روایتی طریقے بھی تبدیل ہو رہے ہیں۔ ادارے ان نیٹ ورکس پر موجودگی کے ذریعے صارفین تک اپنی اشیا اور خدمات کے بارے میں معلومات پہنچا اور صارفین کی ضروریات کو بہتر انداز میں سمجھ رہے ہیں۔

## کاروبار کی دنیا

آج تمام قابل ذکر کاروباری ادارے سوشل نیٹ ورکس پر موجود ہیں۔ یہ ان کے لیے کسٹمرز کے ساتھ رابطے کا اہم ذریعہ ہیں۔ کئی چھوٹے کاروبار Businesses بھی سوشل نیٹ ورکس سے سامنے آنے والے نئے مواقع سے فائدہ اٹھا کر تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ ادارے نئے ملازمین کی تلاش کے سلسلے میں بھی ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔


### عاطف مرزا

عاطف مرزا نے پنجاب یونیورسٹی سے میڈیا سٹڈیز میں ماسٹرز کیا۔ تدریس اور تحقیق سے متعلق ہیں۔ مطالعے اور نئی کتابوں سے محبت کرتے ہیں۔ نفسیات اور ٹیکنالوجی جیسے موضوعات پر تحقیق اور مثبت اندازِ فکر اور عمل پہ رپورٹاژ کی دلچسپی کا خاص میدان ہے۔




Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# صارفین کا انتقام

کمپنیوں کی کوتاہیوں کا شکار اُن باہمت اور بہادر لوگوں کی جدوجہد کی داستان جنھوں نے سوشل میڈیا کو اپنا ہتھیار بنایا اور دُنیا کی بڑی بڑی کمپنیوں کو اپنی غلطیاں ماننے پہ مجبور کر دیا

رضوان علی شاہ

یہ پچھلے دسمبر کی بات ہے، آسٹریلوی شہر سڈنی کے ۲۳ر سالہ نوجوان، آدم بریمو نے ووڈا فون موبائل کمپنی کی خدمات حاصل کیں۔ شروع میں تو خدمات معیاری تھیں لیکن رفتہ رفتہ بات کرتے ہوئے لائن کٹ جانا معمول بن گیا۔ آواز بھی صاف نہ آتی۔ میسج بھجوانے میں بھی ایک گھنٹہ لگ جاتا۔ غرض آدم کو اپنی موبائل کمپنی سے کئی شکایات پیدا ہوگئیں۔

سونے پہ سہاگا یہ کہ ووڈا فون کمپنی کی کسٹمر سروس بھی ناکارہ ثابت ہوئی۔ اس نے ٹال مٹول کرنا معمول بنا لیا تھا۔ ایک ہفتہ تو آدم اذیت برداشت کرتا رہا لیکن پھر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ آخر آج کل کی مصروف زندگی میں موبائل فون رابطے کا بنیادی ذریعہ بن چکا ہے۔ ایک دن وہ سر پکڑے اسی سوچ میں گم رہا کہ آخر اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے؟ وہ حال ہی میں سڈنی یونیورسٹی سے سافٹ ویئر انجینیر بن کر نکلا تھا اور اس کے پاس خیالات کی کمی نہیں تھی۔

وہ سوچوں میں گم تھا کہ ایک خیال جگنو بن کر چمکا اور تاریکی میں روشنی کر گیا۔ اگلے ہی دن اس نے ''ووڈافیل ڈاٹ کام'' (Vodafail.com) کے نام سے ایک ویب سائٹ بنا لی۔ آدم اسی کے ذریعے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا وہی موبائل کمپنی کا ڈسا ہوا ہے یا دوسرے لوگ بھی پریشان ہیں؟ ویب سائٹ میں اس نے ایک خصوصی خانہ ''اپنا درد بیان کریں'' (Share your pain) بنایا۔ چند ہفتوں کے اندر اندر اس خانے میں کئی ہزار لوگوں نے اپنی اپنی حالتِ زار کی کہانیاں بیان کر دیں۔

آدم نے دراصل ووڈا فون کے لاکھوں استعمال کنندگان تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے فیس بک، ٹویٹر اور انٹرنیٹ ٹیکنالوجی پر بحث کرنے والے فورم ''ورل پول ڈاٹ کام (Whirlpool.com) سے مدد لی۔ یوں آدم کا پیغام ایک سے دو، دو سے چار، چار سے چھ لوگوں تک پہنچا اور پھر تیزی سے تقسیم ہوتا گیا۔ وہ بتاتا ہے:

''دیکھتے ہی دیکھتے میری ویب سائٹ لوگوں میں اتنی مقبول ہوگئی کہ میں اسے بہتر بنانے کی خاطر رات گئے تک جاگنے لگا۔ میں نے اس میں نئی خصوصیات متعارف کرائیں۔ مثلاً آسٹریلیا کا نقشہ شامل کیا جس کی مدد سے براعظم کا کوئی بھی رہائشی جان سکتا تھا کہ اس علاقے میں کون سی موبائل فون کمپنیاں معیاری ہیں۔''

ویب سائٹ کے ذریعے آدم کو زبردست حمایت ملی تو اس کے حوصلے بلند ہوگئے۔ آدم نے پھر آسٹریلیا کی ٹیلی کمیونیکیشن انڈسٹری کے محتسب سے رابطہ کیا۔ اس کی مدد سے آدم نے ووڈا فون کمپنی کے ساتھ کیا گیا اپنا ۲ر سالہ



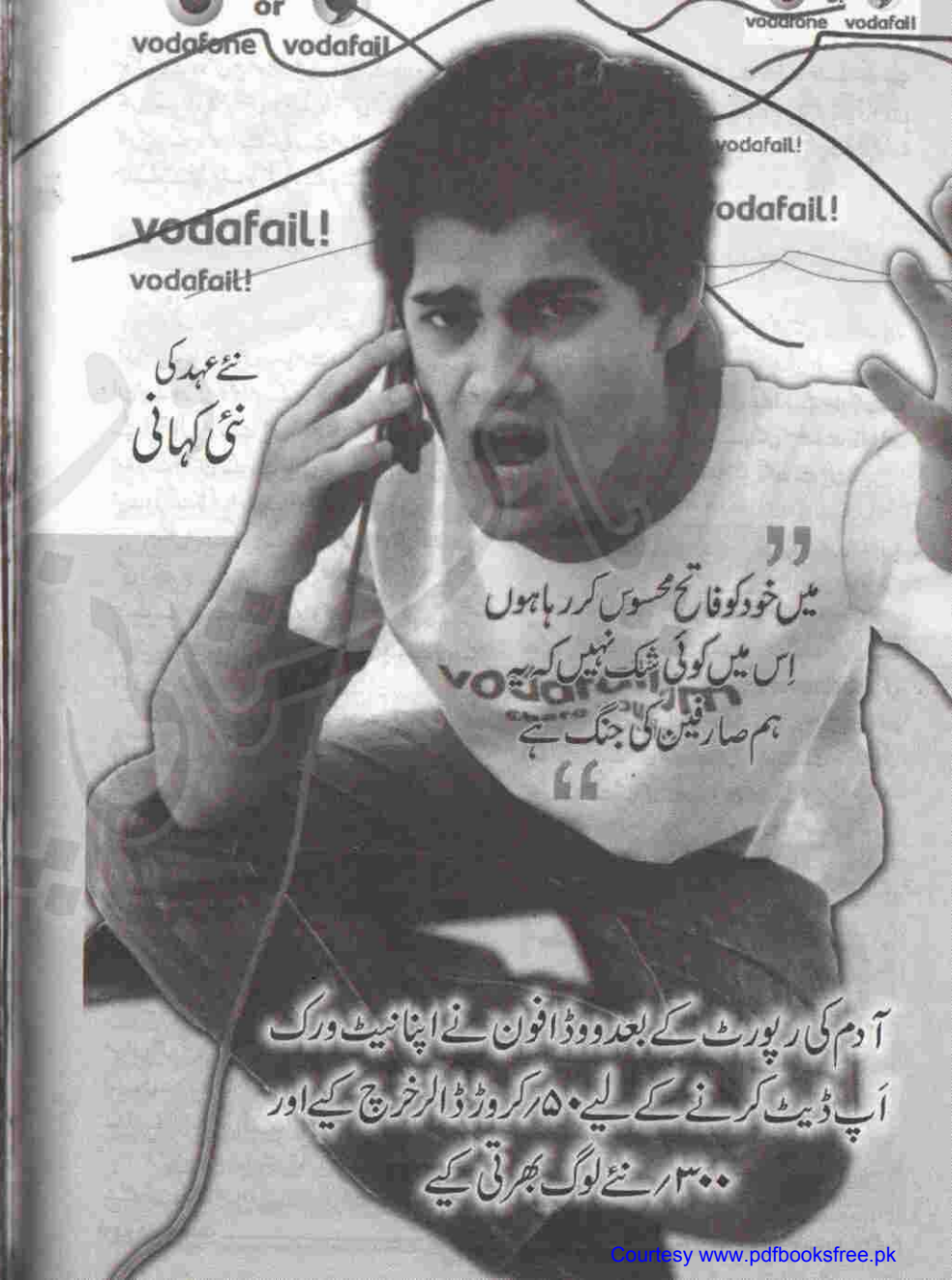


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معاہدہ توڑ دیا۔

آدم کی جنگ جاری تھی کہ ایک قانونی فرم، پائیر آئندرمان نے غیر معیاری کارکردگی کے باعث ووڈافون پر مقدمہ ٹھوک دیا۔ اب مالکان کمپنی کے کان کھڑے ہوئے کیونکہ ان کی شہرت داغدار ہو رہی تھی۔ چنانچہ کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو افسر، نائجل ڈیوز نے کمپنی کی ویب سائٹ پر ان تمام استعمال کنندگان سے معذرت کی جنھیں ووڈافون سے شکایات تھیں۔

ایک ہفتے بعد نائجل نے آدم سے رابطہ کیا۔ وہ معاملات بہتر بنانے کی خاطر اس سے مشورے لینا چاہتا تھا۔ آدم کہتا ہے: ''ویب سائٹ پہ دن رات توجہ دینے کے باعث میں تھک چکا تھا لیکن میں یہ سوچ کر چلا گیا کہ ممکن ہے، میری تجاویز سے بہتری آجائے۔''

اس وقت تک آدم دوسرے موبائل نیٹ ورک کی خدمات حاصل کر چکا تھا۔ لیکن تب ''ووڈافیل ڈاٹ کام'' میں بارہ ہزار سے زائد دردناک آپ بیتیاں جمع ہو چکی تھیں۔ اسی لیے آدم نے فیصلہ کیا کہ اس مواد میں موجود تجاویز ومشوروں کی بنیاد پر ایک رپورٹ تیار کی جائے۔ وہ یہ رپورٹ آسٹریلین مسابقتی اور صارف کمیشن کو دینا چاہتا تھا۔

آدم بتاتا ہے: ''میں نے دو دن لگائے اور سارے واقعہ کا جوہر رپورٹ میں شامل کر لیا۔ یوں یہ امر سامنے آیا کہ غلطیاں کیوں ہوئیں، ان کا سدِ باب کیا ہو اور آئندہ کیسے اقدامات کیے جائیں کہ دوبارہ کوتاہیاں جنم نہ لیں۔ اس طرح رپورٹ میں ہزارہا مرد وزن کے دکھ درد بیان ہو گئے۔'' آدم نے رپورٹ یہ سوچ کر تیار کی کہ مستقبل میں موبائل کمپنیاں صارفین کو بہتر خدمات مہیا کریں۔

بعد ازاں ووڈافون نے اپنا نیٹ ورک اپ گریڈ کرنے کے لیے ۵۰ر کروڑ ڈالر (۴۴ر ارب روپے) خرچ کیے۔ نیز پورے آسٹریلیا میں استعمال کنندگان کی شکایت دور کرنے کے لیے مزید ۳۰۰ر افراد بھرتی کیے گئے۔ کمپنی نے آدم کی بعض تجاویز کو بھی عملی جامہ پہنایا۔ اس بات سے آدم بہت خوش ہے۔ وہ کہتا ہے: ''میں خود کو فاتح محسوس کر رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہم صارفین کی فتح ہے۔''

یوں آدم بریمو نے رونے دھونے کے بجائے مثبت طرزِ فکر اختیار کی اور نہ صرف اپنی اذیت سے چھٹکارا پایا بلکہ ووڈافون کمپنی کو موقع دیا کہ وہ اپنی کوتاہیوں پر قابو پا سکے۔ آدم کی طرح مزید تین صارفین نے بھی اپنے حقوق کی جنگ قانونی اور مثبت انداز میں لڑی اور کامیاب ٹھہرے۔ ان کی داستان درجِ ذیل ہے:

## والوو کمپنی پر دھاوا

دو بچوں کی ماں ۴۱ر سالہ پیٹرہ وین برگ امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر پاسدینا میں رہتی ہے۔ اس نے چھ سال قبل ایک والوو

کار خریدی۔ اس خریداری کے ساتھ یہ سروس کنٹریکٹ بھی تھا کہ اگر چھ سال کے اندر اندر کار خراب ہوئی تو اس کی مفت مرمت کی جائے گی۔ تین سال پہلے والوو چلتے ہوئے دھکے مارنے لگی۔ پیٹرہ اسے والوو کے مقامی ڈیلر کے پاس لے گئی۔ ڈیلر نے ٹرانسمیشن میں نقائص دریافت کیے جو درست کر دیئے گئے لیکن خرابی دور نہ ہوئی اور والوو چلتے ہوئے دھکے مارتی رہی۔

پچھلے سال والوو کی کار کا سروس معاہدہ ختم ہو گیا۔ اسی دوران کار زیادہ ہی تنگ کرنے لگی۔ پیٹرہ مقامی ڈیلر، ریسنگ والوو کے پاس پہنچی۔ ڈیلر نے اسے بتایا کہ ٹرانسمیشن نظام دوبارہ خراب ہو چکا، لیکن اس بار مرمت کرانے کے لیے پیٹرہ کو ۳۷۰۰ر ڈالر دینے تھے۔ یہ سن کر پیٹرہ طیش میں آگئی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ کیسی کار ہے جس کی ٹرانسمیشن صرف تین سال بعد جواب دے گئی حالانکہ وہ گاڑی کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے۔ پھر اس نے شمالی امریکہ میں والوو کمپنی کے صدر دفتر سے رابطہ کیا۔ پیٹرہ کو بتایا گیا کہ اسے بہر حال مرمت کے ۳۷۰۰ر ڈالر دینے پڑیں گے۔

اب ۴۱ سالہ خاتون کے غصے کا ٹھکانہ نہیں رہا لیکن اس نے اپنا طیش عیاں کرنے کا بڑا انوکھا طریقہ دریافت کیا۔ پیٹرہ کے اجداد ناروے کے وائکنگ جنگجوؤں کی اولاد تھے۔ چنانچہ اس کے گھر میں بطور نمائشی شے ایک ناروژی جنگجو تلوار، خود اور زرہ بکتر پہنے اور ڈھال اٹھائے کھڑا تھا۔ پیٹرہ نے یہ جنگجویانہ روپ خود دھارا اور پھر ایک وڈیو بنائی۔ وڈیو میں تلوار لہراتی دورِ جدید کی جنگجو خاتون نے یہ گانا گایا:

''اے والوو اور ریسنگ رس، س، تم نے مجھے ٹوٹا پھوٹا ٹرانسمیشن نظام دے ڈالا۔ پہلے ہم تم میں جو پیار تھا، افسوس، وہ ماضی کا قصہ بن گیا۔''

پیٹرہ نے یہ گانا فطری انداز میں اداکاری کرتے ہوئے گایا اور اپنا تمام غم وغصہ اس میں سمو دیا۔ لہٰذا ایک اچھوتی تخلیق سامنے آئی۔ پیٹرہ نے پھر ایک ویب سائٹ، اسمیکڈ والوو ڈاٹ کام بنائی اور اس میں اپنی وڈیو رکھ دی، نیز یوٹیوب میں بھی لوڈ کر دی۔

یہ وڈیو بہت مقبول ہوئی اور صرف دس دن میں ۲۰ر ہزار لوگوں سے اسے دیکھا۔ وڈیو دیکھنے والوں میں والوو کا سی ای او بھی شامل تھا۔ پھر اس نے پیٹرہ کو فون کیا اور بتایا: ''میری کمپنی آپ کی شکایت ضرور دور کرے گی اور ہم مسئلے کی جڑ تک پہنچ کر ہی دم لیں گے۔''

اس کے بعد والوو کے صدر دفتر سے ماہرین پاسدینا پہنچے اور پیٹرہ کی گاڑی کا بغور معائنہ کیا۔ تب ٹرانسمیشن کے علاوہ مختلف جگہوں سے بھی خرابیاں سامنے آئیں۔ چنانچہ کمپنی نے وہ تمام خرابیاں مفت درست کر دیں جن کا بل ۹ر ہزار ڈالر بنا۔

پیٹرہ کا کہنا ہے: ''میں نے جذبۂ انتقام کے تحت وڈیو نہیں بنائی، میں صرف اس امر کا اظہار چاہتی تھی کہ میرے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس وڈیو کو اتنی شہرت ملے گی اور یہ احتجاج کا نشان بن جائے گی۔

## یونائیٹڈ ائیر لائنز نے گٹار توڑ ڈالا

پچھلے سال امریکی باشندے ڈیوڈ کیرول کی پرواز ہیلی فیکس سے واشنگٹن پہنچی۔ جب وہ دیگر مسافروں کے ساتھ باہر آرہا تھا، تو اس نے آگے جاتے ایک مسافر کی متوحش آواز سنی ''ارے وہ سامان کی پٹی پر بے دردی سے گٹار پھینک رہے ہیں۔'' انہی گٹاروں میں ایک ڈیوڈ کیرول کا بھی تھا۔ الیکٹرک گٹار کی قیمت ۳۵۰۰ر ڈالر (تین لاکھ روپے سے زائد) تھی جو اتنی زور سے گرا کہ ناکارہ ہو گیا۔

اب ڈیوڈ کیرول نے ہرجانہ وصول کرنے کی خاطر امریکی یونائیٹڈ ائیر لائنز سے رابطہ کیا لیکن اسے ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے افسر کی طرف



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوڑایا جاتا رہا۔ ہر افسر کا کہنا تھا کہ دوسرا سے ہرجانہ دلوائے گا۔ ۹ ماہ بعد یونائیٹڈ نے بیچارے ڈیوڈ کو بتایا کہ گٹار توڑنے میں ان کا کوئی قصور نہیں اور جلد ہی ان کے مابین رابطہ ٹوٹ گیا۔

لیکن ڈیوڈ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے برسوں رقم بچا کر اپنا پسندیدہ گٹار خریدا تھا۔ وہ اس المیے کو کیسے بھول جاتا؟ وہ پھر سوچتا رہا کہ اپنا احتجاج کس انوکھے طریقے سے ریکارڈ کرائے تاکہ وہ سنا جا سکے۔ آخر اس کے ذہن میں ایک نادر ترکیب آئی۔ اس نے خود گٹار بجاتے ہوئے ایک گانا ریکارڈ کیا جس کا عنوان تھا: ''یونائیٹڈ بریکس گٹارز (یونائیٹڈ نے گٹار توڑ ڈالے)۔''

اس ویڈیو گانے میں پہلے کچھ کردار بحیثیت ایئر لائن کے غیر ذمے دار سامان نکالنے والے دکھائے گئے۔ پھر ڈیوڈ کا ٹوٹا گٹار دکھایا گیا۔ پھر گلوکار آنکھوں میں آنسو بھرے گاتا ہے:

''تم نے اسے توڑا، تم ہی اس کی مرمت کراؤ،
تم ہی ذمے دار ہو، اسے تسلیم کرلو،
کاش میں کسی اور ایئر لائن میں سفر کرتا
یا کارہی میں آجاتا
کیونکہ یونائیٹڈ تو گٹار توڑنے میں ماہر ہے''

یہ ویڈیو گانا پھر ڈیوڈ نے یوٹیوب پہ پوسٹ کر دیا۔ اسے امید تھی کہ کم از کم چند سو لوگ تو اسے سراہیں گے۔ لیکن اگلے دو ہفتوں میں دس لاکھ سے زائد مرد و زن نے اسے دیکھا اور ڈیوڈ کی آپ بیتی امریکی میڈیا کا من پسند موضوع بن گئی۔ جب ویڈیو مقبول ہوئی، تو ایئر لائن کا رویہ بھی بدل گیا۔ گو اس نے معذرت کرنے یا ذمے داری اٹھانے سے انکار کیا، تاہم ڈیوڈ کو یہ پیش کش کی کہ وہ ۱۲۰۰ ڈالر نقد اور ۱۲۰۰ ڈالر کے فلائٹ واچر قبول کر لے۔ تاہم ڈیوڈ نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ ڈیوڈ بتاتا ہے:

''میں نے انھیں کہا، جب تم لوگوں نے مجھ پر اپنے دروازے بند کر دیئے تو ہرجانے کا معاملہ اسی وقت ختم ہو گیا۔''

بہر حال اس حادثے کے ذریعے ڈیوڈ کو بحیثیت گلوکار خاصی شہرت مل گئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ گٹار



بنانے والی کمپنی، ٹیلر گٹارز نے اسے اپنے کارخانے بلایا، دعوت دی اور جاتے جاتے ڈیوڈ کو دو نئے گٹار تحفہ دیئے۔ ڈیوڈ اس تمام واقعے کے متعلق کہتا ہے: ''یہ ثابت ہو گیا کہ اگر انسان اپنے حق کی خاطر لڑے، تو کامیابی مل کر رہتی ہے۔''

## آن لائن کمپنی کی ٹھگی

یہ فروری ۲۰۱۱ء کی بات ہے، ڈیو کلارک نے ایک آن لائن کمپنی، ۱-۸۰۰ فلاورز سے پھول خریدنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ پھول خرید رہا تھا تو اس نے ڈسکاؤنٹ کی پیشکش کرنے والے ایک لنک پر کلک کر دیا۔ یوں ڈیو کلارک عالم بے خبری میں ٹی ایل جی لوویل کا ''رکن'' بن گیا۔ یہ کمپنی ۱-۸۰۰ فلاورز اور دیگر کمپنیوں کے ساتھ معاہدہ کر کے مخصوص اشیا پر صارفین کو خصوصی ڈسکاؤنٹ کی پیشکش کرتی تھی۔

ان پیشکشوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری تھا کہ ٹی ایل جی لوویل کی ویب سائٹ پر باقاعدگی سے جایا جائے۔ مزید براں جو بھی اس کمپنی کا ''رکن'' بنتا، وہ اس سے ہر ماہ معین فیس لیتی لیکن ڈیو یہ بات نہ جان سکا۔ کمپنی کا دعویٰ ہے کہ ہر کوئی بعض معلومات فراہم کر کے ہی اس کا رکن بن سکتا ہے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ڈیو اس فیس کی بابت نہ جان سکا؟

بہر حال پورا سال گزر گیا اور ۲۷ سالہ ڈیو کو یہی معلوم نہ ہو سکا کہ ٹی ایل جی لوویل اس کے کریڈٹ کارڈ سے ہر ماہ معین رقم کاٹ لیتی ہے۔ ایک دوپہر جب وہ کریڈٹ کارڈ کی سٹیٹمنٹ دیکھ رہا تھا، تو اسے پتا چلا کہ ٹی ایل جی نے اپنی ماہانہ فیس ۹۹ ڈالر کاٹ رکھے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ حیران و پریشان ہو گیا۔ اب جو اس نے اپنے اکاؤنٹ کی چھان بین کی، تو انکشاف ہوا کہ وہ پچھلے ایک سال میں ۱۵۰ ڈالر (۱۳ ہزار روپے سے زائد) کی خطیر رقم خواہ مخواہ کمپنی کو دے بیٹھا ہے۔

وہ بتاتا ہے: ''میں ایک ادارے میں بحیثیت انٹرنیٹ مشیر کام کرتا ہوں۔ دن کے اوقات میں بیشتر عرصہ انٹرنیٹ سے واسطہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود ٹی ایل جی

ٹوئٹر پر ڈیو کے احتجاج نے کمپنی کو ہلا ڈالا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## باتوں سے خوشبو آئے

☆......جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔

☆......خاموشی بغیر تخت کے بادشاہت ہے۔

☆......نماز پڑھ اس سے پہلے کہ تیری نماز جنازہ پڑھی جائے۔

☆......جس کے اندر خود عیب ہوں وہی دوسروں کے عیب تلاش کرتا ہے۔

☆......جو اپنے آپ کو کامل جانے اور دوسروں کو اناڑی' وہ بے عقل ہے۔

☆......اگر کوئی تجھے برا کہے اور تمہیں غصہ آجائے تو سمجھ لو کہ تم واقعی ہی برے ہو۔

☆......جو ان تین باتوں پر عمل کرے، وہ نجات پائے گا، کم کھانا، کم سونا اور کم بولنا۔

☆......اُس شخص کا کبھی ایمان مکمل نہ ہوگا جس کا پڑوسی اس کے شر اور تکلیف سے محفوظ نہ ہو۔

☆......دوستی کا رشتہ کچے دھاگے کے مانند ہے' دھاگا ٹوٹ کر جڑ تو جاتا ہے مگر اس میں گرہ آجاتی ہے۔

☆......اپنے آپ کو کسی کی نظروں میں مت گراؤ کیونکہ لوگ تو گرے ہوئے مکان کی اینٹ تک اٹھا لیتے ہیں۔

(امجد ریاض، لاہور)

والوں نے کامیابی سے مجھے اپنے جال میں پھانس لیا۔"

ڈیو کو علم نہ تھا کہ صرف وہی کمپنی والوں کی لوٹ مار کا شکار نہیں ہوا۔ کئی لوگ کمپنی پر ہرجانے کا دعوئی کر چکے تھے اور ہزارہا لوگوں نے اسے اپنی شکایات کا نشانہ بنایا تھا۔

اس کے بعد ڈیو نے دن کا بقیہ وقت کمپنی کی کسٹمر سروس کے ملازموں سے مغزماری کرتے گزارا۔ بعض افسروں سے بھی تو تکار ہوئی۔ ڈیو کو معلوم ہوا کہ کمپنی زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ اسے دو ماہ کی رقم لوٹا دے لیکن ڈیو کو یہ منظور نہ تھا، وہ اپنی کمائی کا ایک ایک سینٹ واپس چاہتا تھا۔

ڈیو سوچنے لگا کہ اپنا احتجاج کیونکر عیاں کرے؟ آخر وہ ٹوئٹر پر گیا اور غم و غصے سے بھرے الفاظ سے اپنی داستانِ الم بیان کر دی۔ ڈیو نے تفصیل سے بتایا کہ دورِ جدید کے ٹھگوں نے اسے کیسے ٹھگا۔ چند ہی دنوں میں انکشاف ہوا کہ بہت سے دیگر مرد و زن بھی اسی ٹھگی کا شکار ہو چکے۔ مزید براں ڈیو کی پوری داستان کو بہت سے لوگوں نے اپنے اکاؤنٹوں میں بیان کیا اور یوں وہ پورے امریکہ میں پھیل گئی۔

چار دن بعد ۱۔۸۰۰ فلاورز کے نمائندے نے ڈیو سے رابطہ کر لیا۔ ٹویٹر پر اس کے احتجاج نے کمپنی کو ہلا ڈالا تھا۔ ڈیو نے اپنا کیس اس کے سامنے رکھا۔ بعد ازاں ۱۔۸۰۰ فلاورز نے یہ انتظام کیا کہ اسے پوری رقم واپس مل گئی۔ یہی نہیں اس نے ٹھگ کمپنی، ٹی ایل جی کے ساتھ اپنا آن لائن منصوبہ بھی ختم کر دیا۔ اپنی کامیابی سے مسرور ڈیو کلارک کہتا ہے:

"یہ سوشل میڈیا نیٹ ورک کی طاقت اور اثر و رسوخ کا بہترین مظاہرہ تھا۔"





# میری آٹوگراف بُک

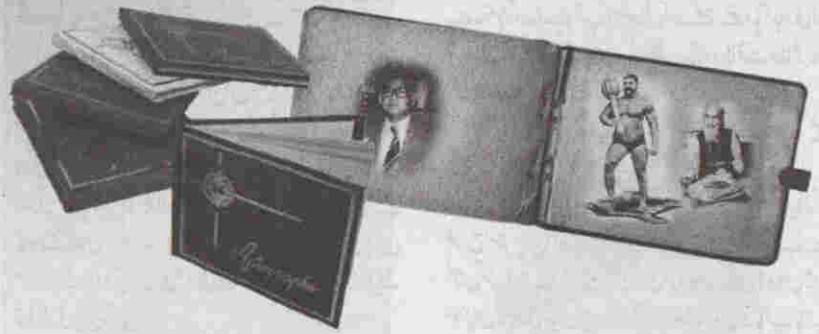

یادوں کے جھروکوں سے چند تاریخی پاکستانی شخصیات کا دلچسپ تذکرہ

منظور طارق

## گاماں پہلوان

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب اُس بوڑھے شیر کی زندگی کی لو تھرتھرا رہی تھی اور وہ میو ہسپتال کے ایک کمرے میں اپنی موت کا منتظر تھا۔

ایک دوست کے ساتھ میں جونہی ان کے کمرے میں داخل ہوا،




Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے معاً یہ احساس ہوا کسی شیر کے پنجرے میں آ گیا ہوں۔ جوانی ڈھل چکی تھی، چوڑے چکلے چہرے کا گوشت لٹکا ہوا تھا، آنکھیں اندر دھنس چکی تھیں، لیکن ان کا لحیم شحیم دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ جس عمارت کے کھنڈر اس قدر عظیم ہیں، وہ خود کیا ہوگی۔ انھوں نے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا تو میرے زندگی سے بھرپور جوان ہاتھ کپکپا کر رہ گئے۔ اُن کے چھوٹے بھائی رستم ہند امام بخش پہلوان (مرحوم) بھی وہاں موجود تھے۔ دو شیروں کی موجودگی میں، مَیں بھی سہم کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''جی فرمائو..... کیویں آئے او.....'' انھوں نے پنجابی میں پوچھا۔

''بابا جی، ایک تو آپ کی خیریت دریافت کرنے، آپ کا مزاج پوچھنے اور دوسرے آپ کے آٹوگراف لینے حاضر ہوا ہوں۔''

بابا جی نے قلم ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا: ''اب تو ہاتھوں میں بھی طاقت نہیں رہی۔''

میں تصور کی آنکھوں سے اس رُستم زماں کو دیکھ رہا تھا جس نے نامی گرامی پہلوانوں کو پلک جھپکنے میں چت کر دیا تھا۔ میرے تصور کی وادیوں میں یکا یک زبسکو اُتر آیا۔ میں نے مؤدب بن کر پوچھا.....

''بابا جی کہنے والے کہتے ہیں کہ زبسکو کو آپ نے چند سیکنڈ میں چت کر دیا تھا؟''

بابا جی ہنس دیے، بولے: ''پادشاہو۔ چند سیکنڈ بڑی چیز ہوتے ہیں ہماری کشتی شروع ہوئی۔ جن لوگوں نے گھڑی دیکھی بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ نظر اُٹھا کر ہمیں دیکھا تو زبسکو صاحب چت ہو چکے تھے اور میں یا علیؓ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اکھاڑے میں ''پیلیں'' ڈال رہا تھا۔''

میں نے اس زمانے کی خوراک کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: ''بیٹا، وہ بڑے سستے زمانے تھے، لیکن اُس زمانے میں بھی ہم پر چار سو روپے روزانہ خرچ ہوتا تھا۔''

فن پہلوانی کے انحطاط پر ایک سوال کے جواب میں بولے..... ''بات دراصل یہ ہے کہ اب لوگوں میں کردار نہیں ہے۔ ہم لوگ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھتے تھے، پاکبازی اور شرافت ہمارا جوہر تھا، اس لیے اللہ نے وہ طاقت عطا فرمائی کہ بڑے بڑے ''گھنے خاں'' ہمارا لوہا ماننے لگے۔''

''بابا جی ..... آپ انشاءاللہ جلد تندرست ہو جائیں گے''۔

''ناں بیٹا..... ایسی بات منہ سے نہ نکالو۔ میں گیدڑ کی طرح بستر پر پڑا ہوں۔ ساری زندگی انجکشن کے قریب سے نہیں گزرا، اب دن میں تین تین مرتبہ میرے بازوؤں میں سوئیاں چبھوئی جاتی ہیں۔ دو قدم اُٹھاتا ہوں تو ہانپ ہانپ جاتا ہوں۔ میں مردوں کی طرح ہنستا مسکراتا اپنی زندگی کی موت کے حوالے کرنا چاہتا ہوں، یوں سسک سسک کر مرنا مجھے قبول نہیں.....''

اُن کے چھوٹے بھائی ہماری باتیں بڑے غور سے سنتے رہے، تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان کے منہ سے آہ نکل جاتی اور وہ کہتے..... ''اللہ میری توبہ..... اپنا رحم کر..... اپنا فضل کر.....

ان کا چھوٹا بھائی بھی منوں مٹی نیچے پڑا ہے، لیکن گاماں پہلوان نے اپنے پیچھے جو خانوادہ چھوڑا، وہ آج بھی مردِ میدان ہے۔ اُس کے لگائے ہوئے پودے آج بھی اپنے قابلِ فخر جدِ امجد کے کارنامے پڑھتے، سُنتے اور پھر اپنے آپ کو اس نقوشِ پا پر چلانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ گاماں ایک فانی انسان تھا، وہ آج اگرچہ موجود نہیں، مگر جب تک فن پہلوانی کا ایک بھی قدر شناس موجود ہے، گاماں زندہ رہے گا، اُس کے کارنامے زندہ رہیں گے۔

## حضرت بہزاد لکھنوی

آپ کو نعت پڑھنے کا ایک سلیقہ تھا، مرحوم جب نعت پڑھتے تو اُس کے جذب و کیف میں ڈوب جاتے، آنکھیں بند کر لیتے اور اپنی گردن اور ہاتھ کے درمیان بندھی ہوئی ڈوری کو متواتر ہلاتے رہتے، جانے اس طرح وہ نعت کے الفاظ کے زیر و بم کو متوازن رکھتے تھے یا یہ ایک عادتِ ثانیہ

بن گئی تھی۔ قدیم لکھنو کی تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے، وہی بانکپن، گفتگو کا وہی کرارا پن، لانبا قد، چھدری ڈاڑھی غلافی آنکھیں، میں نے جس زمانے میں ان کے آٹوگراف حاصل کیے، جوانی کی حدیں پھلانگ چکے تھے اور بڑھاپے کی سرحد پر کھڑے تھے۔ اس سن رسیدہ عمارت کو دیکھنے کے بعد یہ یقین اور پختہ ہو جاتا تھا کہ جوانی میں بلا کے حسین ہوں گے۔ اُن کے دستخطوں سے اُن کی نفاست طبع پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہوتی ہے۔ صاف ستھرے نگینے کی طرح جُڑے ہوئے الفاظ..... کسی نے سچ ہی کہا ہے اگر کسی شخصیت کے اندر جھانکنا چاہو تو اس کی تحریر دیکھ لو۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ اور لیاقت علی خان مرحوم میں بھی یہ وصف تھا کہ الفاظ کے سلسلے میں کنجوس نہ تھے۔ اپنے باطن کی طرح اپنے ظاہر کو بھی عیاں رکھتے تھے۔ نجانے وہ لوگ کیا ہوتے ہیں جو اداسیگی اظہار میں بخیلی برتتے ہیں۔ ان کی تحریر دیکھ کر خوردبین کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ میں ذاتی طور پر ایسے بڑے ادیبوں کو جانتا ہوں جو تحریر کے معاملے

## صحافی نامہ

کسی روزنامے میں بھرتی کرا دے
مرے مولا مجھ کو صحافی بنا دے

جلوس اور جلسے میں دیکھوں سیاسی
کروں اپنے لفظوں میں اُن کی عکاسی
میرے نام سے ایسی خبریں لگا دے

پڑا ہے صحافت کا مجھ کو جو چسکا
لگاؤں حکومت کو میں بھی تو مسکا
ہُنر چاپلوسی کا مجھ کو سکھا دے

پریس کا میں سینے پہ تمغا سجاؤں
جہاں جی کرے میں آزادی سے جاؤں
بڑا قیمتی ہے یہ تمغا دِلا دے

پولیس جو کسی سے بھی ڈرتی نہیں ہے
صحافی سے لیکن اکڑتی نہیں ہے
میرا بھی تو ٹھکا پولیس پہ جما دے

میں پی آر اپنی بڑھاتا ہی جاؤں
صبح شام لوگوں سے کھابے اُڑاؤں
میرا اس طرح مقدر جگا دے

بنی ہے شہر میں صحافی کالونی
ممبر میں بن جاؤں اس کا قانونی
یہ سونے کا ٹکڑا مجھے بھی دلا دے

(چوہدری عبدالخالق)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں قارون ہیں۔ ان کی خوبصورت تحریر کا انداز دیوار پر رینگتی ہوئی چیونٹیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میں ان کے نام کیوں گنواؤں؟ یہ لوگ آپ کے یمین و یسار رہتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے ایسے لوگ خلل دماغ (Complex) کا شکار ہوتے ہیں۔

بہزاد لکھنوی اس طبقے سے الگ تھے۔ ان کی تحریر اُن کے آئینۂ دل کی طرح صاف اور شفاف تھی۔ اُن کے صاحبزادے مدتوں ریڈیو پاکستان سے خبریں سناتے رہے۔ پاکستان کے سیاسی مدّ و جزر کی اکثر خبریں انور بہزاد نے سنائیں۔

اور پھر..... ایک روز اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ بہزاد لکھنوی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یقیناً بہزاد لکھنوی نے حضور سرورِ کائناتؐ کی مدحت کے صلے میں اعلیٰ مقام حاصل کیا ہوگا..... حق مغفرت کرے.....

## عبدالحمید عدمؔ

میکدے اور خرابات کا شاعر۔ میکدے کی راہ سے بچ کر زندگی برتنے والا شاعر، بھاری تن و توش کا مالک۔ انکسار اور جانثاری کا پیکر۔ یُوں لگتا ہے جیسے زمانے بھر کا دُکھ ان کے وجود میں سما گیا ہو۔ آپ سے ملیں تو بچھ بچھ جائیں گے۔ ''حضور'' ان کا تکیہ کلام ہے۔ میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں، عدم پیدائشی شاعر ہے۔ اشعار اُس پر بارش بن کر نازل ہوتے ہیں اور شائد یہی وجہ ہے کہ عدم بے حد زود گو شاعر ہے۔ اُس کے کلام کے درجنوں مجموعے بازار میں دستیاب ہیں اور ہر مجموعہ ایک جرعۂ تازہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اختر شیرانی مرحوم کی طرح عدم بھی طبقہ اناث میں بے حد مقبول ہے۔ کالج کی طالبات اس کے کلام پر جان چھڑکتی ہیں۔

بسیار نویسی نے عدم کو ایک عام سا شاعر بنا دیا ہے۔ ایک ہی مضمون وہ الفاظ کے مختلف ہیر پھیر سے اپنی ہر غزل میں باندھتے ہیں، البتہ ایک چیز جو عدم کو دوسرے شاعروں سے منفرد مقام عطا کرتی ہے، وہ ان کی چھوٹی چھوٹی بحریں

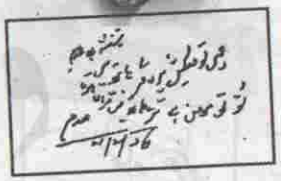

ہیں۔ کوثر و تسنیم میں دُھلے ہوئے اور نگینے کی طرح جُڑے ہوئے الفاظ ہیں۔ وہ ان الفاظ کو شراب کہنہ کے رس میں بھگو کر سینۂ قرطاس پر اتارتے اور خود دلوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ محکمہ اکاؤنٹس میں گزارا اور حیرت ہوتی ہے کہ شاعرِ خرابات کا ایک اور ایک دو سے کیا کام؟ لیکن باور کیجئے، وہ اسی محکمے سے مدتِ ملازمت پوری کر کے ریٹائر ہوئے۔

ایک مرتبہ ملتان تک عدمؔ کے ساتھ سفر کا موقع ملا۔ اچانک ایک جگہ بس خراب ہو گئی۔ قریب ہی ایک ہوٹل تھا، ہم وہاں چائے پینے چلے گئے۔ ایک معصوم سا بچہ حیرت بھری نگاہوں سے تک رہا تھا۔ عدم نے اسے پیار سے اپنے پاس بلایا اور ہوٹل والے سے کہا، بسکٹ، پیسٹری، بن اور اس کے ساتھ جو کچھ تمھاری دُکان میں ہے، اس بچے کو دے دو۔ شائد بچہ کئی دنوں سے بھوکا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے طشتری میں رکھی ساری چیزیں ہڑپ کر گیا اور عدم نے فوراً ہوٹل والے کو دس روپے ادا کر دیے۔ ابھی فارغ ہوئے ہی تھے کہ ایک فقیر نے یہ منظر دیکھ کر دستِ سوال دراز کیا۔ عدم نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو ہاتھ لگا، اسے



دے دیا..... مجھے یاد ہے اُس ریزگاری کے ساتھ ایک پانچ اور دس کا نوٹ بھی شامل تھا۔ (واضح رہے کہ یہ پچاس کے عشرے کی بات ہے)

ایک اور موقع پر ان کے ایک مداح نے ان کے اعزاز میں دعوت دی۔ ان کا پسندیدہ مشروب بھی منگوایا۔ مگر اس مشروب کے ساتھ لوازمات کی کمی تھی۔ اُس وقت اُن صاحب کا نوکر بھی موجود نہ تھا۔ قریب ہی ایک خاکروب کھڑا تھا۔ عدم نے کہا، حضور انھیں تکلیف دیجئے، یہ بازار سے کچھ لا دیں..... میزبان بولے۔ ''عدم صاحب یہ خاکروب ہے۔''

''انسان تو ہے''..... عدم بولے۔

چنانچہ وہ شخص شرماتا لجاتا بازار گیا اور مطلوبہ چیزیں لے آیا۔ عدم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا..... ''حضور اب تکلف کس بات کا..... ذرا ہاتھ صاف کیجئے۔''

## اے کے بروہی

نامور قانون دان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مشیر مسٹر اے کے بروہی کا اصل نام اللہ بخش خدا بخش بروہی تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے، اکثر بڑے آدمی بدخط ہوتے ہیں، خود دیکھ لیجئے۔ تصوف اور رموزِ تصوف پر گھنٹوں بولنے والے شخص کے دستخط کس قدر بھدّے ہیں لیکن یہ شخص مجموعۂ اوصاف ہے۔ اپنے قانونی پیشے کے علاوہ اسے پیروں، فقیروں اور اولیاءاللہ سے بے حد عقیدت اور محبت ہے۔ یہ الگ بات کہ ایک زمانے میں اُس نے پاکستان بھر کے علماء کرام کو چیلنج کیا تھا کہ اگر کوئی قرآن مجید سے ملک کا آئین وضع کر کے دکھا دے تو اسے ایک لاکھ روپے انعام دیں گے۔

پھر ایک دن انھیں یونیورسٹی ہال میں پیر صاحب دیول شریف کے قدموں میں بیٹھے دیکھا تو اپنی بصارت پر یقین نہ آیا۔ پیر صاحب کی تقریر کے دوران چند لوگوں نے انھیں زچ کرنے کی کوشش کی تو بروہی بُری طرح بپھر گئے۔

''آپ لوگ جہنمی ہیں، آپ کو پتھر اور کندن میں تمیز نہیں۔''

پھر نہ جانے کیا ہوا، یکا یک ''مسلمان'' ہو گئے۔ رُومی، اقبال، حافظ اُن کی نوک زباں ہیں۔ قرآن مجید کی متعدد آیات ازبر ہیں۔ اپنی تقریروں میں انھیں برمحل استعمال کرتے اور داد سمیٹتے ہیں۔ اردو بولنے سے کتراتے اور انگریزی میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے، بروہی تو امراء کے وکیل ہیں، اُن کی فیس وہی ادا کر سکتا ہے جو زر و سیم میں کھیلتا ہو۔ تصوف کے بارے میں بروہی کو سنا۔ روح اور مادے کی کثافتوں کے بارے میں انھیں بارہا چہکتے ہوئے پایا۔ عدالتوں میں ان کا استدلال دیکھا۔ اور بروہی نے کیا کیا نہیں دیکھا۔

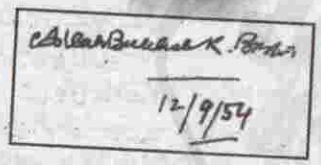

ایوب خان کا عروج و زوال دیکھا۔ اُس کے یمین و یسار رہے۔ قانونی مشورے دیے۔ اپنے خلاف مرتد اور ملحد ہونے کے فتوے سُنے اور پھر ''عوام الناس'' کو اپنے ہاتھوں کے بوسے لیتے ہوئے دیکھا۔ بروہی صاحب کی شخصیت ان چند الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے۔ ''ایک متحرک اور فعال شخصیت''۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندگی صبح وشام کی طرح رنگ بدلتی ہے۔ کبھی خوشی کبھی غم، کبھی سکون اور کبھی تلاطم،
کہیں مسرت اور کہیں حیرت، اِس کا حصہ ٹھہرتے ہیں
حیرتوں سے بھری ایک زندگی کے چند اوراق

# آشیر مجھے مار

کبھی جو موت آنکھیں کھولے سامنے کھڑی ہو تو آپ کو کیسا لگے گا.....؟

حبیب الرحمٰن

## کتے کی دُم

کہتے ہیں کہ کتے کی دُم کئی سال تک نلی کے اندر رکھے جانے کے باوجود جب باہر نکالی گئی تو اس کا خم بدستور قائم تھا مگر جس کتے کا میں ذکر میں کر رہا ہوں یقین مانئے، اِس بے چارے کی دُم بالکل سیدھی تھی۔

میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ ہمارے اپنے گاؤں میں کوئی اسکول نہ تھا۔ جہاں میں پڑھتا تھا وہ سکول بھیر کونڈ نامی بڑے گاؤں میں واقع تھا جو ہمارے گاؤں سے کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں دو نالے پڑتے تھے، اچھڑ اور بھوت نالہ۔

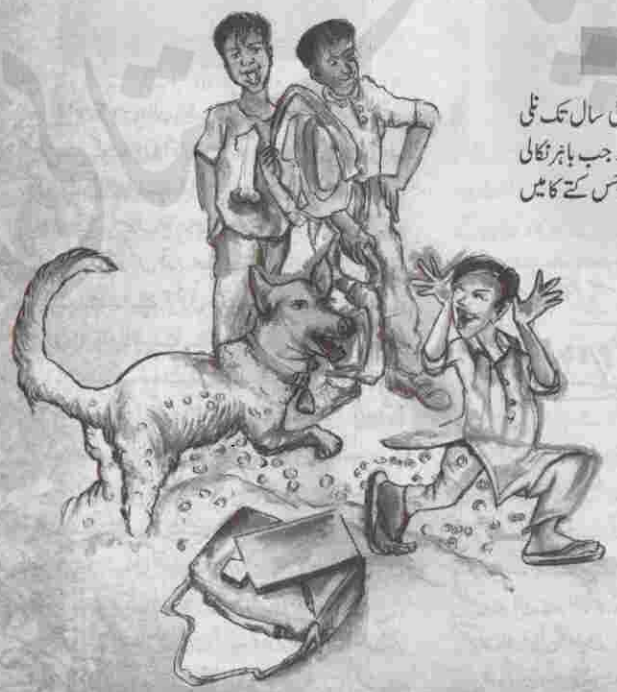

ہم اُنہیں عبور کر کے جایا آیا کرتے۔ عام طور پر ان میں پانی دو تین فٹ سے زیادہ نہیں ہوا کرتا تھا مگر طغیانی کے دوران یہ دونوں پانی اکٹھے ہو جایا کرتے اِس طرح یہ پانی کوئی تین چار فرلانگ چوڑے رقبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا۔ ساون بھادوں کے مہینوں میں یہ پہاڑی نالے اکثر طغیانی میں رہتے اور ہمیں اِس موسم میں کئی کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑتا تا کہ پانی کم ہو تو پار کریں۔ بعض اوقات اوپر ان کے منبع کے قرب و جوار میں بارش کی وجہ سے یہ اچانک چڑھ جاتے اور اِس طرح نچلے حصے میں کئی انسانی جانیں اور مال مویشی ضائع ہو جاتے۔

چار بجے چھٹی کی گھنٹی بجی تو سب سے پہلے میں اور میرے گاؤں کے تین ہم جماعت لڑکے اپنی اپنی تختیاں اور بستے سنبھال کر کلاس سے باہر نکل آئے اور پھر جو دوڑ لگائی تو اچھڑ نالے کے کنارے آ کر دم لیا۔ بارش کی وجہ سے یہ نالہ بپھرا ہوا تھا اور دوسرے نالے کے پانی سے مل کر اس نے تین چار فرلانگ چوڑے دریا کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ ہم نے اپنے اپنے بستے کنارے پر رکھ دیے اور پانی میں پتھر پھینکنے کی مشق کرنے لگے۔ جس کا پتھر پانی کی سطح پر کودتا ہوا دُور تک چلا جاتا، وہ بہت خوش ہوتا۔ اِسی دوران ہمارے بعد آنے والے لڑکوں کی ٹولی نے جس میں میرا بھائی بھی شامل تھا، ایک کتے کو کہیں گھیرا اور اسے پتھروں کے آگے رکھ لیا۔ کتا گولی کی طرح بھاگتا ہماری سمت آ نکلا۔ یہ کاغانی کتا تھا، بہت بڑی جسامت کا۔ یہ کتے کاغان کے گوجر اپنے بھیڑ بکریوں کے کی رکھوالی کے لیے پالتے ہیں۔

نالے کے کنارے جہاں راستہ آ کر ختم ہوتا تھا، وہ ایک ایسا مقام ہے جو اونچے کنارے اور چھوٹے ٹیلوں کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتا تھا تاوقتیکہ آنے والا بالکل ہی قریب نہ پہنچ جائے۔ کتا گھبراہٹ میں جب اِس مقام پر پہنچا اور اِس کی نظر ہم پر پڑی تو بے چارے نے سوچا "یک نہ شد دو شد۔" ہمیں دیکھ کر اِس پر اِس قدر خوف طاری ہوا کہ وہ واپس ہونے کے بجائے پانی میں اُتر گیا۔ میں نے شرارتاً اُس کی دُم پکڑ لی۔ کتے نے "بُوں" کی آواز نکالی اور مجھے کھینچتا ہوا گہرے پانی میں لے گیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میری شرارت مجھے موت کے منہ میں لے گئی ہے، چنانچہ میں نے دُم مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھام لی اور چلانا شروع کر دیا "بچاؤ ڈوب گیا، بچاؤ ڈوب گیا۔"

میری اِس چیخ و پکار سے کتا اور تیزی سے تیرتا اور کبھی کبھی گردن پیچھے کو موڑنے کی کوشش بھی کرتا اور "بوں بوں" کی ہلکی سی آواز نکالتا رہا۔ مگر بالکل ہی مڑ جاتا اس تیز رفتار اور گہرے پانی میں اس کے بس کی بات نہ تھی۔ دو چار ڈبکیوں کے بعد میں بالکل بے بس ہو گیا کیونکہ پاؤں کہیں نیچے ٹکتے ہی نہ تھے مگر مارے خوف کے میں نے کتے کی دُم نہیں چھوڑی۔ مجھے کتا یوں کھینچے لے جا رہا تھا جس طرح جھاڑو کو۔ میرے دونوں ہاتھ اِس کی دُم پر تھے اور باقی بدن کا سارا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے بھی اپنی ماں کا خیال آ رہا تھا اور کبھی بڑے بھائی کا جو لڑکوں کی پچھلی ٹولی میں ہم سے کوئی پونے میل کے فاصلے پر آ رہا تھا۔ خوف سے میرا لہو خشک ہو گیا اور موت میرے رُوبرو کھڑی ہنس رہی تھی۔ میں نے دُعا کی اور خدا سے وعدہ کیا کہ اگر موت سے بچ جاؤں تو پھر ایسی شرارت نہیں کروں گا۔ اِس دوران میرے پاؤں کہیں دو چار مقامات پر تیز پتھروں سے ٹکرائے اور مجھے محسوس ہوا کہ میری ٹانگیں اور پاؤں زخمی ہوئے ہیں مگر زندگی کے مقابلے میں زخمی ہونا میرے لیے اہم نہ تھا۔ ایک مرتبہ میرا ہاتھ کھسکتے کھسکتے دُم کے عین سرے پر پہنچ گیا تھا مگر کسی غیبی طاقت نے دوبارہ میری گرفت مضبوط کر دی۔

دوسرے کنارے پہنچ کر جب کتے کے اگلے پاؤں پانی سے باہر نکلے تو میں نے فوراً دُم چھوڑ دی کیونکہ میرے پاؤں اب بھی ریت اور پتھروں پر تھے۔ کتا دُم دبا کر بھاگا۔ وہ مجھے بلائے ناگہانی سمجھتا رہا مگر میں اُسے اپنا محسن سمجھتا رہا کیونکہ بجائے ڈوبنے کے میں اسی کے سہارے طوفان سے زندہ سلامت بچ نکلا تھا۔

کنارے پہنچ کر میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میرے پاؤں اور ٹانگیں زخمی تھیں اور خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنے کپڑے اُتار کر نچوڑے۔ کچھ دیر سستایا اور پھر لنگڑاتا لنگڑاتا گاؤں کی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف چل دیا۔

اُدھر جب لڑکوں نے مجھے دیکھا کہ کتا مجھے پانی میں کھینچتا چلا جا رہا ہے اور میں مدد کے لیے پکار رہا ہوں تو وہ سب واپس سکول والے گاؤں کی طرف دوڑے تاکہ میرے بھائی اور دیگر لڑکوں کو اس حادثے کی اطلاع دیں۔ میرے بھائی کو اطلاع ملی تو وہ بے چارا جائے حادثہ کی طرف دوڑا اور دو بچوں کو کہا کہ وہ ہمارے ماموں کو اطلاع دیں جو بھیر کونڈ گاؤں کے باسی تھے۔ میرا بھائی زاروقطار روتا جب اس نالے کے کنارے پہنچا جو دریا میں تبدیل ہو چکا تھا تو میرا اور کتے کا کہیں دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ وہ پانی کے کنارے دھاڑیں مار مار کر روتا رہا اور اس کے ساتھی اسے تسلیاں دیتے اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

وہ کبھی کنارے کے ساتھ ساتھ نیچے کی طرف دوڑتا اور کبھی پانی کی سطح پر دُور دُور تک نظر دوڑاتا اور میرا نام لے لے کر زور زور سے پکارتا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ میرے دونوں ماموں مع چند اور آدمیوں کے بھی آن پہنچے۔ آتے ہی اُنہوں نے میرے بھائی کی ڈھارس بندھائی مگر وہ خود دل ہی دل میں رو رہے تھے کہ اپنی بہن کو یہ خبر کیسے اور کس طرح سنائیں گے کہ اس کا چہیتا بیٹا ڈوب کر مر گیا۔ چنانچہ میرے ماموں مع ساری پارٹی کے نالے کے کنارے کنارے نیچے کی طرف چل پڑے جہاں یہ پانی جا کر دریائے سیرن میں گرتا ہے۔ وہاں پہنچ کر بھی اُنہیں مایوسی ہوئی کیونکہ اتنے تیز رفتار سیلاب میں لاش ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ پارٹی کونا کونا چھان کر مایوس لوٹی۔ اب ان میں سے ہر آدمی کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ میرا نام و نشان مٹ چکا۔ میرے ماموں، بھائی اور گاؤں کے چند لڑکے کنارے پر اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ پانی اُترے تو وہ گاؤں جائیں۔ میرے ماموں میرے بھائی بے چارے کو کوس رہے تھے کہ اس کی لاپروائی سے میں ڈوب کر مرا ہوں۔ حالانکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا، شرارت میری اپنی تھی۔

اب جب میں بلی کی طرح بھیگا ہوا اور زخمی حالت میں گھر پہنچا تو میری بیوہ ماں دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ''بیڑا غرق ہو اُن کا جنھوں نے تیرا یہ حال کیا ہے۔ کون تھے وہ کمینے؟ کیا وہاں کوئی چھڑانے والا نہیں تھا؟ اِن بدمعاشوں کے بچوں نے میرے معصوم بچے کا مار مار کر برا حال کر دیا۔ کیا وہ اپنے گاؤں کے تھے یا بھیر کونڈ کے؟ اگر یہاں کے ہیں تو میں خود ان کا علاج کروں گی اور اگر بھیر کونڈ گاؤں کے ہیں تو میرے بھائی ان کے ساتھ سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ میرا بیٹا یتیم ضرور ہے مگر ہم کوئی گئے گزرے تھوڑے ہیں، بانہوں والے ہیں۔ اللہ کا فضل ہے۔'' اب ماں نے مجھے سینے لگا کر چوما اور پوچھا ''جلدی سے بتا کتنے لڑکوں نے تجھے مارا اور وہ کون کون سے ہیں؟''

میں نے بھی اپنی حالتِ زار پر رونا شروع کر دیا اور ہچکیوں کے دوران اسے بتایا کہ اسکول سے واپسی پر جب میں نالہ پار کر رہا تھا تو پانی فوراً چڑھ گیا اور میں کپڑوں سمیت تیر کر بچا ہوں۔ نالے کے اندر نوکیلے پتھر بہہ رہے تھے جن سے میرے پاؤں ٹکرا ٹکرا کر زخمی ہوئے۔ اس پر میری ماں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں بچ گیا۔ ماں نے میرے کپڑے تبدیل کیے اور کھانا دیا۔ کھانے کے دوران وہ بار بار یہی پوچھتی رہیں ''کہیں اور تو چوٹ نہیں لگی میرے بیٹے کو۔''

جب ماں نے میرا سارا بدن دیکھ لیا تو پھر سورۂ مزمل تلاوت کر کے اپنے ہاتھوں پر پھونک ماری اور میرے بدن پر پھیر دیے اور مجھے کہا کہ اب لیٹ جاؤ۔ جب اُنہوں نے پوچھا کہ تمہارا بھائی کدھر ہے، کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں تھا، تو میں نے کہا کہ وہ بہت پیچھے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا ہوا آ رہا تھا اور میرا بستہ بھی اُسی کے پاس ہے تو اُسے دوسرے بچے کی فکر لاحق ہوئی اور کہنے لگی: ''کہیں وہ بھی تیری طرح نالہ پار کرنے کی کوشش نہ کرے۔ خدا اس کا حافظ و ناصر ہو۔ اُسے چاہیے کہ رات وہ ماموں کے ہاں گزارے کیونکہ نالوں میں پانی زیادہ ہوگا۔''

میں بہت تھکا ہوا تھا۔ کھانا کھاتے ہی سو گیا مگر میری ماں قرآنِ پاک لے کر بیٹھ گئی اور تلاوت کرنے لگی۔ عشاء کے قریب میرے ماموں مع بھائی کے آ پہنچے۔ میری ماں نے



دروازہ کھولا تو میرے ماموں ان سے لپٹ گئے اور زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ میرے بھائی نے چیخ ماری اور بے تحاشا ماں سے لپٹ گیا۔ میری ماں نے بھی رونا شروع کر دیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات ہے۔

آخر میری ماں نے پوچھا، آپ لوگ کیوں رو رہے ہیں، خیر تو ہے؟ میری ماں بے چاری کو خیال پیدا ہوا، شاید میرے نانا گزر گئے جو بہت ضعیف تھے۔ میری ماں نے پوچھا ''ابو تو خیریت سے ہیں؟''

اس پر سسکیاں بھرتے ہوئے میرے بڑے ماموں نے کہا ''ابو تو خیریت سے ہیں مگر تیرا بیٹا حبیب الرحمٰن ڈوب کر مر گیا۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ اس کی لاش مل جائے مگر وہ بھی نہیں مل سکی۔ میرے منہ میں خاک کہ میں کیسی منحوس خبر سنانے تمہیں آ گیا ہوں۔''

اب میرے بھائی نے خوب چیخیں ماریں اور ماں سے لپٹ کر رونے لگا۔ ''بی بی! اب حبیب کو ہم کہاں سے لائیں گے؟''

اس پر میری ماں بولی ''کیا آپ سب حبیب الرحمٰن کے لیے رو رہے ہیں؟''

میرے ماموں بولے ''ہاں۔''

وہ بولیں ''رونا بند کرو، وہ تو زندہ سلامت ہے اور اندر کمرے میں سویا ہوا ہے۔''

میرا بھائی اور ماموں جھٹ دوڑے اور مجھے گہری نیند سے جگا کر بستر سے باہر کھینچ لائے۔ اُنہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی زندہ ہوں۔ وہ بھونچکے سے رہ گئے اور کبھی میرے منہ اور کبھی میرے وجود کو دیر تک دیکھتے رہے اور محسوس کرتے رہے۔ جب اُنہیں یقین ہو گیا کہ واقعی میں صحیح سلامت ہوں تو کہنے لگے ''یہ شریر لڑکا کسی نہ کسی روز ہمیں خون کے آنسو ضرور رُلائے گا۔''

جب میری ماں نے پوچھا وہ کیسے، تو ماموں نے میری ماں کو ساری صحیح بات بتا دی۔ ماں نے پھر میری اتنی پٹائی کی کہ مجھے اگلے سارے زخم بھول گئے۔

اگلے روز صبح ناشتے پر سب نے میرا کارنامہ میری زبانی سنا تو ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ ماں کہنے لگی ''یہ تو خود ہی کتے کی دُم ہے، اس لیے اسے کتے کے پیچھے لگنا ضروری تھا۔''

## شکار کا چسکہ

میں بمشکل کوئی گیارہ سال کا تھا جب مجھے شکار کھیلنے کا چسکہ پڑ گیا۔ جب تک بندوق نہیں تھی تو غلیل سے شکار کیا کرتا، مگر جب بندوق ہاتھ آئی تو پھر اسی سے شکار کھیلنے لگا۔ پہلی مرتبہ جب میں نے بارہ بور کی دونالی بندوق سے فاختہ پر فائر کیا تو میں پیچھے جا پڑا اور بندوق میرے سامنے زمین پر گر پڑی۔ پھر بھی میں دل میں کہتا ''جا کوئی بات نہیں، اگر شکار نہیں ہو سکی تو کم از کم ''گھوگھوشو'' تو نہیں کرے گی۔'' یہ تو خیر بات سے بات نکل آئی، اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

میں میٹرک کا طالب علم تھا اور چھٹیوں کے دوران میں سارا دن بندوق لیے مارا مارا پھرتا رہتا۔ شکار کا چسکہ بھی افیم سے کم نہیں ہوتا۔ جب شکار نہ ملے تو نشانے لگاتا رہتا۔ جب کارتوس ختم ہو جاتے تو اکثر میں پرانے خالی کھوکھوں کو دوبارہ بھر کر استعمال کرتا۔ یہ طریقہ بڑا آسان تھا اور ساتھ ہی اس سے کارتوسوں کے خرچ میں بے حد کمی ہو جاتی۔

دسمبر کی ایک سرد صبح میں اپنے چھوٹے بھانجے

### سردار جی کی ''ذہانت''

بھارت میں ایک سکھ نے اپنے گھر پولیس بلوائی۔ معلوم ہوا کہ اس نے کسی سے ہیروئن خریدی تھی اور اسے شک تھا کہ اس کو ہیروئن کی جگہ کوئی سفید سفوف دے کر دھوکا دیا گیا ہے۔ چنانچہ اب وہ چاہتا تھا کہ پولیس ہیروئن فروشوں کی ایف، آئی، آر کاٹے..... یہ سردار جی کی خوش قسمتی تھی کہ ہیروئن واقعی جعلی تھی، ورنہ اس کی اپنی ایف، آئی، آر کٹ جاتی۔

(عالیہ فاطمہ، لاڑکانہ)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

(عبدالعزیز) کو لے کر مرغابیوں کے شکار کے لیے دریا پر گیا۔ یہ دریا جسے سیرن کہتے ہیں، ہمارے گاؤں سے کوئی چھ فرلانگ کے فاصلے پر پہاڑی سلسلوں کے درمیان بہتا ہوا تھہلہ کے مقام پر دریائے سندھ سے جاملتا ہے۔

دریا کے کنارے کنارے ہم دونوں نے کوئی دو اڑھائی میل کا فاصلہ طے کیا اور اس دوران کوئی چھ بڑی اور دو چھوٹی مرغابیاں ماریں۔ یہ سارا وزن میرے بھانجے نے اُٹھا رکھا تھا۔ چلتے چلتے سامنے دُور دریا کے دوسرے کنارے مجھے ایک بڑی مرغابی بیٹھی نظر آئی۔ میں نے اپنا کوٹ اُتارا۔ کارتوسوں کی پیٹی اور دیگر چھوٹا موٹا سامان عبدالعزیز کے سپرد کر کے اسے ہدایت کر دی کہ وہ یہیں بیٹھ جائے اور یہاں سے ہلے نہیں۔ میں خود چھپتا چھپاتا ایک چٹان کے پیچھے جا پہنچا اور وہاں سے مرغابی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔

مرغابی کا ایک پر زخمی ہو گیا اور اس نے پانی کی سطح پر بھاگنا اور ڈبکیاں لگانا شروع کر دیں۔ اسے پکڑنے کے لیے میں اوپر نیچے دوڑتا رہا مگر وہ کنارے سے پھڑ پھڑاتی دریا کے عین وسط میں چلی جاتی اور وہاں سے ڈبکی لگا کر دُور دریا کے اوپر کی طرف یا نیچے کی طرف جا نکلتی۔ میں نے دوسرا فائر کرنا چاہا مگر کارتوس پاس نہ تھے۔ جب میں زیادہ تنگ ہوا تو میں نے بندوق کنارے پر چھوڑ دی اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ یہ کنارہ دریا کی سطح سے کافی اونچا تھا۔ مجھے پانی کا اندازہ نہیں تھا گو تیراکی میں مجھے کافی مہارت حاصل ہے۔ اپنے وزن سے جب میں پانی کی تہہ میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک غار کے اندر ہوں جہاں سے اس کا منہ مجھے نظر آتا تھا مگر پانی گرجدار آواز کے ساتھ اس میں داخل ہوتا اور بھنور کی شکل میں گھومتا۔

میں اوپر منہ کی طرف آتا تو پانی دوبارہ مجھے چکر دے کر تہہ میں جا ڈالتا۔ پانی بالکل شیشے کی طرح صاف تھا۔ میں کوشش کر کے منہ کے قریب پہنچا تو پانی مجھے کمر توڑ طاقت کے ساتھ دھکیل کر تہہ میں لے جاتا۔ اب موت میرے بالکل روبرو تھی۔ مجھے یقین ہو چلا کہ میں زندگی میں اس بھنور سے باہر نہیں نکل سکوں گا۔ موت کا احساس ہوتے ہی میرے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے۔ میں ایک لکڑی کے ٹکڑے کی طرح بھنور میں گھوم رہا تھا، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مجھ پر خواب کی سی کیفیت طاری ہوئی اور بے بسی کے عالم میں میرے منہ سے لفظ ''اللہ'' نکلا اور اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ کس طرح میں غار کے منہ سے باہر پانی پر آ گیا۔ تھوڑی سی حرکت سے میرے پاؤں زمین کو چھو گئے۔ کنارے کی ایک چٹان پر میرا ہاتھ پڑا اور پتا نہیں کتنی دیر میں اس کے ساتھ جھولتا رہا۔ جب مجھے احساس ہو گیا کہ میں اب بھنور میں نہیں بلکہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کنارے پر پہنچ چکا ہوں تو میں نے ہمت کر کے اپنے نیم مردہ جسم کو گھسیٹ کر کنارے لگایا اور ریت پر لیٹ گیا۔

کچھ سورج کی تمازت سے اور کچھ منہ سے پانی خارج ہونے کی وجہ سے میری طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ تاہم میں کوئی ایک گھنٹہ ریت پر پڑا دھوپ سے استفادہ کرتا رہا۔ جب میں کافی سنبھل گیا تو اُٹھا اور بندوق اُٹھا کر واپس لوٹا۔ جب میں نے اپنے چھوٹے بھانجے سے یہ حال بیان کیا تو بے چارا بڑا پریشان ہوا، مگر میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ اب تو میں زندہ اور ٹھیک ٹھاک تمہارے سامنے ہوں۔ اس لیے اب ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے موت سے مجھے بچا لیا، ورنہ میں مُردوں کی صف میں شامل ہو گیا ہوتا۔

## آبیل مجھے مار

پاکستان بننے کے موقع پر میں کابل میں تھا۔ اُس سے پہلے میں انگریزوں کے سفارتی عملے میں تھا۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہمارا اپنا سفارت خانہ بن گیا تو میں وہاں منتقل ہو گیا۔ ہمارے سفارت خانے کے عملے کے دو اور رُکن اور میں اکٹھے سیر کرنے جایا کرتے اور رہتے بھی اکٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام خلیل الرحمٰن اور دوسرے کا عبدالعزیز اورک زئی تھا۔ خلیل الرحمٰن صاحب خزانچی تھے اور اورک زئی صاحب سائی فر اسسٹنٹ۔ ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے اور معتمد دوست تھے۔

ایک دن ہم تینوں حسب معمول شاپنگ پر نکلے۔ ہم باتیں کرتے جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک دو منزلہ عمارت کے اوپر والے حصے میں ہمیں ایک شیر بندھا ہوا نظر آیا۔ یہ پالتو شیر کسی افغان وزیر کا تھا۔ دوسری منزل کے صحن کی چار دیواری کوئی ڈھائی فٹ کے قریب اونچی ہو گی جس کے اوپر سے شیر سر اُٹھائے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہم تینوں عمارت کے سامنے رُک گئے اور کچھ دیر شیر کو دیکھتے رہے۔ اس دوران مجھے اچانک شرارت سوجھی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے اور منہ بند کر کے زور سے ''اونہوں'' کی آواز نکالی۔ آواز نکلی ہی تھی کہ شیر زنجیر توڑ کر اوپر کی منزل سے نچلے حصے کی دیوار پر کودا اور سرخ سرخ آنکھوں سے ہمیں گھورنا شروع کر دیا۔ اب ہمارے درمیان مشکل سے پندرہ سولہ فٹ کا فاصلہ ہو گا۔ شیر دیوار پر کھڑا تھا اور ہم اس سے قدرے فاصلے پر نیچے کھڑے تھے۔

بپھرے ہوئے شیر کو اچانک اِتنے قریب دیکھ کر ہم پر سکتہ طاری ہوگیا۔ یہ بات بالکل خلافِ توقع تھی کہ ہم تینوں بیک وقت موت کے روبرو ہوجائیں گے۔ میں جھٹ دو قدم پیچھے ہٹا اور خلیل صاحب کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اِن کے بالکل پیچھے کھڑا ہوگیا جبکہ میرے ساتھیوں کی یہ حالت زار تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ میں خلیل الرحمٰن صاحب کی پیٹھ سے چمٹا لرز رہا تھا اور یہی حالت اِن کی بھی تھی جنھیں میں نے لاشعوری طور پر ڈھال بنا لیا تھا۔ عبدالعزیز اورک زئی صاحب کی حالت بھی ہم سے مختلف نہ تھی۔ وہ بھی خوف سے لرز رہے تھے۔

شاید قدرت نے ہماری مرگ کے وارنٹ ابھی جاری نہیں کیے تھے، اِس لیے شیر کی توجہ اچانک دیوار کے نیچے سے گزرنے والے ایک سفید کتے کی طرف مبذول ہوگئی۔ شیر نے آہستہ آہستہ غرانا شروع کردیا۔ دیوار کے نیچے اب کتا چل رہا تھا اور اِسی رفتار سے اوپر دیوار پر غراتا ہوا شیر چل رہا تھا۔ شیر کی آنکھیں ہم پر سے ہٹیں تو ہم نے موقع غنیمت سمجھا اور بھاگ کر دُور ایک گلی میں جا کر چھپ گئے۔ کچھ دیر بعد ایک بھاگتے ہوئے نوجوان نے ہمیں بتایا کہ شہر میں ایک شیر کہیں سے آ گیا ہے اور ایک کتے کو پھاڑ ڈالنے کے بعد اب سڑک پر دوڑ رہا ہے اور لوگ چیخیں مار مار کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ ہم یہ سن کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور پھر گلا صاف کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن صاحب بولے ”یہ سب تیری شرارت ہے۔ تو نے نہ صرف اپنے آپ کو اور ہمیں بلکہ تمام شہریوں کو خطروں میں ڈال دیا۔“ پھر کہنے لگے ”شرارت بھی تُو نے خود کی ہے اور جب موت سر پر آ کھڑی ہوئی تو مجھے ڈھال بنا لیا۔ میرے اچھے دوست ہو.....!“

اُن کی اِس بات سے اب تک نادم ہوں اور ابھی تک نہیں سمجھ پایا کہ میرا اِنہیں ڈھال بنانا آیا شعوری فعل تھا یا لاشعوری۔ میں جب بھی یہ واقعہ یاد کرتا ہوں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے، حالانکہ یہ فعل جہاں تک میں سوچ سکتا ہوں، بالکل بے خیالی میں سرزد ہوا تھا نہ کہ بزدلی کی بنا پر۔

## حادثہ

کہتے ہیں انسان کی چھٹی حس بھی ہے جو آنے والے کئی ایک واقعات کی نشاندہی وقت سے پہلے یا پر وقت کردیا کرتی ہے۔ مجھے بھی اِس چھٹی حس نے عین موقع پر ہونے والے ایک عظیم حادثے سے آگاہ کردیا۔ گو ایسے تنگ ترین وقت میں اپنی جان کو اِس خالق حقیقی کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

یہ ستمبر ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ میں پشاور سے بس کے ذریعے ایبٹ آباد جا رہا تھا۔ بس ٹھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ بس کی چھت سامان سے لدی ہوئی تھی۔ اِن دنوں سڑکیں تنگ سی ہوا کرتی تھیں۔ حسن ابدال اور لارنس پور کے درمیان ایک مقام پر خاصا بڑا موڑ تھا۔ عموماً موڑ شروع ہونے سے پیشتر ہی ڈرائیور ہارن بجانا شروع کردیتے ہیں۔ مگر خدا جانے ہماری



بس کے ڈرائیور نے یہ غفلت کیسے برتی۔ میرے دل میں اچانک خیال پیدا ہوا کہ حادثے ہوا کہ ہوا۔

دراصل میری چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی مگر میں گھنٹی کے سچا ہونے کا اگر اعتبار کر بھی لیتا تو کچھ احتیاطی تدابیر اختیار نہ کرسکتا تھا۔ بہرحال فوری طور پر میں نے اپنی پیٹھ کو سیٹ کی پشت سے لگایا اور دونوں ہاتھوں سے سیٹ کے دائیں بائیں حصے مضبوطی سے تھام لیے۔ میں بمشکل یہ کر پایا تھا کہ ہماری بس کا موڑ کے درمیان میں مخالف سمت سے آنے والے ایک ٹرک سے آمنا سامنا ہوگیا۔ سڑک سرتا سر مکئی کی بوریوں سے بھرا ہوا تھا اور خوب رفتار سے آ رہا تھا۔ مجھے اُس لمحے پتا نہیں یہ کیوں سوجھا کہ موت کو روبرو پا کر آنکھیں موند لیں۔

دوسرے ہی لمحے ایک زوردار دھماکا ہوا اور ہماری بس سڑک کنارے اُلٹ گئی۔ آمنے سامنے کی زوردار ٹکر سے اِس کی چھت کھل گئی اور تمام سامان موڑ پر بکھر گیا۔ سواریاں کچھ بس کے اندر پھنسی ہوئی تھیں اور زیادہ تر سڑک پر پڑی تھیں۔ قیامت کا سا سماں تھا۔ عورتیں، بچے، بڑے، بوڑھے سبھی خون میں نہائے ہوئے تھے اور ان کی آہ و بکا سے دل پھٹے جاتے تھے۔ کوئی دس کے قریب آدمی وہیں مر چکے تھے۔ کئی مرے ہوئے آدمی ابھی پھنسے پڑے تھے۔ کوئی ایسی سواری نہیں تھی جو زخمی نہ ہو۔ سڑک پر دائیں بائیں چھوٹے بڑے شیشوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔

جب میں ونڈ سکرین کے راستے باہر نکلا تو کچھ دیر سکتہ کی حالت میں بت بنا کھڑا رہا۔ میرے کپڑے خون سے لت پت تھے۔ یہ خون دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ میں نے اپنا سر ٹٹولا تو یوں لگا جیسے ربر فوم کے گدے پر ہاتھ پھر رہا ہوں۔ اِسی طرح جب منہ پر ہاتھ پھیرا تو یوں لگا جیسے چہرے کے اندر ہڈیاں نہیں صرف گوشت ہی گوشت رہ گیا ہے۔ میں اِس احساس سے زمین پر گر پڑا۔ اِسی دوران آنے جانے والی ساری ٹریفک رُک گئی اور کسی شخص نے مجھے ہلایا تو میں زندہ تھا۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو اِس شخص نے میرا بغور جائزہ لیا اور پتا چلا کہ میرے بدن پر سوائے چند خراشوں کے کوئی زخم نہیں اور یہ خراشیں بھی ونڈ اسکرین سے نکلتے وقت بدن پر آئی تھیں۔ اُس شخص نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں مگر مجھے بھلا کیسے اعتبار آتا جبکہ میرا تمام لباس خون سے سرخ تھا۔

مجھے چھوڑ کر وہ آدمی دوسرے زخمیوں کی طرف راغب ہوا تو میں بیٹھ گیا اور سوچا اگر واقعی زندہ ہوں اور سر سے لے کر پاؤں تک کہیں زخم بھی نہیں تو پھر یہ خون کہاں سے آیا اور میرا سر نرم نرم کیوں ہے۔ اب جو میں نے دوبارہ جائزہ لیا اور سر ٹٹولا تو اُسے بالکل سخت اور ٹھیک حالت میں پایا۔ یہی حال چہرے کا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور سینے سے نیچے تک سارے جسم پر ہاتھ پھیر کر اور ٹٹول ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں ہی وہ واحد شخص ہوں جو زندہ ہونے کے ساتھ ساتھ زخمی بھی نہیں ہوں۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور لوگوں کے ساتھ مل کر زخمیوں اور پھنسے ہوئے مسافروں کو نکالنے کے کام میں مصروف ہوگیا۔ میں نے اور ایک اور نوجوان نے جب ڈرائیور کو باہر نکالا تو وہ مرا ہوا تھا۔ اُس کی کنپٹی میں ایک بڑا سوراخ تھا جس سے اب بھی خون بہہ رہا تھا۔ یہ زخم اِسے ونڈ سکرین کے شیشے کے ریزہ اور موٹے موٹے تیز ٹکڑوں سے آیا تھا۔ مجھ پر اب اِس راز کا انکشاف ہوا کہ میرے کپڑوں پر خون کیسے آیا۔ دراصل ڈرائیور کی کنپٹی کے سوراخ کا رُخ میری جانب تھا جس سے چھوٹتی ہوئی خون کی دھاریں مجھ پر پڑی تھیں۔

غرض یہ کہ کوئی تین گھنٹے تک ہم مسافروں کو سنبھالتے رہے۔ ہم نے بکھرا ہوا تمام سامان بھی اکٹھا کرلیا اور جب ٹریفک پولیس آئی تو اُنہیں سامان مع فہرست حوالہ کردیا۔ ہم نے زخمیوں اور مرنے والوں کی ایک نامکمل سی فہرست بھی مسافروں ہی سے پوچھ پوچھ کر بنا ڈالی تھی جو سامان کے ساتھ ہی پولیس کو دے دی۔ جب میں وہاں سے ایک اور گاڑی میں روانہ ہوا تو اُس وقت تک گاڑیاں سب زخمیوں کو لے کر روانہ ہوچکی تھیں اور مُردوں کے فوٹو لیے جا رہے تھے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

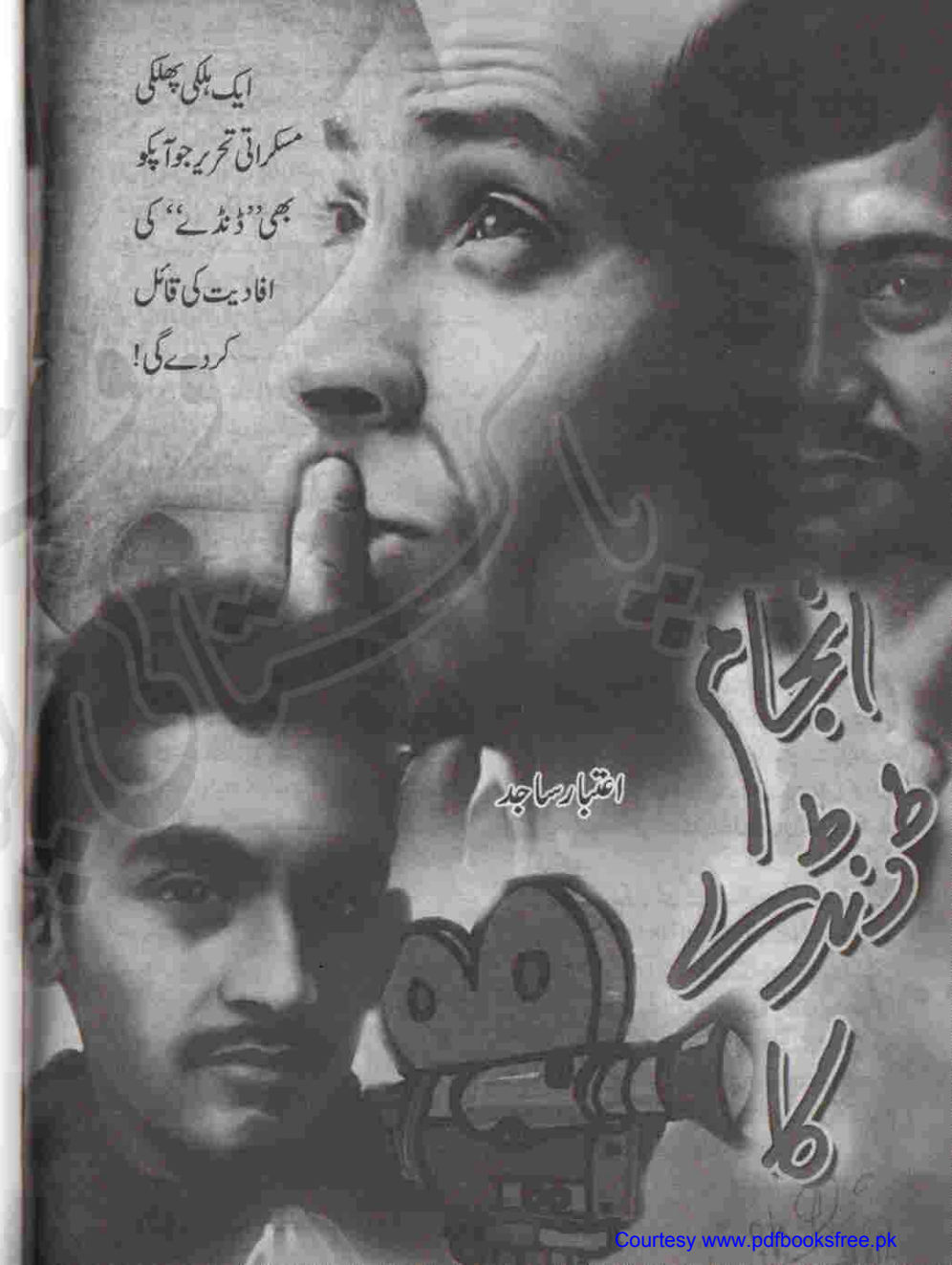


# دروازہ

چھڑاک سے کھلا اور جندوڈا دھڑام سے اندر داخل ہوا۔ یہ اس کی آمد کا مخصوص انداز ہے۔

حسب معمول اس کا چہرہ جوش و جذبے سے تمتما رہا تھا۔ نتھنے تیزی سے پھول اور پچک رہے تھے۔ مونچھوں کے بال بے ترتیبی سے کھڑے تھے۔ یقینی طور پر کوئی نیا منصوبہ نازل ہونے والا تھا۔ اس بات کی گواہی اس کی بغل میں دبی ہوئی فائل نے دی۔

''دُنیا کو حیران اور ششدر کر دینے والا ایک نیا منصوبہ.....'' اس نے مٹھی بھینچ کر ہاتھ کو دائرے میں گھمایا۔ ''بے ڈبلیو انٹر پرائزز''۔ اس منصوبے کے تحت ہم عوام کو کم قیمت پر آسانی سے حاصل ہو جانے والی اشیائے صرف سے متعارف کرائیں گے۔ ایسی چیزیں جنھیں شہری عوام فراموش کر چکے ہیں۔''

''مثلاً.....؟'' میں نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

''مثلاً دھوبی صابن، دھوبی ڈنڈا، ایڑیاں مانجھنے والا جھانوا، دنداسہ، پراندہ، سیب اور ہڑ کا مُربا، چوہے مار گولیاں۔'' وہ ایک ہی سانس میں فرفر بولتا گیا۔ اس نے کئی ایسی چیزوں کے بھی نام لیے جواب صرف بعض دور افتادہ دیہات میں استعمال ہوتی ہیں۔ شہری آبادی کی اکثریت ان کا نام تک نہیں جانتی۔ میں نے فوراً اعتراض کیا کہ ان تمام چیزوں سے گاؤں کے لوگ پہلے ہی اچھی طرح متعارف ہیں۔ رہے شہر کے لوگ تو انہیں ان چیزوں کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں، ان کے پاس گھریلو استعمال کے لیے مشینیں اور دیگر جدید چیزیں ہیں۔ لہٰذا یہ منصوبہ قبل از وقت ناکام تصور کیا جائے۔

جندوڈے کے نتھنوں کے ساتھ مونچھیں بھی پھڑکنے لگیں۔ چیخ کر بولا: ''پروفیسر بی کے بنالہ، میری جان! اس منصوبے کے پیچھے جو روح کام کر رہی ہے، اسے فراموش مت کرو۔ میں کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسانی زندگی جتنی سادہ اور فطرت کے نزدیک ہو، اس میں اتنی ہی خوبصورتی، توانائی اور تندرستی پوشیدہ ہوتی ہے۔ لہٰذا میں ان لوگوں کی توجہ ایک مرتبہ پھر فطرت کی سادگی کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فائل کھول کر فوراً بیلوں کے کھوپوں جیسی عینک آنکھوں پر چپکائی اور اونچی آواز میں ہاتھ لہرا لہرا کر پڑھنا شروع کیا۔ ''سکرین پر ایک ڈنڈا لہراتا ہے، پس منظر سے گمبھیر آواز آتی ہے۔ ڈنڈا.....انسان کا ازلی سہارا.....ڈنڈا.....جس کے ذریعے آپ نا صرف دشمن کو مار بھگانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں بلکہ یہ کپڑے دھونے کے کام بھی آتا ہے۔ آج ہی خریدیے۔ آج ہی استعمال کیجیے۔ چاہے کپڑوں پر چاہے دشمن پر۔ دس دشمن یا بیس کپڑے، ایک ہی ڈنڈا کافی ہے۔''

جندوڈے نے فائل بند کر دی۔ داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے پہلے تو فطری ردِعمل کے طور پر تیزی سے سر نفی میں ہلایا، پھر اس کی شعلہ بار نگاہوں کا رنگ دیکھتے ہی اثبات میں سر ہلانا شروع کیا۔ لیکن ڈرتے ڈرتے کہہ بھی دیا: ''پیارے جندوڈے! تمہاری یہ ایڈورٹائزمنٹ زیادہ نہیں صرف چالیس پچاس برس لیٹ ہو چکی ہے۔ اب ڈنڈے کا نہیں واشنگ مشین کا زمانہ ہے۔''

جندوڈے نے فرطِ جذبات سے میری گردن دبوچ کر اپنا چہرہ میرے چہرے سے اس طرح ملایا جیسے ولن ہیرو سے ملاتے ہیں۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولا: ''ہونہہ واشنگ مشین..... خواتین کو بیکار بٹھا دینے کا مشینی حربہ۔ تاکہ وہ فارغ بیٹھ کر پڑوسنوں سے شوہروں کی غیبت اور عیب جوئی کریں۔ اسی مسئلے کو سامنے رکھ کر یہ دیسی پراڈکٹ ازسرِ نو متعارف کرائی جا رہی ہے۔ اسکرپٹ میں نے لکھا ہے، پروڈکشن میری ہے، جس ہاتھ میں ڈنڈا دکھایا جائے گا وہ میرا ہاتھ ہوگا۔ پس منظر سے جو آواز آئے گی وہ بھی تمہارے اس ناچیز کمترین فدوی نیاز مند جے ڈبلیو خان کی ہوگی۔ البتہ سب سے اہم ذمے داری تمہیں سونپی گئی ہے۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''فنانسر کی تلاش.....'' میں نے جندوڈے کے منہ سے بات اچک لی۔

''بے شک تم ٹھیک سمجھے۔'' وہ زور زور سے سر ہلا کر بولا۔ ''مگر تلاش کی جگہ اغوا کا لفظ استعمال کرو۔ تلاش اس چیز کو کیا جاتا ہے جس کا نظروں سے اوجھل ہونا ثابت ہو جائے۔ اغوا کے لیے اوجھل ہونے کی کوئی شرط نہیں..... تم فنانسر کو ورغلا کر میرے پاس لاؤ گے۔ اس عمل کو ہم بہت مہذب اغوا قرار دیں گے اور زرتاوان کے طور پر فلم پر آنے والی لاگت حاصل کریں گے۔ معاملہ ففٹی ففٹی پر طے ہوگا۔''

''کس کے ساتھ؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا ''معاملہ کس کے ساتھ طے ہوگا؟''

''ظاہر ہے فنانسر کے ساتھ'' جندوڈے نے اطمینان سے کہا۔

''اور میرا حصہ'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ان شاء اللہ یہ کام بھی ہوگا'' جندوڈا آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''جب جے ڈبلیو انٹر پرائزز کی طرف سے یہ فلم کسی پرائیویٹ ادارے کو جملہ حقوق کے ساتھ فروخت کی جائے گی تو اس سے حاصل ہونے والی رقم سے ایک عالیشان کوٹھی خرید کر اس میں دفتر اور اسٹوڈیو قائم کر دیا جائے گا۔ اعلیٰ درجے کا ریسپشن ہال ہوگا۔ گول میز کے پیچھے کم از کم دس آہو چشم دوشیزائیں گاہک کا استقبال کرنے کے لیے موجود ہوں گی۔ اس کے پیچھے شیشے کی دیواروں والا ایک وال ٹو وال کارپٹ کمرا ہوگا۔ گھومنے والی پیور لیدر امپورٹڈ کرسی ہوگی۔ اس کرسی پر براجمان ہوگا جانِ من پروفیسر بی کے بٹالہ۔ جنرل منیجر آبلک مینجنگ ڈائریکٹر جے ڈبلیو انٹر پرائزز۔''

دیر تک وہ مستقبل کے جی۔ ایم کے شاہانہ رنگ ڈھنگ کی نقشہ کشی کرتا رہا اور میں چشمِ تصور میں ریوالونگ چیئر پر جھومتا رہا۔ آخر وہ رک کر بولا: ''ایک اچھا سا لنچ، عمدہ سی چائے اور فائن کوالٹی سگریٹ کا ایک پیکٹ منگوانے کے سلسلے میں فوری قدم اٹھاؤ۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور صبح سے کچھ کھایا نہیں۔''

''ایک عدد سموسا، ایک چائے اور ایک عدد سگریٹ'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''سردست جی ایم آبلک ایم جی کی جانب سے لنچ میں یہی سہولت فراہم کرنے کی گنجائش ہے۔ بنا بریں اس بات کا خیال رکھو کہ کسی بھی وقت دروازے پر دستک ہو سکتی ہے اور مالک مکان چار ماہ کا واجب الادا کرایہ وصول کرنے آسکتا ہے۔ پچھلی بار بھی وہ دھمکی دے گیا تھا کہ اب وہ تنہا نہیں آئے گا۔''

جندوڈے نے آنکھیں میچ لیں۔ بولا: ''خوف و ہراس کی فضا پیدا کر کے لنچ سے فرار حاصل نہ کرو پیارے پروفیسر بی کے بٹالہ۔ تم ایک عظیم دانشور ہو۔ خیر، اس مالک مکان کے کتنے مکان، کتنی دکانیں اور کتنی آمدنی ہے۔ معلومات میں اضافے کے لیے جاننا چاہوں گا۔''

''چھ مکان، دس دکانیں اور ماہانہ لگ بھگ پچیس ہزار روپے کی نیٹ انکم۔ منشی اللہ دتہ صاحب میرے کرم فرما۔ مخیر ہستی، ہوزری کے ایک کارخانے کے مالک، اندازاً چودہ پندرہ مختلف ادبی، ثقافتی اور سماجی تنظیمیں ان کے اشاروں پر چل رہی ہیں۔ کہیں نگران ہیں، کہیں سرپرست، کہیں نگرانِ اعلیٰ ہیں، کہیں سرپرستِ اعلیٰ ہیں۔'' میں نے جندوڈے کو تفصیلات سے آگاہ کیا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھول کے پہلے گلی میں دائیں بائیں دیکھا پھر جیب ٹٹولتا باہر نکل آیا۔ باہر نکل چکا اور گھر سے پچاس قدم کا فاصلہ طے کر لیا تو اچانک آشفتہ دلگیر صاحب مل گئے۔

وہ ایک تازہ نثری نظم لکھ کر سامع کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ شکار کو عین اپنے سامنے پا کر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ لپک کر انھوں نے مجھے دبوچ لیا۔ تقریباً گتھم گتھا ہوتے ہوئے اپنی مسرت اور دلی طمانیت کے اظہار کے طور پر مجھے قریبی کیفے کی طرف دھکیلنا اور گھسیٹنا شروع کر دیا۔ ہم ایک دوسرے کا گریبان تھامے کیفے میں داخل ہوئے۔ حسبِ معمول اکثر میزیں خالی تھیں۔ ایک خالی میز پر قبضہ جما



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر آشفتہ دلگیر صاحب نے دبنگ لہجے میں بیرے کو بلایا اور ازراہِ محبت پوچھنے لگے: ''کیا چلے گا۔ ٹھنڈا یا گرم؟'' میں نے بھی ازراہِ انکسار جواب دیا: ''ناشتا چلے گا۔ جب یہاں چل چکے گا تو مزید منگوایا جائے گا جس کی پیکنگ میرے گھر جائے گی کیونکہ وہاں مہمانِ عزیز بھوکا بیٹھا ہے۔ ہاں تو نظم سنائیے۔ سچی بات یہ ہے کہ آپ کی نظمیں حالات کی عکاسی کرتی ہیں اور سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں۔''

آشفتہ دلگیر کسمسا کر بولے: ''آج تو میرے حالات بھی کچھ میری نظموں جیسے ہیں۔ بہر حال ویٹر: ''ناشتا لاؤ۔ اس میں سے آدھا پیک کر کے لانا۔ ہاں تو نظم عرض کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے ایک لمبا سا کاغذ نکالا اور رک رک کر پڑھنے لگے۔ جتنی دیر میں انھوں نے نظم ختم کی، اتنی دیر میں میں نے ناشتا ختم کیا اور باقی ماندہ ناشتا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''نظم کیسی ہے.....؟'' آشفتہ دلگیر صاحب نے بل ادا کرنے کے لیے جیبیں ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

''یہ نظم اس صدی کی معرکہ آراء نظموں میں شامل ہونے کے لائق ہے۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا اور دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ ''اس نظم میں جو خوبیاں اور محاسن ہیں، وہ بڑے سے بڑے نقاد کے چشمے کی گرفت میں نہیں آسکتے۔ ادبی دنیا میں آپ کے بارے میں بدستور غلط سلط افواہیں اڑائی جا رہی ہیں۔ مگر میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آپ کا اور آپ کی نظموں کا بال بیکا نہیں ہو سکتا۔ آپ اول نمبر کے شاعر ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ دو نمبر کے شاعروں کے ساتھ آپ کی دوستی نے آپ کو برباد کر دیا ہے۔ آپ لٹ چکے ہیں۔ تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ کل پھر نئے ناشتے پر نئی نظم لائیے گا۔ فی امان اللہ.....''

آشفتہ دلگیر صاحب کو مزید دلگیر چھوڑ کر جب میں گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ واحد بوسیدہ صوفے پر منشی اللہ دتہ صاحب براجمان ہیں اور جندوڈا فرنیچر کی شدید قلت کی وجہ

> تلاش کی جگہ اغوا کا لفظ استعمال کرو
> تلاش اس چیز کو کیا جاتا ہے جس کا
> نظروں سے اوجھل ہونا ثابت ہو
> جائے اغوا کے لیے اوجھل
> ہونے کی کوئی شرط نہیں

سے ایک اوندھے کنستر پر ان کے قریب بیٹھا ہے اور قہقہے لگ رہے ہیں۔

مجھے دیکھ کر منشی صاحب کے ماتھے پر فی الفور بل پڑے لیکن جندوڈے نے میری غیر حاضری میں انھیں جانے کیا اناپ شناپ باتیں سنا کر شیشے میں اتار لیا تھا کہ ماتھے کے یہ بل جلد ہی دور ہو گئے اور زندگی میں پہلی بار انھوں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: ''آؤ جی ماسٹر بی کے بٹالہ صاحب۔ خوش آمدید۔ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ مقدر میں جو سختی تھی وہ مر کر بھی نہیں نکلی۔ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔''

اس شاعرانہ حملے پر میں لڑکھڑایا۔ میں نے منشی صاحب کو کبھی شعر و شاعری میں مبتلا نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ اشعار کو اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق جس طرح پیش کر رہے تھے، اس میں چھپی ہوئی دھمکی میرا دل دہلانے کے لیے کافی تھی۔ جندوڈا ہاتھ لہرا کر بولا: ''سبحان اللہ منشی صاحب! شاعری کا جیسا صاف ستھرا بے داغ اور ڈیرٹ جنٹ

ذوق آپ کے اندر پایا جاتا ہے، ایسا کمال اب تک میری نگہ گار آنکھوں نے نہیں دیکھا۔'' پھر وہ میری طرف مڑ کر آنکھ دباتے ہوئے بولا: ''ایک سماجی ثقافتی اور ادبی ہستی، چہرے پر نور، آنکھوں میں سرور، منشی اللہ دتہ مہجور۔ ہمارے ادارے کے نگران اور سرپرستِ اعلیٰ قبلہ وکعبہ نے ازراہِ شفقت یہ عہدہ قبول فرما کر اپنی تصویر عنایت فرمائی ہے تاکہ کل کے اخبارات میں خبر کے ساتھ شائع ہو۔ یہ تصویر خبر کے ساتھ فی الفور تمام اخبارات تک پہنچاؤ۔ منشی صاحب فلم ''ڈنڈا'' کی افادیت کے اصولی طور پر قائل ہوگئے ہیں۔ کرائے میں کسی کے لیے تو ان کا اصول نرم نہیں ہوسکتا البتہ انھوں نے ادائی میں تھوڑی سی نرمی کا عندیہ دیا ہے۔ مزید پندرہ دن کی مہلت عنایت فرمائی ہے۔''

''مگر سولہواں دن نہیں ہونا چاہیے۔'' منشی صاحب نے اچانک بات کاٹ کر کہا۔ ''ورنہ حالات بگڑ سکتے ہیں۔ قفس کی تیلیوں سے سر کو ٹکرانا نہیں اچھا۔ یہ دُنیا درد دیتی ہے، شریکِ غم نہیں ہوتی، کسی کے دور جانے سے محبت کم نہیں ہوتی۔ جب کشتی ثابت وسالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی۔ جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے، تب بوجھ اتارا کرتے ہیں۔''

تیسرے دن جندوڈے کے ساتھ ایک صاحب پرانا وڈیو کیمرا لے آئے۔ غالباً یہ کیمرا کباڑی کی دکان سے خریدا گیا تھا، اس پر جگہ جگہ رنگ برنگی ٹیپیں چپکائی گئی تھیں۔ مختلف چھوٹے بڑے دھاگے تعویزوں کی طرح باندھے گئے تھے۔ شخص مذکورہ ایک ادھڑی ہوئی پرانی جیکٹ، دھاریدار بنیان اور چھجے والی ٹوپی میں ملبوس تھا جس کا چھجا گھما کر گدی کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔

''مسٹر ڈینی فاؤنٹین'' جندوڈے نے تعارف کرایا۔ ''ایک شوقین کیمرامین حالات کی ابتری کا شکار، فلم انڈسٹری سے منہ موڑ کر اب پرائیویٹ سیکٹر میں کچھ کر دکھانے کے آرزومند، ہالی وڈ جانے کے دیرینہ خواہشمند، مگر بھائی پھیرو تک پہنچنے سے قاصر، بوجہ معاشی تنگی اور حالات حاضرہ۔''

ڈینی فاؤنٹین نے برا سا منہ بنا کر کندھے اچکے، کہنے لگا: ''مسٹر جین فونڈا، آئی ایم سوری، مسٹر جندوڈا، میں کئی بار منع کر چکا ہوں کہ آپ بار بار میری غربت کا ذکر نہ کریں۔ اس طرح پبلک میں میری ڈیمانڈ متاثر ہوسکتی ہے، پارٹیاں بدل سکتی ہیں، بہرحال کام کی بات کریں۔''

فی الفور کام کی بات شروع ہوگئی۔ پارٹیاں سکرپٹ پر بیٹھ گئیں۔ فلمی دنیا میں جب یہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ نکالا جاتا ہے کہ سکرپٹ تیار ہو چکا ہے، اب اس پر کام ہو رہا ہے۔ یہاں سکرپٹ پر بیٹھنے کا یہ مطلب تھا کہ ہم تینوں نے جہاں جگہ دیکھی وہیں بیٹھ گئے۔ خاصی دیر اس بیٹھنے کے عمل میں سکرپٹ کے بعض کاغذات بھی ہمارے نیچے بیٹھ گئے۔ خاصی دیر سر کھپایا جاتا رہا کہ صفحہ نمبر چار کے بعد صفحہ نمبر چھ کیسے شروع ہوگیا۔ پانچواں صفحہ کہاں گیا۔ بالآخر پانچواں صفحہ جندوڈے کے شکنجے سے برآمد ہوا۔ جب یہ صفحہ برآمد ہوگیا تو گیارھواں صفحہ غائب پایا گیا۔ یہ میرے دائیں گھٹنے کے نیچے سے برآمد ہوا۔ اکیسویں صفحے کی برآمدگی اس ٹوٹے پھوٹے خوفناک وڈیو کیمرے کے نیچے سے ہوئی جو کنستر کو تپائی سمجھ کر رکھ دیا گیا تھا۔ اب اس سین میں کھانستے کھنکھارتے منشی اللہ دتہ مہجور داخل ہوئے۔ وہ گھر سے کچھ رقم اور ایک منصوبہ لے کر آئے تھے۔ یہ منصوبہ نہیں حکم تھا۔ اس کی رو سے سکرپٹ کو دوبارہ لکھا جانا تھا اور اشتہاری فلم کا ڈنڈا منشی صاحب کو خود دشمنوں پر چلانا تھا۔ ان کا حکم یہ تھا کہ دشمنوں کو سراسر کافر دکھانا چاہیے اور اس ڈنڈے کو دنادن کافروں کی گنجی ٹانٹ پر پڑنا چاہیے۔ آخر میں منشی صاحب کو سکرین پر کلوزاپ میں آکر ڈنڈے کی افادیت میں ایک دھواں دھار تقریر کرنی تھی جس میں بتانا تھا کہ دین کی بھلائی کے لیے جہاد ضروری ہے اور جہاد کے لیے ڈنڈے کے استعمال میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ویسے تلوار ہو تو زیادہ بہتر ہے تاکہ کافروں کے پلید سرکٹ کر زمین پر گرتے دکھائے جاسکیں۔ آخر میں منشی صاحب کو ایک فقرہ کہہ کر معاملے کو اختتام تک



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچانا تھا یعنی برادرانِ اسلام! جہاد میں ڈنڈے کی افادیت اپنی جگہ لیکن کپڑے دھونے کے لیے بھی یہ چیز بری نہیں۔ اس کے استعمال سے بازوؤں کی ورزش بھی ہو جائے گی اور استعمال کنندہ کی صحت پر بھی اس کے خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔

بدقسمتی سے میرے منہ سے نکل گیا: ''اگر سکرپٹ میں ایسی تبدیلی لائی گئی تو اس کے لیے مرکزی خیال بلکہ خیالات کو بدلنا پڑے گا۔''

منشی صاحب نے خشونت آمیز لہجے میں فوراً میری بات کاٹ کر کہا: ''تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ عطا کردہ میعاد کے اندر اندر کرایہ ادا کردو۔ باقی معاملات میرے اور جے ڈبلیو خان کے درمیان ہیں۔ براہِ کرم بیچ میں دخل نہ دو۔''

میں ہڑبڑا گیا بلکہ سہم گیا۔ منشی صاحب نے براہِ راست میری دکھتی رگ پر کرائے کا نشتر رکھ دیا تھا۔ جندوڈے نے کھنکھار کر سچوئشن کو سنبھالا، بولا: ''نورانی شخصیت، عالم فاضل ہستی، منشی صاحب! شاید آپ کو معلوم نہیں کہ پروفیسر بی کے بٹالہ سے زیادہ بہتر جہاد کے ڈائیلاگ کوئی فلمی تاریخی رائیٹر بھی نہیں لکھ سکتا۔''

''وجہ؟'' منشی صاحب نے بدستور خشونت آمیز لہجے میں پوچھا۔

''اس کی وجہ پروفیسر بی کے بٹالہ کی جہاد میں قلبی شرکت ہے۔'' جندوڈے نے ترنت جواب دیا۔ ''یہ ہر جہاد میں قلبی طور پر شریک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا لکھا ہوا ناول کئی مرتبہ چھپنے کے باوجود کہیں نظر نہیں آتا۔ اگلے ایڈیشن کا انتساب آپ کے نام ہوگا۔''

''انتساب؟'' منشی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پوچھنا چاہتے تھے کہ انتساب کیا ہوتا ہے مگر اپنی شرافتِ طبعی کے باعث پوچھ نہ سکے۔ بھنوئیں اچکا کے رہ گئے۔

''وضاحت ضروری ہوگئی ہے۔'' جندوڈے نے اونچے لہجے میں کہا۔ ''انتساب وہ ہوتا ہے جو کسی کتاب کی بنیان ہوتا

یہ دُنیا درد دیتی ہے، شریکِ غم
نہیں ہوتی، کسی کے دور جانے سے
محبت کم نہیں ہوتی۔ جب کشتی
ثابت وسالم تھی، ساحل کی تمنا
کس کو تھی۔ جب کشتی ڈوبنے لگتی
ہے، تب بوجھ اتارا کرتے ہیں

ہے۔ اگر آپ کی بنیان اتار لی جائے تو نیچے سے کیا برآمد ہوگا۔ کچھ بھی نہیں۔ سوائے ایک افسوس ناک توند کے۔ اسی کو چھپانے کے لیے آپ بنیان اور اس کے اوپر کرتہ پہنتے ہیں۔ اسی طرح مصنف بھی ناول کے عیب چھپانے کے لیے انتساب.....''

''ناول کے عیب!!'' منشی صاحب اچھلے۔ ''یعنی یہ ناول عیوب سے بھرپور ہے۔ استغفراللہ۔ توبہ، توبہ ایسے ناول پر میرا نام؟.....''

''بزرگو'' جندوڈے نے فوراً ان کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر انہیں اچھلنے سے روکتے ہوئے کہا: ''یہ ناول جب پہلی مرتبہ انگلینڈ پہنچا تو ملکہ معظمہ نے رائیٹر کو فوراً شاباش کا ایک خط لکھا۔ پیارے پروفیسر، عظیم دانش ور، بی کے بٹالہ، مائی ڈیئر فوراً اپنے پرانے کاغذات میں سے ملکۂ معظمہ کا خط نکال کر منشی صاحب کی خدمت میں پیش کرو۔''

منشی صاحب نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا: ''رہنے دو، رہنے دو۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ ماسٹر بٹالہ ایک اچھا کرایہ دار اور آنکھیں جھکا کر چلنے والا نوجوان ہے۔ اب تک اس

کے خلاف کوئی سنگین الزام سامنے نہیں آیا لیکن خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ جو شاعر نے کہا ہے پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ اپنی زندگی بڑے چین سے گزری مومن، آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے؟''

جندوڈے نے گلوگیر ہو کر فوراً منشی صاحب کو گلے لگا لیا۔ کہنے لگا'' آپ ایسی پاک صاف شکل والی شخصیت کے منہ سے ایسے پھڑکانے والے شعر سن کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کلیجے پر چھریاں چل جاتی ہیں۔ منشی صاحب۔ دنیا میں بہت لوگ دیکھے ہیں لیکن اب تک آپ کی ٹکر کا کوئی نیک انسان نہیں دیکھا۔ غالب کا ایک شعر ہے کہ دنیا جہان میں بہت سے سخن ور پڑے ہیں۔ دھکے کھا رہے ہیں۔ لیکن اے ظالم غالب کہتے ہیں کہ تیرا اندازِ بیاں ہے اور۔ شاہین کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور۔ براہِ کرم اپنے دائیں ہاتھ سے واسکٹ کی اندرونی جیب میں رکھی ہوئی نقدی کھنگال کر نکالیں اور پراجیکٹ کی عبوری امداد کے طور پر پیش کریں۔ دنیا میں بہت لوگ آئیں گے، آپ کے بعد، مگر نہیں ہوگا ان میں آپ کا جواب۔ بسم اللہ کریں۔''

منشی صاحب نے اس الجھی الجھی تقریر پر بھونچکا ہو کر اپنا ہاتھ اپنی واسکٹ میں ڈالا۔ کچھ دیر تک اپنے دل کو سہلایا۔ پھر ہاتھ باہر نکالا، یہ خالی تھا، دو تین مرتبہ یہی عمل دہرایا۔ آخر کھنکھار کر شیطان پر لعنت بھیجی اور ایک طرف تھوکتے ہوئے چند مڑے تڑے پرانے نوٹ نکال کر جندوڈے کے اوور کوٹ کے پھیلے ہوئے دامن پر رکھ دیے۔

جندوڈے نے فی الفور انہیں گنا اور ڈنک کھائے ہوئے بیل کی طرح بلبلا اٹھا: ''کل تین سو بیس روپے۔ افسوس صد افسوس چار سو بیس میں پورے ایک سو کی کمی۔ ایک دل ہلا دینے اور راتوں کی نیند حرام کر دینے والی امداد۔ حاجی صاحب!'' اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا: ''یہ پیسے آپ لے جا کر میری طرف سے کسی یتیم، بیوہ یا مسکین کو امداد کے طور پر دے دیں۔ لیکن ڈنڈے والی فلم سے خود کو خارج سمجھیں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرامائی انداز میں منشی صاحب کے گلے لگ گیا۔ سسکتے ہوئے بولا: ''میرا کوئی قصور ہو تو معاف کر دیں۔ یہ دنیا تو چار دن کا میلہ ہے۔ اس کے بعد تو اپنے اپنے اعمال ہیں۔ یعنی اپنا اپنا ٹھیلہ ہے۔''

اس قسم کے دس پندرہ جذباتی فقروں کے باہمی تبادلے کے بعد صورت حال میں ایک ایسی تبدیلی آئی کہ ہم سب دنگ رہ گئے۔ منشی صاحب نے تین سو بیس روپوں میں فوراً ایک سو ایک کا اضافہ کر دیا۔ ساتھ ہی دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

جب منشی صاحب جا چکے تو اکتایا ہوا ڈینی فونٹین کہنے لگا: ''جمائیاں لیتے لیتے میں تو تنگ آ چکا ہوں۔ مہربانی کریں اور چائے کے ساتھ پیسٹریاں منگوائیں۔ خالی پیٹ چائے پینے سے مجھے ڈاکٹروں نے منع کر رکھا ہے۔ اس کے بعد گیسٹ بنوانے کے لیے مجھ سے ریٹ وغیرہ طے کریں۔ یہ کام مفت نہیں ہو سکتا۔ ایڈوانس رقم پہلے پکڑائیں۔''

جندوڈے نے لپک کر اس کی گدی کے پیچھے ہاتھ ڈال دیا۔ دو چار بے تکلفانہ جھٹکے دے کر خوش اخلاقی دکھاتے ہوئے بولا: ''پہلے کام، پھر دام۔ ویسے بھی ہم پرانے دوست ہیں۔ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ میری تین گھنٹے کی فلم ''کھنگدے جاؤ تے لنگھدے جاؤ'' تم ہی شوٹ کرو گے۔ تم ہی اس کے جملہ حقوق ملک بھر میں تقسیم کرو گے۔ تم ہی اس کی ہیروئن کے ساتھ ڈنر اور لنچ کھاؤ گے۔ تم ہی......''

ڈینی فاؤنٹین نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں برا سا منہ بنایا۔ پھر اس برے سے منہ کو مزید برا بناتے ہوئے قہقہہ لگا کے بولا: ''میں تو مذاق کر رہا تھا جناب! آپ تو مائنڈ کر گئے'' ڈینی اپنا ٹوٹا پھوٹا خوفناک کیمرا امانت کے طور پر میرے کمرے میں کنستر پر رکھ کر چلا گیا۔ اس کے بعد جندوڈے نے مجھے کالر سے پکڑ کر سکرپٹ لکھنے کے لیے بٹھا دیا۔

ازسرِنو کہانی جوڑی اور توڑی گئی۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے جب میں سکرپٹ کا آخری صفحہ لکھ کر اٹھا تو کیا دیکھتا



ہوں کہ جندوڈے چاروں شانے چت میرے بستر پر لیٹا سڑک کوٹنے والے انجن کی طرح خراٹے لے رہا ہے۔

میں نے گہرا سانس لے کر شانے اچکائے۔ ایک چادر اٹھائی اور خستہ حال صوفے پر ڈھیر ہو کر آنکھیں موند لیں۔ صبح سویرے میرے اٹھنے سے پہلے ہی وہ رخصت ہو چکا تھا۔ البتہ ایک چٹ میرے لیے موجود تھی جس پر جناتی انداز میں لکھا تھا:

''میرے دوست عظیم دانشور پروفیسر بی کے بٹالہ! اس خط کو خط نہ سمجھنا تار سمجھنا۔ صبح میں چائے پینے ہوٹل گیا تو لوگ آپس میں ڈینی کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی کباڑی کا کیمرا اچرا کر بیچنے کے چکر میں تھا کہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ کیمرا برآمد نہیں ہوا، کیسے ہوتا؟ وہ تو تمہارے کمرے میں کنستر کی تپائی پر رکھا تھا۔ یہ حالات دیکھ کر فدوی ناچیز کمترین فوراً الٹے پاؤں بھاگ کر تمہارے کمرے میں آیا۔ تم بدستور گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ میں نے فوراً کیمرا کمبل میں چھپایا اور کباڑی ڈنگو بھائی پیتل والے کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ مالِ مسروقہ مجھے سڑک پر پڑا ہوا ملا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ ڈینی فاؤنٹین پولیس کو بتا چکا ہو کہ مال مسروقہ کہاں رکھا ہے۔ ویسے ڈنگو بھائی پیتل والے کا دل نرم ہے، وہ یقیناً پولیس کو مطلع کر دے گا کہ اس کی چیز اسے واپس مل گئی ہے لہٰذا وہ ڈینی کو رہا کر دیں۔ ہماری پولیس میں بے شمار اچھے لوگ ہیں۔ کوئی دل کا نیک پولیس مین ڈنگو بھائی کی درخواست پر ڈینی کو رہا کر دے گا لیکن رہائی کے بعد ڈینی فاؤنٹین پین سیدھا تمہاری طرف آئے گا۔ اس کے تیور اچھے نہیں ہوں گے۔ تم فوراً پیچھے آ جاؤ۔ میں تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے گاؤں روانہ ہو رہا ہوں۔ ٹی اے ڈی اے کے طور پر منشی اللہ دتہ مجبور کی عبوری امداد سے فیض اٹھا رہا ہوں۔ البتہ تمہارے تکیے کے نیچے پچاس روپے کا ایک نوٹ رکھ کر جا رہا ہوں۔ یہ نوٹ تمہیں میرے گاؤں موضع بھمبریاں والی تک پہنچانے، راستے میں گنے کے رس کے دو تین گلاس پینے، ایک پاؤ بھنی ہوئی مونگ پھلی کھانے اور ایک آدھ روپیہ بطورِ خیرات کسی فقیر کو دینے کے کام آئے گا۔ آنے میں تاخیر نہ کرنا۔ ہم منشی اللہ دتہ مجبور صاحب کو واپسی میں رو پیٹ کر کسی طرح منا لیں گے اور انہیں یقین دلا دیں گے کہ وہ تمہارے ناول اور میری فلم ''کھنگدے جاؤ تے لنگھدے جاؤ'' کے ہیرو ہوں گے۔ بھلے آدمی ہیں مان جائیں گے۔

تمہارا منتظر!

جے ڈبلیو خان

نوٹ: بدقسمتی سے تمہارے سرہانے اپنا سگریٹ کا پیکٹ بھول آیا ہوں، براہِ کرم جوں کا توں واپس کر دینا، خبردار کسی سگریٹ کو ہاتھ نہ لگانا، یہ تمہارے لئے زہرِ قاتل اور میرے لیے امرت دھارا ہیں۔''

## انداز اپنا اپنا

جج (ملزم سے) تمہیں کل صبح پانچ بجے پھانسی دے دی جائے گی۔ یہ سن کر ملزم ہنسنے لگا۔

جج نے پوچھا تم ہنس کیوں رہے ہو؟''

ملزم جناب میں تو اٹھتا ہی صبح نو بجے ہوں۔

(کاشف خورشید، ملتان)

## اعتبار ساجد

اعتبار ساجد صاحب دیوان شاعر ہیں۔ ان کی شاعری ہی نہیں ان کے [illegible] بھی تازگی لیے ہوتے ہیں۔ پسند کیے جاتے ہیں۔ اسلام آباد سے [illegible] لاہور کے ہو رہے ہیں۔ ان دنوں [illegible] بھی ہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# ہم دماغ کا ۹۰ فیصد حصہ کیوں استعمال نہیں کرتے؟

عاطف مرزا

ایک مقبول لیکن غلط تصور یہ پایا جاتا ہے کہ لوگ دماغ کا ۱۰ فی صد حصہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ تصور خصوصاً نفسیات کے میدان میں پایا جاتا ہے۔ یہ تصور اشتہارات اور عام لٹریچر میں بھی سامنے آتا رہتا ہے۔ دماغ کے سائنس دان یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ کسی ایک وقت پہ دماغ کے بہت تھوڑے نیوران زیادہ فعال ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دماغ کا باقی حصہ فارغ بیٹھا رہتا ہے۔ دماغ پہ کی گئی تحقیق سے یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ ہم سارے دن میں اپنا پورا دماغ استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ پورے دماغ میں پھیلے ہوئے اس کے مختلف حصے مختلف افعال سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ دماغ کا ۹۰ فیصد حصہ غیر استعمال شدہ ایک طرف پڑا رہتا ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ دماغ کی وہ تمام قوتیں اور طاقتیں جو تخلیقی کاموں کے لیے بہتر انداز میں سوچنے کے لیے خالق کائنات نے دے رکھی ہیں، انہیں استعمال بھی نہیں کیا جاتا۔ سب سے بڑے سائنس دان آئن سٹائن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے دماغ کا ۷ فی صد حصہ استعمال کیا اور اتنا بڑا کام کر ڈالا۔

اس حوالے سے ہمارے دماغ تو بے چارے کام پہ لگے ہی نہیں۔

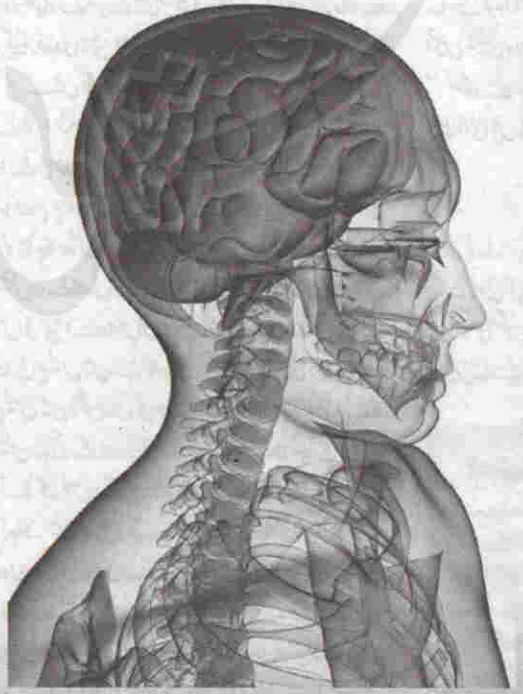



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# بابو

ایک ''آفس بوائے'' کا جاں گداز قصہ
جو نمکین ہے اور تمکین بھی!

محمود احمد لئیق

## مجھے

دبئی کی جس امریکی کمپنی میں ملازمت ملی، وہاں پہلے سے ایک آفس بوائے، بابو کام کر رہا تھا۔ یہ عرفیت تھی، دفتری ریکارڈ میں اس کا نام تھا ایڈی چری براؤنی، لیکن یہ کاغذات میں تھا۔ ویسے وہ بابو کہلاتا حتیٰ کہ بیوی بھی بابو کہتی جس کا علم بعد میں ہوا۔ ہم دونوں اکاؤنٹس کے شعبے کے ملازم تھے۔ یہ شعبہ کئی ذیلی شعبوں پر مشتمل تھا، جیسے کہ Payroll, Accounts Payable, General Ledger, اور Billing وغیرہ۔ ہر ذیلی شعبے میں دس کے قریب ملازمین

تھے، ایک شعبہ فائلنگ کا بھی تھا۔ بابو ان تمام شعبوں کا واحد آفس بوائے تھا، جس کی ذمے داریوں میں ہر ذیلی شعبے تک ڈاک لے جانا، لانا اور کافی شاپ میں تمام اشیا مہیا کرنا تھا۔ وہاں کافی، ٹی بیگ، شکر اور دودھ وغیرہ کی فراہمی اس کے ذمے تھی، چائے کے لیے اسٹیل کا ایک بڑا ہیٹر تھا جو بجلی سے چلتا تھا، بالکل برقی کیتلی کی طرح کام کرتا تھا، کھولتا ہوا پانی ہر وقت مل جاتا لیکن جب مزید پانی ڈالا جاتا تو چند منٹ بعد نقطۂ ابال تک آتا تھا جبکہ کافی ایک مرتبہ چڑھا دو تو شام تک کھولتی رہتی۔

گوروں کا پسندیدہ مشروب کافی تھا جبکہ دیسی لوگوں کا چائے۔ دیسی ملازمین زیادہ تعداد میں تھے اس لیے بار بار پانی ختم ہوجاتا اور بابو کو دیسی لوگوں کی خدمت بڑی مصیبت لگتی۔ بابو ہم سے تقریباً دس سال بڑا تھا اور تب ہم چھبیس سال کے تھے۔ ہندوستان کے صوبے کیرالا کے ایک شہر 'ملاپورم' کا رہنے والا تھا۔ انہیں پاکستان میں مالاباری کہا جاتا ہے جبکہ مالابار وہاں کا شہر ہے۔ یوں سمجھیں کہ ہر پنجابی کو لاہوری یا ہر سندھی کو لاڑکانہ کا سمجھا جائے۔

بابو اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح ایک پستہ قد، دبلا پتلا، گھنگھریالے بالوں کا مالک تھا لیکن رنگت کیرالا کے لوگوں کے برعکس کسی حد تک گوری تھی۔ مزاج بھی کیرالا کے باسیوں کے برعکس تھا، بات بات پر آگ بگولا ہونے کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور بقول مشتاق یوسفی غصہ ناک پر دھرا رہتا جو کہ اکثر گالیوں کی شکل میں خارج ہوتا۔ یہ گالیاں کئی زبانوں میں ادا کی جاتی تھیں، اُردو کے علاوہ جسے کہ وہاں ہندی کہا جاتا ہے، انگریزی، عربی اور نظریۂ ضرورت کے تحت اپنی مادری زبان ملیالم سے بھی استفادہ کرلیتا۔ لگتا تھا کہ اس کے دماغ میں تمام زبانوں کے ایسے الفاظ موجود تھے جن سے حسبِ ضرورت استفادہ کرلیتا۔ کبھی کبھی یا انتہائی مجبوری میں وہ اپنا مافی الضمیر اشاروں سے ادا کرتا، آخر کیوں نہ ہو۔

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اس کی شادی کو دس سال ہوچکے تھے لیکن آنگن میں کوئی کلی نہیں کھلی تھی، اس محرومی پر رنجیدہ ضرور تھا لیکن دُکھ اور محرومی مذاق میں اڑا دیتا۔ اکثر کہتا "ایک لکڑی کا بچہ بنا کر رکھوں گا۔" لاولد جوڑوں میں سے اکثر اس محرومی کے باعث نفسیاتی امراض کا شکار ہوجاتے ہیں، بدمزاجی اور کڑواہٹ پیدا ہوجاتی ہے لیکن اس کے برعکس ایسے بھی جوڑے ہیں جنہوں نے اس محرومی کا ازالہ مختلف انداز سے کیا، کسی نے بچوں کو گود لے لیا اور کسی نے دنیا کے سارے بچوں کو اپنا سمجھ کر انسانیت کی خدمت کو اپنا شعار بنالیا اور اس محرومی پر راضی برضا رہے۔ معروف شاعر اقبال عظیم اپنی زندگی کے آخری عرصے میں قوتِ بصارت سے محروم ہوگئے تھے اس محرومی کا اظہار انکے اشعار میں بکثرت نظر آتا ہے لیکن کہیں کہیں انہوں نے اس پر بھی شکرِ خداوندی کا اظہار کیا ہے۔

بے نوریٔ نگاہ کا اک فائدہ تو ہے
کانٹے بجھائی دیں نہ اندھیرا دکھائی دے

بابو میں دونوں احساسات بدرجۂ اتم موجود تھے اور ہنسی ہنسی میں اس کی تلافی کرتا نظر آتا تھا۔ جب کسی نوزائیدہ بچے کو دیکھتا یا دفتر کے کسی ساتھی کے یہاں نئے مہمان کی آمد کی خبر آتی تو اس کے زخم گہرے ہوجاتے لیکن پھر بھی دوسروں کی خوشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا، مٹھائی کا تقاضا کرتا، اس کے بانٹنے کا اہتمام کرتا، "بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ" کی تفسیر بن جاتا۔

ہمیں یاد ہے کہ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کی شام ہمارے صاحبزادے مغرب سے کچھ قبل اس دنیا میں تشریف لائے۔ جمعہ کی چھٹی کے بعد ہفتہ کے دن ڈھیر ساری مٹھائی کے ساتھ دفتر میں حاضری دی۔ اس امریکی کمپنی کی روایت تھی کہ بیٹے کی پیدائش پر سگار تقسیم کیے جاتے اور بیٹی کی آمد پر ٹافی بانٹی جاتی تھی، ہم نے اس تضاد پر تحقیق کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا، ہاں البتہ سگار قبول کرنے سے معذرت کرلیتے، اس لیے کہ تمباکو نوشی سے ہمارا دور کا بھی واسطہ نہ تھا، بہت سارے گورے برا بھی مانتے تھے، لیکن ہم نے اپنی وضع نہ بدلی، کئی دوستوں نے مشورہ دیا کہ سگار لے لیا کرو اس سے انکار بدشگونی ہوتا ہے۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہرحال مٹھائی کے ساتھ دفتر پہنچے تو پورے دفتر میں مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ بابو کے ذمے مٹھائی کی تقسیم کی ذمے داری لگائی۔ ایک ایک فرد کو مٹھائی دی اور وہ تمام افراد جو اس سے قبل باپ بن چکے تھے، انہیں گالیوں سے نوازتا اور کہتا، "بچے یا بچی کی پیدائش پر اس طرح مٹھائی بانٹی جاتی ہے، ایک سگار یا ایک ٹافی نہیں دی جاتی۔" ان دنوں ہمارے شعبے کا سربراہ ایک برطانوی نوجوان تھا، عمر تقریباً تیس سال لیکن شادی کے جھنجھٹ سے آزاد تھا۔ نام تھا ٹام ڈے (Tom Day)۔ بابو نے اسے مٹھائی دی اور وجہ بیان کی تو وہ اپنے کمرے سے نکل کر ہمارے پاس آیا اور بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا، مٹھائی کی تعریف کی، واپس جاتے ہوئے اپنے کمرے کے دروازے پر رُک کر مڑا اور پوچھا کہ اس بچے کا نمبر کیا ہے؟ مراد یہ تھی کہ اب کل کتنے بچے ہیں۔

بازو میں بیٹھنے والے موہن نے بتایا کہ پہلی اولاد ہے، اس پر وہ دوبارہ ہمارے پاس آیا اور بھرپور معانقہ کیا، تقریباً ۲۸ سال ہوگئے لیکن اب تک دوستوں کی مبارکباد اور ٹام کے معانقے کی گرمی محسوس ہوتی ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کے بعد آرزوؤں اور تمناؤں کے باوجود کوئی پھول کھل نہ سکا اور ہمیں اسی ایک پر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن یہ بھی کیا کم ہے اور ہم اسی پر شکرِ خداوندی بجالاتے ہیں۔

۲۰۰۸ء میں بننے والی حکومت کی ایک وزیر نے فرمایا تھا کہ حکومت دو بچوں سے زیادہ پیدا ہونے پر ان کے والدین پر جرمانہ عائد کرے گی، لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ صرف ایک بچے کے والدین کے ساتھ حکومت کیا امتیازی سلوک کرے گی؟ ہم ان سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ ایک بچے پر بونس کا اعلان کریں۔ ہم پھر بھی مطمئن ہیں کہ زندگی میں ایک دن ٹام اور بابو جیسے سنگدل اور کٹھور انسانوں کی نیک خواہشات سمیٹنے کا موقع میسّر آیا۔

ہمارے شعبے میں سیکرٹری کے علاوہ دس ملازمین تھے۔ ان میں سے تین پاکستانی تھے، اقبال، حارث اور یہ خاکسار، گویا تین کا مقابلہ سات سے تھا، یہ مقابلہ بدکلامی، طنز و استہزا اور چھیڑ چھاڑ کا تھا۔ ویسے تو ان ساتوں کا مقابلہ ہم میں سے کوئی بھی ایک فرد کرسکتا تھا پھر بھی اقبال کا کیا کہنا، اس کا اندازِ بیان، جوشِ خطابت، بدکلامی کے میدان میں ذخیرۂ الفاظ، تشبیہات، استعارے اور مثالیں بے بدل تھیں۔

اقبال کو کتابوں سے چڑ تھی، اخبار پڑھنے کو وقت ضائع کرنا گردانتے تھے، حالاتِ حاضرہ پر گفتگو سے وہ کوسوں دور تھے، ایسے موقع پر دلاور فگار کا مصرعہ دہرا دیتے تھے۔

حالاتِ حاضرہ کو کئی سال ہو گئے

لیکن اس میں ایک استثنیٰ تھا یعنی اگر بابو سے مڈبھیڑ ہوجائے تو سارے اصول اور قاعدے دھرے رہ جاتے اس زور کا رن پڑتا کہ پانی پت یاد آجاتا۔ اس مباحثے میں آپ جناب کی غلطی کبھی سرزد نہیں ہوئی، ایک درجہ اوپر سے شروع ہوکر حدِ نظر سے ایک ایک قدم آگے جاکر 'تیری' پر ختم ہوتا۔ کامیابی کا سہرا ہمیشہ اقبال کے سر باندھا جاتا۔ اس طرز کی لڑائی میں بقیہ دو پاکستانی یعنی حارث اور یہ خاکسار بھی کم نہ تھے مگر۔

وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

یہ ایک روز کا تماشا تھا، حکمت عملی یہ ہوتی کہ اس کی ابتدا کا اعزاز ہمارے ذمے تھا۔ ذرا سی چھیڑ چھاڑ پر وہ یہی کہتا کہ پاکستانی سب ایسے ہوتے ہیں۔ پاکستان اور پاکستانی پر کوئی حرف آئے تو اقبال اور حارث کیسے خاموش رہ سکتے تھے، سر پر کفن باندھ کر میدانِ کارزار میں کود پڑتے۔ شعبے کے دوسرے ملازمین بیچ بچاؤ کراتے، یہ کم و بیش روز کا معاملہ تھا۔ شعبے کے دوسرے ملازمین لطف اندوز ہوتے۔ اگر خدانخواستہ کبھی ناغہ ہوجائے تو ساتھی ملازمین کے مطالبے پر یہ بزم سجائی جاتی، ہاں غمی کے موقع پر یعنی کسی ساتھی ملازم کے گھر سے اندوہناک اطلاع آتی تو عارضی طور پر ایک یا دو دنوں کی جنگ بندی ہوجاتی اس سے زیادہ کے متحمل نہ ہوپاتے۔ احمد فراز کہہ گئے ہیں۔

دل گرفتہ ہی سہی بزم سجالی جائے
یادِ جاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے

بحیثیت کافی بوائے بابو کی ذمے داری کافی شاپ میں

ہر چیز مہیا رکھنا تھا۔ بجلی کے ہیٹر میں پانی بھرا رہے، چائے کی پتی، شکر اور دودھ بھی موجود ہو، اس کے علاوہ ڈاک لانا اور لے جانا بھی اس کی ذمے داری تھی۔ چونکہ ڈاک پہنچانا اور وصول کرنا بھی اس کا کام تھا، دن میں چار مرتبہ ڈاک لاتا اور لے جاتا، کل ملا کر آٹھ چکر ہوتے۔ سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوسکتا ہے لیکن یہ آٹھ چکر بغیر کسی تو تکار کے گزر جائیں، ایسا ہونا ناممکن تھا۔ اس سے ہٹ کر جب بھی موقع ملتا ہمارے شعبے میں آکر براجمان ہوجاتا۔ مسکراتے ہوئے سگریٹ یا بیڑی کے کش لیتا، انتہائی خوشگوار موڈ میں ہوتا، سارے دشنام، الزامات، الٹے سیدھے تبصرے سب شیرِ مادر کی طرح پی جاتا، جواب نہ دیتا۔ کبھی کبھی مزیدار اور دلچسپ تبصرہ کردیتا، اس کا یہ دورہ سب کو حیران کردیتا کہ جہاں سے انعام واکرام اور اعزازات سے 'عزت افزائی' کی جاتی، فرصت ملتے ہی اسی کوئے ملامت کی سیر کو جاتا۔ وہی حال تھا کہ۔

جس ظالم نے تڑپایا اسی پر مجھ کو پیار آیا

بابو کی ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ ہم اسے ملباری ہونے کا طعنہ دیتے تھے، وہ جواباً ہمارا پاکستانی ہونے کا مضحکہ اڑاتا۔ پاکستان کی علاقائی تقسیم سے واقف نہ تھا کہ اس مناسبت سے طعنہ دیتا، ادھر کیفیت یہ تھی کہ جہاں اس نے پاکستانیوں کو کچھ کہا تو بقیہ دو بھی کود پڑتے۔ یہ ستر کی دھائی کے آخر کا ذکر ہے اس وقت تک پاکستانیوں میں جرأت ایمانی باقی تھی، کرکٹ سے لیکر تمام میدانوں میں لوگ پاکستان کا پرچم اٹھائے پھرتے تھے۔ لیکن بہت جلد یہ حال ہوا کہ۔

وقت نے ایسی کروٹ بدلی خواب سنہرے ٹوٹ گئے

۱۹۹۲ء کے ورلڈ کپ کی جیت ایک بھیانک حقیقت بن کر سامنے آئی جب آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے میدانوں میں قومی ٹیم کی جیت پر قومی پرچم کے بجائے، علاقائی جماعتوں کے پرچم لہرائے گئے، بدقسمتی سے یہ علاقائی پارٹیاں اب سیاسی پارٹیاں بن گئی ہیں۔

بابو کی ذمے داریوں میں کافی بنانا بھی شامل تھا جس سے زیادہ تر گورے مستفید ہوتے تھے، ایک مرتبہ بنادی تو شام تک کھولتی اور چلتی رہتی، اس بنا پر کہ گوروں کی تعداد کم تھی، چائے کے طلبگار زیادہ تھے، بار بار پانی بھرنا پڑتا تھا، بہت جلد خالی ہوجاتا، پھر کربھی کافی دیر انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہ انتظار بڑا صبر آزما تھا، غالب کہہ گئے ہیں۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

بارہا ایسا ہوا کہ جب چائے کے لیے گئے تو پانی گرم نہ تھا۔ یاد رہے کہ اس کمپنی میں چائے اور کافی کے لئے 'قلم خود' تکلیف کرنی پڑتی تھی۔ بابو کا کام تھا کہ یہ چیزیں موجود رہیں۔ ہم میں سے کوئی جاتا اور پانی گرم نہ ہو اور بابو موجود ہو تو ایسے ایسے تبصرے کرتا کہ اس کا خون کھول اٹھتا، خصوصاً حارث کے جملے جلتی پر تیل کا کام کرتے۔ بات سے بات پیدا کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میر انیس شاید اسی کے لئے کہہ گئے ہیں۔

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

شام کے چار بجے ہوں اور صبح سے کئی کپ پی چکے ہوں پھر بھی اگر ابلتا پانی نہ ملے تو ہم تینوں کا تبصرہ کچھ یوں ہوتا، 'صبح سے چوتھا چکر ہے ہر مرتبہ پانی گرم نہیں ملتا، دوسرا یہ کہتا، پتا نہیں انتظامیہ نے چپراسیوں کو اتنی ڈھیل کیوں دے رکھی ہے'، تیسرا یہ کہتا 'نہ جانے یہ لوگ انتظامیہ کے اتنے چہیتے کیوں ہیں، نہ جانے یہ گوروں کی کیا خدمت انجام دیتے ہیں کہ انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا'، یہاں سے حارث کی وضاحتیں شروع ہوجاتیں، وہ کہتا، یہ مالاباری لوگ جس خدمت کے لئے مشہور ہیں۔ اسے بوجھنے کے لیے کسی غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں ہے، معمولی صلاحیت کا انسان بھی اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے، پھر اس کے بعد وہ خدمات کی تفصیل بتانا شروع کرتا، 'یہ لوگ دام، درمے اور سخنے ہر خدمت کے لیے تیار رہتے اور تن، من اور دھن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اردو کے یہ ثقیل الفاظ اس تک نہ پہنچ سکتے مگر پھر بھی مطمئن رہتا کہ تعریف ہو رہی ہے، ہماری طرف استہفامیہ نظروں سے دیکھتا، ہم سمجھ رہے ہوتے کہ یہ ابتدا ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

ہمیں یقین تھا کہ مقطع میں سخن گسترانہ بات ضرور آئے



گی۔ حارث کا بیان جاری رہتا، 'یہ لوگ جب کسی کی خدمت کرتے ہیں تو دین، ایمان، ضمیر، اخلاق اور کردار کو حائل نہیں ہونے دیتے، صرف وفاداری بشرطِ استواری پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے آگے وہ جوانی اور اس کے تقاضوں کی تکمیل میں ان کی قوم کی خدمات پر آتا تو بابو کو ہوش آتا، لیکن اس وقت تک نوبت وہاں تک جاتی جس کے لیے کہا گیا ہے۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

بابو اس اینٹی کلائمکس (Anti Climax) پر اکھڑ گیا اور حسبِ معمول اپنا غصہ مغلظات کی شکل میں نکال کر چلا گیا۔ نوبت یہاں تک آئی کہ اس کے ہم وطن ہم سے پوچھتے کہ یہ دن بھر کیا کرتا ہے، اکثر پانی گرم نہیں ملتا ہے تو ہم اس کے سامنے کہتے، حارث سے پوچھو وہ بتائے گا۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ جب چائے لینے گئے تو پانی ابل رہا تھا اور بابو بھی وہاں موجود تھا تو ہمارا ردِعمل یوں ہوتا، 'شکر ہے کہ آخر گرم پانی مل گیا، چلو دن میں ایک مرتبہ تو چائے میسّر آئی، حالانکہ اس سے پیشتر کئی مرتبہ چائے نوشی کا لطف اٹھا چکے ہوتے۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ جب ہم نے شکوہ کیا کہ صبح سے گرم پانی نہیں میسر تھا چائے بنانے کے لیے، تو اسے یاد تھا کہ ہم صبح چائے پی چکے ہیں۔ ایسے موقع پر وہ چیخ پڑتا، 'صبح تمہارا باپ چائے پی رہا تھا' تو ایسے موقع پر موضوعِ گفتگو تبدیل کرتے ہوئے ہم بھی اسی قدر چیخ کر کہتے، 'تمہارے باپ کی چائے ہے کیا، کمپنی نے ہمارے لیے رکھا ہے یہ سب، تم چپراسی ہو اور تمہارا کام ہے کہ یہ سارا سامان تیار رکھو۔ اسے چپراسی لفظ سے بڑی نفرت تھی اور ہم بات بات پر اسے چپراسی کہہ کر مخاطب کرتے تھے تو وہ آگ بگولا ہوجاتا اور کہتا، میرا عہدہ آفس بوائے کا ہے۔ ہم کہتے کہ اسے اردو یا ہندی میں چپراسی کہتے ہیں۔ یہاں اس کی بوتی بند ہوجاتی، وہ ہندی سے زیادہ واقف نہ تھا کہ وضاحت کرسکے۔

بابو کو زیادہ چائے پینے والوں سے شدید نفرت تھی۔ ایک امریکی جس کا نام تھا باب پاول (Bob Powell) ہر آدھے گھنٹے بعد آدھمکتا۔ اسے دیکھ کر اس کے تمام طبق روشن ہوجاتے (شکر ہے ہمارے ساتھ اس نے یہ واردات نہیں کی ورنہ اُودھم مچ جاتا، اُسے معلوم تھا کہ یہ لوگ خاموش رہنے والے نہیں ہیں) اسے دور سے آتا دیکھ کر ابلتے پانی میں ٹھنڈا پانی ملا دیتا حالانکہ وہ ابلتے ہوئے پانی میں صرف ٹی بیگ ڈال کر چلا جاتا، شکر اور دودھ سے بے نیاز تھا۔ بابو کا کہنا تھا کہ چائے پینے میں دس منٹ لگتے ہیں پھر بھی وہ ہر آدھ گھنٹے بعد آجاتا ہے۔ ہمارا کہنا تھا کہ "تم تو آدھے گھنٹے سے قبل ہی دوسرا سگریٹ سلگا لیتے ہو تو وہ چائے کیوں نہیں پی سکتا ہے۔" بابو اکڑ کر کہتا، 'سگریٹ میری ہوتی ہے، اقبال نے شمشیر برہنہ کا وار کیا "چائے تمہارے باپ کی ہے، اس میں تمہارا کیا جاتا ہے۔" اس طرح کی جھڑپیں روز کا معمول تھیں۔

ایک مرتبہ وہ ڈاک لیکر آیا تو ہم نے پوچھ لیا، 'پانی گرم ہے کیا۔ مطلب یہ کہ اگر پانی ابل رہا ہے تو چائے بنالیں۔ جواب میں اس نے چند ناقابلِ تحریر جملے کہے، اس وقت ہمیں بھی کیا سوجھی کہ ہر ذیلی شعبے میں فون کر کے قابلِ اعتماد ساتھوں سے کہہ دیا کہ وہ جب آئے تو پوچھنا کہ پانی گرم ہے۔ ہمارے شعبے سے نکل کر آٹھ ذیلی شعبوں میں گیا۔ ہر جگہ اس سے یہی سوال پوچھا گیا، وہ سب کو گالیاں دے کر آگے بڑھتا رہا۔ آخری منزل پر اس کا صبر جواب دے گیا اور آنکھوں میں آنسو لے کر ہمارے پاس آیا اور گلوگیر آواز میں کہا، 'تم اچھا نہیں کر رہے ہو، اقبال اور حارث نے اسے دلاسا دیا اور سمجھایا کہ بدتمیزی کی ابتدا تم نے کی ہے، تم اگر بیہودہ جواب نہ دیتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔

یہ بات اس کی سمجھ میں آئی، وہ ہمارے پاس آیا تو پھر ہم نے اس کی ٹھیک ٹھاک خبر لی، تم ہمیں مالاباری مت سمجھو، یہ بہت معمولی ردِعمل ہے۔ ساتھ ہی فلم شعلے کا وہ مشہور جملہ دہرا دیا، ہم سے دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔ ابھی تو صرف دفتر کی حد تک ہے۔ ہوسکتا ہے کہ گھر پہنچنے پر بیوی بھی پوچھے کہ پانی گرم ہے کیا؟ ہمارا جواب بہت ذومعنی اور شدید تھا۔ جواب میں پھر ایک جنگِ عظیم کا خطرہ تھا اور ہم نے تیاری بھی کرلی تھی لیکن وہ اس پر بے اختیار ہنس پڑا۔ اس واقعہ کا دفتر میں بڑا چرچا ہوا اور ہر آدمی پوچھنے لگا، 'پانی گرم ہے'، وہ ہم



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے شکایت کرتا لیکن ہم کہتے، یہ تمہارے اپنے اعمال کا پھل ہے، زیادہ جذباتی ہوتا تو ہم کہتے، 'تم مجھے کہنا شروع کردو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، یہ قصہ چند دنوں چلا اور پھر اپنی موت مرگیا۔

بابو نے پورے دفتر سے خاصمت مول لے رکھی تھی سوائے دو افراد کے، ایک فنانس منیجر اور انشورنس کے شعبے کے سربراہ جارج حیل (George Hale) کے۔ ان دونوں کو شیشے میں اتار رکھا تھا، بلکہ یوں کہیں کہ بوتل میں جن کو قید کر رکھا تھا۔ فنانس منیجر تو عہدے میں سب پر فوقیت رکھتا تھا البتہ جارج کی اپنی خصوصیات تھیں، عمر کم و بیش 55 سال، دبلا پتلا، درمیانے قد کا تھا، ایک ہاتھ میں قلم تو دوسرے میں سگریٹ اور کافی دونوں بیک وقت تھامے رہتا تھا۔ شکر ہے اس وقت تک کمپیوٹر اور سافٹ ویر ایجاد نہیں ہوا تھا ورنہ نہ جانے کیا صورت ہوتی۔ ماچس یا لائٹر دن میں ایک مرتبہ استعمال کرتا، باقی پورا دن دیا سے دیا یعنی سگریٹ سے سگریٹ جلاتا تھا۔ خود کہتا کہ 'میں ماچس کی اچھی خاصی بچت کرلیتا ہوں، مگ بھی ہاتھ سے اس وقت چھوڑتا جب کافی ختم ہوجاتی، بابو منتظر رہتا اور جیسے ہی مگ ٹیبل پر رکھا جاتا، دوبارہ بھر کے دے دیتا۔ جارج کے بیوی بچوں اور خاندان کا کچھ پتا نہ تھا۔ ایک بیٹی تھی مگر وہی جو سلیم کوثر کہہ گئے ہیں۔

تجھے دشمنوں کی خبر نہ تھی مجھے دوستوں کا پتا نہ تھا

جارج صبح آٹھ بجے دفتر آتا تو رات نو بجے سے قبل واپس نہ جاتا۔ اس کا کھانا پینا دفتر کی حد تک سگریٹ اور کافی تھا بابو پر اس کی نوازشیں جاری رہتیں۔ اس زمانے میں سگریٹ کا پیکٹ تین درہم کا تھا لیکن ایسا کوئی نوٹ نہ تھا۔ پیسے واپس لینا اس کی شان کے خلاف تھا، جو ہاتھ میں آتا دے دیتا، چاہے دس کا نوٹ ہو، پچاس کا ہو یا سو کا ہو۔ اس وقت تک دوبئی میں پانچ سو یا ہزار کا نوٹ نہیں آیا تھا۔

جارج کے لیے بابو کا جذبۂ خدمت دیکھ کر ہم اکثر کہتے ''اتنی خدمت ماں باپ کی کرتا تو نامۂ اعمال میں کچھ نیکیاں ہوتیں۔'' حارث کہتا، ان کے پاس اتنے پیسے کہاں تھے کہ دو روپے کی سگریٹ کے لیے سو روپے دے کر پیسے واپس نہ لیں'، اقبال جلتی پر تیل چھڑکتے، وہ بے چارے تو اس سے توقع رکھتے تھے کہ اپنے پیسے سے پان اور سگریٹ لے کر آئے'، ہم پھر یہ کہتے، 'لیکن ان کی توقع پوری نہ ہوسکی، پتا نہیں یہ بدنصیبی کس کے حصے میں آئی۔

ایک عجیب بات یہ دیکھی گئی کہ بابو سے جب ہم تین یا ہم میں سے کوئی چھیڑ چھاڑ کرتا تو اسے اپنے شعبے کے تمام مالاباری ملازمین کی آشیرباد حاصل ہوتی، کبھی کبھی تعاون بھی حاصل ہوتا لیکن یہ زیرِ زمین ہوتا۔

کمپنی کا ایک طریقۂ کار تھا کہ جب کسی ملازم کی ملازمت کی شرائط میں تبدیلی ہوتی تو ایک پی، این، ایف (Personal Notification Form) جاری کیا جاتا، یہ پرسنل ڈیپارٹمنٹ (جسے آج کل HRD کہا جاتا ہے) سے جاری ہوکر ہمارے شعبے (Pay Roll) میں آتا اور ملازمین سے خفیہ رکھا جاتا۔ کسی کی تنخواہ میں اضافہ ہو یا ایک شعبے سے دوسرے میں تبادلہ ہو یا عہدے میں تبدیلی ہو تو پی این ایف جاری ہوتا۔ کبھی یہ بھی ہوا کہ عہدہ تبدیل ہوا لیکن تنخواہ میں اضافہ نہیں ہوا۔ ایک دن عجیب انقلاب آیا، بابو نے فنانس منیجر کوشیشے میں ایسے اتارا کہ اس کا عہدہ آفس بوائے سے تبدیل کر کے ڈاک کلرک کردیا گیا باقی تمام شرائط وہی تھیں۔ یہ پی این ایف پورے شعبے میں بڑی دلچسپی سے دیکھا گیا، ہم سب اس کی صلاحیت کے قائل ہوگئے۔

ریکارڈ میں تبدیلی کردی گئی، اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ تبدیلی کہیں ظاہر نہ ہوتی تھی، عہدہ کہیں ظاہر نہ ہوتا تھا، یہ صرف اس وقت درج کیا جاتا جب کسی کو ملازمت یا تنخواہ کا سرٹیفکیٹ جاری کیا جاتا۔ یہ سارے پی این ایف موہن کے پاس آتے، وہ ایک سینئر ملازم تھا۔ وہ کمپیوٹر کے فارم بنا کر بھجوادیتا اور رپورٹ آنے پر شعبے کے متعلقہ ملازم کو چیک کرنے کے لیے دے دیتا۔ بدقسمتی سے بابو کے کوائف کی جانچ پڑتال ہمارے ذمے تھی۔ موہن خود مالاباری تھا لیکن اس کا تعلق ایک دوسرے شہر قصرکوٹ سے تھا۔ دو تین دن بعد اس نے بابو کی موجودگی میں اداکاری کا آغاز کیا، وہ ایسے کردار نبھانا بخوبی جانتا تھا۔



ہم سے پوچھا، 'تمہیں معلوم ہے بابو کے عہدے میں تبدیلی ہوگئی ہے؟ ہم نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا ''ہاں سنا ہے کہ اسے فنانس منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی ہے۔'' اس پر پورے ڈیپارٹمنٹ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، بابو بھی اس میں شامل تھا، موہن نے پوچھا، پی این ایف ملا؟ ہمارا جواب تھا 'نہیں ملا لیکن سنا ہے کہ تنخواہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے، پھر سر پکڑ کر حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، 'اب ہمیں بابو کو رپورٹ کرنا پڑے گا۔'

موہن کو اپنے کردار سے انصاف کرنا تھا، اس نے پوچھا، 'کیا تم سمجھتے ہو کہ فنانس منیجر اپنی جگہ پر بابو کو بٹھادے گا؟ ہمارا کہنا تھا کہ وہ ایک انصاف پسند آدمی ہے۔ اس نے دیکھا کہ بابو اس سے زیادہ باصلاحیت ہے تو اس نے جگہ خالی کردی، دیانت داری کا تقاضا بھی یہی ہے (اس وقت تو ہمیں علم نہ تھا کہ ہمارے مذہبی شعائر میں شامل ہے کہ اپنے سے بہتر فرد کے لیے جگہ خالی کردی جائے۔ پھر بعد کے مطالعے سے یہ علم ہوا۔)

خرم مراد کی تحریر کردہ ادھوری سوانح کے مطابق وہ ڈھاکہ پہنچنے پر اپنی جماعت کے نظم میں داخل ہوئے۔ ساتھ ہی مقامی امیر رفیع احمد رضوی صاحب نے فروری ۱۹۶۳ء میں ارکان کا اجتماع بلایا اور کہا کہ ان سے بہتر آدمی درمیان میں موجود ہے، اور نظم کو وہ بہتر چلا سکتے ہیں، اس لیے امارت سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ کافی بحث ہوئی۔ شوریٰ نے بھی ان سے کہا کہ وہ ایسا نہ کریں، خرم صاحب نے بھی انہیں بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانے۔ آخر کار ان کا استعفا منظور ہوگیا اور ڈھاکہ جماعت اسلامی کی امارت کی ذمے داری خرم صاحب پر آگئی۔ برسوں قبل خرم صاحب نے اپنی نظامت کے دور میں خورشید صاحب (پروفیسر خورشید احمد) کو کراچی جمعیت کا قائم مقام ناظم مقرر کیا تھا مگر ان کی بہتر اور موثر کارکردگی دیکھ کر از خود اس ذمے داری سے سبکدوش ہوگئے۔ اپنے سے بہتر آدمی کے لیے جگہ چھوڑنے کا تصور مولانا مودودیؒ نے تاسیس اوّل کے اجتماع میں پیش کردیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا ''فرائض امارت کی انجام دہی کے ساتھ برابر اس تلاش میں رہوں گا کہ کوئی قابل تر آدمی اس کا بار اٹھانے کے لیے مل جائے۔ جب میں ایسے آدمی کو پاؤں گا تو خود سب سے پہلے اس کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔''

موہن بھی عجیب چیز تھا، بات کو گھمانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ تمام شعبے کے افراد سے مخاطب ہوکر کہنے لگا، 'دوستو نوٹ کرلو یہ فنانس منیجر کو انصاف پسند اور دیانت دار کہہ رہا ہے، آئندہ برا بھلا کہے تو یاد رکھنا، اس بک بک میں بابو کا عجیب حال تھا، کبھی ادھر دیکھتا کبھی ادھر۔

کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

دوسری طرف موہن کی اداکاری شباب پر تھی۔ دوبارہ سارے اسٹاف سے مخاطب ہوکر کہنے لگا، 'یہ شخص جو دن میں دس مرتبہ اسے گالی دیتا ہے، محض بابو کو تنگ کرنے کے لیے اسے دیانتدار اور انصاف پسند قرار دے رہا ہے، ہمارا جواب تھا کہ کوئی بھی جب اچھے کام کرے گا تو سب اس کی تعریف کریں گے اور جب وہ لوگوں کو تنگ کرے گا تو گالی سنے گا۔ بابو بھی اس عہدے پر پہنچ کر اچھے کام کرے گا تو میں ہی نہیں پوری دنیا اس کی تعریف کرے گی اور اسی طرح تنگ کرے گا جیسے چپراسی بن کر کرتا رہا ہے، تو کیا تم بھی اسے گالی دو گے؟ موہن بظاہر بڑا ہمدرد بنا ہوا تھا، کلیم عاجز نے ایسے ہی دوستوں کے لیے کہا ہے۔

وہ دوست ہو کہ دشمن کو بھی تم مات کرو ہو

اب موہن نے پینترا بدل کر کہا، 'جاؤ پرسنل والوں سے پوچھو کہ کیا معاملہ ہے؟ ابھی تک ڈاکومنٹ دستاویز کیوں نہیں بھیجا ہے، ہمارا فوری جواب تھا ''یہ میری ذمے داری نہیں ہے، میرا کام اُس وقت شروع ہوتا ہے جب کاغذات مل جائیں، ہر روز پانچ چھ پی این ایف ملتے ہیں اسے اپ ڈیٹ کرنے سے فرصت نہیں ہے لہٰذا جو نہیں ہے، اس کی تحقیقات کیا کروں۔ یہ خود جا کر معلومات کیوں نہیں کرتا۔'' وہاں جا کر معلومات کرنا اس کے لیے ناممکن تھا، وہاں تو سارے لبنانی اور فلسطینی بیٹھے ہوئے تھے، وہاں دال گلنا مشکل تھی، اگر کچھ بات بننے کا امکان ہوتا تو ہم نے سوچ رکھا تھا کہ فون کر کے کہہ دیں گے کہ بتانے سے انکار کردو۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بابو بہت جذباتی ہوگیا۔ نہ جانے اس وقت اسے اپنے عہدے سے اتنا لگاؤ کیوں ہوگیا، ذمے داری بھی وہی تھی، ایک پیسے کا فائدہ بھی نہیں تھا، بہت مایوس ہوکر اس نے ہم سے کہا، 'تم نہیں چاہتے ہو کہ میری ترقی ہو' اس پر ہمارا جواب تن بدن میں آگ لگانے والا تھا، ہم نے کہا "ابے کہاں کی ترقی اور کہاں کی عزت کے خواب دیکھ رہا ہے، تو اس جنم میں چپراسی ہے اور ان شاء اللہ اگلے جنم میں بھی چپراسی رہے گا....." اس پر تو اس کا ضبط جواب دے گیا، پہلے بھی وہ کئی مرتبہ ہمیں ٹوک چکا تھا کہ وہ آفس بوائے ہے چپراسی کیوں کہتے ہو، ہم کہتے کہ انگریزی میں بات کروگے تو کہوں گا، اردو یا ہندی میں یہی کہتے ہیں۔

غم و غصہ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر وہ واپس جانے لگا تھا کہ موہن نے آواز دی اور اس کا پی این ایف دکھایا اور بتایا کہ اسے اپ ڈیٹ کر دیا گیا ہے اور ہماری طرف اشارہ کر کے کہا، 'تمہارے دوست نے کارروائی پوری کرلی ہے، بس تھوڑی دل لگی کر رہا تھا، اس کا خانشار ختم ہو چکا تھا۔ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ مسکرایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شکریہ ادا کرے یا گالی دے، ہم سے گلے لگا شکریہ ادا کرنے کے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

ہم نے اسے سمجھایا کہ انسان اپنے کردار اور اخلاق سے پہچانا جاتا ہے، قرآن میں آیا ہے کہ تم میں اکرم و افضل وہ ہے جس کا تقویٰ زیادہ ہے، یہ عہدہ اور حیثیت سب بتانِ وہم و گماں ہیں۔ اسے ہم ہندو سمجھتے تھے، اس لیے جا بجا مذہب اور قرآن کا حوالہ دیتے رہتے تھے۔ یہ غلط فہمی جلد دور ہوگئی۔ (تذکرہ آگے آئے گا)۔ جاتے جاتے وہ ایسا وار کر گیا کہ ہم لاجواب ہو گئے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اچھا انسان تمہاری طرح ہوتا ہے تو مجھے منظور نہیں اور میری دعا ہے کہ میری اگلی نسل میں بھی ایسا متقی نہ پیدا ہو۔ اس وقت ہم نہ جانے کس ترنگ میں تھے کہ ایسا جواب دیا کہ اب تک شرمندہ ہیں، کسی کی قدرتی محرومی کا مضحکہ اڑانا بڑی گھٹیا اور رکیک حرکت ہے اور اس وقت ہم سے یہ حرکت ہوگئی، ہم نے اس کی اولاد سے محرومی کی طرف غائبانہ اشارہ کرتے ہوئے کہا، 'پہلے نسل بڑھنے کی دعا مانگ، پھر دوسری طرف رجوع کرنا، بابو نے ہماری بات سنی اَن سنی کر دی۔

بابو کا اصلی نام تھا ایڈی چری براؤنی، تاہم شاید ہی کسی کو صحیح نام کا علم ہو، دفتری کاموں کے لیے نمبر (Employee Number) چلتا تھا یا پھر بابو۔ ہمیں یہ علم اس لیے تھا کہ اس کی تنخواہ اور دیگر معاملات ہماری ذمے داری کی حدود میں آتے تھے۔ اس نام سے سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ وہ مسلمان تھا نہ اس نے کبھی ایسا تاثر دیا۔ یہ بات اکثر نوٹ کی گئی کہ کسی کے متعلق کوئی بدگمانی گھر کرلے تو ایسے واقعات سامنے آتے ہیں کہ جو کہ اُسے مزید تقویت پہنچاتے ہیں۔ قتیل شفائی کہہ گئے ہیں۔

وہ بدگماں ہے تو سو بار آزمائے مجھے

بدگمانی میں ہم اسے ہندو سمجھ بیٹھے تھے، بڑی وجہ نام تھا اور اس سے بڑھ کر اس کا طرزِ عمل۔ جس کمپنی سے ہم وابستہ تھے وہاں ماہِ رمضان نہیں آتا تھا۔ ویسے تو یہ برکتوں کا مہینا ایک یا دو دنوں کے فرق سے پوری دنیا میں آتا ہے لیکن ہماری کمپنی اس سے مبرا تھی۔ چائے، کافی اور سگریٹ کھلے عام چل رہے ہوتے اور تو اور باقاعدہ وقفۂ طعام دیا جاتا۔ پولیس کے اکثر ملازمین جو قریب ہی ڈیوٹی انجام دے رہے ہوتے، کمپنی کی حدود میں آکر ٹھنڈے گرم مشروبات سے لطف اندوز ہوکر منہ پونچھتے واپس چلے جاتے۔ شعبۂ حسابات میں دس کے قریب مسلمان تھے، تمام افراد روزے کا احترام کرتے۔ اگر کوئی روزہ نہ بھی رکھتا تو ظاہر بھی کرتا کہ روزے سے ہے لیکن بابو ان سب باتوں سے بے نیاز تھا۔ رمضان کے دوران کھلے عام غیر مسلموں کی طرح دن بھر سگریٹ اور چائے کا لطف لیتا، یہ ساری باتیں ہماری بدگمانی کو تقویت پہنچاتی رہیں۔ رمضان میں ظہر کے وقت سارے مسلمان جو کہ بمشکل دس تھے، نماز کو جاتے سوائے بابو کے۔ اس معمول کو سات سال گزر گئے اور ہم اسے ہندو ہی سمجھتے رہے۔ ۱۹۸۴ء میں جب اس کمپنی سے وابستگی کو آٹھواں سال شروع ہوا تو ہم نے اس سفر کا قصد کیا جس کی تمنا میں سب کے دل دھڑکتے ہیں۔



دن گنے جاتے تھے جس دن کے لیے

ہماری مراد سفرِ حج سے ہے۔ اگرچہ روضۂ اقدس پر حاضری حج و عمرہ کے فرائض میں نہیں لیکن اس کے بغیر حج و عمرہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جب بھی کوئی مسلمان اس سفر کا قصد کرے تو تمام لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود دل میں کیف و سرور کی لہر جاگ اٹھتی ہے، ساتھ ہی ماضی کے اعمال پر ندامت کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ اقبال عظیم نے ایک شعر میں کس کمال سے یہ کیفیت منتقل کر دی ہے۔

مدینے کا سفر اور میں نم دیدہ نم دیدہ
جبیں افسردہ افسردہ قدم لغزیدہ لغزیدہ

دنیا کے تمام سفرنامے ایک طرف اور دوسری طرف اس سفر کی روداد کو تولا جائے تو یقیناً اسی کا پلڑا بھاری رہے گا۔ ذکرِ مدینہ اور اس کی تڑپ کی لذت کے ذکر سے دنیا کی لائبریریاں بھری ہوئی ہیں۔ اردو زبان میں اس سفر کی روداد لاکھوں افراد نے لکھی ہے، انہی میں ایک 'شب جائے کہ من بودم' شورش کاشمیری کے قلم کا شاہکار ہے۔ اعجاز رحمانی ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے ہزاروں نعتیں قلمبند کی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جاؤں کیوں کوئے خیر البشر چھوڑ کے
کوئی جاتا نہیں اپنا گھر چھوڑ کے
کوئی منزل سوائے مدینہ نہیں
اک سفر چن لیا ہر سفر چھوڑ کے
کوئی لمحہ سکوں کا ملے گا کہاں
یہ مدینے کی شام و سحر چھوڑ کے

۱۹۸۴ء میں جب اس سفر کا ارادہ کیا تو یہ طے کیا کہ دبئی سے مکہ کا ۲ ہزار کلومیٹر کا سفر بذریعۂ کار طے کیا جائے۔ ایک ماہ قبل کاغذی کارروائی شروع ہوگئی، دشواریاں اور رکاوٹیں بھی شدید تھیں لیکن۔

کسی کے ہاتھوں نے سہارا دیا ورنہ
کہاں میں کہاں یہ راستے پیچیدہ پیچیدہ

شعبے کے تمام ملازمین جن میں ہندو اور عیسائی بھی شامل تھے، ان کا تعاون شاملِ حال رہا۔ پندرہ دنوں میں یہ مرحلہ طے ہوا۔

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

پورے دفتر کو علم ہوگیا کہ یہ خاکسار حج کو جارہا ہے۔ سب کی نیک خواہشات سمیٹ رہا تھا، اسی دوران ایک مرتبہ چائے لینے گیا تو بابو نے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا، میرا باپ بھی اس سال حج کرنے جائے گا' ہمارے نزدیک تو وہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتا، اس لیے اپنی معلومات کا رعب جھاڑتے ہوئے کہا "تمہارے حج کو تو کاشی کہتے ہیں، وہ بنارس جائے گا۔" اس کا یہ سننا تھا تن بدن میں آگ لگ گئی، اچانک کھڑا ہوا اور وہاں موجود خواتین کو خاطر میں لائے بغیر گالی سے نوازتے ہوئے کہا "میں مسلمان ہوں۔"

دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے ہم نے کہا "یہ نام مسلمانوں میں پہلے نہیں سنا۔" اس نے وضاحت کی کہ بیران ایک جگہ کا نام ہے جہاں ایک نامور بزرگ تھے، اسی نسبت سے ہمارے خاندان کا یہ نام ہے۔ ہمیں یاد آیا کہ ۱۹۷۵ء میں جب ہم نے اسٹیٹ بینک کی ملازمت اختیار کی تھی تو ہمارے شعبے کے سربراہ 'بیابانی صاحب' تھے اور ۱۹۷۹ء میں ایک دوست رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تو ان کے سسر کا نام افضل بیابانی تھا۔ یہ سلسلۂ تصوف سے جڑا تھا۔ فوراً ہی سنبھل کر ہم نے وار کیا "چلو مان لیا لیکن یہ ایڈی چری اور پھٹی چری کیا چیز ہے اور یہ مسلمانوں میں کہاں سے آیا؟" بحث چل پڑی، وہ مسلمان ہونے پر مصر تھا اور ہمارا کہنا تھا کہ

اس کا کہنا تھا کہ اگر اچھا انسان تمہاری طرح ہوتا ہے تو مجھے منظور نہیں اور میری دعا ہے کہ میری اگلی نسل میں بھی ایسا متقی نہ پیدا ہو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ نام مسلمان کا نہیں ہوسکتا۔

یہ سلسلہ طول پکڑ گیا تو ہم نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا ’’اب تو طبی معائنے سے فیصلہ ہوگا۔‘‘ مزید یہ بھی کہا ’’میں اقبال کو کہوں گا کہ معائنے کے بعد رپورٹ دو۔‘‘ اس پر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا، ایسا کھلا کہ...... بہر حال یہ بات جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگوں نے اسے بابو کی جگہ بڑے ادب سے مسٹر چری پکارنا شروع کر دیا، اسے یہ بھی منظور نہ تھا اور سب کا ذمے دار ہمیں ٹھہراتے ہوئے سلام کلام بھی ختم کر ڈالا۔ لطف یہ کہ مسٹر چری کہنے والوں کو کچھ نہ کہتا، ہم اس سے کہتے کہ کہنے والے سب تیرے باپ ہیں کیا جو انہیں کچھ نہیں کہتا، نوبت یہ آئی کہ اسے کوئی نئے نام سے پکارتا تو ہم ایک آنکھ دبا کر پکارنے والے سے محاذ آرائی شروع کر دیتے مگر اس سنگدل پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ تجدیدِ وفا کا امکان باقی نہ تھا اور ہم اس کے امیدوار تھے۔ شکیل بدایونی کا شعر دہراتے رہے۔

یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک
مگر ایسی بے رخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے

ہمیں فکر تھی کہ اس سے صلح صفائی کے بغیر حج پر جانے کا تصور تکلیف دہ ہوگا، ایک ہفتہ یونہی گزر گیا مگر زمیں جنبد نہ جنبد گل محمدؒ سوچا کہ جاتے وقت معافی تلافی کر لیں گے۔ زیادتی سراسر ہماری تھی اور ڈر تھا کہ آخری دن وہ دفتر نہ آیا تو اسے کہاں ڈھونڈیں گے، کیسے مک مکا ہوگا۔ ہفتہ بعد ایک خوشگوار تبدیلی ہوئی کہ اس نے سلام کا جواب دینا شروع کیا لیکن یہ بے سبب نہ تھا۔ ہم نے اسے ٹوکا کہ اب تو مسلمان سمجھ کر سلام کرتے ہیں لیکن جواب نہ دینا تو پرانے خدشات کو تقویت دیتا ہے۔ اس دلیل سے وہ متاثر تو ہوا لیکن سلام سے آگے نہ بڑھا، صورتحال وہی تھی کہ جس کی وضاحت اقبال عظیم کر گئے ہیں۔

تعلق ان سے باقی ہے فقط صاحب سلامت تک
ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں مگر سنجیدہ سنجیدہ

اسی دوران روانگی کا دن آ گیا۔ بابو کی خفگی دل و دماغ پر سوار تھی۔ دفتر کے ایک ایک فرد کو ہمارے پروگرام کا علم تھا، ارادہ تھا کہ لنچ کے وقفے میں چھٹی کر کے گھر چلے جائیں گے اور پھر دو بجے اس سفر پر روانگی ڈالیں گے کہ جس کی خیر و برکات کا ذکر بھی ایک سعادت ہے۔ سوچ رکھا تھا کہ دفتر سے خدا حافظ کہتے ہوئے سب سے معافی تلافی کر لیں گے لیکن بابو بد بخت پھر بھی ذہن پر سوار تھا۔ دفتر پہنچے تو بابو دروازے پر منتظر تھا، کہنے لگا، ’آدھے گھنٹے دیر سے آئے ہو‘ اس کے کہے بغیر اندازہ ہو گیا کہ وہ ہمارا انتظار کر رہا تھا، یہ گفتگو استقبالیہ پہ بیٹھی ہوئی خاتون سندرا تک پہنچی۔

بابو سے اس نے کہا ’’ارے تو اس کا انتظار کر رہا تھا، میں سمجھی کہ کسی لڑکی کے چکر میں کھڑا ہے۔‘‘ ہم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور تمہیں غصہ آ رہا تھا کہ تمہارے ہوتے ہوئے دوسری طرف کیوں رغبت رکھتا ہے؟ اس پر تو اسے غصہ تو بہت آیا لیکن سنبھل کر کہنے لگی ’’تو حج کرنے جا رہا ہے پھر بھی باز نہیں آیا۔‘‘ ہم نے پھر جواب دیا ’’حج کے بعد ہر غلط بات سے توبہ کر لوں گا، ابھی تو وقت ہے اس سے لطف لینے کا۔ اس کے بعد اسے فیض احمد فیض کا شعر سنایا۔

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

اسے اس کا مطلب بھی سمجھانا پڑا، مطلب سمجھتے ہی بولی ’’تیرے پاس تو چار دن نہیں صرف چار گھنٹے بچے ہیں۔‘‘ اس پر ایک قہقہہ گونج گیا۔

اس دوران بابو نے ہمارے ہاتھ سے وہ کولر بھی لے لیا جو ہم برف کی گولیاں (Ice Cubes) رکھنے کے لیے لائے تھے، گاڑی کی چابی بھی مانگی اور کہا کہ ’جاتے وقت میں اسے بھر کر گاڑی میں رکھ دوں گا، عجیب انداز تھا اس کا، نہ کوئی شکایت نہ گلہ، ہم تو معافی مانگنے کا ارادہ کر کے آئے تھے لیکن ایک لفظ کہے بغیر اس نے ہمیں وہ سبق دیا کہ ہم آج بھی شرمندہ ہیں، ارم لکھنوی یاد آ گئے

کچھ اس سے نہ کہنا ہی تھی فتح محبت کی
جیتی ہوئی بازی کو ہم جان کے ہار آئے

واپسی پر کولر کے ساتھ گاڑی تک آیا اور قبل اس کے کہ ہم کچھ کہہ سکیں، معافی مانگی، ہمارا یہ حال تھا کہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے شرمندہ کیے دیتی ہے نگاہِ شرمسار اس کی

دل تو چاہا کہ اس کے پیر پکڑ لیں لیکن دائیں بائیں اتنے لوگوں کی آمد و رفت تھی، اسی کا بہانہ بنا کر اس سے اجتناب کیا۔ خدا جانے وہ انا تھی یا کچھ اور جس نے اس عظیم شخص کے آگے جھکنے سے باز رکھا۔ اعجاز رحمانی یاد آ گئے۔

خود بخود اپنے خدوخال نظر آئیں گے
وہ جو دیوارِ انا ہے گرا کر دیکھو

ایک شعر اسی غزل کا اور سن لیں، اگرچہ موضوع سے ہٹ کر ہے جس میں ان کا خطاب سیاست دانوں سے ہے

رقص شعلوں کا اگر اتنا پسندیدہ ہے
اپنے گھر میں بھی کبھی آگ لگا کر دیکھو

حج سے واپسی پر بابو سے بغل گیر ہوئے۔ اس نے پوچھا ’’میرے لیے دعا کی۔‘‘ ہم نے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ خصوصی طور پر اس کے لئے اولاد کی دعا کی ہے۔ اس لئے کہ اس کا تذکرہ محرومی کے احساس کو تازہ کر دیتا ہے، پھر فوراً ہی اپنی روایت اپناتے ہوئے کہا ’’بابو اب میں حج کر کے آیا اور بالکل سیدھا ہو گیا ہوں، مجھ سے بیہودہ مذاق مت کرنا۔‘‘ اس کا جواب کئی من بھاری تھا اور لگتا تھا کہ اس نے اگلا پچھلا حساب ایک جملے میں چکا دیا ہے ’’ارے تم تو اس جانور کی دم ہو جسے سو سال بھی زمین میں گاڑ کر رکھو تو بھی سیدھی نہیں ہوتی۔‘‘ ایک مشترکہ قہقہے نے اس کی بات کی تائید کر دی، ہم نے بھی خاموشی اختیار کی کہ آئندہ حساب چکا لیں گے۔

۱۹۸۵ء میں کمپنی نے اچانک پالیسی بدلی اور تمام آفس بوائے اور میل کلرک کو فارغ کر دیا۔ ایک کمپنی کو ٹھیکا دے دیا، نصف کی بچت تھی، ہوائی ٹکٹ، چھٹیوں کے پیسے اور بعد از ملازمت کے فوائد ادا کرنے کی بھی بچت تھی، وہی نظر آیا کہ ہلدی اور پھٹکری کے بغیر رنگ چوکھا آ رہا تھا۔ بابو واپس ملاپورم چلا گیا۔ جب اس کی یاد آتی ہے تو فیض احمد فیض کا شعر نوحہ بن کر دل و دماغ میں گونجنے لگتا ہے۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

## اقوال زریں

☆...... خدا جسے ذلیل کرنا چاہے وہ دولت کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔

☆...... مقتول کے لیے یہ فخر کم نہیں ہے کہ وہ قاتل نہیں ہے۔

☆...... اچھا صحافی وہ ہے جس میں صراف کا اخلاق، محافظ کی پھرتی اور استاد کی لیاقت ہو۔

☆...... زبان کی لغزش قدم کی لغزش سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

☆...... کسی کے اخلاق پر اعتماد نہ کرو، جب تک اسے غصے کی حالت میں نہ دیکھ لو۔

☆...... ایسا اشارہ کرنا بھی حرام ہے جس سے دوسروں کو رنج پہنچے۔

☆...... کام کرنے والے کو صرف ایک شیطان ستاتا ہے، مگر کاہل انسان کو ہزاروں شیطان ستاتے ہیں۔

☆...... جو شخص اپنے نفس کا معلم نہیں ہو سکتا، دوسرے کا کس طرح ہوگا؟

☆...... قلم ہاتھ کی زبان اور تحریر ایک خاموش آواز ہے۔

☆...... عقل مند آدمی یہ نہیں سوچتا کہ وہ کیا کام کرے اور کون سا نہیں، وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا ہے۔

☆...... محنت وہ سنہرا سکہ ہے جس سے ہم ہر شے حاصل کر سکتے ہیں۔

☆...... جو دن نیکی کے بغیر گزر جائے، وہ روئے جانے کے قابل ہے۔

☆...... علم یہ ہے کہ جو اچھی بات سنو اسے لکھ لو اور جو لکھ لو اُسے حفظ کرو اور جو حفظ کرو اسے دوسروں تک پہنچاؤ یا پہنچانے کی کوششیں کرو۔

☆...... دنیا میں زندگی کی سانسیں بہت کم ہیں اور قبر کی زندگی بہت طویل۔

(ارشاد حسین لاشاری، ملتان)

# انسان نے وقت کو قابو کرلیا

رخسانہ فضل

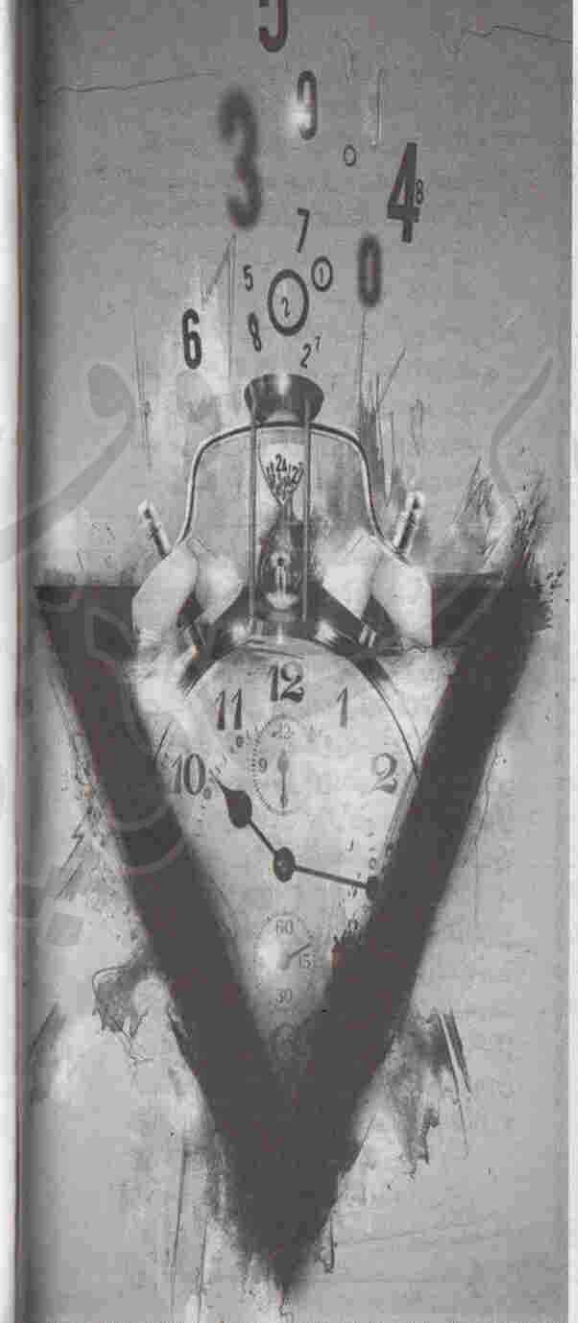

**روشنی سے زیادہ تیز رفتار ذریعے نے آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی بنیادیں ہلا دیں**

پچھلے دنوں ایک سائنسی انکشاف نے خصوصاً مغرب میں ہر عام و خاص کو چونکا دیا۔ انکشاف یہ ہے کہ ہماری کائنات میں روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے سفر کرنے والا مادہ بھی پایا جاتا ہے۔ چونکہ روشنی کی رفتار وقت کا پیمانہ بھی ہے، لہٰذا اس انکشاف کے معنی یہ ہوئے کہ انسان وقت کو قابو کرنے کا راز بھی جان گیا کیونکہ انسان درج بالا مادے سے کسی طرح ''خلائی مشین'' بنالے تو وہ اس میں بیٹھ کر مستقبل یا ماضی کی طرف سفر کرسکتا ہے..... کہ مشین کی رفتار روشنی کی رفتار (یعنی وقت) سے زیادہ تیز ہوگی۔ جب بھی ایسی مشین بنی، آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ انسانی زندگیوں میں زبردست انقلاب آجائے گا۔

یہ نظریہ کہ روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی کے ساتھ کائنات کی کوئی شے سفر نہیں کرسکتی، امریکی سائنسدان، آئن سٹائن کی تخلیق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ روشنی کے ذرات، فوٹون کوئی کمیت (یا وزن) نہیں رکھتے۔ ۱۹۰۵ء میں منظر عام پر آنے والا یہ تصور ''نظریہ اضافیت'' کے نام سے مشہور ہوا۔ بعد ازاں اسی نظریے کی بنیاد پر جدید طبیعات نے جنم لیا۔ ماہرینِ سائنس اس نظریے کی مدد سے جانتے ہیں کہ ستاروں سے لے کر سیاہ سوراخوں (Black Holes) تک کائنات کی تمام اشیا کیونکر کام کرتی ہیں۔ لیکن اب اس انکشاف نے سائنسی دنیا ہی نہیں، عام لوگوں میں بھی ہلچل مچادی کہ نظریہ اضافیت غلط ہوسکتا ہے۔

سائنسدان جدید ترین پیمائشی آلات کے ذریعے جان چکے ہیں کہ روشنی فی سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو بیاسی میل (دو لاکھ ننانوے ہزار سات سو ساٹھ کلومیٹر) کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ چنانچہ تین سال قبل سوئس شہر، جنیوا میں قائم دنیا میں سب سے بڑی طبیعاتی لیبارٹری، سرن (یورپین آرگنائزیشن فار نیوکلیر ریسرچ) ذراتی طبیعاتی مرکز اور وسطی اٹلی میں موجود گران ساسو لیبارٹری نے فیصلہ کیا کہ وہ نیوٹرائنو ذرے کی رفتار معلوم کرنے کا تجربہ کرتے ہیں۔

## نیوٹرائنو ذرات کا کمال

نیوٹرائنو کائنات کے انوکھے ذرے (Particles) ہیں۔ یہ معمولی سی کمیت رکھتے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کوئی شے ..... دیوار، پتھر، شیشہ وغیرہ ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ یہ ہر ارضی شے کے آر پار ہو جاتے ہیں جب کہ روشنی کے سامنے دیوار آجائے تو وہ پار نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اب بھی آپ کے ارد گرد کروڑوں اربوں نیوٹرائنو کسی روک ٹوک کے بغیر گھوم پھر رہے ہیں۔

تجربے کا آغاز ۲۰۰۸ء میں ہوا۔ تجربے کے پہلے مرحلے میں سرن لیبارٹری، جنیوا میں نصب خصوصی مشین سے ایک ہزار نیوٹرائنو ذرات گران ساسو لیبارٹری، اٹلی کی طرف چھوڑے گئے۔ دونوں لیبارٹریوں کے مابین ۷۳۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ چنانچہ نیوٹرائنو نے وہاں تک پہنچنے میں سیکنڈ کا ۲٫۴ ہزارواں حصہ لگایا۔ گران ساسو لیبارٹری میں لگے خصوصی آلات نے نیوٹرائنو پکڑ لیے۔ مزید براں نیوٹرائنو کی رفتار جانچنے اور پہنچنے کا صحیح وقت معلوم کرنے کے لیے جدید ترین جی پی ایس نظام اور سیزیم ایٹمی گھڑی استعمال کی۔ اس جدید جی پی ایس نظام کی پیمائش اتنی زبردست ہے کہ صرف ایک سینٹی میٹر کی ہی غلطی ممکن ہے۔

جب سرن اور گران ساسو کے ماہرین کو پہلے تجربے کا نتیجہ معلوم ہوا، تو وہ ششدر رہ گئے۔ کیونکہ نیوٹرائنو نے تیز رفتاری میں روشنی کو مات دے ڈالی تھی۔ گو فرق صرف ساٹھ نینو سیکنڈ کا تھا لیکن یہ اتنا بڑا ضرور تھا کہ طبیعات کی بنیادیں ہلا کر رکھ دے۔ واضح رہے ایک سیکنڈ کا ایک اربواں حصہ نینو سیکنڈ کہلاتا ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## دلچسپ معلومات

☆ اگر زمین کی جسامت کو میٹر کے برابر سمجھ لیا جائے تو پلوٹو ہم سے صرف ڈیڑھ کلو میٹر دور ہو گا۔
☆ ایمیزون جنگل کے تمام جانوروں کا وزن کیا جائے تو ۲۰ فیصد وزن صرف چیونٹیوں کا ہو گا۔
☆ انسانی جسم میں جتنی ہڈیاں (۲۰۶) ہوتی ہیں، اتنی صرف زرافے کی گردن میں پائی جاتی ہے۔
☆ کمرے میں موجود ہوا کے ایٹم ۱۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اِدھر اُدھر حرکت کرتے ہیں۔
☆ قدیم مصری، پھپھوندزدہ روٹیاں زخموں پر رکھ کر علاج کیا کرتے تھے اور یوں وہ ضد حیوی سے واقف تھے۔

چنانچہ ماہرین نے فیصلہ کیا کہ نیوٹرائنو کی رفتار معلوم کرنے کے لیے مزید تجربات کیے جائیں۔ تجربوں کا یہ سلسلہ پھر تین سال تک جاری رہا۔ ہر بار پیمائش کے ذریعے یہی انکشاف ہوا کہ نیوٹرائنو ذروں کی رفتار روشنی سے لگ بھگ ۶۰ نینو سیکنڈ زیادہ رہی۔ ماہرین نے نتائج میں ۱۰ نینو سیکنڈ کی کمی بیشی کا اندازہ رکھا تھا لیکن یہاں تو فرق ۶۰ نینو سیکنڈ تھا۔ اسی لیے پچھلے ماہ آخر کار ماہرین نے اعلان کر ہی دیا کہ روشنی سے بھی زیادہ تیز رفتار ذرہ دریافت ہو چکا۔

لیکن ابھی یہ اعلان مصدقہ نہیں کیونکہ سوئس اور اطالوی ماہرین نے امریکی اور جاپانی ماہرینِ طبیعات سے درخواست کی ہے کہ وہ بھی نیوٹرائنو کی رفتار معلوم کرنے کے لیے تجربات کریں۔ چنانچہ اگلے چھ ماہ میں شکاگو کی ضرمی لیب اور جاپان کی ٹوکیو لیبارٹری اس تجربے کو دہرائیں گی۔ اگر امریکی اور جاپانی تجربات نے بھی خلافِ توقع نتیجہ دیا، تو یقیناً جدید طبیعات کی بنیادیں ہل جائیں گی۔

سرن لیبارٹری میں اس تاریخی تجربے کے سربراہ، پروفیسر انتونینو اریڈٹو کا کہنا ہے: ''ہمیں جب بار بار ایک ہی نتیجہ ملا، تو ہم حیران پریشان ہو گئے۔ لیکن یہ ابھی ثقہ نہیں، جب امریکی اور جاپانی بھی اسی نتیجے کی تصدیق کریں گے، تب وہ مصدقہ ہو گا۔ دراصل نیوٹرائنو جیسے انتہائی چھوٹے پیمانے پر تجربے کرتے ہوئے کوئی بھی غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ امریکی یا جاپانی ہماری کوتاہی دریافت کر لیں اور طبیعات کی بنیادیں اپنی جگہ قائم رہیں۔''

### کائنات کی نظر نہ آنے والی پراسرار شے

بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ عین ممکن ہے، فضا میں ایسی کوئی پراسرار اور غیر مرئی طاقت موجود ہو جس کے تال میل سے نیوٹرائنو کی رفتار بڑھ گئی۔ واضح رہے، امریکی انڈیانا یونیورسٹی سے وابستہ مشہور طبیعات دان، ایلن کوسٹلیکی ۱۹۸۵ء میں اسی قسم کا نظریہ پیش کر چکا ہے۔ لہٰذا یہ تجربہ بھی ثابت کرتا ہے کہ کائنات میں ایسی کوئی پراسرار طاقت ہے جو نظر نہیں آتی، مگر اشیا پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ ممکن ہے یہی طاقت خدائے رب ذوالجلال سے وابستہ ہو۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکہ کی فرمی لیب نے اپنے ایک تجربے کے سلسلے میں نیوٹرائنو کی رفتار معلوم کرنا چاہی تھی۔ تب بھی یہ انوکھے ذرات رفتار میں روشنی کے ذروں (فوٹون) کو ۱۲ نینو سیکنڈ پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ لیکن یہ وقت زیادہ اہم نہ تھا، اسی لیے ماہرین نے اسے نظر انداز کر دیا۔ لیکن اب ۶۰ نینو سیکنڈ کے فرق کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔

کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ سرن لیبارٹری سے مشین نے پوری قوت سے نیوٹرائنو خارج کیے تھے۔ لہٰذا ان کی رفتار تیز ہو گئی۔ لیکن جو نیوٹرائنو اور فوٹون سپر نووا (پھٹتے ستاروں) سے خارج ہوتے ہیں، وہ زمین تک پہنچتے پہنچتے تیز رفتار نہیں رہتے۔ چنانچہ تب ان کی رفتار روشنی کی رفتار سے کم ہوتی ہے۔ گویا یہ نظریہ عیاں کرتا ہے کہ نیوٹرائنو کی رفتار کا تعلق انھیں ملنے والی توانائی (Energy) سے ہے۔ وہ جتنی زیادہ ہو گی، ان کی رفتار بھی اتنی ہی تیز ہو جائے گی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk





۹ نومبر ۹ یادیں

# ۹ یادوں کا گلدستہ

# اقبالؒ کو اقبال کیسے ملا؟

ماہ نور فیصل

**جنگ** آزادی ۱۸۵۷ء میں ناکامی کے بعد مسلمانانِ ہند کو مایوسی اور نا اُمیدی نے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ لیکن اللہ نے سرسید، حالی، علامہ اقبال اور بہت سے مسلمان رہنما، دانشور اور شاعر اُمت مسلمہ کی بیداری اور رہنمائی کے لیے بھیج دیے۔

علامہ اقبال نے خصوصاً اپنے کلام کے ذریعے مسلم قوم میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ آپ نے واضح کیا کہ مسلمانوں کا معاشی و مادی ابتلا کا شکار ہو جانا کوئی اتنا بڑا حادثہ نہیں کہ وہ مایوس ہو کر بیٹھ جائیں۔ قوموں کی زندگی میں اس طرح کے حادثات آتے ہی رہتے ہیں، مگر زندہ اقوام بحرانوں سے مضمحل اور ضعیف نہیں ہوتی بلکہ انہیں اپنی قوت و شوکت کے لیے چیلنج سمجھ کر عروجِ نو کے لیے بطور زینہ استعمال کرتی ہیں۔

علامہ اقبال کے متعلق نو مختلف شخصیات کے خیالات و تاثرات ایک گلدستہ کی صورت پیش ہیں۔ ان کے ذریعے شاعرِ مشرق کی حیات کے مختلف گوشے اُبھر کر سامنے آتے اور ہمارے لیے مشعلِ راہ بنتے ہیں۔

علامہ اقبال کی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کیا اہمیت تھی۔ اس پر ڈاکٹر اسرار احمد روشنی ڈال رہے ہیں:

آپ کی تعلیم و تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خصوصی اہتمام کیا۔ آپ ایک نیک اور پارسا گھر میں عبادت گزار سنجیدہ والدین کے زیرِ تربیت رہے۔ آپ کی تعلیم کے لیے اساتذہ کرام بھی بہت قابل، مخلص اور شریف النفس تھے۔ شمس العلماء میر حسن نے آپ کی تعلیم کی مضبوط بنیادیں رکھیں۔ پروفیسر آرنلڈ آپ کے وہ انگریز اُستاد تھے جنھوں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ شاعری ترک نہ کریں۔ آپ یہ قصہ بھی پڑھیں گے۔

ایک بناوٹی انسان کی دو زندگیاں ہوتی ہیں۔ ایک گھر میں اور ایک لوگوں کے سامنے لیکن علامہ اقبالؒ ایک بے ریا شخص تھے۔ اُن کے صاحبزادے جاوید اقبال اور ملازم علی بخش کی یادیں بہت دلچسپ ہیں۔

ایک اُستاد کی قابلیت، اُس کے علم کا حدود اربعہ، اُس کی قوتِ برداشت، اُس کا احساسِ ذمے داری اُس کے شاگردوں سے زیادہ بہتر کون جانتا ہے۔ اُن کے ایک شاگرد میاں افضل حسین کی باتیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

علامہ اقبالؒ کو اللہ نے یہ صلاحیت دی تھی کہ آپ بالکل ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکتے تھے کہ کون سا کام کرنے کے لیے کون سا فرد موزوں ہے۔ آپ نے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے قائدِ اعظمؒ کا انتخاب کیا اور اُمتِ مسلمہ کی دینی اُمور میں رہنمائی کے لیے مولانا مودودیؒ کو پنجاب بلایا۔ ہم یہاں مولانا مودودیؒ کے ایک انٹرویو سے اقتباس دے رہے ہیں۔ مولانا نعیم صدیقی اپنے دورِ شباب میں علامہ اقبال سے ملے۔ ان کی رُوداد بھی آپ پڑھیں گے۔

## علامہ اقبال کی نگاہِ دور رس

پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان قطع نظر اس سے کہ وہ عوام میں سے ہو یا خواص میں سے اور بالکل ان پڑھ اور جاہل ہو یا عالم و فاضل، علامہ اقبالؒ کے ساتھ عقیدت و محبت اور انسانیت کے گہرے رشتے میں منسلک ہے۔ ہر پاکستانی جانتا ہے کہ یہ مملکت خداداد جس میں ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے رہ رہے ہیں، اس کا قیام علامہ ہی کے تخیل و تصور کا مرہونِ منت ہے۔

اگرچہ علامہ اقبالؒ بنیادی طور پر سیاست دان نہ تھے لیکن اُنھوں نے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ سوچا اور مسائل کا جو حل پیش کیا، وہ ان کی بیدار مغزی، معاملہ فہمی اور سیاسی تدبر کا شاہکار ہے۔ ۱۹۳۰ء سے قبل ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ یہ صرف علامہ مرحومؒ ہی کی نگاہِ دور رس و دُور بین تھی جس نے حالات کے رُخ اور زمانے کی رفتار پہچان کر مسلمانانِ ہند کے جملہ مسائل کا یہ حل بتایا کہ ہندوستان کے کم از کم شمال مغربی گوشے میں واقع مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کی آزاد اور خود مختار مملکت قائم کی جائے۔

پاکستان کے ساتھ علامہؒ کا تعلق صرف ''معصور'' کا نہیں بلکہ اِس سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کی نگاہِ دور رس نے مسلمانانِ ہند کے قومی مقدمے کی پیروی اور ان کی قیادتِ عظمیٰ کے لیے صحیح ترین وکیل اور قائد کی حیثیت سے محمد علی



جناحؒ کو ڈھونڈ نکالا۔ قائدِ اعظمؒ کا انتخاب بلاشبہ علامہ اقبالؒ کے خلوص و اخلاص کا واضح ثبوت اور ان کے انکسار اور تواضع کی روشن دلیل ہے۔ علامہؒ نے نہ صرف پاکستان کا تصور ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس کے خاکے میں رنگ بھرنے کی عملی جدوجہد کے ابتدائی مراحل میں قائدانہ حیثیت سے شرکت بھی کی۔

کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ آزادی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ مملکتِ خداداد پاکستان کا معجزانہ قیام اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے، اسی صورت میں ہمیں علامہؒ کے ذاتی احسان کا بھی کوئی احساس ہو سکتا تھا مگر وائے ناکامی کہ متاعِ کارواں جاتا رہا، کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا۔

ہماری اِس ناقدری کے نتیجے میں پاکستان کا مشرقی حصہ ہم سے علیحدہ ہو گیا۔ اِس دردناک حادثہ فاجعہ پر بھارت میں جس طرح خوشی منائی گئی اور اسے جس طرح ''ہزار سالہ شکست کے انتقام'' سے تعبیر کیا گیا، اس سے اُن لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو ہندوؤں کے بارے میں کسی حسنِ ظن میں مبتلا تھے۔ اگر اندرا گاندھی اِس نہرو خاندان کی بیٹی ہوتے ہوئے جس کی وسیع المشربی ضرب المثل ہے، یہ الفاظ اپنی زبان سے نکال سکتی ہے تو سوچنے کی بات ہے اگر ایک بار ہندوؤں کو ہندوستان میں فیصلہ کن اقتدار حاصل ہو جاتا تو ان کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوتا؟

حقیقت یہی ہے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان قائم نہ ہوتا تو نہ صرف کہ اب تک ہندوستان سے اسلام کا صفایا ہو چکا ہوتا بلکہ پورا مشرقِ وسطیٰ ہندو شاونیت کے سیلاب میں بہہ جاتا۔

(ڈاکٹر اسرار احمد)

## والدِ محترم شیخ نور محمد کی باوقار شخصیت

علامہ اقبالؒ کے والدِ محترم، شیخ نور محمد تجارت پیشہ گھرانے کے فرد تھے۔ اُنھوں نے قرآن شریف ضرور پڑھا ہوگا، مگر کسی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم نہ حاصل کر سکے۔ ذہین تھے اور سیکھنے، آگے بڑھنے اور حاصل کرنے کے ذوق و شوق سے مالا مال تھے۔ بس اِسی لگن اور دلچسپی کی بنا پر حرف شناسی

سے عبارت شناسی کی منزل تک پہنچے اور رفتہ رفتہ، دھیرے دھیرے اُردو عبارت پڑھنے لگے۔ بعد ازاں فارسی کتابیں بھی پڑھ لیتے۔ سادہ مزاج، بردبار اور حلیم الطبع شخص تھے۔ والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے۔ جس کسی کو ان سے معاملہ پیش آتا، وہ اِس نوجوان کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہوتا۔ شیخ محمد رفیق نے جلد ہی اپنے اکلوتے بیٹے نور محمد کی شادی سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں کر دی۔

اپنے حسنِ اخلاق، عالی ظرفی، گوناگوں خوبیوں اور صلح کل طبیعت کی وجہ سے شیخ نور محمد کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ شیخ نور محمد نہ صرف اپنے خاندان بلکہ محلے، کاروباری حلقوں اور شہر میں بھی ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ تقریباً ۲۵ سال کی عمر میں اللہ نے اُنھیں اولادِ نرینہ عطا کی، نام عطا محمد رکھا گیا۔ شیخ عطا محمد (۱۸۵۹ء۔۱۹۴۰) نے رڑکی انجینئرنگ کالج سے ڈپلومہ حاصل کیا اور ایک بھرپور زندگی گزاری۔ لاہور اور یورپ میں آپ ہی اپنے بھائی، اقبالؒ کی تعلیم کے زیادہ تر اخراجات وہی برداشت کرتے رہے۔

شیخ نور محمد کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی قابلِ ذکر ہے، جس کا تعلق ان کی روحانیت سے ہے۔ وہ نیک سیرت اور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاکیزہ مزاج تھے۔ تلاوت کلامِ پاک، عبادات خصوصاً نوافل شب اور تہجد سے شغف رکھتے۔ خدمتِ خلق کے ساتھ کلام اللہ کی تلاوت کو دین و دُنیا کی ترقی کا سبب سمجھتے۔ انہوں نے یہی تاکید اپنی اولاد کو کی تھی۔

علم و عرفان کا ذوق اور دینی جذبہ اُنہیں کشاں کشاں علما و صلحا کی مجالس میں لے جاتا اور وہ ان صحبتوں سے برابر استفادہ کیا کرتے۔ گفتگو حکیمانہ خیالات و عارفانہ کیفیات کی آئینہ دار ہوتی چنانچہ (اقبالؒ کے اُستاد) سید میر حسن اُنہیں اَن پڑھ فلسفی کے لقب سے پکارتے تھے۔ بعض لوگ تصوف کے مشکل نکات کی تفہیم کے لیے ان سے رُجوع کیا کرتے۔ اُنہیں مطالعہ قرآن کا خاص ذوق تھا۔ ہمیں ان کی زندگی دیانت و شرافت، خدمتِ خلق اور کسبِ حلال کے لیے محنت و جدوجہد سے عبادت نظر آتی ہے۔ ساری عمر روزی کے لیے، دل بریار دوست بدکار، پر ان کا عمل رہا۔ دل خدا کی طرف، ہاتھ کام میں لگے رہتے۔

شیخ نور محمد اپنے اقبال مند بیٹے کی تربیت کے لیے کس قدر سنجیدہ اور کوشاں رہے، اِس سلسلے میں بہت مشہور واقعہ ہے کہ آپ نے بڑی محنت سے اقبالؒ کے ذہن میں بٹھایا ''بیٹا، جب قرآن پڑھو تو اِس طرح پڑھو جیسے تم پر نازل ہو رہا ہے۔'' اقبالؒ کہتے ہیں کہ والد صاحب کی باتوں سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ قرآن مجید دل کے راستے بھی انسان کے شعور میں داخل ہوتا ہے۔

(ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

## بے جی..... شاعرِ مشرق کی والدہ محترمہ

شاعرِ مشرق کی والدہ محترمہ امام بی بی اپنے خاندان میں ''بے جی'' کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ ۱۸۳۴ء کو سیالکوٹ کے قصبہ سمبڑیال میں پیدا ہوئیں۔ انتہائی وضع دار خاتون تھیں۔ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھیں لیکن صوم و صلوٰۃ کی بڑی پابند تھیں۔ حسن سلوک کے باعث سارا محلّہ ان کا گرویدہ تھا۔ دیانتداری کا یہ حال تھا کہ محلے کی اکثر عورتیں ان کے پاس اپنا زیور اور دیگر قیمتی سامان بطور امانت رکھتی۔

''بے جی'' اپنے چھوٹے بیٹے علامہ اقبال سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ اقبال بھی اُن کا بے حد احترام کرتے۔

جب اقبالؒ تعلیم کے لیے یورپ گئے تو وہ راتوں کو اُٹھ کر اُن کے بخیریت وطن واپس لوٹنے کی دُعائیں مانگتی۔ جب آپ کا قیام لاہور میں تھا، سیالکوٹ جاتے تو آپ کی

والدہ خوشی سے پھولے نہ سماتیں اور کہتیں ''میرا بالی آ گیا۔'' یہ الفاظ سن کر علامہ اقبالؒ ماں کے سامنے اپنے آپ کو بالکل ننّا سا بچہ تصور کرنے لگتے۔

''بے جی'' نے علامہ اقبالؒ کے لیے بچپن ہی سے رزقِ حلال کا پورا پورا اہتمام کیا اور مشتبہ کمائی سے دُودھ کا ایک قطرہ بھی اِن کے جسم میں نہیں جانے دیا۔ علامہ اقبالؒ کے والد نے ایک مرتبہ بچوں کو بتایا ''تمہاری بے جی کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ میری کمائی میں کچھ ملاوٹ ہے۔ دراصل اُن دِنوں میں ایک جگہ ملازمت کیا کرتا تھا۔ امام بی بی کو خیال ہوا کہ جو تنخواہ مجھے وہاں سے ملتی ہے، وہ درست ذرائع سے حاصل نہیں ہوتی۔ میں نے اُنہیں بہت سمجھایا کہ ایسی کوئی بات



نہیں اور اگر ہے تو بھی تو میں تو پوری دیانتداری اور محنت سے اپنا کام انجام دیتا ہوں۔ اِس لیے میری کمائی پر شک کی کوئی گنجائش نہیں مگر ان کی تسلی کسی طرح سے نہ ہو سکی اور اُنہوں نے اقبال کو اپنا دُودھ پلانا بند کر دیا۔ اپنا کچھ زیور بیچ کر ایک بکری خرید لی اور اُس کا دُودھ اقبال کو تب تک پلایا جب تک پوری تسلی نہ ہو گئی کہ میری آمدن بالکل پاک صاف ہے۔''

۹ نومبر ۱۹۱۴ء کا دن شاید حضرت علامہ اقبالؒ کی زندگی کا تاریک ترین دن رہا ہو گا کہ آخر وہ گھڑی آن پہنچی جب عزیز ترین ہستی اُن کی والدہ محترمہ بچھڑ گئیں اور وہ مجبور اور بے بس کچھ نہ کر سکے۔ میاں جی نے اپنی رفیقہ حیات کا کفن خود سیا اور خواتین کو میت پر واویلا کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔

حضرت علامہ اقبالؒ کی مشہور اور شاہکار نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کا ہر شعر اپنی جگہ ایک علیحدہ جہان لیے ہوئے ہے۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اِس گھر کی نگہبانی کرے

(اشفاق نیاز)

## علامہ اقبالؒ کے شفیقِ رہبر

سیالکوٹ کے کالج میں ایف اے کے درجے تک تعلیم تھی۔ بی اے کے لیے اقبالؒ کو لاہور آنا پڑا۔ اُنہیں علمِ فلسفہ کی تحصیل کا شوق تھا۔ اُنہیں لاہور کے اساتذہ میں نہایت شفیق اُستاد ملا جس نے فلسفے کے ساتھ اُن کی مناسبت دیکھ کر اُنہیں خاص توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔ یہ پروفیسر آرنلڈ تھے جنھوں نے بعد ازاں اقبالؒ کو شاعری ترک کرنے سے روکا تھا۔ پروفیسر صاحب جو جواب سر ٹامس آرنلڈ ہو گئے اور انگلستان میں مقیم ہیں، غیر معمولی قابلیت کے شخص ہیں۔ قوتِ تحریر اُن کی بہت اچھی ہے اور وہ علمی جستجو اور تلاش کے طریقِ جدید سے خوب واقف ہیں۔ اُنہوں نے چاہا کہ اپنے شاگرد کو اپنے مذاق اور اپنے طرزِ عمل سے حصہ دیں اور وہ ارادے میں بہت کچھ کامیاب ہوئے۔

پہلے اُنہوں نے علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانے

میں اپنے دوست مولانا شبلی مرحوم کے مذاقِ علمی کے پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی، اب اُنہیں یہاں ایک اور جوہرِ قابل نظر آیا جس کے چمکانے کی آرزو اُن کے دل میں پیدا ہوئی۔ جو دوستی اور محبت اُستاد اور شاگرد میں پہلے دن سے پیدا ہوئی، وہ آخرش شاگرد کو اُستاد کے پیچھے پیچھے انگلستان لے گئی اور وہاں یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا، جو کہ آج تک قائم ہے۔ آرنلڈ خوش ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور میرا شاگرد علمی دُنیا میں میرے لیے بھی باعثِ شہرت افزائی ہوا۔ اقبال معترف ہے کہ جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے ڈالی تھی، اُس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہوئے۔

ایک دن شیخ محمد اقبالؒ نے (قیامِ لندن کے دوران) مجھ سے کہا کہ اُن کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری ترک کر دیں اور قسم کھالیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے، اُسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں جسے ترک کرنا چاہیے بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے امراض کا کچھ علاج ہو سکے۔ اِس لیے ایسی خداداد طاقت کو بے کار کہنا درست نہ ہوگا۔

شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے، کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادۂ ترکِ شعر کو بدل دیں اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترکِ شعر اختیار کیا جائے۔ فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اِس شغل کی نذر کرتے ہیں، وہ اُن کے لیے اور اُن کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے۔ ایک تغیر جو ہمارے شاعر کی طبیعت میں آیا تھا، اُس کا یوں خاتمہ ہوا۔

(شیخ عبدالقادر)

## تمھیں یوں قرآن مجید پڑھنا چاہیے

والد کے عقیدت مندوں میں ایک حجازی عرب بھی تھے جو کبھی کبھار آتے اور انہیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا کرتے۔ میں نے بھی ان سے کچھ عرصے کے لیے قرآن مجید پڑھا۔ وہ بڑے خوش الحان تھے۔ والد صاحب بھی قرآن مجید سنتے، مجھے بلوا بھیجتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار اُنہوں نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے ''تمھیں یوں قرآن پڑھنا چاہیے۔'' اِسی طرح مجھے ایک بار مسدسِ حالی پڑھنے کو کہا اور خاص طور پر وہ بند جب قریب بیٹھے ہوئے میاں محمد شفیع نے دہرایا ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' تو آپ سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔

میں نے اُنہیں والدہ کی موت پر آنسو بہاتے نہ دیکھا مگر قرآن مجید سنتے وقت یا اپنا کوئی شعر پڑھتے یا رسول اللہ کا اسم مبارک کسی کی نوک زبان پر آتے ہی اُن کی آنکھیں بھر آیا کرتی۔ اپنی زندگی میں صرف دو بار اُنہوں نے مجھے سینما دیکھنے کی اجازت دی۔ دونوں بار فلمیں انگریزی تھیں۔ ایک تو فرانسیسی ادیب ایمائیل زولا کی حیات سے متعلق تھی اور دوسری فلم نپولین کے حالاتِ زندگی پر مبنی۔ والد دُنیا بھر کے جری سپہ سالاروں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ہر صاحبِ عمل کو صاحبِ فکر پر فوقیت حاصل ہے۔ مجھے اکثر خالد بن ولیدؓ اور حضرت فاروقِ اعظمؓ کی باتیں سنایا کرتے۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ نپولین کے اجداد عرب سے آئے تھے اور واسکوڈی گاما کو عرب

جہاز رانوں ہی نے ہندوستان کا رستہ دکھایا۔ میں دونوں فلمیں میاں محمد شفیع، آنٹی ڈورس اور منیرہ کے ساتھ دیکھنے گیا تھا۔

مجھے اُردو ادب سے متعلق کتب اور افسانے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ باغ و بہار (قصہ چہار درویش) حاتم طائی، طلسم ہوشربا اور عبدالحلیم شرر کے سب ناول پڑھ ڈالے۔ ساتویں جماعت کے امتحان کے قریب میرے ہاتھ الف لیلیٰ لگ گئی۔ اِس کتاب سے میں اِس قدر محظور ہوا کہ رات گئے تک اسے پڑھتا رہا۔ امتحان سر پر آ گئے لیکن میں نے الف لیلیٰ کو نہ چھوڑا بلکہ رات کو امتحان کی تیاری کے بجائے الف لیلیٰ پڑھتا رہتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ساتویں جماعت کے امتحان میں فیل ہو گیا۔ جب والد کو علم ہوا کہ میں الف لیلیٰ میں منہمک ہونے کی وجہ سے امتحان میں فیل ہوا ہوں تو برہم نہ ہوئے بلکہ فرمایا ''اگر تم امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد الف لیلیٰ پڑھتے تو تمہیں اور بھی لطف آتا۔''



اُن کی وفات سے کوئی دو ایک ماہ پیشتر ایک شام پنڈت جواہر لعل نہرو کو اُن سے ملنے آنا تھا۔ میں نے والد سے پوچھا ''پنڈت نہرو کون ہیں؟'' آپ نے فرمایا ''جس طرح محمد علی جناح مسلمانوں کے لیڈر ہیں، اُسی طرح پنڈت نہرو ہندوؤں کے سربراہ ہیں۔'' جب وہ تشریف لائے تو میں نے ڈیوڑھی میں بڑھ کر اُنہیں ''السلام علیکم'' کہا۔ اُنہوں نے ہاتھ جوڑ کر میرے سلام کا جواب دیا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

(جاوید اقبال)

## علامہ اقبالؒ کی درویشانہ زندگی کے ایک گواہ، خادمِ خاص علی بخش کی یادیں

**س:** اقبال صبح عموماً کب بیدار ہوتے تھے؟

**ج:** بہت سویرے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ بہت کم سوتے تھے۔ نمازِ فجر کی بہت پابندی کرتے اور نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔

**س:** وہ قرآن کس انداز میں پڑھتے؟

**ج:** جب تک اُن کی آواز بیماری سے متاثر نہیں ہوئی تھی، وہ قرآن پاک کی تلاوت بلند آہنگ میں خوش الحانی سے کرتے تھے۔ آواز بیٹھ گئی تو بھی قرآن پڑھتے ضرور مگر بلند آواز سے نہیں۔

**س:** نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر کیا کرتے تھے؟

**ج:** آرام کرسی پر دراز ہو جاتے۔ میں حقہ تیار کر کے لے آتا۔ حقے سے شغل کرتے ہوئے اُس روز کے عدالتی کیسوں کے خلاصوں پر بھی نظر ڈالتے رہتے۔ اِس دوران گاہ گاہ شعر کی آمد بھی ہونے لگتی۔

**س:** آپ کیسے پہچانتے تھے کہ علامہ پر شعر گوئی کی کیفیت طاری ہو رہی ہے؟

**ج:** وہ مجھے پکارتے یا تالی بجاتے اور کہتے ''میری بیاض اور قلمدان لاؤ۔'' میں یہ چیزیں لاتا تو وہ اشعار لکھ لیتے، اگر اطمینان نہ ہوتا تو بہت بے چین ہو جاتے۔ شعر گوئی کے دوران اکثر قرآن مجید لانے کو کہتے۔ شعر گوئی کے علاوہ بھی دن میں ایک بار مجھے بلا کر قرآن مجید لانے کی ہدایت کرتے۔

**س:** وکالت کا کیا عالم تھا، بہت کام کرتے یا تھوڑا؟

**ج** وکالت میں اپنے آپ کو زیادہ مصروف نہ ہونے دیتے۔ عام طور پر یوں تھا کہ ۵۰۰ روپے فیس کے کیس آ جاتے تو مزید کیس نہیں لیتے تھے۔ دیگر سائلین کو اگلے ماہ آنے کا کہہ دیتے۔ اگر مہینے کے پہلے تین چار دِنوں میں چار پانچ سو روپے کا کام مل جاتا تو باقی مہینا مزید کوئی کیس نہ لیتے۔

**س:** یہ پانچ سو روپے کی حد کیوں لگائی گئی؟

**ج** اُن کا تخمینہ تھا کہ اُنہیں ماہانہ اخراجات کے لیے اس سے زیادہ پیسوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اِس رقم میں گھر کا کرایہ، نوکروں کی تنخواہیں، منشی کی تنخواہ اور گھر کے عمومی اخراجات شامل تھے۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب علامہ اقبالؒ انارکلی اور میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔

**س:** علامہؒ صاحب نے کتنے عرصے تک وکالت کی؟

**ج:** جب تک اُنہیں گلے کی بیماری لاحق نہیں ہوئی تھی،



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وکالت کرتے رہے۔ یہ انداز اً ۳۳-۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا۔

**س:** کھانے میں کیا پسند تھا؟

**ج:** پلاؤ، ماش کی دال، قیمہ بھرے کریلے اور خشکہ۔

**س:** کھانا کس وقت کھاتے تھے؟

**ج:** بارہ ایک بجے کے درمیان ایک ہی مرتبہ کھانا کھاتے۔ رات کے کھانے کا معمول نہ تھا۔

(علی بخش سے انٹرویو۔ گفتگو ممتاز حسن)

## خوش قسمتی ہے کہ اقبال سے پڑھنے کا موقع ملا

حکیم الامت علامہ اقبالؒ کثیر الجہات شخصیت تھے۔ اُن کی معروف اور مقبول ترین حیثیت شاعر کی ہے مگر وہ روایتی شاعروں سے مختلف اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اگر اقبالؒ کی سب حیثیتوں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اقبالؒ نے ہمیں کسی نہ کسی شکل میں ایک نیا راستہ دِکھایا، کچھ نئے تصورات عطا کیے اور ایک نئے سرمدی نغمے کے ذریعے ہمارے سازِ دل کو چھیڑا..... غور فرمائیے تو اِن سب حیثیتوں میں ایک معلّم کی قدر مشترک نظر آتی ہے..... شاعری ہو یا ان کے فلسفیانہ خطبات، دینی فکر کی تجدید ہو یا سیاسی جدوجہد کا مرحلہ..... ہر قدم پر وہ ہمیں کچھ بتاتے، کچھ سکھاتے اور کسی نہ کسی نکتے کی تعلیم دیتے نظر آتے ہیں۔

یہ تو مختصر سا ذکر تھا ایک شاعر کی معلمانہ حیثیت کا..... مگر اہم بات یہ ہے کہ اِس شاعر نے اپنی زندگی کا ایک حصہ لفظی اور لغوی معنوں میں بھی ''معلّم'' کی حیثیت سے بسر کیا۔ علامہ کی معلمانہ زندگی کا آغاز یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ہوا۔ ایم اے کرنے کے بعد ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو وہ اورینٹل کالج سے رُخصت لے کر گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی درس دیتے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں تین سال کی رُخصت لے کر اعلیٰ تعلیم پانے انگلستان چلے گئے۔ انگلستان میں قیام کے زمانے ہی میں اُنہوں نے معلّمی کے بجائے وکالت کا پیشہ اپنانے کا فیصلہ کرلیا۔ انگلستان سے واپس آکر بھی اُنہیں کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج میں پڑھانا پڑا۔

میاں افضل حسین، اقبال کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ''میں اِس زمانے میں بی ایس سی کا طالب علم تھا۔ اِس طرح ڈاکٹر محمد اقبال کا شاگرد بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اُنہوں نے ہمیں یہ دو کتابیں پڑھائیں:

1. Longer English Poems by Hale
2. Human Intercours by P.G Hamerton

ڈاکٹر اقبال اُن کتابوں کو پڑھانے کی بہترین اہلیت رکھتے تھے کیونکہ آپ بیک وقت شاعر تھے اور فلسفی بھی اور اُس وقت نفسیات بھی فلسفہ کا ایک حصہ تھی۔ لہٰذا وہ تخلیقی فکر کے ساتھ انسانی رویے کی تشریح کرتے تھے اور ایک شاعر اگر شاعری کا مضمون پڑھائے تو ہمیں اور کیا چاہیے اور حقیقت میں یہ ہماری بڑی خوش قسمتی تھی۔

ڈاکٹر اقبالؒ ہیمرٹن کے مشاہدات کو ذاتی تجربات کی روشنی میں واضح کرتے۔ اِس کتاب سے اُنہوں نے متعدد ایسی مثالیں پیش کیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ انسان اپنی روایت اور طرزِ تعلیم و تربیت کی بنا پر ایک ہی معاملہ میں مختلف رویہ اختیار کرسکتے ہیں۔

ہیل کی کتاب ڈاکٹر اقبالؒ نہایت عمدگی سے پڑھاتے۔ اقبالؒ ایسے عظیم شاعر کی زبان سے کسی نظم کی دلکشی اور دلچسپی کی وضاحت اور شاعر کے حقیقی مدعا کی تشریح سننا انتہائی مسرت کا باعث تھا۔ یہ ہماری انتہائی خوش بختی تھی کہ ہمیں اقبال جیسا اُستاد نصیب ہوا۔

(میاں افضل حسین)

## اسلامی فقہ کی نئے سرے سے تیازی کا منصوبہ

**س:** علامہ اقبالؒ سے تعلقات کس طرح نشو و نما پائے؟

**ج:** ایک دن علامہ کا خط بکایک حیدر آباد میں موصول ہوا۔ اُس میں لکھا تھا کہ تم پنجاب منتقل ہو جاؤ، کیونکہ جنوبی ہند آنے والے حالات کے لحاظ سے ایک محفوظ علاقہ نہیں۔ جو کام تم کر رہے ہو، اُس کے لیے پنجاب میں میدان ہے۔

اِس خط کو پڑھ کر مجھے یہ انداز ہوا کہ علامہ اقبالؒ مجھے جانتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ جہاں مسجد شہید گنج کا ایجی ٹیشن چل رہا ہے، کچھ لوگ روپوش ہونے کی سوچ رہے ہیں، وہاں جا کر میرے جیسا آدمی کیا کر سکے گا، چنانچہ میں نے علامہ مرحوم کو لکھا کہ مجھے آپ کی اِس رائے سے اتفاق نہیں کہ جنوبی ہند کام کرنے کے لیے موزوں علاقہ نہیں ہے۔ پھر میں ۱۹۳۷ء ہی میں دہلی گیا اور اِس خیال میں تھا کہ سوچ سمجھ کر رائے قائم کروں کہ کس جگہ اپنا مستقر بنایا جائے۔

**س:** آپ کے جوابی خط کے بعد کوئی اور خط بھی ڈاکٹر صاحب نے لکھا؟

**ج:** جی ہاں، آنے سے قبل دو تین خط ملے اور بعد میں بھی۔ بدقسمتی سے پٹھان کوٹ سے جس عالم میں ہجرت کرنی پڑی، اُس کی وجہ سے کتابوں اور دوسرے کاغذات کے علاوہ میرے جمع شدہ خطوط کا قیمتی ذخیرہ بھی ضائع ہو گیا۔ متعدد شخصیتوں کے اہم خطوط میرے پاس تھے، ایک بھی نہیں بچا۔

**س:** آپ فرما رہے تھے کہ مستقر طے کرنے کا معاملہ آپ کے زیرِ غور تھا؟

**ج:** جی ہاں اِسی زمانے میں چودھری نیاز علی خاں، جو دہلی آئے تھے، وہ بھی مجھ سے ملے اور وہ میرے پنجاب منتقل ہونے کے لیے اصرار کرتے رہے۔ مرحوم کا تقاضا یہ تھا کہ چل کر اِس تیاری کو دیکھ تو لیجیے جو ہم کر رہے ہیں۔ اِس خیال سے کہ اِس جگہ کو بھی دیکھ لوں اور علامہ اقبالؒ سے بھی مل لوں، میں نے سفرِ پنجاب کا فیصلہ کرلیا۔ شرقی صاحب نے جالندھر میں ٹھہرنے کے لیے اصرار کیا۔ وہیں پہلی بار میری ملاقات علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم سے ہوئی۔ جالندھر سے لاہور آکر میں اقبالؒ سے ملا۔ کچھ دیر گفتگو رہی۔

بطورِ خلاصہ یہ بات مجھے یاد ہے کہ علامہ کا مجوزہ پروگرام یہ تھا کہ اسلامی فقہ کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر اِس کام کے لیے تم تیار ہو جاؤ تو میں ہر سال چھ ماہ وہاں آتا رہوں گا اور مل کر کام کریں گے۔ میں نے کہا، میری اِس سے زیادہ کیا خوش قسمتی ہوگی کہ آپ کے ساتھ کام کروں۔ یہ میرے لیے اِتنی بڑی کشش تھی کہ میں نے حیدر آباد سے پنجاب منتقل ہونے کی تیاری شروع کر دی۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں منتقل ہوا۔ ابھی سامان رکھوا ہی رہا تھا جس سے فارغ ہوتے ہی علامہ سے ملاقات کے لیے لاہور جانا تھا کہ اپریل ۱۹۳۸ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

(مولانا مودودیؒ کے ایک انٹرویو سے اقتباس)

## علامہ کے آنسو میرے دل میں محفوظ رہ گئے

اقبالؒ کی زندگی کا غالباً وہ آخری سال تھا جبکہ مجھے ان کی خدمت میں پہلی اور آخری حاضری دینے کی سعادت حاصل ہوئی۔

میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں خواندگی کے ابتدائی مرحلے ہی میں مجھے اقبالؒ کی نظمیں پڑھنے کو ملیں۔ اُنہیں خوب پڑھا، یاد کیا اور کچھ سمجھ کر اور کچھ بن سمجھے ان سے لطف لیا..... اور پھر تعلیم کے ساتھ ساتھ اقبالؒ سے ذہنی قرب بڑھتا چلا گیا۔

ایک صاحب جن کی آمد و رفت اقبالؒ کے ہاں تھی، میرے بھی کرم فرما تھے۔ میری درخواست پر ایک موقع پر اُنہوں نے مجھ سے یہ وعدہ کیا کہ وہ مجھے اقبال کی خدمت میں لے چلیں گے..... اور ایک دن وہ مجھے لے کر چل



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## لڑکی جس نے پورے جاپان کو حیران کر دیا

جاپان میں ۱۹ برسالہ لڑکی مایا ساتو نے آٹو ریس جیت کر ملک بھر کو حیران کر دیا ہے۔ آٹو ریس موٹر سائیکلوں کی ایک ایسی ریس ہے جس میں موٹر سائیکل سواروں نے اپنے جوتوں پر سٹیل کے خول چڑھائے ہوتے ہیں۔ وہ ریس کے لیے مخصوص ٹریک پر ۱۵۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے جوتے زمین پر رگڑتے ہیں تو سٹیل کے خول سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ دلچسپ اور خطرناک بات یہ ہے کہ ان موٹر سائیکلوں کی بریک نہیں ہوتی۔ مایا ساتو ۴۴ برس قدیم اس موٹر سائیکل ریس میں چیمپئن کا اعزاز حاصل کرنے والی پہلی لڑکی ہے جس نے زندگی میں پہلی بار چھ برس کی عمر میں موٹر سائیکل چلائی تھی۔ موٹر سائیکل ریسنگ اس کے خون میں شامل ہے۔ اس موٹر سائیکل ریس میں کامیابی حاصل کرنے والوں کو بھاری انعامات دیے جاتے ہیں جبکہ ریس پر شرطیں لگانے والے کروڑوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس کھیل میں شامل ہونے سے قبل خاص تربیت حاصل کرنی پڑتی ہے جو فوجی ٹریننگ جیسی ہوتی ہے۔ سواروں کو تربیت دینے والے اداروں کے قوانین اس قدر سخت ہیں کہ پچاس میں سے بمشکل ایک درخواست گزار داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

(ابن بشارت، لاہور)

کھڑے ہوئے۔

میں جذبۂ احترام کے ساتھ جھجکتے جھجکتے جاوید منزل میں داخل ہوا اور اسی جذبے کے ساتھ اقبالؒ تک پہنچا۔ ادب سے ہاتھ ملایا اور خاموش بیٹھ گیا۔

علامہ اقبال کوٹھی کی اصل عمارت سے دُور ایک چھوٹے سے برآمدے میں تشریف فرما تھے۔ کھلا سر، اُدھ کھلی آنکھیں، سادہ سی قمیص اور دھوتی پر مشتمل لباس۔ بان کی چارپائی بغیر دری یا گدے کے، دیوار کی جانب حقہ رکھا ہوا، جس کے کش علامہ وقفے وقفے بعد لیتے۔ غرض ٹھیک وہی منظر جو چشم تصور میں تھا۔

زمانہ شہید گنج کے تنازع کا تھا۔ اسی سلسلے میں کوئی لیڈر (غالباً نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ تھے) اقبال سے بات چیت کرتے بتا رہے تھے کہ یہ ہوا اور وہ نہیں ہو سکا۔ اقبال نے سلسلۂ گفتگو میں دھیمی آواز میں یہ الفاظ کہے "افسوس! کوئی مخلص مسلمان نہیں ملتا۔" اس پر اُن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور مجھے یاد ہے کہ اُنہوں نے دھوتی کے پلو سے آنسو پونچھ ڈالے۔ میں بڑے عقیدت مندانہ انداز میں بغیر جنبش کے چپ چاپ یہ منظر دیکھتا رہا۔ یہ آنسو میرے دل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے بلکہ شاید وہ میرے بعض اچھے جذبات کے لیے بیج ثابت ہوئے۔

اس دوران میں نے نہ کوئی گفتگو کی اور نہ بات چیت کرنے کا کوئی ارادہ ہی دل میں پیدا ہوا۔ اس وقت خواہش صرف اتنی ہی تھی کہ میں دیکھوں اور سنوں۔ ساتھ یہ احساس بھی تھا کہ میرا مقام نہیں کہ اقبال کو مخاطب کروں۔ آنے والے لیڈر جب اُٹھ گئے تو میرے مہربان بزرگ نے اقبال سے یہ کہہ کر تعارف کرایا "یہ نوجوان آپ سے بہت متاثر ہے اور بڑی صلاحیت رکھتا ہے۔" اس پر فرمایا "ہاں قوم کو (یا اسلام کو) ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔"

یہ الفاظ سنتے ہی جب میں رُخصتی مصافحہ کر رہا تھا تو اپنے اندر ایک نئی کیفیتِ اعتماد محسوس ہوئی۔ اُس لمحے ذہن میں ایک خیال یہ تھا کہ میں عنقریب لاہور آ جاؤں گا اور پھر علامہ سے مسلسل ملاقاتیں رہا کریں گی، مگر میرے لاہور آنے سے پہلے ہی وہ اس سرائے فانی سے رُخصت ہو گئے۔ پھر بھی اقبال زندہ ہے، ہمارے دلوں کی دُنیا میں.....

(مولانا نعیم صدیقی)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُردو ڈائجسٹ

"لیڈر کی بات کریں تو سٹیو جابز سب سے بڑا نام ہے (بل گیٹس)"

ہمت، حوصلے اور ذہانت کی علامت

سٹیو جابز ۱۹۵۵ - ۲۰۱۱

آج کی دُنیا پہ اَنمٹ نقوش چھوڑنے والا نہ رہا

اس نے وہ بیج ''ایپل'' کو دُنیا کی سب سے بڑی ٹیکنالوجی کمپنی بنا ڈالا

## پرسنل کمپیوٹر کا موجد

# سٹیو جابز

دنیا کا کوئی شخص ٹیکنالوجی کی دُنیا پر اس سے زیادہ اثرات مرتب نہیں کر سکا

عاطف مرزا

آج کمپیوٹر ہماری زندگی کے ہر شعبے کا اہم حصہ بن چکا ہے اور چھوٹے بڑے سب اِسے آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں لیکن کمپیوٹر کی ایجاد کے ابتدائی دِنوں میں صورتِ حال ایسی نہ تھی۔ اُس وقت کمپیوٹر کا سائز ایک کمرے کے برابر تھا اور اِس کا استعمال چند مخصوص شعبوں تک محدود تھا۔ اِس بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ عام لوگوں کے استعمال کی چیز بن سکتا ہے۔

سٹیو جابز (Steve Jobs) وہ شخص ہے جس نے پرسنل کمپیوٹر کا تصور متعارف کروایا اور عام لوگوں کی کمپیوٹر تک رسائی ممکن بنادی۔

سٹیو جابز نے ۱۹۷۶ء میں ۲۱ رسال کی عمر میں اپنے دوست سٹیو وزنیک کے ساتھ مل کر کمپیوٹر بنانے والی کمپنی ایپل کا آغاز اپنے گھر کے گیراج سے کیا۔ اُس نے ایپل کو دُنیا کی سب سے بڑی ٹیکنالوجی کمپنی بنا دیا۔ آج اُس کی مارکیٹ ویلیو ۳۵۰ ربلین ڈالر ہے۔ ۲۰۱۱ء میں اِسے تیل کی بڑی کمپنی Exxon Mobil سے آگے نکل کر دُنیا کی سب سے زیادہ ویلیو ایبل کمپنی بننے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ایپل کمپنی پرسنل کمپیوٹر، کمپیوٹر سافٹ ویئر اور کنزیومر الیکٹرونکس بنانے اور مارکیٹ کرنے والی کمپنی ہے۔ اِس کی مقبول پراڈکٹس میں میکن ٹاش کمپیوٹرز، آئی پوڈ، آئی فون اور آئی پیڈ شامل ہیں۔

ایپل کا اعزاز دراصل سٹیو جابز کی کامیابوں کی داستان ہے۔ جابز مارکیٹ کے رجحانات کے دیکھنے اور سمجھنے کی بے مثال صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ ایسی پراڈکٹس سامنے لے کر آیا جو ڈیزائن اور جدت میں دوسروں سے بازی لے کر بے پناہ مقبولیت کی منزل تک پہنچیں۔ جابز ایسا مہم جو تھا جس نے میوزک، موویز، موبائل فونز اور کمپیوٹنگ کی عالمی مارکیٹ کو بدل کر رکھ دیا۔ اس نے اپنی ہر پراڈکٹ کے ساتھ ڈیجیٹل عہد کے طرزِ زندگی کو نئی سمت دی۔ اس نے پھلوں کے باغات کے علاقے سیلکان ویلی کو ٹیکنالوجی انڈسٹری میں جدت کا مرکز بنا دیا۔ اسے اس عہد کا ایڈیسن اور ہنری فورڈ بھی قرار دیا گیا۔ مائیکروسافٹ Microsoft کے بل گیٹس نے اس کی قائدانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور کہا کہ لیڈر کی بات کریں تو سٹیو جابز سب سے بڑا نام ہے۔

جابز کی زندگی کی داستان دراصل ہمت اور حوصلے کی داستان ہے۔ اس نے غربت اور مشکل حالات میں اپنا سفر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk



### ایک دن مجھے اس دُنیا سے چلے جانا ہے

''جب میری عمر ۱۷ رسال تھی تو میری نظر سے ایک موقع گزرا کہ اگر آپ ہر دن ایسے گزار دیں کہ جیسے یہ آپ کا آخری دن ہو تو ایک دن آپ یقیناً اس معاملے میں سچے ثابت ہو جائیں گے۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ اُس دن سے آج تک ۳۳ رسال کے عرصے میں میری یہ عادت رہی ہے کہ میں روزانہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اگر آج میری زندگی کا آخری دن ہو تو کیا میں وہ کام کرنا چاہوں گا جو مجھے آج کرنے ہیں۔ جب بھی کئی دن اس سوال کا جواب مسلسل نفی میں آتا ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ اب کچھ بدلنے کی ضرورت ہے۔

میرے نزدیک زندگی کے متعلق بڑے فیصلے کرنے میں مدد دینے والی سب سے اہم چیز یہ یاددہانی ہے کہ ہمیں جلد اس دُنیا سے چلے جانا ہے کیونکہ موت کے سامنے دوسروں کی توقعات، فخر اور اعزاز کی باتیں، شرمندگی یا ناکامی کا خوف جیسی چیزیں بے معنی اور حقیر ہو جاتی ہیں۔ صرف وہی چیزیں باقی رہتی ہیں جو حقیقتاً اہم ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ڈر سے کہ میں کہیں فلاں فلاں چیز سے محروم نہ ہو جاؤں، نکلنے کا سب سے اہم طریقہ یہ یاد رکھنا ہے کہ ایک دن مجھے اسی دُنیا سے چلے جانا ہے۔ آپ کے ہاتھ پہلے ہی خالی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ اپنے دل کی بات نہ مانی جائے۔''

شروع کیا لیکن یہ اپنے راستے خود بناتا گیا۔ جابز کامیابیوں کے اس سفر میں آخری سات سال کینسر سے بھی لڑتا رہا لیکن اس عرصہ میں بھی وہ اپنی کمپنی کی پہچان بنارہا اور نئی پراڈکٹس متعارف کرواتا رہا۔ ۲۰۱۱ء میں وہ کینسر کے مرض سے دنیا سے چل بسا۔

## زندگی کے ابتدائی سال

جابز ۱۹۵۵ء میں سان فرانسسکو میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن امریکہ کی الیکٹرونکس انڈسٹری کے مرکز سیلکان ویلی میں گزرا۔ جابز کو شروع ہی سے الیکٹرونکس میں دل چسپی تھی۔ اس کے ہمسائے میں ایک شخص کو الیکٹرونکس کے چھوٹے منصوبوں پہ کام کرنے کا شوق تھا۔ اس شخص کے کام کو دیکھ کر جابز کا رجحان الیکٹرونکس میں بڑھتا گیا۔ جابز چھوٹی عمر میں ہی بہت پُر اعتماد تھا۔ جب وہ آٹھویں جماعت میں تھا تو ایک دفعہ وہ فریکوئنسی کاؤنٹر پہ کام کر رہا تھا۔ اسے ایک پرزے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے معروف آئی ٹی کمپنی HP کے شریک بانی ولیم ہیولٹ سے فون پہ رابطہ کیا۔ ہیولٹ نے ۲۰ منٹ تک اس بچے کی بات سنی اور اسے مطلوبہ پرزہ مہیا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جابز کو اپنی کمپنی میں کام کرنے کی بھی دعوت دے دی۔

اپنے دوست وزنیک سے جابز کی ملاقات ہائی اسکول میں تعلیم کے دوران ہوئی۔ دونوں نے ابتدائی الیکٹرونکس کا مضمون اکٹھے پڑھا۔ دونوں مل کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ انہی دِنوں ان کی ملاقات کیپٹن کرنچ سے ہوئی جو فضائیہ کا سابق ٹیکنیشن تھا اور اس نے ایک ایسا آلہ بنایا تھا جس کی مدد سے غیر قانونی طور پر مفت کال کی جاسکتی تھی۔ یہ آلہ درحقیقت ایک سیٹی تھی اور اس کی فریکوئنسی ایسی تھی کہ جب اسے فون ہیڈسیٹ کے قریب بجایا جاتا تو فری کال کرنا ممکن ہو جاتا تھا۔ جابز اور وزنیک نے اس ٹیکنیشن سے اس آلے کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں اور اپنے طور پہ اسے بنانا اور فروخت کرنا شروع کر دیا۔ اپنے اس منصوبے سے وہ ۶ ہزار ڈالر کمانے میں کامیاب ہوئے۔

جابز نے ریڈ کالج سے ایک سمسٹر مکمل کرنے کے بعد اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ تعلیم مہنگی ہے اور غریب والدین پہ اخراجات کا بوجھ ڈالنا اسے بہت گراں گزرتا تھا۔ اگرچہ وہ کالج سے فارغ ہو چکا تھا لیکن اس نے

اپنی دل چسپی کی وجہ سے خطاطی کی کلاسیں لینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جابز کے لیے وقت بہت مشکل تھا۔ اس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ دوستوں کے کمروں میں فرش پہ سوتا رہا۔ وہ کوک کی خالی بوتلیں اکٹھی کرتا اور انھیں واپس جمع کروا کر کھانے کی لیے رقم اکٹھی کرتا۔ ہر اتوار کی رات وہ سات میل پیدل سفر کر کے ایک مقامی ٹیمپل جاتا جہاں اُسے ہفتے میں ایک دن اچھا کھانا نامل جاتا تھا۔

اس کے بعد جابز نے وڈیو گیمز بنانے والی کمپنی اٹاری میں ٹیکنیشن کا کام شروع کر دیا۔ زندگی کے اس دور میں وہ اپنے اندر ایک خلا محسوس کر رہا تھا اور روحانی تسکین کا متلاشی تھا۔ یہی تلاش اسے انڈیا بھی لے گئی۔ اپنی زندگی کے باقی حصے میں وہ بدھ مت سے متاثر رہا۔

## پہلا کمپیوٹر

۱۹۷۵ء میں جابز اور اس کا دوست مقامی کمپیوٹر کلب سے منسلک ہو گئے۔ جابز کلب کے اجلاسوں میں دلچسپی لیتا رہا۔ کلب کے ایک رکن نے بعد میں جابز کے بارے میں بتایا کہ جابز ہر جگہ موجود ہوتا اور ہر بات کو سننے کی کوشش کرتا تھا۔ یہاں وزنیک نے کلب کے دوستوں کے لیے کمپیوٹر بنایا۔ جابز نے وزنیک کے ساتھ مل کر اسے مارکیٹ میں لانے کا پروگرام بنایا۔ اس طرح دونوں نے ۱۹۷۶ء میں ۱۳۰۰ ڈالر سے ایپل کمپنی کا آغاز کیا۔ کمپنی کا نام جابز نے اپنے پسندیدہ پھل کے نام پہ رکھا۔ ایپل کمپنی کا نام غیر روایتی تھا کیونکہ انجینئر اس وقت اپنی مشینوں کا تعارف ماڈل نمبرز کے حوالے سے کرواتے تھے۔ جابز نے مارکیٹنگ کی طرف توجہ دی تو مقامی سٹور سے ۵۰ کمپیوٹروں کا آرڈر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ پہلے کمپیوٹر کو ایپل ون کا نام دیا گیا۔

جابز نے ایپل ون سے حاصل ہونے والے سرمایے کو کمپیوٹر کا بہتر ورژن بنانے کے لیے استعمال کیا۔ نئے کمپیوٹر کو ایپل ٹو کا نام ملا۔ اسے ۱۹۷۷ء میں کیلی فورنیا کے کمپیوٹر میلے میں پیش کیا گیا۔ یہ پلاسٹک کیس میں پہلا کمپیوٹر تھا جسے خریدار ڈبے سے نکال کر استعمال کر سکتا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے خریدار کو کمپیوٹر کے مختلف حصے خود جوڑنا پڑتے تھے۔ ایپل ٹو کے آنے سے پرسنل کمپیوٹر کے رجحان میں اضافہ ہونے لگا۔ ۱۹۷۷ء میں اس کی فروخت ۲ ملین ڈالر تھی جو ۱۹۸۱ء میں ۶۰۰ ملین ڈالر تک پہنچ گئی۔ ۱۹۸۳ء میں ایپل فارچون ۵۰۰ کی فہرست میں شامل ہو گئی۔ ایپل وہ پہلی کمپنی تھی جو اتنے کم عرصے میں اس فہرست میں شامل ہوئی۔

## پیش بینی

۱۹۷۹ء میں جابز Xerox ریسرچ سینٹر گیا جہاں اس نے تجرباتی پرسنل کمپیوٹر دیکھا۔ اسے ماؤس کی مدد سے چلایا جا سکتا تھا اور استعمال کرنے والا اپنی ڈاکومنٹس اور پروگراموں کو آئی کون جیسی شکل میں دیکھ سکتا تھا۔

جابز نے ۱۹۹۵ء میں اپنے اس مشاہدے کے بارے میں کہا: ''مجھے دس منٹوں کے اندر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والے وقت میں کمپیوٹر اسی صورت میں سامنے آئیں گے۔''

۱۹۸۴ء میں ایپل نے میکن ٹاش کمپیوٹر متعارف کروایا۔ ونڈوز، مینیو زاور ماؤس جیسی خصوصیات کی وجہ سے اسے استعمال کرنا بہت آسان تھا۔ جابز نے کہا کہ اس کمپیوٹر کے خوبصورت فانٹ کبھی سامنے نہ آتے اگر اس نے نوجوانی میں ریڈ کالج میں کیلی گرافی کی کلاسیں نہ لی ہوتیں۔ میکن ٹاش کمپیوٹر کے سامنے آنے سے ایک سال پہلے وہ سکولے (Sculley) کو پیپسی کولا کمپنی سے لے کر آیا اور اسے ایپل کا چیف ایگزیکٹو بنایا۔ اُس نے سکولے کو ایپل میں آنے پہ آمادہ کرنے کے لیے بڑی خوبصورت تجویز دی: ''کیا تم اپنی باقی عمر میٹھا پانی بیچنے میں ہی صرف کرنا چاہتے ہو یا دنیا کو تبدیل کرنے کے لیے قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہو۔''

سکولے کا ایپل میں آنا جابز کے لیے مفید ثابت ہوا۔ اس نے کمپیوٹر کے نئے ماڈلز سامنے لانے میں جابز کی مدد کی۔

## ایپل سے جبری فراغت

ابتدا میں میکن ٹاش کی فروخت مایوس کن رہی۔ اسی عرصے میں کمپنی معاشی مسائل کا شکار ہو گئی۔ چیف ایگزیکٹو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکولے اور جابز کے تعلقات میں بھی تناؤ آتا گیا۔ یہ اعتراضات بھی سامنے آنے لگے کہ جابز کی آمرانہ سوچ اور فیصلوں میں من مانی کا رویہ کمپنی کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ CEO کے ساتھ تنازع زیادہ بڑھا تو بورڈ آف ڈائریکٹر نے جابز کو کمپنی سے فارغ کر دیا۔

## نئی کمپیوٹر کمپنی کا آغاز

جابز کے لیے یہ وقت بڑا تکلیف دہ تھا جب اسے اپنی ہی بنائی ہوئی کمپنی سے نکلنا پڑا۔ جابز اس وقت ایک امیر آدمی تھا۔ وہ باقی زندگی آرام سے گزار سکتا تھا لیکن اس نے اسی میدان میں ایک نئی مہم پہ نکلنے کا فیصلہ کیا جو اسے پسند تھا۔ مایوس ہونے کے بجائے اس کی نظر نئے امکانات پہ تھی۔ اس نے نیکسٹ (Next) کے نام سے ایک نئی کمپیوٹر کمپنی کا آغاز کر دیا۔ یہ کمپنی کمپیوٹر انڈسٹری میں کوئی بڑا نام تو پیدا نہ کر سکی مگر آنے والے وقت پہ اس کے اثرات بہت گہرے ثابت ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں ایک پروگرامر نے ایک سوئس تحقیقی مرکز میں نیکسٹ مشین پہ کام کرتے ہوئے ورلڈ وائیڈ ویب (WWW) کا پہلا ورژن تیار کیا۔

## اینی میشن، فلموں کا نیا میدان

ایک سال بعد جابز نے سٹار وار کے ڈائریکٹر سے گرافکس گروپ خرید لیا۔ جابز نے اسے پکسار (Pixar) کا نیا نام دیا۔ جابز کی توجہ کا نیا میدان کمپیوٹر اینی میشن (Annimation) کے ذریعے بننے والی فیچر فلمیں تھیں۔ سٹوڈیو پکسار کا کام کمپیوٹر اینی میشن ہارڈ ویئر تیار کرنا تھا۔ اس سٹوڈیو کو امریکہ میں انٹرٹینمنٹ کے بڑے نام ڈزنی اور کئی دوسرے فلم میکرز نے استعمال کیا۔ جابز کی راہنمائی میں اس سٹوڈیو کو ۱۹۹۵ء میں فلم ٹوائے سٹوری (Toy Story) سے نمایاں کامیابی ملی۔ یہ فلم باکس آفس پہ ۳۶۲ ملین ڈالر سمیٹنے میں کامیاب ہوئی۔ اس فلم کو بننے میں چار سال لگے لیکن جابز نے اپنے ساتھیوں کی ہمت کو پست نہ ہونے دیا۔

> وہ ایسا مہم جو تھا جس نے اپنی جدت پسند اور جرأت مندانہ سوچ سے موویز، موبائل فون اور کمپیوٹنگ کی عالمی مارکیٹ کا نقشہ بدل دیا

اس سٹوڈیو سے جابز ارب پتی بن گیا۔ اس سٹوڈیو نے ۲۶ اکیڈمی ایوارڈ (Oscar) حاصل کیے۔ سٹوڈیو نے کمپیوٹر اینی میشن فلم کو رواج دیا جسے دنیا بھر کے بچے اور بڑے پسند کرنے لگے۔

جابز کو ایک نمایاں کامیابی اس وقت ملی جب امریکہ کے انٹرٹینمنٹ کے بڑے ادارے ڈزنی نے ۷ بلین ڈالر میں جابز سے اس سٹوڈیو کو خرید لیا۔ اس کے نتیجے میں وہ والٹ ڈزنی کا سب سے بڑا شیئر ہولڈر بن گیا۔

## جابز کی واپسی

جابز کے جانے کے بعد ایپل کمپنی زوال کی طرف جانے لگی۔ بل گیٹس کی ابھرتی ہوئی کمپنی مائیکروسافٹ کے مقابلے میں یہ اپنی ساکھ کھوتی جا رہی تھی۔ ایپل نے اپنی ترقی کے لیے نئی حکمتِ عملی ترتیب دینا شروع کی تو اس کی نظر نیکسٹ کمپنی پر پڑی۔ ایپل نے جابز کی کمپنی کو ۴۰۰ ملین ڈالر میں خرید لیا۔ اس طرح جابز اس کمپنی میں واپس آ گیا جس کی بنیاد اس نے خود رکھی تھی۔ ایپل واپس آنے کے بعد جابز نے جس چیز کو ہاتھ لگایا اس کو سونا بنا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ دیوانوں نے پاگل خانے پہ دوبارہ قبضہ کر لیا ہے اب وہ جو دل چاہے کر سکتے ہیں۔

اپیل واپس آنے کے بعد اس نے بہتر ڈیزائن کی پراڈکٹس سامنے لانے کی اپنی روش کے ساتھ ساتھ کم قیمت مینو فیکچرنگ، موثر سپلائی چینز جیسے دوسرے بزنس Processes پہ بھی توجہ دی۔ یہ سبق اس نے نیکسٹ کی ناکامیوں سے سیکھا تھا۔ جابز نے اپیل کا رُخ کنزیومر الیکٹرونکس کی طرف موڑ دیا۔ اس میدان میں نئی کامیابیاں اس کی منتظر تھیں۔ جابز نے کبھی پرانی کامیابیوں پہ قناعت نہ کی تھی اور اپنے لوگوں سے بھی یہی توقع رکھتا تھا۔ اپیل کے ایک سابق ملازم نے بتایا کہ جب جابز اپیل میں واپس آیا تو کمپنی کے کیفے ٹیریا میں ڈسپلے کے

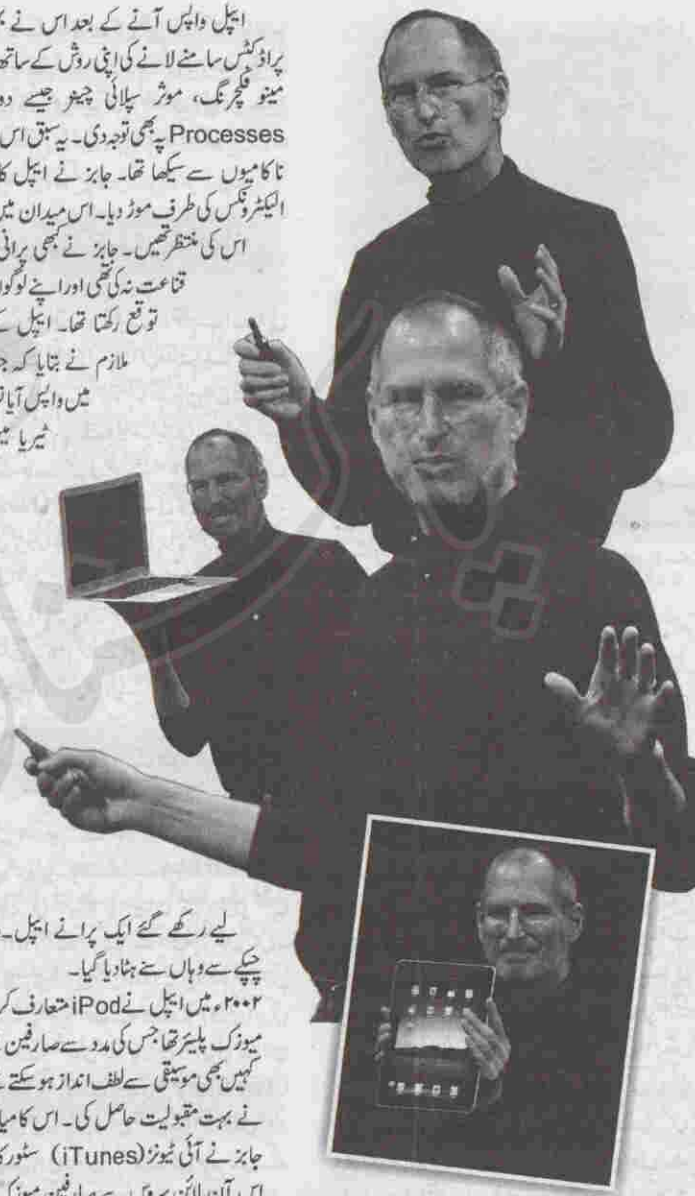

لیے رکھے گئے ایک پرانے اپیل۔ون کمپیوٹر کو چپکے سے وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

۲۰۰۲ء میں اپیل نے iPod متعارف کروایا۔ یہ ایسا میوزک پلیئر تھا جس کی مدد سے صارفین چلتے پھرتے کہیں بھی موسیقی سے لطف انداز ہو سکتے تھے۔ آئی پوڈ نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ اس کامیابی کے بعد جابز نے آئی ٹیونز (iTunes) سٹور کا آغاز کیا۔ اس آن لائن سروس سے صارفین میوزک ڈاؤن لوڈ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر سکتے تھے۔ آئی پوڈ اور آئی ٹیونز نے دنیا کی میوزک انڈسٹری کو بدل کر رکھ دیا۔

جب اپیل کی ڈیزائن ٹیم نے آئی پوڈ کا پہلا ورژن جابز کو دکھایا، تو جابز نے کہا یہ بہت بڑا ہے۔ انجینئر نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اس کا سائز ٹیکنالوجی کا معجزہ ہے اور اسے مزید چھوٹا کرنا ممکن نہیں۔ اس کے اندر ایک ہزار گانے سما سکتے ہیں۔ جابز نے یہ بات سنی تو اپنے دفتر میں موجود مچھلیوں کے ٹینک تک گیا اور اس ورژن کو اس میں پھینک دیا اور پانی کے بننے والے بلبلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی اس کا سائز بڑا ہے اور اسے مزید چھوٹا کیا جا سکتا ہے۔

۲۰۰۷ء میں اپیل نے آئی فون iPhone کے نام سے ایک سمارٹ فون متعارف کروایا۔ اس موبائل پر صارفین ملٹی میڈیا اور انٹرنیٹ استعمال کر سکتے تھے۔ جابز نے مستقبل میں جھانک لیا تھا کہ ایک وقت آنے والا ہے جب لاکھوں لوگ موبائل پہ انٹرنیٹ استعمال کر رہے ہوں گے۔ اگرچہ آئی فون کے آنے سے پہلے سمارٹ فونز خاصے مقبول تھے لیکن iPhone اپنی ٹچ سکرین جیسی جدت کے باعث موبائل کمپیوٹنگ کی مارکیٹ میں نیا معیار قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ جابز کا ہدف یہ تھا کہ یہ ۲۰۰۸ میں ۱۰ ملین کی تعداد میں فروخت ہو لیکن کمپنی ۱۱ء۶ ملین سیٹ فروخت کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ۲۰۱۰ء کے آخر تک اس کی فروخت ۹۰ ملین یونٹ تک پہنچ گئی۔ iPhone کی کامیابی کے سفر میں بھی جابز نے اپنے معیار پہ سمجھوتا نہ کیا۔ iPhone کو ۲۰۰۷ء میں منظوری دینے سے پہلے اس نے اس فون کے دو ورژن نامنظور کیے۔ موبائل فون کی دنیا میں آنے کے بعد اپیل محض کمپیوٹر کمپنی نہ رہی تھی۔ اس نے اپنے نام سے کمپیوٹر کا لفظ نکال دیا۔ اب یہ Apple Inc. بن گئی۔

## دُنیا انسانی ہتھیلی پر

۲۰۱۰ء میں اپیل آئی پیڈ (iPad) کے نام سے موبائل کمپیوٹر سامنے لے کر آئی تو پرسنل کمپیوٹر کا روایتی تصور

## سٹیو نے ڈیجیٹل عہد کے طرزِ زندگی کو نئی سمت دے ڈالی

ختم ہو گیا۔ اس موبائل کمپیوٹر سے صارفین کتابوں، رسائل، مووِیز، میوزک، گیمز اور انٹرنیٹ کی معلومات تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ iPad استعمال کرنے میں بھی آسان تھا اور اس کے ظاہری ڈیزائن کو بھی پسند کیا گیا۔ آئی پیڈ کے سامنے آنے سے پوری دنیا سمٹ کر ایک ہتھیلی پہ آنے کا انسانی خواب سچ ثابت ہو گیا۔

جابز ایک ایسا انجینئر تھا جو کمپیوٹر کو اندر سے جانتا تھا اور ایسا آرٹسٹ جو ایک باذوق صارف کی طرح کمپیوٹر کو باہر سے بھی خوبصورت دیکھنا چاہتا تھا۔ جابز نے iPad-2 متعارف کرواتے ہوئے کہا تھا کہ صرف ٹیکنالوجی سے کام نہیں چلتا جب تک ٹیکنالوجی کے ساتھ لبرل آرٹس جیسے شعبوں کو شامل نہ کیا جائے بہترین نتائج سامنے نہیں آتے۔ جابز کی جمالیاتی پہلوؤں میں دلچسپی بعض اوقات اپنی انتہا تک پہنچ جاتی۔ اپیل کے ایک پرانے انجینئر نے بتایا کہ ایک دفعہ جابز نے مطالبہ کیا کہ میکن ٹاش کی اندرونی وائرنگ کا رنگ اپیل کے ابتدائی قوس قزح والے لوگو جیسا ہونا چاہیے۔

اسی طرح جب اپیل گوگل (Google) کے ساتھ مل کر کسی منصوبے پہ کام کر رہی تھی جابز نے گوگل کے انجینئر کو فون کیا اور اعتراض کیا فون کی سکرین پہ گوگل کے لفظ کا ایک حرف رنگ کا صحیح شیڈ پیش نہیں کر رہا۔

جابز کی مارکیٹ کے رجحانات کو دیکھ لینے کی صلاحیت بھی بے مثال تھی۔ کسی پراڈکٹ کا پوٹینشل دیکھنے کے لیے وہ تحقیق کے روایتی طریقوں کے بجائے اپنے اندر کے

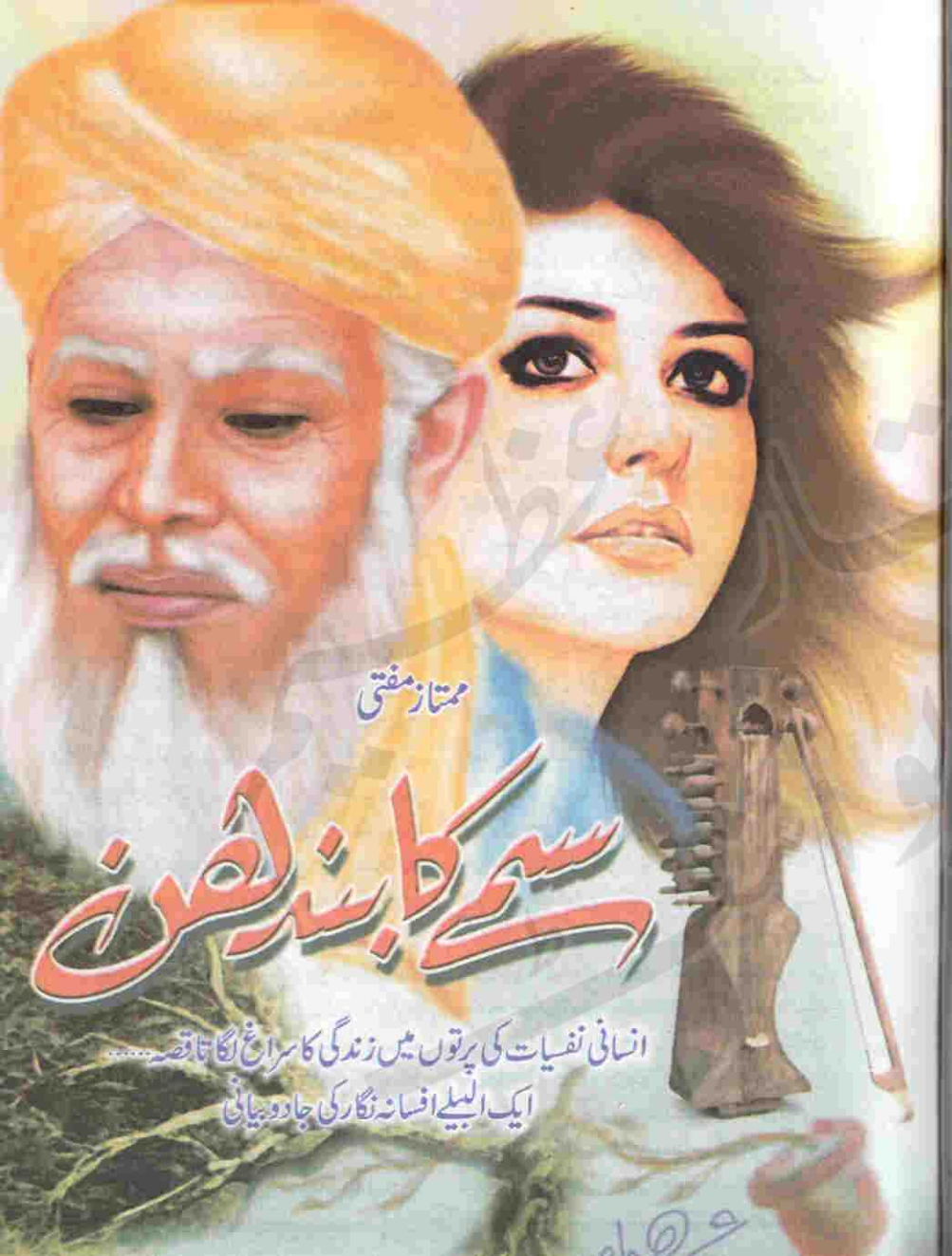


آرٹسٹ کی آواز پہ زیادہ بھروسا کرتا تھا۔ جب جابز نے iPad متعارف کروایا تو اس سے پراڈکٹ کے آغاز سے پہلے کی گئی مارکیٹ ریسرچ کے متعلق سوال پوچھا گیا تو اس کا کہنا تھا اکثر اوقات لوگوں کو خود پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور جب ان کے سامنے ایک اعلیٰ پراڈکٹ لائی جاتی ہے تو وہ سے پسند کرنے لگتے ہیں۔

جابز خود کو ہارڈ ویئر انجینئر سمجھتا تھا نہ سافٹ ویئر پروگرامر اور نہ ہی مینیجر، درحقیقت وہ ٹیکنالوجی لیڈر تھا جو بہترین لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرسکتا تھا اور ان کے سامنے ایک چیلنج رکھ سکتا تھا۔ اس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ اپنے مینجمنٹ سٹائل کے حوالے سے سخت گیر رہا۔ اگر اسے اپنے لوگوں کا کوئی آئیڈیا پسند نہ آتا تو وہ اسے بے دھڑک احمقانہ قرار دے دیتا تھا۔ ایک مکمل چیز کی تلاش میں وہ بے شمار آئیڈیاز کو نامنظور کردیتا تھا۔

یہ بھی کہا گیا کہ وہ پراڈکٹس اور حکمتِ عملی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اپنی رائے مسلط کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ کمپنی کے اشتہارات میں کانٹ چھانٹ اور پراڈکٹس کے رنگوں کے معاملے پر بھی اختلاف کرتا تھا۔

جابز کی سماجی فلاح و بہبود کے منصوبوں میں دلچسپی اپنے ہم عصر بل گیٹس کے مقابلے میں محدود تھی۔ ماحول کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی تنظیم گرین پیس نے بھی اسے تنقید کا نشانہ بنایا کہ وہ اپنی پراڈکٹس میں اس بات کا خیال نہیں رکھتا کہ وہ آسانی سے ری سائیکل ہوسکیں۔ لیکن ان باتوں کے باوجود جدید طرزِ زندگی پر اس کی سوچ کے اثرات بہت دُور تک دیکھے جاسکتے ہیں۔

## کینسر سے شکست

۲۰۰۳ء میں اسے کینسر ہوا۔ اس نے سرجری کی بجائے متبادل تھراپی کو ترجیح دی۔ ایک سال بعد اُسے سرجری کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑا۔ ۲۰۰۹ء میں اُس نے ایپل سے ۶ ماہ کی رُخصت لے لی۔ ۲۰۱۱ء میں بھی اسے کمپنی سے رُخصت لینا پڑی لیکن وہ کینسر کے مسائل سے نہ نکل سکا۔ اس بیماری کے باوجود وہ آخر تک کمپنی کے معاملات کو دیکھتا رہا۔ اگست ۲۰۱۱ء میں اُس نے ایپل کے CEO کی حیثیت سے استعفا دے دیا۔ اُس نے اپنے خط میں لکھا:

''میں نے ہمیشہ کہا کہ اگر ایسا وقت آیا جب میں ایپل کے چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں اور خود سے وابستہ توقعات پوری نہ کرسکا تو میں خود سب سے پہلے اس کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کردوں گا۔ آج وہ دن آگیا ہے۔'' اکتوبر میں وہ کینسر کے مرض سے شکست کھا کر اس دُنیا سے چل بسا۔

جابز کی موت سے یہ سوال سامنے آیا کہ ایپل جابز جیسے کرشماتی لیڈر سے محروم ہونے کے بعد کمپنی اپنی کامیابیوں کا سفر کیسے جاری رکھ پائے گی۔ والٹ ڈزنی، وال مارٹ سٹورز اور آئی۔ بی۔ ایم جیسی بڑی کمپنیاں اپنے بانی لیڈروں کے جانے کے بعد مسائل کا شکار ہوئیں۔ کیا ایپل میں ایسے لوگ موجود ہیں جو جابز کی جدت پسند اور جرأت مندانہ سوچ کو آگے لے کر جاسکیں۔

## جابز کی زندگی کے اہم اسباق

جابز نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ۲۳ سال کی عمر میں میرے پاس ایک ملین ڈالر تھے۔ ۲۴ سال کی عمر میں میرے پاس ۱۰ ملین ڈالر جمع ہو چکے تھے اور ۲۵ سال کی عمر میں ۱۰۰ ملین ڈالر حاصل کرچکا تھا لیکن یہ میرے لیے اہم نہیں تھا کیونکہ میں کبھی دولت کے پیچھے نہیں بھاگا۔

۲۰۰۵ء میں جابز نے Stanford یونیورسٹی کے طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں نصیحت کی کہ ہمیشہ بامعنی کام کریں۔ ایسا کام جسے وہ دل سے پسند کریں، اپنا رشتہ خود بنائیں۔ اس نے کہا کہ زندگی کے اہم فیصلے کرتے ہوئے یہ یاد رکھیں کہ ہمیں اس دُنیا میں صرف محدود وقت ملتا ہے۔

جابز نے نوجوانی میں کہا تھا کہ وہ ایسی زندگی گزارنا چاہتا ہے کہ اُس سے دُنیا میں بڑی تبدیلی آجائے اور اُس نے اپنی بات سچ کردی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# آپی

کہا کرتی تھی ''سنہرے، سمے سمے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سمے کا اپنا رنگ، اپنا اثر ہوتا ہے۔ اپنا سمے پہچان، سنہرے۔ اپنے سمے سے باہر نہ نکل۔ جو نکلی تو بھٹک جائے گی۔

اب سمجھ میں آئی آپی کی بات۔ جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکتی، آنلے سے نہ گرتی۔ سمجھ تو گئی۔ پر کتنی دیر پڑی سمجھن کی۔ آپی مجھے سنہرے کہہ کر بلایا کرتی تھیں۔ کہتی تھیں ''تیرے پنڈے کی جھال سنہری ہے۔ جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی، کٹھالی میں پڑے بنا۔ پھر یہ جھال کپڑوں سی نکل نکل کر جھانکے گی۔

پتا نہیں میرا نام کیا تھا۔ پتا نہیں میں کس کی تھی، کہاں سے آئی تھی۔ کوئی لایا تھا۔ بالپن ہی میں آپی کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ اِسی کی گود میں پلی، اِسی کی سرتال بھری بیٹھک کے جھولنے میں جھول جھول کر جوان ہوئی۔ پھر سنہرا اُمڈ اُمڈ آیا۔ چھپائے نہ چھپتا تھا۔ آپی بولی ''نہ دیسے، چھپانہ۔ جو چھپائے نہ چھپے اِسے کیا چھپانا۔''

کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپی ٹوکتی ''یہ کیا کر رہی ہے بیٹی؟ سیانے کہتے ہیں جس کا کام اُسی کو ساجھے۔ تیرا کام نہیں۔ دکھنا ہے تو نظر نہ بن، منظر بن۔ اور جو دیکھے بھی تو تو دکھنے کا گھونگھٹ نکال۔ اِس کی اوٹ سے دیکھ، پھر سے دیکھ سنہرے۔ ابھی تو شام ہے۔ یہ سمے تو اُداسی کا سمے ہے۔ دُکھ کا سمے ہے۔ شام بھئی گھن نہ آئے۔'' آپی گنگنانے لگی ''یاد ہے نا یہ بول؟ شام تو نہ آنے کا سمے ہے۔ تیرا آنے کا سمے ہے۔ پگلی ذرا رُک جا۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے۔ پھر تیرا ہی سمے ہوگا، پچھلے پہر تک.....''

ایک دن آپی کا جی اچھا نہ تھا۔ مجھے بلایا، گئی۔ لیٹی ہوئی تھی۔ سرہانے تپائی پر سوڈے کی بوتل دھری تھی۔ ساتھ نمک دانی تھی۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب سوڈے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولا پھنسا ہوتا تھا، ٹھاکر کے کھلتا تھا۔

بولی ''سنہرے، بوتل کھول گلاس میں ڈال۔ چٹکی بھر نمک گھول اور مجھے پلا دے۔ میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اُٹھا، بلبلے ہی بلبلے۔ آپی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی ''دیکھ لڑکی، یہ ہمارا سمے ہے۔ ہمارا سمے وہ ہے جب جھاگ اُٹھے۔ ہم میں نہیں، دوجے میں اُٹھے۔ دوجے میں جھاگ اُٹھانا یہی ہمارا کام ہے۔ خود شانت، دوجا بلبلے ہی بلبلے۔ جب تک جھاگ اُٹھتا رہے گا، ہمارے سمے۔ جب دوجا شانت ہو جائے، سمجھ لے ہمارے سمے بیت گیا اور جب سمے بیت جائے دھیرج پاؤں دھرنا۔ ٹھک نہ کرنا۔ ٹھک کا سمے گیا۔ چمک نہ مارنا، چمک کا سمے گیا۔ پائل نہ جھنکارنا، پائل کی جھنکار بیرن بھئی۔''

پھر وہ لیٹ گئی اور بولی ''سنہرے، میری باتیں پھینک نہ دینا، دل میں رکھنا۔ یہ بھیتر کی باتیں ہیں، اوپر کی نہیں، سُنی سنائی نہیں، پڑھی پڑھائی نہیں۔ وہ سب چھلکے ہوتی ہیں، بادام نہیں ہوتیں۔ جان لے بیٹی بات وہ جو بھیتر کی ہو۔ گری ہو، چھلکا نہ ہوا۔ جو بیتی ہو، جگ بیتی نہیں۔ آپ بیتی ہو، ہڈ بیتی۔ باقی سب جھوٹ، دِکھلاوا بہلاوا۔

آج مجھے باتیں یاد آ رہی ہیں۔ بیتی باتیں۔ بسری باتیں۔ سانپ گزر گئے، لکیریں رہ گئیں، لکیریں ہی لکیریں۔ سانپ تو صرف ڈراتے ہیں، پھنکارتے ہیں۔ لکیریں کاٹتی ہیں، ڈستی ہیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے۔ چلتی ہیں، چلے جاتی ہیں جیسے دھار چلتی ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے دوجی شروع ہو جاتی ہے۔

آپی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں۔ پیلی، روپا اور میں۔ پیلی بڑی، روپا منجھلی اور میں چھوٹی۔ پیلی میں بڑی آن تھی، پر مان نہ تھا۔ اس آن میں چھب تھی۔ سندرتا بھرا ٹھہراؤ تھا۔ یوں رُعب سے بھری رہتی جیسے مُنیار رس سے بھری رہتی ہے۔ گردن اُٹھتی رہتی، مورتی سمان۔

روپا سُر ہی سُر تھی۔ شدھ سر۔ تاروں سے بنی تھی۔ اُس کے بند بند میں تار لگے تھے۔ سرتیاں سمرتیاں اور وہ گونجتے مدھم میں گونجتے اور پھر سننے والوں کے دلوں کو جھلا دیتے تیجی میں تھی۔ آپی کہتی تھی ''سنہرے، تجھ میں دُکھ کی بھیگ ہے۔ تو بھگو دیتی ہے۔ خود بھی ڈوب جاتی ہے، دوجے کو بھی ڈبو دیتی ہے پگلی دوجے کو ڈبویا کر، خود نہ ڈوبا کر۔ مجھے تجھ سے ڈر آتا ہے سنہرے۔ کسی دن تو ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔''



آپی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا منہ اُٹھایا اور چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے۔ وہ تو چلے گا ہی ہر بیٹھک پر۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ تو دو لیتے آتے تھے پر ایسے بدمزہ ہو کر جاتے کہ پھر رُخ نہ کرتے۔ آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں۔ اُس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں پر اُچھالیں گے تو پڑے اُچھالیں۔ لڑکیو تم نہ اُچھلنا۔ جو نگاہوں پر اُچھل جاتی ہیں وہ منہ کے بل گرتی ہیں اور جو گر گئی وہ سمجھ لو، نظروں سے گر گئی۔ پھر نہ اپنے جوگی رہی نہ دوسروں جوگی۔

آپی کی بیٹھک میں نظریں نہیں چلتی تھیں۔ کان لگے رہتے تھے۔ دل دھڑکتے تھے۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا۔ برہا کا ہوتا۔ رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھیں، نہ وہاں تماشا ہوتا نہ تماش بین۔ مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب ہمارے ہاں ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تھی۔ دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔ ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دو جا نہیں آ سکتا تھا۔ صرف ٹھاکر کے سنگی ساتھی۔

ٹھاکر بھی تو عجب تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ریچھ۔ طاقت سے بھرا ہوا۔ اندر جھانکو تو بچہ۔ نرم نرم، گرم گرم، ویسے تھا آن بھرا مان بھرا۔ سنگیت کا رسیا۔ یوں لگتا جیسے بھیتر کوئی لگن لگی ہو۔ دھونی رمی ہو، آرتی بجی ہو۔

ٹھاکر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی۔ آپی عزت کرتی تھی، بھروسا کرتی تھی۔ ٹھاکر نے کبھی بھی نظر اُچھالی نہ تھی۔ جھکائے رکھتا۔ پیتا ضرور تھا، پر ایسی کہ جوں جوں پیتا جاتا اُلٹا مدھم پڑتا جاتا۔ آنکھ کی چمک گل ہو جاتی۔ آواز کی کڑک بھیگ جاتی۔ اس کا نشہ ہی انوکھا تھا۔ جیسے بوتل کا نہ ہو۔ بھیتر کا ہو۔ بوتل اِک بہانہ۔ بوتل چابی ہو بھیتر کے پٹ کھولنے کی۔

ڈرو سیکھو ڈرو بھیتر کے نشے سے ڈرو۔ بھیتر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ یوں ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے راجہ کے روبرو بنیج کھڑا ہو۔ بوتل کا تو خالی سر چکراتا ہے۔ بھیتر کا من کا جھولنا جھلا دیتا ہے۔ ڈرو سیکھو ڈرو، بھیتر کے نشے سے ڈرو، بوتل کا تو کام کاج جوگا نہیں چھوڑتا۔ بھیتر کا کسی جوگا نہیں چھوڑتا۔ خود جوگا بھی نہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ٹھاکر کے نشے کا ریلا مجھے بھی لے ڈوبے گا۔

ہاں تو اُس روز ٹھاکر کی بیٹھک ہو رہی تھی۔ بول تھے ''گاگھری میں کون جتن کر کھولوں۔ مورے پیا کے جیا میں پڑی رہی۔'' گیت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ ٹھاکر جھوم جھوم جا رہا تھا۔ پھر کہو، پھر بولو کا جاپ کیے جا رہا تھا۔ نہ جانے کس گرہ کو کھولن کی آرزو جاگی تھی۔ اپنے من یا محبوب کی من کی۔ سمے بیتا جا رہا تھا۔ سمے کی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ سمے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ اِس روز وہ سمے ایسا ہی سمے تھا۔

دفعتاً گھڑی نے تین بجائے۔ آپی ہاتھ جوڑے اُٹھ بیٹھی۔ بولی ''شما کرو ٹھاکر جی۔ معافی مانگتی ہوں۔ ہمارا سمے بیت گیا۔ اب بیٹھک ختم کرو۔''

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا ''نہ آپی، ابھی تو رات بھیگی ہے۔'' آپی بولی ''ٹھاکر ہم سوکھے پروں والے پنچھی ہیں۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سمے بیت جاتا ہے۔ جو ہمارے پر بھیگ گئے تو اُڈاری نہ رہے گی۔ فنکار میں اُڈاری نہ رہے تو باقی رہا کیا؟'' ٹھاکر نے بڑی منتیں کیں، آپی نہ مانی۔

محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپی کے گرد ہو گئیں۔ ''آپی یہ سمے کا گورکھ دھندا کیا ہے؟'' آپی بولی ''لڑکیو! سمے بڑی چیز ہے، ہر کام کا الگ سمے بنا ہے۔ رات کو گاؤ، بجاؤ، پیو پلاؤ، ملو ملاؤ، موج اُڑاؤ۔ بس تین بجے تک۔ پھر بھور سمے اُس کا سمے ہے۔ اُس کا نام جپو۔ اسے پکارو، فریاد کرو، دُعائیں مانگو، سجدے کرو۔ اِس سمے میں تم تیش نہیں کر سکتے، گناہ نہیں کر سکتے، قتل نہیں کر سکتے۔ یہ دھندا جو ہمارا ہے اِس کے سمے میں نہیں چل سکتا۔ اِس کے سمے میں پاؤں نہ دھرنا۔ اُس نے برا مانا تو ماری جاؤ گی۔ جو وہ راضی ہو گیا تو بھی ماری جاؤ گی اور دیکھو اُس کے سمے کے نیڑے نیڑے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اُسے پکارے۔ بھجن نہ چھیڑنا۔ ڈرو کہیں وہ تمہاری پکار سن کر ہنکارا نہ بھر دے۔

پھر وہ دن آ گیا جب میں نے اَنجانے میں سمے کا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بندھن توڑ دیا۔ اُس روز ٹھاکر آئے۔ آپی سے بولے ''بائی کل خواجہ کا دن ہے۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ آج رات خواجہ کی محفل ہوگی اُدھر حویلی میں۔ صرف اپنے ہوں گے، گھر کے لوگ۔ تجھے لینے آیا ہوں، چل میرے ساتھ میرے گاؤں۔''

آپی سوچ میں پڑ گئی اور بولی ''روپا ماندی ہے، وہ تو نہیں جا سکے گی، کسی اور دن رکھ لیتا نذر نیاز۔''

''خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں؟'' وہ بولا۔

''تو کسی اور منڈلی کو لے جا۔''

''اونہوں!'' ٹھاکر نے منہ بنا لیا۔ خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا ان کے نام لینے کے لائق مکھ تو ہو۔

''میں کس لائق ہوں جو اُن کا نام منہ پر لگاؤں۔''

''بس اک تیری ہی بیٹھک ہے بائی جہاں پوتر تا ہے۔ جہاں جسم کا نہیں من کا ٹھکانا ہے۔''

آپی مجبور ہوگئی۔ اُس نے روپا کا دھیان رکھنے کے لیے پیلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھاکر کے گاؤں چلی گئی۔

رات بھر وہاں حویلی میں خواجہ کی محفل لگی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھاکر کی بہنیں، بہوئیں، بیٹیاں، ٹھاکرانی سب بیٹھے تھے۔ وہ تو سمجھ لو بھجن منڈلی تھی اور خواجہ کے گیت ''خواجہ میں تو آن کھڑی تورے دوار'' سے شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے سمے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں، دِل ڈوبے۔ آپی کا من ڈوب ہی گیا۔ ٹھاکر اسے محفل سے اُٹھا کر اندر لے گیا۔ شربت شیرا پلانے کو۔ پھر وہیں لٹا دیا۔

''پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھی بھیگ گئی۔ آنکھیں بھر بھر آئیں۔ میں حیران، میں تو کچھ مانگ نہیں رہی۔ میں تو التجا نہیں کر رہی۔ میں تو اِک تاجر ہوں۔ پیسہ کمانے کے لیے آئی ہوں۔ میری آنکھیں کیوں بھر بھر آئیں خواہ مخواہ۔ سو میں بنا سوچے سمجھے گائے چلی گئی۔ آنکھیں بھر بھر آتی رہیں۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا، پر میں بھیگ بھیگ کر گاتی گئی۔ سمے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ میں ان کے سمے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔ آپی تھی نہیں جو مجھے ٹوکتی۔

اور مجھے کیا پتا تھا کہ خواجہ کون ہے۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا ہے۔ اُس کے گیت یاد کر رکھے تھے۔ میں صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے۔ میں تو غریب نہ تھی۔ مجھے کیا پتا کہ مجھے بھی نوازدے گا خواہ مخواہ زبردستی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اِس میں اتنی بھی سدھ بدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے، کون گا رہا ہے، کون منگتا ہے، کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے۔ کون جھولی سمیٹ رہا ہے۔ میں تو یہی سنتی آئی تھی کہ دُکھی لوگ پکار پکار کر ہار جاتے ہیں، پر کوئی سنتا نہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اتنا دیا لو ہے، اتنا نیڑے ہے، اتنے کان کھڑے رکھتا ہے۔

پھر ٹھاکر بولا ''سنہری بائی، بس اِک آخری فرمائش۔ خواجہ پیا موری رنگ دے چنریا۔ ایسی بھی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے۔ دھو یا دھوئے جائے ساری عمریا۔''

پھر مجھے سدھ بدھ نہ رہی۔ ایسی رنگ پچکاری چلی کہ میں بھیگ بھیگ گئی اور میں ہیں نہیں ساری محفل رنگ رنگ ہوگئی۔ انگ انگ بھیگا۔ خواجہ نے رنگ گھاٹ بنا دیا۔

گھر پہنچی تو گویا میں، میں نہ تھی۔ دِل رویا رویا، دھیان کھویا کھویا۔ کسی بات میں چت نہ لگتا۔ بیٹھک بیگانہ دِکھتی۔ ساز میں طرب نہ رہا۔ سارنگی روئے جاتی۔ اُستاد نکو خاں بجاتے پر وہ روئے جاتی۔ طبلہ سر پیٹتا، گھنگھرو کہتے پاؤں میں ڈال اور بن کو نکل جا۔ وہاں اِس کا جھومر ناچ جو پتے پتے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے۔

روز دن میں تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ بھیں بھیں کر روتی۔ پھر حال کھیلنے لگتی۔ پیلی حیران، روپا کا منہ کھلا، آپی چپ۔ یہ کیا ہو رہا ہے جب آٹھ دِن یہی حالت رہی بلکہ اور بگڑ گئی تو آپی بولی ''بس پتر، تیرا اِس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ دانا پانی ختم ہوگیا۔ تو نے اِس کے سمے میں پاؤں دھر دیا۔ اُس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اِس دھندے جوگی نہ رہی۔

''پر کہاں جاؤں آپی؟ اِس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرنے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لیے۔''

''جس نے بلایا ہے اِس کے دربار میں جا۔'' روپا بولی۔

''اِس بھیڑ میں جائے۔'' آپی بولی ''یہ لڑکی جائے جس



کا سنہری پنڈا کپڑوں سے باہر جھانکتا ہے۔ نہیں یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اِسی کوٹھڑی میں رہے گی، بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی۔''

''پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ رقت ختم ہوگئی۔ دل میں ایک جنون اُٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں، کسی ایک کی۔ تن من دھن سے اُسی کی ہو جاؤں۔ ہو رہوں۔ وہ آئے تو اُس کے جوتے اُتاروں، پنکھا کروں، پاؤں دابوں، سر میں تیل مالش کروں، اُس کے لیے پکاؤں، میز لگاؤں، برتن رکھوں، اُس کی بنیانیں دھوؤں، کپڑے اِستری کروں، آرسی کا کول بناؤں پھر سرہانے کھڑی رہوں کہ کب جاگے، کب پانی مانگے۔

''ایک دن آپی بولی ''اب کیا حال ہے دھیے؟'' میں نے رو رو کر ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا۔

''بولی وہ کون ہے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟''

''اونہوں کوئی نظر میں نہیں۔''

''ناک نقشہ دِکھتا ہے کبھی۔''

''نہیں آپی۔''

''کوئی بات نہیں'' وہ بولی ''جو کھونٹی پر لٹکانا مقصود ہے تو آپ کھونٹی بھیجے گا۔''

دس ایک دن بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ بجا۔ آپی داخل ہوئی۔ خواجہ نے کھونٹی بھیج دی۔ اب بول کیا کہتی ہے؟''

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی زمیندار ہے، اُدھیڑ عمر کا۔ کہتا ہے بس ایک بار بیٹھک میں آیا اور سنہری بائی کو سنا تھا۔ جب سے اب تک اُس کی آواز گانوں میں کوجتی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کیے، کوئی پیش نہیں گئی۔ اب ہار کے تیرے در پر آیا ہوں۔ بول تو کیا کہتی ہے؟ منہ مانگا انعام دوں گا۔

میں نے کہا ''دے دے۔ سال کے لیے بخش دے، جیسے تیری مرضی۔'' آپی ہنسنے لگی۔ پھر بولی ''چل بیٹھک میں اِسے دیکھ لے ایک نظر۔''

''اونہوں۔'' میں نے سر ہلا دیا۔

''نہیں آپی، اُنہوں نے بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔ دیکھنے کا مطلب؟''

''کتنی دیر کے لیے مانوں؟''

''جیون بھر کے لیے۔''

''سوچ لے، جو اوباش نکلا تو؟''

''پڑا نکلے۔ کیسا بھی ہے، جیسا بھی نکلے۔''

''اگلے دن بیٹھک میں ہمارا نکاح ہوگیا۔ زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا۔ آپی نے روک کر لوٹا دیا۔

بولی ''سودا نہیں کر رہی، اپنی دھی وداع کر رہی ہوں اور یاد رکھ! یہ خواجہ کی امانت ہے، سنبھال کر رکھیو۔''

حویلی یوں اُجڑی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو۔

ویسے تو سبھی کچھ تھا۔ ساز و سامان، آرائش، قالین، صوفے، قد آدم آئینے، جھاڑ فانوس سبھی کچھ۔ پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

''برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرانی بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے، مگر اِسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اِسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے، کہاں ہے، کیوں ہے۔

اوپر سے شام آ رہی تھی۔ سمے کو سمے ٹکراتی۔ اُداسیوں کے جھنڈے گاڑتی۔ یادوں کے دیے جلاتی۔ بیتی باتوں کے

## باتوں سے خوشبو آئے

☆.....جب دعا سے بات نہ بنے تو اپنا فیصلہ خدا پر چھوڑ دو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

☆.....صرف خدا پر بھروسا کرو اور اپنی محنت اور کوشش کو نہ چھوڑو، ملتا وہی ہے جس کی انسان کوشش کرتا ہے۔

☆.....کسی کی خوبیوں کی تعریف میں وقت ضائع مت کرو بلکہ اُس کی خوبیاں اپنانے کی کوشش کرو۔

☆.....جس کام سے دوسروں کو روکو اُسے خود بھی مت کرو۔

☆.....اپنا مزاج درویشانہ رکھو، مضائقہ نہیں اگر تمہارا لباس شاہانہ ہے۔

(شہریلی چنگیزی، لاہور)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الاپ گنگناتی۔ دبے پاؤں، مدھم، یوں جیسے پائل کی جھنکار بیر بنیا ہو۔

دُور، اپنے کوارٹر کے باہر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی نگاہیں چھوٹی چودھرانی پر جمی ہوئی تھیں۔ حقے کا سوٹا لگتا اور پھر سے چھوٹی چودھرانی کو دیکھنے لگتا۔ یوں جیسے اسے دیکھ دیکھ کر دُکھی ہوا جا رہا ہو۔

دوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بوڑھا مالی پودوں کی تراش خراش میں لگا تھا۔ ہر دو گھڑی بعد سر اُٹھاتا اور چھوٹی چودھرانی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا۔ پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کانٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔

جنت بی بی، جو چھوٹی چودھرانی کا کھانا پکاتی تھی، دو تین بار برآمدے کے پرلے کنارے پر کھڑی ہو کر اِسے دیکھ گئی تھی۔ جب دیکھتی تو اِس کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔ پلو سے پونچھتی پھر لوٹ جاتی۔

سارے نوکر کمین چھوٹی چودھرانی پر جان چھڑکتے تھے۔ اِس کے غم میں گھلے جا رہے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اِس پر سخت ناراض بھی تھی۔ اِس نے اپنے دونوں پاؤں پر کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ کیوں خود کو دوجوں کا محتاج بنا لیا تھا؟ کیوں!

اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سہارا ہوتا۔ اپنی اولاد تو تھی نہیں۔

جب چودھری مرنے سے پہلے بقائمی ہوش و حواس اپنی آدھی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرانی کے نام کر گیا تھا تو اِسے کیا حق تھا کہ اپنا تمام تر حصہ بڑی چودھرانی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک دن بڑی چودھرانی نے اِسے حویلی سے نکال باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا در دیکھے گی۔

ایک طرف تو اِتنی بے نیازی کہ اِتنی بڑی جائیداد اپنے ہاتھ سے بانٹ دی اور دوسری طرف یوں سوچوں میں گم تصویر بن کر بیٹھی رہتی ہے۔ سارے ہی نوکر حیران تھے کہ چھوٹی چودھرانی کس سوچ میں کھوئی رہتی ہے۔ چودھری کو مرے ہوئے تین ماہ ہو گئے تھے۔ جب سے یونہی حواس گم قیاس گم بیٹھی رہتی ہے اور پھر ٹوٹتی رات سے اِس کے کمرے سے گنگنانے کی آواز کیوں آتی ہے؟ کس خواجہ پیا کو بلاتی ہے؟ خواجہ پیا موری لیو خبر یا۔ کون خبر لے؟ کیسی خبر لے؟ چھوٹی چودھرانی پر اُنہیں پیار ضرور آتا تھا پر اِس کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سوچ میں پڑی رہتی ہے۔

چھوٹی چودھرانی کو صرف ایک سوچ لگی تھی۔ اندر سے ایک آواز اُٹھتی۔ بول تیرا جیون کس کام آیا؟ وہ سوچ سوچ ہار جاتی پر اِس سوال کا جواب ذہن میں نہ آتا۔ اُلجھے اُلجھے خیال اُلجھاتے۔ مجھے چمن سے اکھیڑا۔ بیل بنا کر اِک درخت کے گرد گھما دیا اور اب اِس درخت کو اکھیڑ پھینکا۔ بیل مٹی میں مل گئی۔ اب یہ کس کے گرد گھومے؟ بول میرا جیون کس کام آیا؟

دفعتاً اِس نے محسوس کیا کہ کوئی اُس کے رُوبرو کھڑا ہے۔ سامنے گاؤں کا پٹواری کھڑا تھا۔

"کیا ہے۔" وہ بولی۔

"میں ہوں پٹواری، چھوٹی چودھرانی جی۔"

"تو جا، جا کر بڑی چودھرانی سے مل، مجھ سے تیرا کیا کام؟"

"آپ ہی سے کام ہے۔" وہ بولا۔

"تو بول کیا کہتا ہے؟"

"گاؤں میں دو درویش آئے ہیں۔ گاؤں والے چاہتے ہیں انہیں چند دن یہاں روکا جائے۔ جو آپ اِجازت دیں تو آپ کے مہمان خانے میں ٹھہرا دیں۔"

"ٹھہرا دو۔" وہ بولی۔

"نوکر چاکر، بندوبست۔" وہ رُک گیا۔

"سب ہو جائے گا۔"

پٹواری سلام کر کے جانے لگا تو پتا نہیں کیوں اُس نے سرسری طور پر پوچھا "کہاں سے آئے ہیں۔"

پٹواری بولا "اجمیر شریف سے آئے ہیں۔ خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں۔" اِک دھماکا ہوا۔ چھوٹی چودھرانی کی بوٹیاں ہوا میں اُچھلیں۔

اگلی شام چھوٹی چودھرانی نے جنت بی بی سے پوچھا "جنت، یہ جو درویش ٹھہرے ہوئے ہیں، ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا؟

جنت بولی "لو چھوٹی چودھرانی، وہاں تو سارا اُن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں، جو منہ میں سے کہتے ہیں، ہو جاتا ہے۔"

"تو تیار ہو جا جنت، ہم بھی جائیں گے۔ تُو اور میں۔"

"چودھرانی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔"

"تُو چل تو سہی۔" چودھرانی نے خود کو چادر میں لپیٹتے ہوئے کہا "اور دیکھا وہاں مجھے چودھرانی کہہ کر نہ بلانا۔ خبردار......!"

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا۔ جنت نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کون ہے؟ اندر سے آواز آئی۔ جنت نے پھر دستک دی۔ سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا۔ جنت زبردستی اندر داخل ہو گئی۔ پیچھے پیچھے چودھرانی تھی۔ سفید ریش گھبرا گیا اور بولا "سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ وہ اِس وقت کمرے میں مشغول ہیں۔

"ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے۔" چھوٹی چودھرانی بولی۔

"تو پھر؟" سفید ریش گھبرا گیا۔

"ایک سوال پوچھنا ہے۔" چودھرانی نے کہا۔

"سائیں بابا اِس سے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔"

"سائیں بابا نے جواب نہیں دینا۔ اُنہوں نے پوچھنا ہے۔" وہ بولی۔

"کس سے پوچھنا ہے؟" خادم بولا۔

"اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالکے ہیں۔" یہ سن کر سفید ریش خادم سن کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"ان سے پوچھو۔" چھوٹی چودھرانی نے کہا "ایک عورت تیرے دروازے پر کھڑی پوچھ رہی ہے کہ غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا؟"

کمرے پر منوں بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔

چھوٹی چودھرانی بولی "کہو وہ عورت پوچھتی ہے، تو نے بیٹھک کے گملے سے اِک بوٹا اُکھیڑا۔ اسے بیل بنا کر ایک درخت کے گرد لپیٹ دیا کہ جا اِس پر نثار ہوتی رہ۔" وہ رُک گئی۔ کمرے کی خاموشی اور گہری ہو گئی۔ "اب تو میں نے اِس درخت کو اُکھیڑ پھینکا ہے۔ بیل مٹی میں رل گئی۔ وہ بیل پوچھتی ہے۔ بول میرا جیون کس کام آیا؟" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

"تیرا جیون کس کام آیا۔ تیرا جیون کس کام آیا۔" سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے۔

"تُو پوچھتی ہے کہ تیرا جیون کس کام آیا؟" وہ رُک گیا۔ کمرے میں خاموشی اِتنی بوجھل تھی کہ سہاری نہیں جاتی تھی۔

"میری طرف دیکھ۔" سفید ریش خادم نے کہا "سنہری بائی، میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا۔ مجھے نہیں پہچانتی؟ میں تیرا سارنگی نواز تھا۔ دیکھ میں کیا تھا کیا ہو گیا۔

چھوٹی چودھرانی کے منہ سے ایک چیخ نکلی "اُستاد جی آپ۔" وہ اُستاد کے چرن چھونے کے لیے آگے بڑھی۔

"عین اُس وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔ "سنہری بی بی! تیرا جیون کس کام آیا۔"

چھوٹی چودھرانی نے مڑ کر دیکھا۔

"ٹھاکر۔" وہ چلائی۔

ٹھاکر بولا "اب ہمیں پتا چلا کہ سرکار نے ہمیں اِدھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا۔" اُس نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکایا اور بولا "بی بی ہمیں آشیرباد دے۔"

## ممتاز مفتی

ممتاز مفتی نے ایک زندگی میں کئی زندگیاں بسر کیں۔ جس رنگ میں رہے، اُسی کے ہو رہے۔ لکھنے پہ آئے تو "علی پور کا ایلی" جیسی ناول نما خودنوشت سے شہرت پائی۔ لبیک لکھ کر سب کو حیران ہی کر دیا۔ افسانوں کی دُنیا آباد کی۔ مفتیانے انھی دنوں کا تحفہ ہے۔ قدرت اللہ شہاب سے دوستی کی۔ ساتھ میں نئے لکھنے والوں کو اپنی چھتر چھایہ دی، الکھ نگری سے پٹڑی ایسی بدلی کہ تلاش پہ جا نکلے۔ "تلاش" اُن کی وہ کتاب ہے جو کبھی پرانی نہ ہو گی۔ پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ تلاش پہ لیے پھرتی ہے۔ ایسی اُنگلی پکڑتی ہے کہ انسان کو چھڑوانا بھول جاتا ہے۔





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## اے

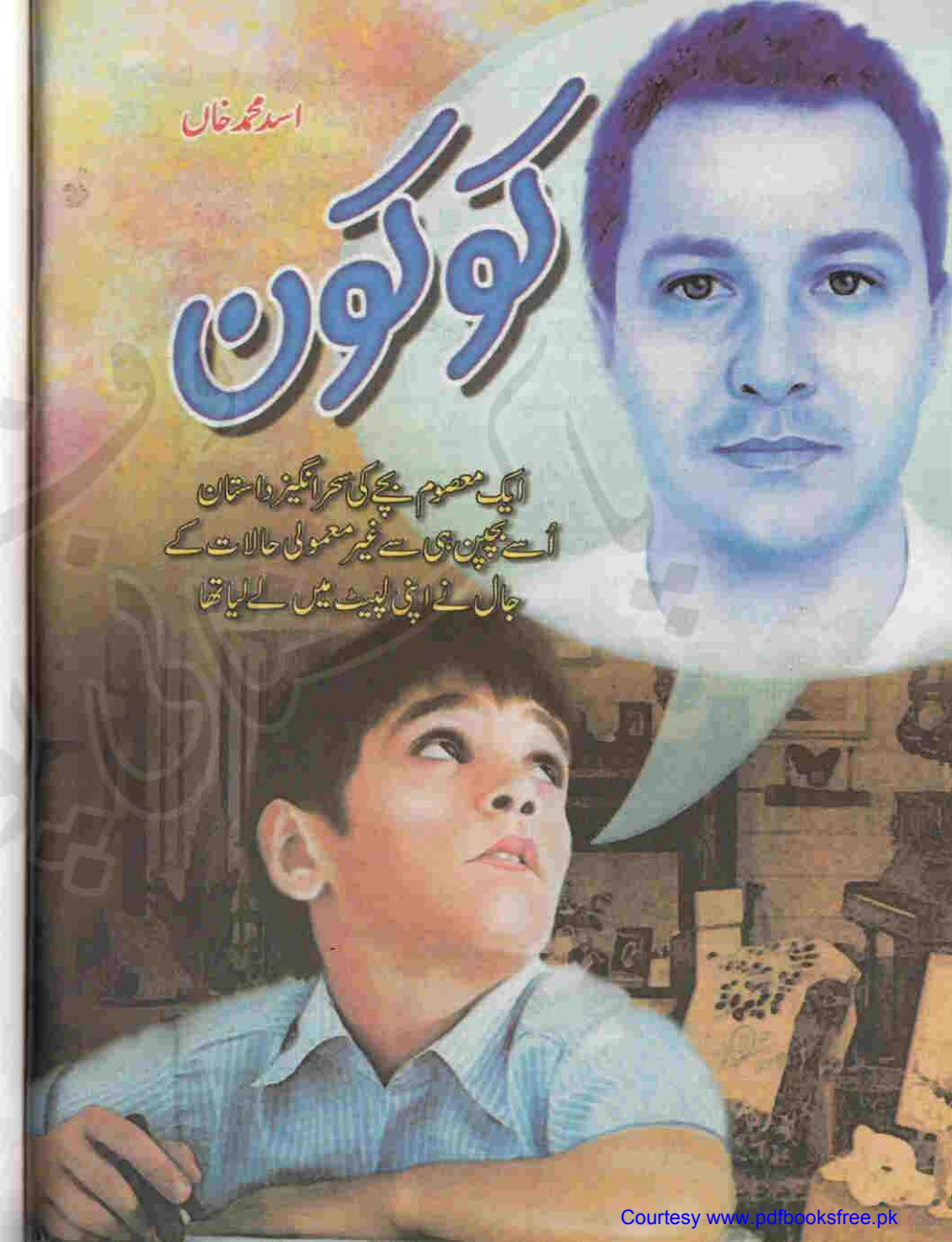

اے میری کچھ نہیں تھیں۔ نہ ماں، نہ رشتے دار۔ وہ بس میری ماں کی سہیلی تھیں۔ یہ دونوں کسی اور شہر میں (میرے پیدا ہونے سے بہت پہلے) پاس پاس کے گھروں میں رہتی تھیں۔

میں کچھ ہی مہینے کا تھا جب میرے باپ نے، نہ معلوم کیوں، میری ماں کو مار ڈالا۔ (میرے باپ کا نام اے اے نے بہت دنوں تک مجھے نہیں بتایا تھا۔ یہ انھوں نے کچھ ہی دن پہلے بتایا ہے)۔ بس تو اے اے کسی سے بھی کہے بغیر، مجھے اٹھا لائیں اور اس شہر میں آن بسیں۔ وہ میری ماں سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اے اے بہت چاہتی تھیں انھیں۔

اچھا تو، پولیس نے باپ کو قید میں ڈال دیا۔ انھوں نے مجھے اور اے اے کو بھی تلاش کیا ہوگا۔ ہم انھیں نہیں ملے۔ اے اے نے بتایا کہ میری ماں کا نام بی بی تھا۔ راتوں میں دیر تک اے اے مجھے اپنے اور بی بی کے بچپن، لڑکپن کے قصے سناتی تھیں۔ اتنی چاہت، ایسے لاڈ پیار سے وہ میری ماں، بی بی کا نام لیتی تھیں کہ وہ خاتون، میں نے جن کی تصویر تک نہیں دیکھی تھی، قصے سنتے ہوئے میری اپنی دوست جیسی بن جاتیں، بالکل اے اے کی طرح۔ اور وہ شہر جسے میں نے بس نقشے میں دیکھا تھا، اپنے شہر جیسا لگنے لگتا۔

پڑھائی اور اے اے کے بتائے ہوئے چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو کر پہلے تو میں اپنے کھیل کھیلنے یا تصویریں بنانے میں لگ جایا کرتا تھا، مگر اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کھیلنے، تصویریں بنانے میں اب میرا جی نہیں لگتا تھا۔ میں چھوٹی موٹی شرارتوں، مزے مزے کے ان قصوں کو یاد کرنے بیٹھ جاتا تھا جو مجھے اے اے نے سنائے ہوتے۔ جو کچھ بھی...... برسوں پہلے، اُن دو چھوٹی لڑکیوں نے کیا ہوتا، میرے حساب سے، وہ اب ہم تین چھوٹے بچوں کا کیا ہوا بن جاتا تھا۔ تیسرا بچہ میں ہوتا تھا...... سی سی۔

ایسا لگتا تھا کہ میں یہ جگہ، یہ دن رات چھوڑ کے، کسی نہ کسی طرح، اُن دو چھوٹی شریر لڑکیوں کے شہر اور اُن کے دنوں میں پہنچ گیا ہوں۔ وہاں موجود ہوں۔ جو بھی اے اے کا اور میری ماں، بی بی کا شہر اور اُن کے دن رات ہوا کرتے تھے۔ وہاں چل پھر رہا ہوں، کھیل رہا ہوں۔

مجھے اُن قصوں میں بس انھی تین آدمیوں سے سروکار ہوتا تھا۔ اے اے اور بی بی سے ...... اور سی سی سے ...... مطلب، خود اپنے آپ سے۔ اور جب یاد کرتا تھا تو بس تین ہی آدمی اچھی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اے اے، بی بی اور سی سی، یعنی خود میں ...... یہ مجھے اجلے اجلے نظر آتے تھے۔ ہے نا عجیب بات؟ اور انھی تین کی آوازیں مجھے سنائی دیا کرتی تھیں۔ بالکل صاف، سمجھ میں آنے والی آوازیں......

حیرت ہے!

پھر ان قصوں میں دوسرے لوگ بھی آنے لگے۔ بی بی کی ماں جی اور ایک بہت گوری چٹی بوڑھی عورت، بی بی کی دادی۔ ان کے نام خبر نہیں کیا تھے۔ یہ بھی مجھے دھندلے دھندلے نظر آتے تھے۔ اے اے کے سنائے قصوں کے سارے لڑکا، لڑکی، ٹیچر، بوڑھے، جوان اور میری ماں بی بی کے اور اے اے کے گھروں کے لوگ۔ بے شک کم کم اور دھندلے دکھتے مگر جب بھی یاد کرتا تو دکھتے ضرور تھے...... اور آوازیں ان کی ہلکی ہلکی، جیسے دور سے آتی سنائی دیتی تھیں۔ اُن میں ہم تینوں جیسی کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔

اس طرح بی بی کے اور اے اے کے گھروں میں کام کاج کے لیے آنے والے سب لوگوں کو میں پہچاننے لگا تھا۔ بہت سوں کی شکلیں تو اے اے نے بتائی بھی تھیں۔ جن کی شکلیں نہیں بتائی تھیں، اُن کو میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ ایسا ہوگا اور وہ ایسا۔ بس اسی طرح، میں نے، ان سبھی لوگوں سے دوستیاں جیسی کر لی تھیں۔ لیکن باپ سے دوستی نہیں ہوئی تھی۔ اے اے نے اُس کی شکل ہی نہیں بتائی تھی۔

ایک دن، جب اے اے مجھے سُلانے، شب بہ خیر کہنے آئیں تو میں نے انھیں روک لیا اور پوچھا کہ میرے باپ کی شکل کیسی تھی، کیسا دِکھتا تھا وہ؟

اے اے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں ضد کرنے لگا تو پوچھنے لگیں کہ جو سناتی ہوں تجھے وہ باتیں اچھی لگتی ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں، بہت۔ کہنے لگیں کہ وہ اچھے لوگ تھے، اس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے ان کی باتیں بھی اچھی ہیں۔

''تو میرا باپ اچھا نہیں تھا؟'' میں نے پوچھا۔ انھوں نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے بھی اور بات شروع کر دی۔ اُن سے بی بی کا پوچھا کہ وہ پڑھائی میں کیسی تھیں؟ اسکول کا یونیفارم کیسا ہوتا تھا؟ وہ یونیفارم میں کیسی دِکھتی تھیں؟ بی بی اور آپ گھر میں کیسے کپڑے پہنتی تھیں؟

اے اے نے سب کچھ بتا دیا۔ ہنس کے کہنے لگیں ''بہت باتیں کر رہا ہے آج! کیا پہنتی، کیسی دِکھتی تھیں؟ یہ سب جان کے کیا کرے گا تو؟''

میں نے چالاکی سے اُن کی بات ٹال دی۔ جب انھوں نے گدگدی کرنے کی دھمکی دی تو مجھے پوری بات بتانی پڑی کہ آپ کے سنائے یہ سب قصے، یہ ساری اچھی اچھی باتیں، میں دل ہی دل میں دہراتا ہوں اور آپ کے اور بی بی کے ساتھ وہ وقت اسی طرح گزارتا ہوں جیسا آپ نے گزارا تھا۔ ہم خوب مزے کرتے ہیں، خوب کھیلتے، شرارتیں کرتے ہیں۔ ہم تینوں، آپ، بی بی اور آپ ہی کی طرح کا ایک چھوٹا لڑکا میں، سی سی۔

وہ دیر تک مجھے حیرت سے دیکھتی اور مسکراتی رہیں۔ پھر انھوں نے میری پیشانی چوم لی اور بولیں ''سی سی! تو نے تو مجھے حیران کر دیا۔ ارے واہ! یہ باتیں بھلا کیسے سوچ لیتا ہے؟'' میں کیا بتاتا، مجھے خود معلوم نہیں تھا۔

جاتے ہوئے وہ کہنے لگیں: ''سی سی! تو ہمیشہ سے میرا بیٹا بھی ہے اور دوست بھی۔ بالکل بی بی کے جیسا، پکا دوست، ساتھ کا کھیل..... ٹھیک ہے نا؟ اب ان قصوں میں ہم تین دوست ہوا کریں گے۔ تُو، میں اور بی بی۔ مگر ہم اور بی بی تو سکول کا یونیفارم بھی پہنیں گے۔ تو کس کس طرح کے کپڑے پہنے گا؟ سوچ کے رکھنا''۔ پھر وہ شب بخیر کہتی ہوئی چلی گئیں۔

اُس رات کے بعد سے اسی طرح ہونے لگا۔ اے اے اپنے بچپن، لڑکپن کی کوئی بھی کہانی سناتے ہوئے خود ہی مجھے ایسے شامل کر لیتیں جیسے میں وہیں تھا اور کبھی تو مجھے یاد دلانے لگتیں ''یاد ہے نا تجھے؟ ہم لوگ کتنے شوق سے درختوں پہ چڑھتے، کچی پکی املیاں توڑتے تھے؟ بی بی کی ماں جی..... نانی تیری، چاہے جتنی خفا ہوں، ڈانٹ پھٹکار کریں، ہم باز نہیں آتے تھے۔ املیاں چھین کے پھکوا دیتی تھیں وہ، پر ہم کہاں ماننے والے تھے۔''

اے اے مجھے یاد دلاتیں۔ پوچھتیں کہ تو ہمیں یونیفارم پہنے، کندھوں پہ بستے لٹکائے، اُنھیں ہاتھوں سے سنبھالے اسکول لاری پہ چڑھنے میں بازی لے جانے کی کوشش کرتے دیکھتا تھا نا؟ میں کہتا ''ہاں دیکھتا تھا۔'' اور جب بہت راتوں تک میں یہ بات برابر سنتا رہا اور یہی جواب دیتا رہا تو پھر مجھے اے اے اور بی بی اُسی طرح نظر آنے لگیں..... مطلب، یونیفارم پہنے، کندھوں پہ بستے لٹکائے، انھیں سنبھالتی اور لاری پہ چڑھنے میں بازی لے جانے کی کوششیں کرتی۔

پھر عجیب بات ہونے لگی، خود بخود میں یہ جان گیا کہ جب دروازے میں پھنستی ہوئی وہ اندر پہنچتی تھیں تو، دونوں میں وہ، جو پہلے پہنچتی تھی اس پر خوش ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اُس نے دوسری کو ہرا دیا ہے۔ پر دوست کو ہرا کے خوش ہونا؟ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

میں نے کہہ دیا کہ اے اے! مجھے بتائیے کیا سچ میں ایسا لگتا تھا کہ ایک نے دوسری کو ہرا دیا ہے؟ پہلے تو وہ سوچ میں پڑ گئیں پھر کہنے لگیں ''سی سی! میں نے تجھے ایسا تو کچھ نہیں بتایا تھا، اس لیے کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی، کھوٹے پن کی بات تھی۔ ہمیں ایک دوسرے کے لیے ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔''

''مگر آپ ایسا سوچتی تو تھیں نا؟''

وہ جواب میں بولیں: ''ہاں، ہم میں یہ بُرائی تو ہو گی۔'' میں نے کہا ''ہو گی نہ کہیے۔ یہ کہیے تھی۔ ہم میں یہ بُرائی تھی۔''

اے اے نے دھیرے سے سر ہلا کے مان لیا کہ ہاں یہ ایک برائی تو تھی۔

ایک دن انھوں نے کسی لڑکی کا بتایا کہ وہ اُن دنوں میں اتنی دوستی دیکھ کر کُڑھتی تھی۔ نہ معلوم کیوں کُڑھتی تھی۔ پھر انھوں نے بتایا کہ اُس کی صورت ایسی ایسی تھی۔ میں نے پوچھا نہیں تھا۔ پھر بھی انھوں نے اُس کی صورت بتائی۔ نام بھی بتایا اُس کا۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ یہ پہلی بات تھی اے اے کی، جو مجھے اچھی نہیں لگی۔



انھوں نے میرے باپ کی..... جو اچھا نہیں تھا..... نہ تو مجھے صورت بتائی تھی، نہ ہی نام بتایا تھا۔ تو پھر انھوں نے لڑکی کی صورت اور اُس کا نام مجھے کیوں بتا دیا؛ جو کُڑھتی تھی اور اچھی نہیں تھی؟ اُس کی اتنی باتیں کیوں کیں مجھ سے؟

مجھے دو دن تک اس بات کا صدمہ رہا۔ اے اے نے کیوں کیا ایسا؟ وہ سمجھ تو گئیں کہ میں خفا ہوں، پر کس بات پر خفا ہوں؟ یہ نہیں سمجھی تھیں وہ۔ اس لیے تیسرے دن میں نے اُن سے پوچھ لیا۔ کہا ''اے اے! آپ دونوں میں جو ایک بات اچھی نہیں تھی وہ آپ نے مجھے بتا دی۔ جو لڑکی کُڑھتی تھی اور اچھی نہیں تھی، آپ نے اُس کی صورت اور نام تک مجھے بتا دیا۔''

کہنے لگیں ''ہاں، جو لڑکی اچھی نہیں تھی اُس کی صورت اور نام تجھے بتا دیا۔ جو بات ہم دونوں میں اچھی نہیں تھی، وہ تجھے بتا دی..... پھر؟

میں نے کہا ''لڑکی کی صورت اور نام بتا دیا، مگر میرا باپ ..... جو اچھا نہیں تھا، وہ کیسا دِکھتا تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟..... یہ مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

اے اے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کے چہرے پر ایسی خفگی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ رات تک وہ مجھ سے نہیں بولیں، میں بھی کیوں بات کرتا؟

رات میں جب میرے سونے کا وقت ہوا تو وہ روزانہ کی طرح گلاس میں پانی لے کر آئیں اور بہت پیار سے مجھ سے کہنے لگیں ''لے نا، اپنی گولی کھا لے۔'' میں نے کہا ''نہیں، میں نہیں کھاتا۔'' اور میں نے منہ پھیر لیا۔ انھوں نے کتنی ہی بار یہ بات کہی اور میں نے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا۔ اس پر وہ بگڑ گئیں اور مجھے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ میں نے چیخ کر کہا ''میں بھی نہیں بولوں گا آپ سے، آپ اچھی نہیں ہیں!''

بہت عجیب بات ہوئی۔ اے اے نے اچانک میرا سر تھام کے مجھے خود سے بھرا لیا۔ میں سمجھا لاڈ کرتی ہیں، پر انھوں نے گردن کے پیچھے سے ہاتھ پہنچا کر منہ کھولا اور گولی ڈال دی..... میں نہیں پی رہا تھا، مگر انھوں نے بہت سا پانی پلا دیا..... قمیص تک بھیگ گئی میری۔ میں رونے لگا۔ انھوں نے پروا نہیں کی۔ جلدی جلدی میری قمیص بدلی اور روشنی اور دروازہ بند کرتی چلی گئیں۔ آج انھوں نے گانے کا ٹیپ بھی نہیں لگایا تھا۔ ''شب بہ خیر'' بھی نہیں کہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اٹھ کے دروازہ پیٹوں۔ پر اُٹھا ہی نہیں گیا، نیند آ گئی تھی۔

جیسے روز راتوں میں خواب آتے تھے، آج بھی ویسے ہی خواب آئے۔ صبح اُٹھا تو روز کی طرح منہ کڑوا ہو رہا تھا، پیاس لگ رہی اور سر گھوم رہا تھا۔ اِس سب کے ساتھ، آج غصہ بھی آ رہا تھا مجھے۔ اے اے نے مجھے اس طرح کیوں گولی کھلائی؟ اچھی طرح کہہ دیتیں، انکار کیا ہے میں نے؟ روز تو کھا لیتا ہوں۔

پھر صبح کو وہ روز کی طرح مسکراتی ہوئی آئیں، گال تھپتھپائے اور ٹھنڈے جوس کا گلاس میرے منہ سے لگا کے ''شاباش'' کہتی ہوئی مجھ سے ایک سانس میں گلاس ختم کرا دیا پھر روز کی طرح مجھے نہانے بھیجا، کپڑے بدلائے، ناشتا کرایا، گھنٹوں پڑھاتی رہیں، ہوم ورک دے کر خود کھانا پکانے لگیں۔

کھانے کے بعد میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ تصویریں بنا سکتا تھا، نرم لکڑی کو آریوں سے کاٹ کے تیز چاقوؤں سے تراش کے ریتیوں سے ہموار کر کے کچھ بھی بنا سکتا تھا۔ موٹر کار، خرگوش، طوطا..... کچھ بھی۔ اُن پہ رنگ کر سکتا تھا۔

تو میں نے سوچا آج گھوڑا بناؤں گا۔ میں اپنا سامان اٹھا لایا۔ ڈبے میں رنگ، پنسل کاغذ سبھی تھے، مگر آریاں، چاقو، ریتیاں نہیں تھیں۔

میں نے پوچھا ''اے اے! سب چیزیں آپ نے کہاں رکھ دیں؟ میں لکڑی کا گھوڑا بناؤں گا۔''

وہ میرے بیڈ پہ لیٹی تھیں اور نیند میں ہو رہی تھیں۔ کہنے لگیں کاغذ پہ بنا لو، سی سی! جب اٹھوں گی تو لا دوں گی۔''

میں نے کہا ''جی نہیں کاغذ پہ نہیں، میں لکڑی سے بناؤں گا اور ابھی بناؤں گا۔ آپ اُٹھیے! لا کر دیجیے۔''

انھوں نے کچھ کہا جو میں سن نہیں سکا۔ میں نے الجھ کے پوچھا ''اے اے! میری چیزیں ڈبے میں رکھی ہوتی ہیں۔ آپ نے کیوں نکالیں؟''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ جھٹکے سے اُٹھ بیٹھیں اور چیختی ہوئی آواز میں ایسی بری بری باتیں کرنے لگیں جو میری سمجھ میں نہ آئیں۔ اس لیے کہ میں نے تو وہ کبھی سنی نہیں تھیں۔ انھوں نے میرے باپ کے لیے کوئی بہت بری بات کہہ دی۔ اور یہ بھی کہا کہ میں بالکل اپنے باپ پہ پڑا ہوں۔ ضِدّی، بدتمیز اور نہ جانے کیا کیا ہوں..... اور میری صورت بھی باپ جیسی ہے!

یہ پہلی بات تھی جو مجھے اپنے باپ کے بارے میں اچانک معلوم ہوئی۔ ''اُس کی صورت میرے جیسی تھی۔''

میں وہاں سے ہٹ کر شیشے کے سامنے آیا اور اپنی صورت دیکھنے لگا ''اچھا؟ میرا باپ ایسا دِکھتا تھا؟''

میں نے دل میں کہا ''ٹھیک ہے، مجھے اپنے باپ کا نام بھی معلوم ہونا چاہیے۔'' (تو اس کے لیے مجھے کچھ کرنا ہوگا؟)

میں نے بڑھ کے اُن کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اُن سے کہا ''غصہ مت کیجئے، سو جائیے..... گھوڑا تو میں کاغذ پہ بنالوں گا۔''

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہیں پھر دھیرے سے کہنے لگیں ''تو سمجھتا نہیں ہے۔ چاقو، آریاں اور ریتیاں، یہ سب تیز دھار ہوتی ہیں۔ اِن سے تجھے چوٹ لگ سکتی ہے۔ ہاتھ بھی کٹ سکتا ہے تیرا۔ اِسی لیے میں نے سب ہٹا دیں''۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سب جھوٹ ہے، اصل بات کچھ اور ہے۔

''ہٹا دیں؟ ..... یہاں سے ہٹا کے کہاں رکھ دیں؟ یہاں کے علاوہ گھر میں اور کیا ہے؟'' مگر یہ میں نے نہیں پوچھا۔ وہ نہیں بتاتیں۔

یہ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔ جس طرح یہ معلوم ہوا کہ باپ کی صورت کیسی تھی۔ اسی طرح اُس کا نام بھی اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ سب چیزیں یہاں سے ہٹا کے کہاں .....؟

''تو کیا سوچنے لگا؟'' اے اے نے پھر سوال کیا کہ تُو کیا سوچ رہا ہے اور انھوں نے ہاتھ بڑھا کر میرا سر اپنے شانے سے ٹکا لیا۔ یہ ٹھیک ہے، میں نے دل میں کہا کہ انھیں کچھ بھی بتانا اچھا نہیں ہے۔

تو بس میں ہنسنے لگا۔ اور میں نے وہ بات کہہ دی جو سچ نہیں تھی ''میں کچھ نہیں سوچ رہا''۔ میں نے کہا..... اِس بات پر وہ خود بھی ہنسنے لگیں۔

مگر اب مجھے ان کی ہنسی پر بھروسا نہیں رہا۔ نہ ان کی پیار کی باتوں پر۔ وہ مجھ سے اچھی بات کر کے جو چاہتی ہیں کرا لیتی ہیں۔ اور کوئی بات اگر ان کی مرضی کی نہیں ہوتی تو وہ چیختی اور بُری بُری باتیں کہتی ہیں۔ اور جب جی چاہتا ہے وہ سچ بات کہنا بند کر دیتی ہیں۔

(تو میں بھی اب اپنی مرضی کروں گا!)

میں نے بہت دن انھیں خفا ہونے کا موقع نہیں دیا۔ اُن سے اُلجھ کے بات نہیں کی۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ چڑ جاتیں اور کچھ نہیں بتاتیں۔ بہت سی باتیں معلوم کرنا تھیں مجھے۔ یہ پوچھنا تھا کہ لکڑی کے کام والے اوزار کہاں ہیں۔ اور یہ بھی کہ کیا اب وہ مجھے کبھی نہیں ملیں گے؟ اور ایک مرتبہ باتیں کرتے کرتے میں نے ہنس کے پوچھ بھی لیا کہ آپ نے یہ کس طرح کہا کہ میرا باپ ضِدّی اور بدتمیز تھا؟

وہ کچھ سوچ رہی تھیں، ایک دم بول پڑیں ''سب جو کہتے تھے۔ اصل میں ڈی ڈی خود ہی بہت کمینہ آدمی رہا ہو گا۔'' پھر ایک دم چپ ہو گئیں۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ مجھے یہ نام معلوم ہو۔ مگر اب تو مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا: ''یہ ڈی ڈی کیسا نام ہے؟ بُرا نام ہے نا؟ اس کی آواز بھی اے اے، بی بی اور سی سی جیسی نہیں ہے..... ہے نا؟''

کہنے لگیں: ''تو ٹھیک کہتا ہے۔ مگر اس وقت ایک دم تجھے اُس کا خیال کیسے آ گیا؟''

میں نے کہا: ''مجھے اُس کی وجہ سے خیال نہیں آیا، اپنی وجہ سے آیا..... میرے کام کے اوزار ہٹا دیئے آپ نے اور میں نے پوچھا تو آپ نے بے ضرورت ڈی ڈی سے مجھ کو ملا دیا کہ میں بالکل اپنے باپ پہ پڑا ہوں، ضِدّی، بدتمیز اور نہ جانے کیا کیا ہوں اور آپ ایسی بری باتیں بھی کہنے لگیں جو میری سمجھ میں نہ آئیں۔ اب مجھے اپنے اوزار چاہئیں۔ یہ آپ نے جھوٹ کہا ہے کہ چاقو اور آریاں اور ریتیاں، یہ



سب دھار والے ہوتے ہیں، ان سے چوٹ لگ سکتی ہے، اس لیے آپ نے ہٹا دیئے۔ اگر ایسا تھا تو آپ نے پہلے ہی کیوں دیئے تھے؟ ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔ جی ہاں! اِس لیے کہ میں بڑا ہو گیا ہوں، کام سیکھ گیا ہوں''۔

یہ سب ٹھیک تھا۔ مگر میں نے ایک غلطی کر دی۔ میں نے اے اے سے کہہ دیا کہ مجھے اُن کی یہ بات جھوٹ لگتی ہے کہ باپ نے ماں کو مار ڈالا تھا۔ ایسا بالکل نہیں ہوا ہو گا۔ میں نے کہا ''اگر انھوں نے میری ماں کو.....''

انھوں نے بات بھی پوری نہ کرنے دی۔ طمانچے اور گھونسے مار مار کے مجھے گرا دیا اور اتنی خراب اور گندی باتیں کیں کہ میں پریشان ہو گیا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

میری ناک سے خون بہنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں واش روم میں جا گھسا اور کنڈی بند کر لی۔ میں نے سُنا وہ برابر کچھ نہ کچھ بکے جا رہی تھیں۔

بہت دیر بعد میں باہر آیا۔ اے اے جا چکی تھیں۔ رات ہو گئی۔ میں بھوکا تھا، لیٹ کے آنکھیں بند کر لیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ گولی کھلانے ضرور آئیں گی لیکن وہ نہیں آئیں۔ میں بہت دیر جاگتا اور سوچتا رہا پھر سو گیا۔

رات میں کسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ باہر سے کہیں ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ موٹر کاریں اور بائیک ہارن بجاتی گزر رہی تھیں۔ یہ آوازیں میں نے ریڈیو اور ٹیپ پہ سنی ہیں۔ باہر کوئی ٹیپ بجا رہا ہے؟ مگر ہیں، یہ ٹیپ یا ریڈیو نہیں، سڑک پر موٹر کار نے ہارن دیا تھا اور کہیں قریب سے اذان کی آواز آئی تھی۔ میں نے ٹیپ پہ کتنی بار اذان سنی ہے، مجھے پوری یاد ہے۔ آدھی رات کے بعد کون سی اذان ہو رہی ہے؟

ہاں، یہ صبح کی اذان نہیں تھی۔ میں دیر تک سوچتا رہا۔ گھڑی میں ایک سے زیادہ بجا تھا۔ کیا یہ دن کا وقت ہے؟ بہت سی آوازیں ایسی تھیں جنھیں میں نہیں جانتا۔ مگر ایک آواز اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ آئس کریم والے کی آواز! وہ کتنی دیر کھڑا گھنٹی بجاتا، آواز لگاتا رہا پھر چلا گیا۔

میں بہت دیر سوچتا رہا، یہ دن کا وقت ہے۔ باہر دن نکلا ہوا ہے۔ مجھ سے رات کہہ کر جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ (یہ رات نہیں دن کا وقت ہے!)

ٹھیک ہے۔ میں نے خود سے کہا کہ ٹھیک ہے، مجھے معلوم کرنا ہے کہ اصل بات کیا ہے۔ مجھے جھگڑنا نہیں، بس معلوم کرنا ہے۔ اور اب میرے لیے اے اے کو سمجھنا ضروری ہے۔

سب سے زیادہ انھیں یہی اچھا لگتا ہے کہ میں روز..... ہر روز اُن کی دی ہوئی گولی کھا کے پانی پی لیتا ہوں۔ اب ایسا کچھ کروں کہ وہ سمجھیں میں پانی پی رہا ہوں، تو اس لیے پی رہا ہوں کہ میں نے گولی کھا لی ہے۔ مگر میں گولی حلق سے نہ اتاروں، منہ میں ہی روک لوں۔

اگلی صبح جب وہ کچھ ناراض سی، کچھ لاڈ کرتی آئیں تو میں نے سوچ لیا کہ آج ایسا ہی کروں گا۔

میں دن بھر ان کی کہی باتوں پر سر ہلاتا، مسکراتا رہا۔ دن بھر میں نے سب کچھ ویسا ہی کیا جیسا وہ چاہتی تھیں۔ پھر شام ہوئی اور رات ہو گئی۔ میں نے انھیں کاغذ پہ گھوڑے کی تصویر بنا کے دکھائی، وہ خوش ہوئیں۔ پھر میرے لیے گولی لے کر آ گئیں۔ میں نے گولی منہ میں ڈالی، اُسے زبان اور داڑھ کے بیچ روک لیا۔ اوپر سے پانی پی لیا۔ منہ پونچھنے کے بہانے گولی مٹھی میں لے کر جیب میں ڈال لی۔ انھوں نے شب بخیر کیا۔ میں نے جواب دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ انھیں پتا نہیں چلا۔ وہ سمجھیں میں سو گیا ہوں۔ مگر میں سب سن رہا تھا۔ انھوں نے گانے کی آواز بند کی، روشنی بجھائی اور دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔

میں نے سُنا، دروازہ بند کرتے ہوئے انھوں نے چابی گھمائی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ اچھا؟ اے اے تالا ڈال کے جاتی ہیں! کیوں؟ سب طرف دن ہوتا ہے، تو وہ کہیں جاتی ہیں؟ پر وہ جاتی کہاں ہیں؟ میں رات سمجھ کے یہیں سوتا رہتا ہوں! میں جا نہیں سکتا کیوں کہ باہر تالا پڑا ہے! (مجھے سوچتے رہنا چاہیے)

میں نے کئی دن ایسا کیا۔ میں گولی منہ میں ڈالتا، اُسے ایک طرف روک لیتا، پانی پی لیتا، پھر گولی مٹھی میں لے کے جیب میں ڈال لیتا۔ یوں کچھ دنوں میں چار چھ گولیاں جمع ہو گئیں۔ میں نے انھیں ایسی جگہ چھپا دیا جہاں وہ سوچ بھی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں سکتی تھیں۔ اگر جلدی نہ سو جاؤں تو بہت سی باتیں سوچ سکتا ہوں۔ یہ زیادہ ضروری ہے۔ سوچنا بہت ضروری ہے۔ تو بس میں جاگتا اور سوچتا رہا۔

اور پھر جبکہ میری طرف شام ہوئی۔ وہ میرے لیے دودھ کا پیالہ اور اپنے لیے ایک کپ میں سیاہ کافی لے کر آگئیں اور مجھ سے ہنس ہنس کے باتیں کرنے لگیں اور جب وہ کم دھیان دے رہی تھیں، میں نے کافی کے کپ میں تین گولیاں ڈال دیں۔ باتیں کرتے کرتے انھوں نے چمچہ چلایا اور کافی پی لی۔

باتیں کرتے ہوئے وہ تکیے سے ٹیک لگا کے اونگھنے لگیں۔ پھر لیٹ گئیں اور..... سو گئیں۔

(میں یہی چاہتا تھا)

دو چابیوں میں سے ایک دروازے میں گھوم گئی۔ دروازہ کھل گیا۔ باہر پیلا بلب جل رہا تھا اور سیڑھیاں اوپر چڑھتی چلی جارہی تھیں۔ اوپر چڑھتے ہوئے روشنی سفید ہوتی جاتی تھی۔ سیڑھیاں گھوم گئیں، میں رک گیا۔ یہاں سے آوازیں تیز ہونے لگیں۔ اوپر یہ کیا ہے جو اتنا شور ہو رہا ہے؟ بوجھ اٹھانے والی گاڑی ہوگی، بڑی گاڑی جسے ٹرک کہتے ہیں۔ میرے پیر دُکھ رہے ہیں۔ مگر میں بھاگ کے چڑھتا ہوں، گرتا ہوں پھر اٹھ جاتا ہوں۔ یہاں ایک دروازہ ہے، بند ہے، تالا نہیں ہے اس میں۔ میں اندر چلا جاتا ہوں۔ یہ کمرا ہے..... بہت بڑا کمرا۔ سامان سے بھرا ہوا۔ یہاں ایک بستر ہے اور کیا اور کیا ہے۔ یہ ایک طرف میرے اوزار پڑے ہیں۔ میں بھاگتا ہوں۔ کرسی سے ٹکراتا ہوں اور اُٹھتا ہوں، اُدھر سامنے دروازہ ہے۔ یہ بڑا دروازہ ہے، اِس میں تالا پڑا ہے، میں دوسری چابی لگاتا ہوں۔ تالا کھل جاتا ہے مگر مجھے بہت زور لگا کے دروازہ کھولنا پڑا۔ دروازہ کھلا تو بہت سفید روشنی، میرے اوپر آئی۔ میں ذرا سا پیچھے ہٹا پھر دوڑ کے بڑھا ..... اور دوسری طرف سیڑھیوں پر سے لڑھکتا سخت زمین پر جا گرا۔ کوئی چیختا ہوا..... ایک بھاری آواز والا آدمی چیختا ہوا، ارے ارے، کہتا ہوا جھپٹا۔ میں نے رونا اور خود بھی چیخنا شروع کر دیا.....

جنھوں نے مجھے اُٹھایا تھا، اُسی سڑک پہ کپڑے کی دکان کرتے ہیں، وہ اپنی دکان کھولنے جا رہے تھے۔ اُنھی نے پولیس اور ہسپتال والوں کو فون کیا تھا۔ پھر پولیس والے میرے ڈی ڈی کو اور میری ماں کو ہسپتال لائے تھے۔ میں ڈی ڈی کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ مجھے پتا تھا وہ کیسے دِکھتے ہیں۔

ماں وہ نہیں تھی جسے اُس عورت، اے اے نے بی بی کا نام دیا تھا۔ ماں وہ تھی جسے اُس نے اسکول کی لڑکی کہا تھا اور بتایا تھا کہ وہ اس کی اور بی بی کی دوستی سے کُڑھتی ہے۔ کہیں کوئی بی بی نہیں تھی۔ جھوٹ بولتی تھی وہ!

ماں میرے پاس ہسپتال میں ہی اُٹھ آئی ہے۔ وہ روتی بھی ہے اور ہنستی بھی ہے۔ نو سال پہلے میں کچھ ہی گھنٹے کا تھا تو اُس اے اے نے مجھے ہسپتال سے چرا لیا تھا۔ وہ وہاں نوکری کرتی تھی۔ نئے شہر کی ایک پرانی ٹوٹی حویلی کو اُس عورت، اے اے نے، کرائے پر لے کے حمام کو قید خانہ جیسا بنا لیا تھا۔ وہیں رہا تھا میں۔ پورے نو سال۔

اب پولیس والے اُسے سب جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ میں نے اُنھیں بتایا ہے کہ وہ کیسی دِکھتی ہے۔ مجھ سے پوچھ پوچھ کے انھوں نے اُس اے اے کی تصویر بنالی ہے۔ کہتے ہیں میری بنوائی ہوئی تصویر ہسپتال کے فوٹو سے بہت ملتی ہے۔ ماں کہہ رہی ہے دیکھنا وہ ضرور پکڑی جائے گی۔

## اسد محمد خاں

اسد محمد خاں ۱۹۳۲ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آئے۔ اُنہوں نے افسانے لکھے اور طویل دورانیے کے کھیل، گیت، بلی لکھے، غرض ہر صنف میں اپنی پہچان کرائی۔ اُنہیں ۲۰۰۹ء میں تمغۂ امتیاز بھی عطا ہوا۔ اکثر ان کے افسانوں کے کردار انوکھے ہوتے ہیں اور پھر مکالموں اور جملوں کی تراش خراش انہیں اور بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

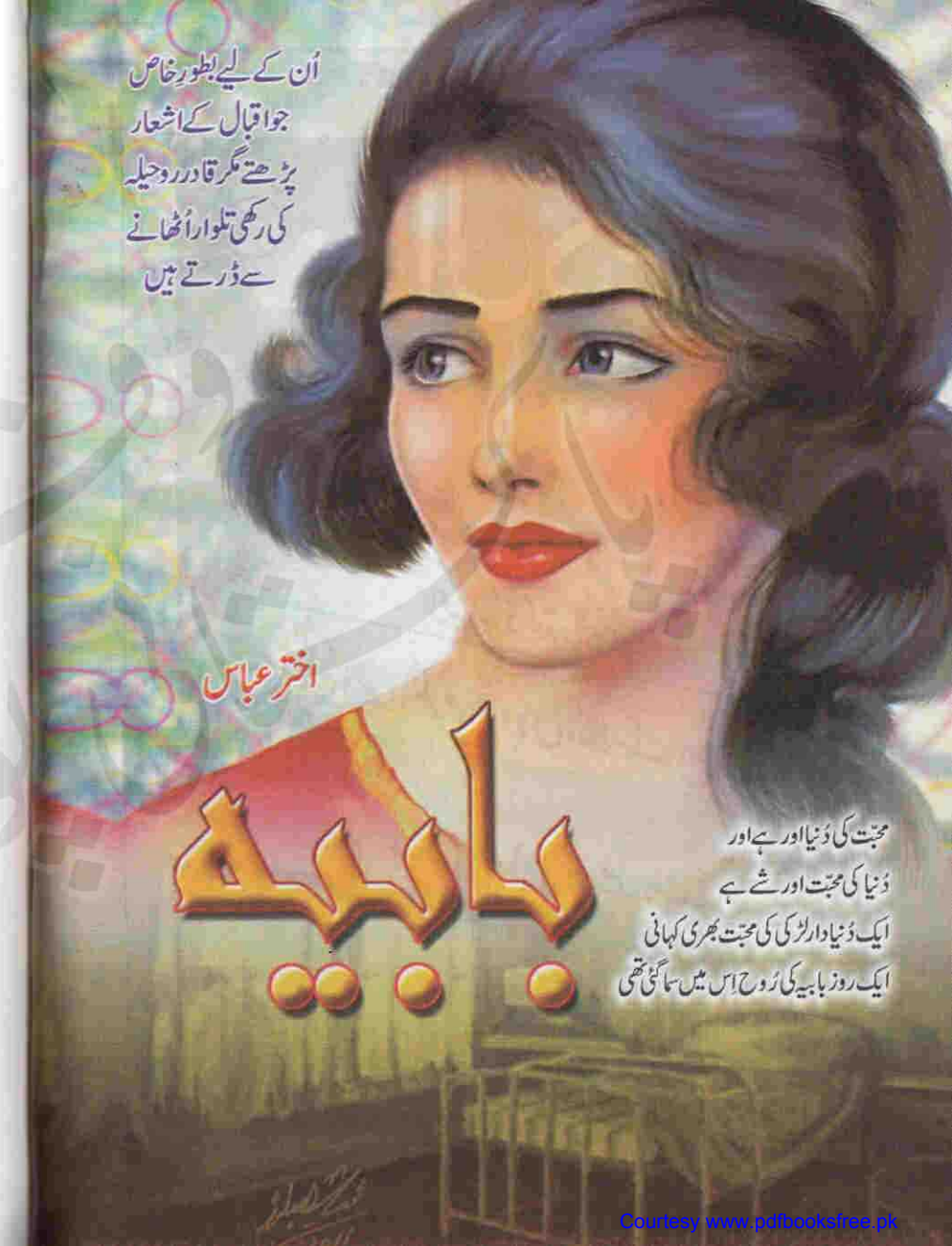

# بابیہ تمھاری

اختر عباس

یہ سہیلی تو دریا سے نکلی تازہ مچھلی جیسی ہے، ہاتھوں سے پھسلے جاتی ہے۔" جانے اِتنے سالوں بعد امی کی کہی ہوئی یہ بات میرے ساتھ آ کر کب بیٹھ گئی ہے اور میں دُکھ اور حیرت سے یوں بھری بیٹھی ہوں جیسے ہسپتال کا یہ کمرہ، بے آواز چلتے اے سی کی ٹھنڈی ہوا اور ابھی واپس جاتے ڈاکٹر کی سرد مہری اور اُس کی بتائی باتوں کی مایوسی سے بھرا ہے۔

"شرمین، شرمین" میں نے دھیرے دھیرے اسے پکارا ہے۔ وہ خود ہی تو کہا کرتی تھیں۔ "افشین! تم کو بنانے والے نے لہجے کی وہ مٹھاس دی ہے کہ کبھی بند کتاب کے کسی ورق کو کھول کر دھیرے سے پڑھ لو تو وہ لفظ زندہ ہو کر بیٹھ جائیں۔"

اُس نے میری آواز کا جواب تو درکنار، اشارے سے وصولی کی رسید تک نہیں دی۔ ایک لمحے کو میرا جی چاہا کہ اُس کو جھوٹی کہہ دوں۔ مردہ لفظوں کے زندہ ہونے کی باتیں کرنے والی خود تو زندہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کے احساس سے دُور ہے۔ وہ چپ تھی مگر وہ چپ سکون جیسی نہ تھی۔ وہ گل مہر کی طرح تھی۔ اب یوں مرجھائی سوئی پڑی ہے جیسے بیداری کی زندگی سے اُس کا کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ ابھی ابھی دروازہ کھول کر باہر جانے والا ڈاکٹر جب اُس کی رپورٹیں دیکھ کر کندھے اُچکا کر بولا تھا تو وہ مجھے کسی قحط زدہ علاقے میں کام کرنے والے اُس بے حس سرکاری ملازم جیسا لگا تھا جس کے ہاتھ ہی نہیں، دل اور لفظ بھی اُمید اور آس کے لفظوں سے خالی ہوں۔ ڈاکٹر بناتے ہوئے اِنہیں اِتنے لیکچر دیتے، اِتنی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو جو تھوڑے یقین بھرے میٹھے بول بھی سکھا دیا کریں۔ جاتے مریض کے سانس نہیں لوٹا سکتے تو ساتھ آئے ہوئے وجودوں کی سانسوں کو اپنے بے مہر لفظوں سے تو نہ روکا کریں۔ پہاڑی چشمے کے پانیوں جیسے سرد لہجے والا ڈاکٹر کیسے جان سکتا ہے کہ یہ جو خوبصورت اور معصوم سے وجود والی لڑکی آخری سانس لے رہی ہے، اِن دنوں پورے ملک میں اکیلی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی اور ماں سات سمندر پار بڑے بیٹے کی زندہ درگور ہو جانے والی بیوہ بہو کو پرسا دینے اور اپنے بیٹے اور دو معصوم بیٹیوں کی میتیں لینے گئے تھے، جہاں ہوائی اڈے پر چھوٹے بیٹے کی داڑھی دیکھ کر ایف بی آئی والوں نے اِسے تحقیقات کے لیے روک لیا اور بوڑھی ماں کو باہر جانے کا راستہ دِکھایا۔ جہاں نہ کوئی اِسے جاننے والا تھا نہ سنبھالنے والا۔ جس کی محبت اُنہیں کشاں کشاں وہاں لے گئی تھی وہ منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔

"محبّت کی دُنیا اور ہے اور دُنیا کی محبّت اور شے ہے۔"

امی یہ کہہ کر خاموش ہو جایا کرتی تھیں۔ میں شرمین کے بیڈ کے ساتھ کرسی لگائے بے دھیانی میں دُور نکل گئی تھی۔ میرے لیے لفظوں کا یہ استعمال ہی نہیں مفہوم بھی نیا تھا۔ وہ ہاتھ میں پیامِ مشرق لیے ایک شعر پہ نشان لگا کر فارغ ہوئیں تو مجھے جھنجھوڑ کر سمجھانے لگیں۔ تمہیں پتا ہے مرشد نے ایک کہانی بھی رقم کی ہے۔ وہ علامہ کا ذکر ہمیشہ مرشد کہہ کر کیا کرتیں۔ اِسی لیے اقبال مجھے غیر نہیں، اپنے اپنے بلکہ گھر کے بڑے ہی لگتے رہے ہیں۔

یہ کہانی شرف النساء کی ہے جو لاہور کے مغل گورنر عبدالصمد کی بیٹی تھی۔ یہ جی ٹی روڈ پر جو انجینئرنگ یونیورسٹی ہے، اُس کے پیچھے اِس کا مقبرہ ہے۔ زمانے گزر گئے مگر مقبرے کا نشان باقی ہے۔ اُدھر مرشد نے شہزادی کا نام امر کر دیا۔ شہزادی شرف النساء عجیب لڑکی تھی۔ خوبصورت، خوب سیرت، چلتی تو ہوائیں مسکراتیں، بات کرتی تو پھول جھڑتے۔ اِتنی پیاری ہونے کے باوجود وہ سب سے مختلف تھی، مانو کسی اور مٹی سے بنی ہوئی...... صبح اُٹھ کر پھولوں سے سجے تخت پہ تلاوت کرنے بیٹھتی تو اِس قدر خوش الحانی سے قرآن کی آیات پڑھتی کہ محل میں رہنے والے سب کام چھوڑ کر متوجہ ہو کر اُس کی بلائیں لیتے۔ کہتے ہیں اُس کی مالک سے محبت سب سے مختلف اور انوکھی تھی۔ وہ ایک کام عجیب کرتی، تلاوت کرنے سے پہلے وہ اپنی تلوار منگواتی اور اِسے نیام سے نکالتی اور پھر رحل کے اوپر رکھ لیتی۔ اُس کا یہ معمول دیکھ کر کچھ عزیزوں، کنیزوں نے بارہا وجہ دریافت کی تو شرف النساء مسکرا کر خاموش رہتی۔ اُس نے کبھی کھل کر جواب نہ دیا۔ اپنی وفات سے ذرا پہلے بالآخر اُس نے اپنی ماں پر یہ راز کھول دیا اور بولی "ماں یہ تلوار تو ایک طاقت ہے اور قرآن



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک قانون۔ قانون طاقت کے بنا نافذ نہیں ہوسکتا اور قانون کے بغیر طاقت انصاف نہیں کرسکتی۔ یہ لازم و ملزوم ہیں، اسی لیے عمر بھر ان دونوں کو ساتھ ساتھ رکھا۔"

ماں نے بیٹی کے ہونٹوں سے حکمت اور دانش بھرے جملے سن کر کیسی خوشی اور کتنا فخر محسوس کیا ہوگا، اس کا اندازہ میں بخوبی لگا سکتی ہوں کیونکہ ایک روز شرمین یہ کہانی سن کر کتنی دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کو دیکھتی رہی تھی۔ کوئی نازک اندام شہزادی اِس قدر سیانی اور دانش مند بھی ہوسکتی ہے۔ وہ ٹک ٹک امی کو دیکھ رہی تھی، جو شرف النساء کی کہانی یوں سنا رہی تھیں جیسے خود وہاں موجود ہوں۔

اب سوچتی ہوں بہت بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ جو کام خود کرنے کے خواہاں ہوں اور نہ کرسکیں تو اولاد سے اِس خواب کی تعبیر کے متمنی ہوتے ہیں۔ بن کہے بن بولے، آس لگا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ بچے وہ بڑائی کر کے دِکھائیں۔

شرف النساء کی کہانی ابھی ادھوری تھی۔ علامہ نے اُس کی قبر کے بارے میں جب یہ کہا کہ لاہور کی سرزمین عرش جیسی اعلیٰ ہے کہ وہ یہاں دفن ہے۔ یہ بتاتے ہوئے امی کی آنکھوں کی چمک بہت بڑھ گئی تھی۔ تمہیں پتا ہے پھر مرشد اقبال نے اپنے مرشد رومی کی قیادت میں جنت جانے کا تذکرہ لکھا ہے۔ جنت میں داخل ہوتے ہی اُنہیں تلاوت کی آواز سنائی دی۔ ایک خوبصورت، دل نشین، روشن اور معطر محل سے جو سارا زمرد سے بنا ہوا تھا، اُن کے سامنے تھا۔ اُس میں ایسے لعل و جواہر جڑے تھے جو آنکھوں کو خیرہ کیے دیتے تھے۔ نہ کسی نے ایسے جواہر دیکھے نہ سنے۔ معلوم ہوا وہ خوش نما محل اسی خوش گلو اور خوش فکر مغل شہزادی شرف النساء کا تھا جو دُنیا کی محبت کے بجائے مالک کی محبت میں دُنیا میں جیتی رہی تھی اور اسے پا کیزگی ہی نہیں، ہمت، جرأت اور غیرت کے نشان کے طور پر جانا جاتا تھا۔

میں کلاس میں ہمیشہ شہزادیوں کی طرح ہی جانی جاتی رہی اور اِس کی اصل وجہ میری امی تھیں۔ میرے پہناوے سے لے کر پڑھائی کی جزیات تک کا وہ ایسے ہی خیال رکھتیں جیسے کسی شہزادی کا رکھتی ہوں۔ میں پیار اور توجہ کی ندی میں اپنے والدین کے ساتھ یوں بہتی رہتی جیسے دو کشتیاں ساتھ ساتھ بہے جاتی ہیں۔ دوسروں سے محبت، خیر خواہی اور خوش گمانی کی امی نے ایسی تربیت کی کہ میرے لیے زندگی بہت آسان ہوگئی۔ شرمین سے دوستی کی ابتدا اسکول کے اِنہی دِنوں میں ہوئی۔ میں دوسروں کی خوبیوں پر جلنے اور حسد کرنے کی صلاحیت سے ہی محروم تھی۔ کسی کو آگے بڑھتے دیکھتی، کسی بات میں نمایاں پاتی تو پورے دِل سے تعریف کر دیتی۔ جہاں جہاں ممکن ہوتا، کسی توقع اور تمنا کے بنا کام آجاتی۔ شاید قدرت نے اِسی مزاج کے انعام کے طور پر میرے لہجے کو شیریں کر دیا تھا جو شرمین کو بہت بھاتا تھا۔

وہ کہتی "افشین! تُو مجھے بہت پیاری ہے۔ تیرا اچھا برا بھی بہت عزیز ہے، پر کیا کروں تیری شرف النساء میرے حلق سے نہیں اُترتی۔ مجھے تو شرمیلا نیگور پسند ہے۔ ناچتی گاتی، آزادی سے خوشیاں مناتی۔ مغلوں نے بھی ہندوستان پر راج کیا اور یہ بھی ہندوستانی ہے۔ مجھے الزبتھ ٹیلر پسند ہے، صوفیہ لورین پسند ہے۔ بڑی تہذیب، بڑا ملک اور بڑی سوچ والے لوگ ہیں، بس تو مجھ سے ناراض نہ ہونا، مجھے رنگوں کی تمیز بھی آگئی ہے اور لوگوں کی بھی۔ اچھا برا بھی اچھی طرح نظر آتا ہے لیکن میں کیا کروں..... آزادی، خود مختاری اور برابری کے لیے میرے اندر بہت تڑپ ہے۔ سارے خواب اِنہی کے ہیں۔ دیکھنا! میں آنے والے کل پر کیسے راج کرتی ہوں..... یہ دُنیا بہت بڑی ہے، آدمی سے بھی بڑی..... اِس کا شمار قطار حد، حساب ہی نہیں۔ اِس کی سمتیں فاصلے بے شمار پھر اِس میں رہتے ہوئے میں کیسے پابند ہوجاؤں۔ میں ایک دائرے میں رہنے، دیکھنے، سننے پر اپنے آپ کو آمادہ ہی نہیں کر پاتی۔ میرے لیے یہ شرف النساء کی ایک کتاب، ایک تلوار کافی نہیں ہے، میں اِس سے بہت آگے کی انسان ہوں۔" اُس کی باتیں اکثر چاول میں آئے کنکر کی طرح ہوتیں۔ کبھی چبھے جاتیں، کبھی بھول جاتیں۔ امی سے آکر ان کا تذکرہ کرتی تو وہ کہتیں "بیٹا مسابقت اور بقا کی دوڑ، بے شک آنے والے کل زندگی کی سب سے بڑی سرگرمی ہوگی۔ بنانے والے نے دُنیا کو اسی اُصول پر بنایا ہے۔ یہ ترقی کے



لیے ہے، تنزلی کے لیے نہیں۔ آگے بڑھنا، اچھا سوچنا، ترقی کا زینہ اور زندگی کا قرینہ ہے۔ یہ نہ ہو تو زندگی کی ساری دوڑ دھوپ ہی ختم ہوجائے۔ سارا کاروبارِ زندگی رُک جائے۔ مگر یاد رکھنا میری بچی! اپنے خوابوں کو اپنی ہی روایات کی مٹی میں بونا، یہ کسی اور جگہ نہ جڑ پکڑ سکیں گے نہ عزت۔ بیج کہیں پھوٹ بھی پڑے تو پھل زہریلا ہو جائے گا۔ اپنے ہیروز اپنے تصور میں زندگی کی بنیادوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ دوسروں کی بنی عمارتوں پر دُور سے خوش ہوا جاسکتا ہے، اِن کی دی ہوئی سہولتوں کے قریب جانے کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اندر داخل ہونے اور قابض ہونے کی قیمت الگ اور اِتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کنپٹیاں ہی جلا دیتی ہے۔

گیریژن سکول سے کالج اور پھر یونیورسٹی کے سفر میں شرمین کہا کرتی تھی "میری ماں نے مجھے اپنے اور مذہب کے پلو سے باندھنے کی بہت کوشش کی مگر کیا کروں یا تو گرہ ہر بار ڈھیلی ہو جاتی یا پھر میں خود اِسے ڈھیلا کر لیتی اور پلو سے نکل آتی۔"

مجھے زندگی بھر ایسی کوئی کوشش کرنے کا نہ اتفاق ہوا نہ ضرورت پیش آئی۔ میری امی نے تب ایم اے کیا تھا جب اکثریت کو ایم اے کے لفظ اُردو میں لکھنے بھی نہ آتے تھے۔ مجھے اپنی امی ہمیشہ عزیز اور محبوب رہیں کہ وہ کتابی باتیں نہ کرتی تھیں۔ اُن کے پاس جو کچھ تھا..... اقدار، روایات، خواب، سب اُن کے اپنے سوچے اور پورے یقین سے سنبھالے ہوئے خیال تھے۔ ایسے میں کوئی مصنوعی باڑ باندھنے کی نوبت ہی کیوں آتی، کسی گرہ کی ضرورت ہی کیوں رہتی۔ امی کبھی گلستان سعدی میں سے اور کبھی مرشد اقبال کی پیامِ مشرق سے جب اشعار فارسی لہجے میں پڑھتیں تو بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ بتاتیں "پیامِ مشرق جرمن مفکر گوئٹے کے پیغامِ مغرب کا جواب تھی اور دُنیا بھر میں اس کا بہت چرچا ہوا تھا۔ فارسی کی مٹھاس اور دانائی اِنہی اشعار نے مجھے عطا کی۔"

اب جب کبھی میرے میاں گھر میں کبھی کسی فارسی شعر پہ چہکتے ہیں تو مجھے آواز دیتے ہیں اور میں امی کے لہجے اور انداز میں وہ شعر اُنہیں سمجھانے بیٹھ جاتی ہوں۔ امی سچ کہتی تھیں "سچے علم سے زندگی زیادہ سمجھ آتی ہے، یہ برداشت اور تحمل کی قوت ہی فزوں نہیں کرتا، علم کا تاثیر تقسیم کرنے اور دوسروں کو آسانیاں دینے کی توفیق بھی بڑھاتا ہے۔"

"تجربوں اور کامیابی کے لیے درازیٔ عمر ضروری نہیں، کم عمری کے باوجود زندگی بہت کچھ آئینہ دکھاتی ہے۔" یہی بات تھی جو شرمین نے گزشتہ سال ہمارے گھر رات کے کھانے پر کہی تھی "گھر اور جگہوں سے کیا ہوتا ہے سب کچھ مکینوں سے ہے۔ میں نے بڑی جگہوں پہ چھوٹے لوگ اور چھوٹی جگہوں پہ بڑے لوگ دیکھے ہیں۔ ہر جگہ کی اپنی مشکلیں، آسانیاں ہوتی ہیں۔ تمہاری امی صحیح کہتی تھی کہ قیمت چکانی پڑتی ہے۔ قیمت بے شک بڑی ہے مگر میں اپنے خوابوں اور آزادی سے دستبردار نہیں ہوسکتی..... عزت، انا اور انفرادیت بھی کی قربانی دینی پڑتی ہے۔"

یونیورسٹی کے دِنوں میں ہی اُس نے ٹی وی کے لیے ماڈلنگ شروع کر دی تھی۔ پھر وہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں چلی گئی اور وہیں سے اُس نے چھلانگ لگائی اور ایک انٹرنیشنل ڈونرا یجنسی جوائن کر لی۔ اتنی کامیابی پر بھی وہ مطمئن نہ تھی۔ اُس کی نگاہ ہر طرف تھی۔ چار سمتوں کے تو صرف نام ہیں، جدھر نگاہ اُٹھتی، وہی اُس کی سمت ٹھہرتی، وہی ہدف قرار پاتی۔ ترقی کے لیے اُس کے خوابوں کو کسی پل قرار نہ تھا۔ تبھی ایک روز اُس کا فون آیا "افشین! تھوڑا وقت چاہیے تم سے، پچھلے دِنوں میں بین الاقوامی کانفرنس میں جرمنی گئی تھی۔ تمہارے اقبال صاحب پر وہاں بڑا کام ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر این میری شمل سے ملاقات بھی ہوئی اور باتیں بھی۔ آنٹی کسی مغل شہزادی کا ذکر کیا کرتی تھیں..... کوئی شریف سا نام تھا اُس کا۔ ڈاکٹر شمل نے تو کئی مغلیہ شہزادیوں کا ذکر کیا، بانگ درا ہے نا..... اُس میں غلام قادر روحیلہ پر پوری نظم تھی جو اُنہوں نے مجھے سنائی۔ کس قدر ظالم آدمی تھا یہ روحیلہ۔ طاقت اور دھوکے سے غالب آیا تو مغل بادشاہ کی آنکھیں نکال دیں پھر اس کے حرم کو رقص کا حکم دیا۔ جن شہزادیوں کا چشمِ فلک نے پورا چہرہ نہ دیکھا تھا وہ ننگے سر و ننگے پاؤں لرزتی ناچتی تھیں اور آنکھوں سے آنسو بہاتی تھیں..... پھر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اِس ظالم نے کیا کیا کہ اُٹھ کر کمر سے خنجر کھولا اور وہیں آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ جانے تھکا ہوا تھا یا فتح کے بعد کے خواب دیکھ رہا تھا، لگا سو گیا...... پھر وہ اچانک اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بادشاہ کی رانیوں اور بیٹیوں سے بولا:

''تم کو اپنے مقدر سے شکایت نہیں کرنی چاہیے۔'' میں مسند پر سویا نہ تھا، البتہ سوتا بننے میں بناوٹ تھی، تکلّف تھا کیونکہ جو معرکے مارتے ہیں وہ غالب رہتے اور فاتح قرار پاتے ہیں۔ وہ غفلت کی نیند سے دُور رہتے ہیں

یہ مقصد تھا مرا، اِس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے مرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

پھر جانے یکدم کیا ہوا شرمین پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ ''افشین! تمہیں پتا ہے کہ میں بھی اُنہی مغل شہزادیوں میں سے ہوں...... اِتنے دِنوں سے ننگے سر اور ننگے پاؤں رقص میں ہوں ...... بس میرے قادر روحیلہ کا نام بدل گیا ہے۔ وہ سات سمندر پار بیٹھ کر پل پل کی خبر رکھتا ہے، جاگتے سوتے جملے کستا ہے...... سوتا ہے تو بھی اِس یقین کے ساتھ کہ اِس کے حکم کی تعمیل میں کمی نہ ہوگی نہ رقص رُکے گا...... اور احتجاج بھی نہ ہوگا۔ تمہیں پتا ہے میرا بھائی مغل واشنگٹن ڈی سی میں تھا۔ دو معصوم بچیوں کو گھر پر اُن کی ماما کے سامنے تڑپا تڑپا کر مار دیا گیا۔ میں بھی تو Killers کے لیے کام کرتی ہوں۔ یہ اِنہی کی ڈونر ایجنسی ہے...... میں کیا کروں...... اِنہی کے اشاروں پہ ناچتی، ان کے حکموں سے مال روکتی اور ان کے وفاداروں میں تقسیم کرتی ہوں۔ اِتنا نام، منصب، مرتبہ، اپنی پوزیشن اور اختیار چھوڑوں بھی تو کیسے؟ اور وہاں ان کے ساتھ، ان کے ادارے میں رہوں بھی تو کیسے؟''

شرمین مجھے بے شک بہت پیاری تھی مگر اس جیسے لوگ عجیب ہوتے ہیں۔ اکثر ایک بند کمرے کا ایسا دروازہ بن جاتے ہیں کہ جب داخل ہوں، دم گھٹتا محسوس ہو...... اُس روز مجھے یوں لگا کہ بند کمرے میں گھٹن کم ہو رہی ہے ...... سوچ کا کہیں کوئی ننھا منا سا در کھلا ضرور تھا......

شرمین کوئی عام سی لڑکی ہوتی تو کب کی میری یادوں کی کھلی کتاب پر پڑی مٹی اوڑھ کر میٹھی نیند سو چکی ہوتی اور جو میری امی عام سی ہوتیں اور اُنہوں نے مجھے دوسروں سے محبت کرنا نہ سکھایا ہوتا۔ اختلاف رائے کے باوجود احترام اور مروت کا سبق نہ پڑھایا ہوتا تو شرمین میری محبت کے پانیوں میں تیرنے چپکے چپکے، وقفے وقفے سے کیوں آتی رہتی؟

یونیورسٹی کا آخری سال تھا جب ہم ایک اسائنمنٹ کے لیے ایوانِ اقبال گئے تھے۔ کیا بھلا سا نام تھا مصور کا...... اسلم کمال۔ ہاں علامہ اقبال کے اشعار پہ بنائے ان کے پورٹریٹ اور مصورانہ عکاسی کو شرمین کتنی ہی دیر دُنیا و مافیا سے بے نیاز دیکھتی رہی تھی...... پھر ایک خوبصورت موٹی موٹی آنکھوں والی لڑکی کے بارے میں پوچھ بیٹھی۔ دھیمے لہجے میں بات کرنے والے مصور نے بتایا کہ یہ قرۃ العین طاہرہ ہے۔ یہ اِس قدر حسین تھی کہ کسی کی نگاہ نہ ٹکتی تھی...... اِس کی شہرت حسین ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ شاعرہ ہونے کی بھی تھی۔ اس کی شاعری باغیانہ بھی تھی اور ایران کے سرکاری مذہب کے خلاف بھی...... اِس کو بابیہ کہا جاتا تھا۔ بادشاہِ وقت نے سزائے موت کا حکم سنایا اور پھر مشیروں سے کہا ''اِس کی بخشش کا کوئی سامان کرو...... اِسے کہو اپنا موقف چھوڑ دے، ہم معاف کردیں گے یا اِسے کہو ہمارے حرم میں ملکہ بن کے آجاؤ پھر بھی درگزر کریں گے اور موت سے بچالیں گے۔''

علامہ کو یہ خاتون بابیہ ہونے کے باوجود اپنی خودی کے باعث بے حد پسند تھی۔ اُنہوں نے اِس کی خودداری اور خودی پہ لکھا۔ اِس خوبصورت اور خوددار خاتون کو بعد میں گلے میں تار ڈال کر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا......

پوری بات سن کر شرمین نے کہا:

''اچھا آپ کے اقبال صاحب تو خاصے کھلے دل و دماغ کے مالک تھے۔''

اسلم کمال مسکرا کر رہ گئے۔

بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ کچھ باتیں یا واقعات آپ کے سامنے رونما ہوتے ہیں اور آپ ان کا رزلٹ نکالنے نہیں بیٹھ جاتے۔ شرمین کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوتا رہا......



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے شک کسی دوست سے ربط ضبط کبھی عقل سے سوا بھی ہو جاتا ہے، بے اختیاری سی ہو جاتی ہے۔ یہ جنون نہیں زندگی ہے اور زندہ آدمی ارادے سے ہوتا ہے۔ آدمی اپنا تو اپنے ارادے سے ہوتا ہے۔ اِس کا نام چہرہ وہی رہتا ہے، رفتار وہی، گفتار وہی...... مگر بس ایک گماں، ایک قیاس...... جانے کتنے لوگ چلتے پھرتے زندگی میں شامل رہتے ہیں مگر کوئی نہیں جانتا کہ وہ کتنے زندہ ہیں۔ ان کی زندگی کتنی اپنی اور کتنی پرائی ہے۔

☆☆

شرمین کی بے ہوشی کا یہ تیسرا دن ہے۔ کہتے ہیں دُعاؤں کی قبولیت کی بھی گھڑی ہوتی ہے۔ زندگی گزر جاتی ہے اور کسی کے لیے وہ گھڑی نہیں آتی، میں نے کچھ اور مانگا ہوتا تو وہ بھی مل جاتا۔ میں نے تو صرف شرمین کے ہوش میں آنے کی نامکمل سی دُعا کی تھی اور کیے جا رہی تھی...... اچانک وہ کسمائی اور دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں ...... مجھے دیکھا اور مسکرائی...... وہ بولنا چاہتی تھی۔ کتنے پل ہمت جمع کرتی رہی پھر اشارے سے میرا ہاتھ مانگا اور تھام کر بولی ''افشین! پتا ہے میں نے روحیلہ کا خنجر اُٹھا کر اُس پر وار کردیا ہے۔ پورے ملک میں ایجنسی کا جتنا نظام تھا وہ صرف پیسے کی تقسیم کا نہیں، وفاداریاں خریدنے کا تھا۔ اپنی مرضی کے اِن لوگوں کو کاشت کرنے کا جس کا پھل واشنگٹن میں بیٹھے بڑوں کو بھائے...... افغانستان میں ریلیف کا کچھ کام بھی میری زیر نگرانی ہوا تھا۔ وہاں ہم پیسے بھی ملک و ملت سے بے وفائی کرنے والوں کو دیتے تھے...... ضرورت مندوں کو نہیں۔ ہاں یہ تمہارے ایک ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر...... بھی کئی جگہوں پہ ریلیف کا کام کرتے ہوئے ہمارے بڑوں کو بہت چبھتے تھے، تبھی اِن کو اُٹھوا لیا گیا۔ اور بانٹو روٹیاں، اور لگاؤ روٹیوں کے پلانٹ...... کہتے تھے یہ روٹیوں کے پردے میں اُسامہ بن لادن اور اُس کی تنظیم کو ایٹمی اسلحہ دینے والا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے تو چاہے کچھ نہ کیا ہو، میں اِن کی کمر توڑنے والا کام کر چلی ہوں۔

تمہیں پتا ہے گزشتہ کئی ہفتوں سے میں نے جہاں جہاں مقامی لوگوں سے ملاقاتیں کیں، اِن کو روحیلہ کے سامنے مزید رقص سے منع کر دیا ہے۔ ان کی کمزوریوں کی فائلیں تلف کر دی ہیں، اُنہوں نے میرے ایک بھائی کو مار دیا...... ماں کو در بدر کر دیا...... دوسرا بھائی بے سروپا الزامات بھگت رہا ہے اور میں ان کے اشارے پر ان کی خدمت کے لیے لوگ تیار کیے جاتی ہوں۔ جس روز سے میں ملک سے بے وفائی کرنے والوں کا ریکارڈ اور اُن کے کارنامے اور اپنی ایجنسی کی غیر قانونی نوازشات کی فلاپیاں حکومت کے علاوہ کچھ اور حساس تنظیموں تک پہنچانے کے منصوبے پر کام کر رہی تھی وہ مجھے مزید ترقی کے مواقع دِکھانے چلے آئے تھے۔ اختیارات کی مزید آزادی...... سہولتوں کی ناقابلِ تصور جنت...... ساؤتھ ایشیا کے انچارج کے طور پر تقرری مگر رقص جاری رکھنے کی فرمائش کے ساتھ...... مگر سمجھ نہیں آئی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کبھی قرۃ العین طاہرہ نظر آتی ہے، کبھی روحیلہ اور دربار میں ناچتی شہزادیاں۔ مایوس ہو کر اُنہوں نے آفس میں ہی مجھ پر قاتلانہ حملہ کروایا شاید اِسی ڈر جس سے بابیہ کو مارا تھا ...... جب اُس نے اپنی رائے بدلنے سے انکار کر دیا تھا......

سنو افشین ......! میں جو مر گئی تو کیا تمہاری شرف النساء مجھے اپنے زمرد والے محل میں آنے دے گی...... میرے پاس قرآن اور تلوار نہ سہی...... مگر وہ مجھے اچھی لگنے لگی ہے...... تیموری شہزادیوں سے خنجر نہ اُٹھانے کی جو بھول ہوئی تھی...... میں نے اپنے تئیں کفارہ ادا کر دیا ہے۔ جان تو ویسے بھی جانی تھی اب اپنی عزت، اَنا اور خودداری کے ساتھ دے رہی ہوں۔

میں تو اِسے یقین بھی نہ دلا پائی اور وہ دریا سے نکلی کسی تازہ مچھلی کی طرح ہاتھوں سے پھسل گئی۔ شام ابھی بھیگی نہیں تھی جب اس نے مسکراتے ہوئے میرے ہاتھوں میں دم دے دیا......

بھائی بتا رہا تھا......

''وائی بلاک کے صاف ستھرے سے قبرستان میں جہاں قریب ہی ایک چھوٹا سا تالاب تمہارے آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا...... اِسے دفنا آئے ہیں......''

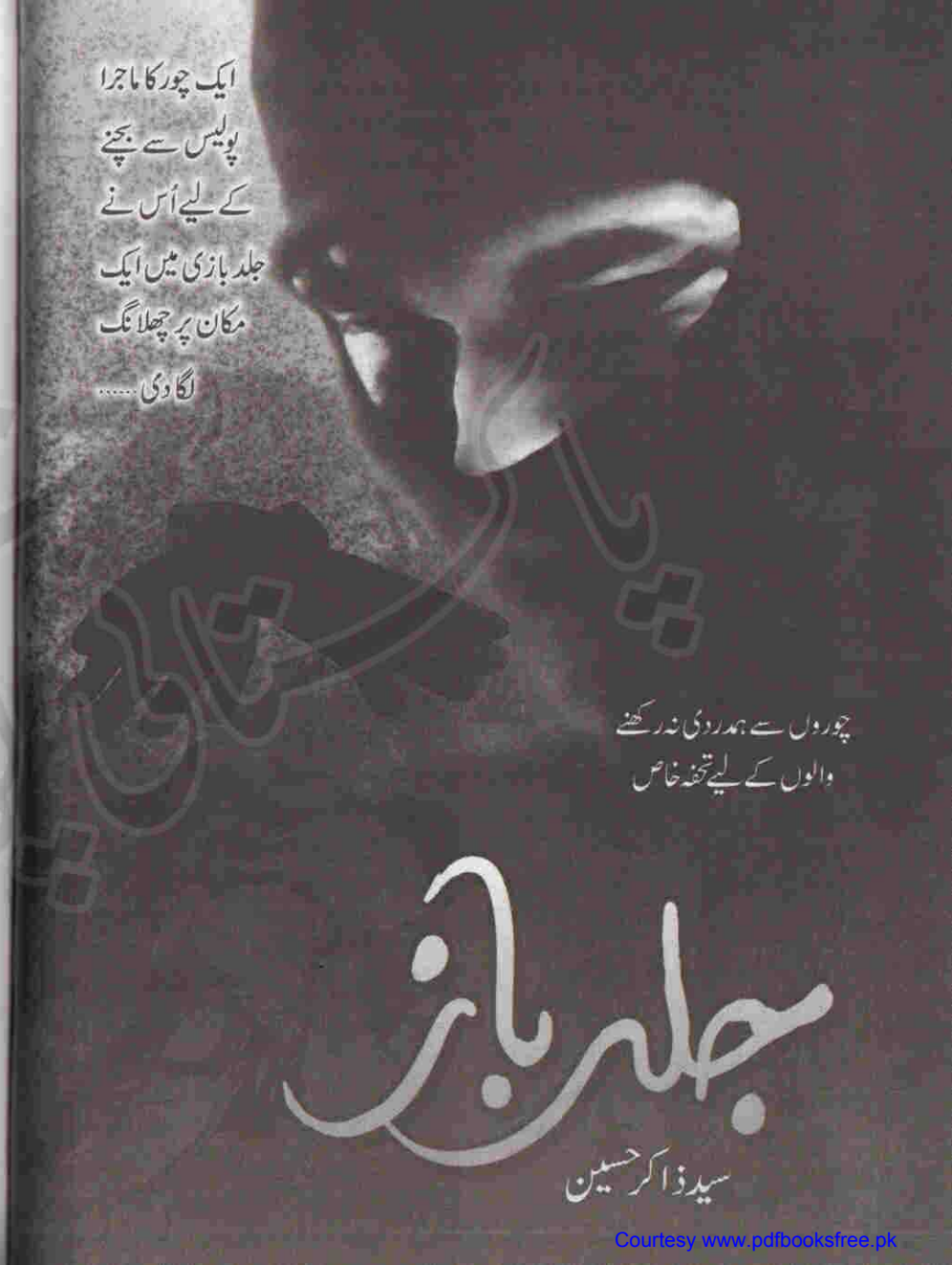

ایک چور کا ماجرا
پولیس سے بچنے
کے لیے اُس نے
جلد بازی میں ایک
مکان پر چھلانگ
لگا دی ......

چوروں سے ہمدردی نہ رکھنے
والوں کے لیے تحفہ خاص

# جلد باز

سید ذاکر حسین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نِکسن نے قد آدم آئینے میں اپنے سراپا پر نظر ڈالی اور مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ سر سے پاؤں تک چست سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ چہرے پر نقاب بھی سیاہ رنگ کا تھا جس میں آنکھوں اور ناک کی جگہ چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ پاس ہی میز پر سیاہ رنگ کا ایک بیگ پڑا تھا۔ نکسن نے اسے اٹھایا اور جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے ہی وہ رک گیا...... ''مجھے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے...... جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا اور واپس آئینے کے سامنے آگیا۔

نِکسن ایک کامیاب چور تھا۔ قفل شکنی میں اس کی مہارت مسلّمہ تھی۔ مضبوط سے مضبوط اور پیچیدہ سے پیچیدہ تالا بھی اس کے سامنے دو منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ وہ ذہین بھی تھا اور موقع شناس بھی...... لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود اس میں ایک خامی تھی...... وہ بہت جلد باز تھا۔ ہر کام چاہتا تھا کہ فوراً ہو جائے۔ اپنی اسی جلد بازی کی وجہ سے وہ کئی بار جیل کی ہوا کھا چکا تھا۔

اس وقت وہ ایک فلیٹ میں نقب لگانے کی تیاری کر رہا اور خود کو سمجھا رہا تھا کہ جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ یہ جملہ کئی بار اپنے ذہن میں دہرانے کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی تیاری کا جائزہ لیا۔ بیگ کھول کر تالا توڑنے کے آلات چیک کیے۔ اس علاقے کا نقشہ دیکھا جہاں وہ مطلوبہ فلیٹ تھا۔ ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے بیگ سنبھالا اور اپنے فلیٹ کو تالا لگا کر منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

مطلوبہ عمارت تک پہنچ کر اس نے آس پاس کا جائزہ لیا اور محتاط قدموں سے چلتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ اکثر فلیٹوں کی روشنیاں گل تھیں اور اچھا خاصا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ مطلوبہ فلیٹ میں تالا لگا ہوا تھا۔ لوگ موجود نہیں تھے۔ یہ بات وہ پہلے سے جانتا تھا۔ اسی لیے اس نے آج کی رات کا انتخاب کیا تھا۔

اس نے بیگ کھول کر اوزار نکالے۔ ایک بار پھر چاروں طرف کا جائزہ لیا اور تالا کھولنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لیکن تالا کھلتے ہی خطرے کا الارم بجنا شروع ہوگیا تھا۔ نکسن ایک دم گھبرا گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس عام سے فلیٹ میں حفاظت کا اتنا جدید انتظام کیا گیا ہوگا۔ وہ ایسی کسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ یہاں سے فوراً نکلنا چاہیے اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا تو پولیس کی ایک گشتی وین وہاں آکر رکتی ہوئی نظر آئی یقیناً انہوں نے الارم سن لیا تھا۔ دو پولیس والے اتر کر تیزی سے بلڈنگ کی طرف بھاگے۔ انہیں دیکھ کر تو نکسن بالکل ہی بدحواس ہوگیا، اس نے اپنے اوزار سنبھالے اور سیڑھیوں سے اوپر کی جانب دوڑ لگا دی۔

وہ جلد از جلد اس عمارت سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ عمارت کی چھت پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ دیوار سے ملی ہوئی ایک اور بلڈنگ کی چھت تھی جو خاصی نیچی تھی۔ اس چھت پر کودنا گویا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا لیکن نکسن جیل جانے سے مر جانا بہتر سمجھتا تھا۔ اس کے گزشتہ تجربے نے ثابت کر دیا تھا کہ چوری کے جرم میں جیل جانے سے بہتر ہے کہ خودکشی کر لی جائے۔ جیل میں چوروں کے ساتھ جو ظالمانہ اور انسانیت سوز غیر اخلاقی سلوک کیا جاتا تھا اس کے تصور ہی سے نکسن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

اس نے اپنے پیچھے سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے بھاری بوٹوں کی آواز سنی جو لحہ بہ لحہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ وقت کم تھا اور جو بھی فیصلہ کرنا تھا فوراً کرنا تھا۔ نکسن نے چھت پر کودنے کا فیصلہ کیا اور آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی۔ اسے یقین تھا کہ چند سیکنڈ کے بعد اس کا جسم پختہ چھت سے ٹکرائے گا اور اس کی کئی ہڈیاں چکنا چور ہو جائیں گی۔ آنے والے تکلیف دہ لمحات کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ کسی ٹھوس شے سے ٹکرایا

## قرآن کے سائے میں زندگی

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے جب ملک شام فتح کیا تو ان کے وزراء نے نئے مفتوحہ ملک کا جائزہ لینے کے بعد سلطان کی خدمت میں عرض کہ کیا کہ جناب والا! یہ نصرانیوں کا ملک ہے، یہاں کے لوگ نہایت ہی سرکش مزاج اور سخت جان واقع ہوئے ہیں، اس لیے ہمارا آپ کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ ان کے لیے سخت گیری کی ضرورت ہے لیکن چونکہ اسلام کے سیاسی اُصول بہت نرم ہیں، لہٰذا آپ کو مشورہ ہے کہ احکام اسلام کے علاوہ بھی اگر کچھ اور قوانین نافذ کر دیے جائیں تو یہاں لوگوں پر قابو رکھنے میں آسانی ہوگی، حکومت کو استحکام حاصل ہوگا اور وہ تمام قوتیں جو نظام حکومت کو کمزور کرنے والی ہیں، کچلی جاسکیں گی۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا چہرہ وزراء کی باتیں سن کر متغیر ہوگیا۔ فرمانے لگے ”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے یہ جو ملک فتح کیا ہے، اس لیے فتح کیا ہے کہ اپنی حکومت اور سلطنت قائم کروں اور لوگوں کی گردنوں پر اپنی غلامی کا جوا رکھوں؟ تم میری بات کان کھول کر سن لو کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ میں نے محض اللہ کو خوش کرنے کے لیے اور اس کی رضا کی خاطر یہ ساری کوششیں کی ہیں۔ میں تو صرف اپنے ملک کا چاکر ہوں، میں اپنا حکم ہرگز نافذ نہیں کروں گا۔ یہ ملک رہے یا جائے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ تم اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ میں کوئی بھی حکم قرآن وسنت کے خلاف صادر نہیں کرسکتا اور قرآن وسنت کی مخالفت میں کوئی بھی کوشش ہرگز کامیاب نہیں ہونے دوں گا کیونکہ قرآن اللہ کا فرمان اور سنتِ رسول ﷺ کی امانت ہے۔ انسانیت کی فلاح مومن ہو یا کافر، انہی دونوں پر عمل کرنے میں ہے۔“

سلطان نے قاضیوں اور مفتیوں کا تقرر کیا، ہر مذہب کے ماننے والوں کو مکمل آزادی دی۔ مملکت کے ہر فرد کو تحفظ کا احساس ملا۔ جس طرح مسجدیں محفوظ تھیں، دیگر مذاہب کے عبادت خانے بھی محفوظ تھے۔ ہر مذہب کا ماننے والا یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ قرآن کے سائے میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ جس نے اعلان کر رکھا تھا تا کہ دین میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے۔

کچھ عرصہ بعد شام میں عظیم انقلاب آیا۔ کہاں تو شام نصرانی اکثریت کا ملک تھا اور کہاں مسلم اکثریت کا علاقہ بن گیا، تلوار کے زور پر نہیں، نہ مال ودولت کا لالچ دے کر بلکہ اسلام کی برکتوں نے اہل شام کو یہ بتا دیا کہ یہی وہ دین ہے جو انسانیت کو ہر قسم کے جبر واستحصال سے نجات دلا سکتا ہے۔ اہل شام کو اسلام کی رحمتوں سے روشناس کرانے والا آج بھی شام کی خاک میں محو استراحت ہے۔

(علی شیر زاہد، لاہور)

تو اسے احساس ہوا کہ کسی نرم وجود نے اسے تھام لیا ہے جو پہلے تو اس کے وزن سے نیچے دبتا چلا گیا اور پھر اس نے آہستہ سے نکسن کو اوپر اچھال دیا۔

وہ سخت حیران تھا۔ ایک پل کے لیے تو اس کا دماغ سن ہو کر رہ گیا اور وہ چت لیٹا خالی خالی نظروں سے فضا میں گھورتا رہا۔ جب حواس قابو میں آئے تو اس نے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہ نرم شے دراصل فوم کے ناکارہ گدے تھے جنہیں مالک مکان نے چھت پر پھینک دیا تھا۔ قدرت کی اس مہربانی پر اس نے رب کا شکر ادا کیا اور اچھل کر ان گدوں سے نیچے اتر آیا...... بہت اوپر جہاں تھوڑی دیر پہلے نکسن موجود تھا اب پولیس کے سپاہیوں کے ہیولے نظر آرہے تھے جو نیچے جھانک کر شاید اسے تلاش کر رہے تھے وہ زیرلب مسکرایا اور ہاتھ ہلا کر انہیں ٹاٹا کیا۔

لیکن اس کی مسکراہٹ اس وقت دم توڑ گئی جب اس نے ایک سپاہی کو اپنا نشانہ لے کر فائر کرتے دیکھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور پھرتی سے نیچے اترنے لگا۔ اس نے فائر کی آواز سنی لیکن گولی اسے نقصان پہنچائے بغیر کہیں اندھیرے میں گم ہوگئی۔

وہ دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا گراؤنڈ فلور تک پہنچا اور پھر جونہی اس نے سیڑھیوں کے دروازے سے باہر قدم رکھا اس کا بدن سن ہو کر رہ گیا۔ اس نے سامنے سے دو پولیس کانسٹیبلوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر اس نے جلد بازی سے کام لیا تھا اور جلد بازی میں یہ بھول گیا تھا کہ جس بلڈنگ کی چھت پر وہ کودا تھا وہ پولیس اسٹیشن کی بلڈنگ تھی۔






Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# میرا

سوال سن کر والد صاحب چونک پڑے اور ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئے، میرے گال پر ایک چپت لگائی اور سوچ میں غرق ہو گئے۔

میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ میرے اندر کا بیٹا دہل گیا اور میں نے ان کے پاؤں پر سر رکھ دیا اور کہا کہ میں آپ کی عظمت کا گرویدہ ہوں مگر مجھے بے حد شوق ہے کہ آپ کے حالات جان سکوں۔ اگر کبھی زندگی نے مہلت دی تو اسے کتابی شکل میں ضرور شائع کروں گا۔ فرمانے لگے کہ بیٹا جب میں نے تمھاری بڑی بہنوں کی شادیاں کیں تو ۵۰۰ روپے چچا ارشاد سے اُدھار لیے تھے اور اپنی ایک دو نالی بندوق فروخت کی تھی اور ایک گھوڑی جو کہ مجھے بہت پیاری تھی، فروخت کی تھی اور کپڑا تمھارے پھوپھا حاجی فیض الرحمان صاحب سے اُدھار لیا تھا۔

کہنے کو تو اس وقت میں ایک ایس ایچ او تھا مگر میرے مالی حالات انتہائی سفید پوشی والے تھے۔ جب میری تعیناتی ۱۹۵۴ء میں صادق آباد میں ہوئی تو صادق آباد تھانہ بہاولپور ڈویژن کا سب سے اچھا تھانہ تھا۔ لوگ بڑی سفارشوں اور چاہت سے اپنی تعیناتی صادق آباد تھانہ میں کروایا کرتے۔ ۱۹۵۴ء میں یہ تھانہ اعلیٰ حکام کو چار ہزار روپے ماہوار دیا کرتا تھا۔ جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ میری تعیناتی صادق آباد تھانے میں کر دی گئی ہے تو میں رات بھر سو نہ سکا۔ صبح سب سے پہلے میں اپنے ایس پی صاحب ملک محمد بشیر وارن صاحب کے پاس پیش ہو گیا اور اپنی پریشانی کا اظہار کیا کہ چار ہزار روپے کی رقم تو میری سالانہ تنخواہ سے بھی زیادہ ہے اور میں کیوں دوسروں کے لیے ظلم کا بازار گرم کر کے یہ رقم وصول کروں۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے مجاز حکام سے بات کر لی ہے، آپ کو ایک پیسہ بھی نہیں دینا پڑے گا کیونکہ اس وقت اس علاقے میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور آپ کو اس علاقے میں ایک خاص مقصد اور مشن کے تحت بھیجا جا رہا ہے۔ لوٹ مار، اغوا، چوری، رسا گیری زمیندار لوگوں کو شیوا بن چکی ہے اور امیر غریب کو جینے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں۔ آپ نے صرف قانون اور حکومت کی عملداری قائم کرنی ہے جس کے لیے آپ کو پورے اختیارات حاصل ہوں گے۔ لہٰذا میں نے اپنے تبادلے کے احکامات وصول کرنے کے بعد بطور ایس ایچ او تھانہ صادق آباد کا انتظام سنبھال لیا۔

سب سے پہلے جو شخص مجھ سے ملنے آیا، وہ چوہدری برکت تھا۔ منشی تھانہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ پولیس کا خیر خواہ ہے اور آنے والے ایس ایچ او کا تمام خرچ برداشت کرتا ہے اور تمام آسامیوں سے رقم وصول کر کے تھانے میں پہنچا دیتا ہے۔ میں نے منشی سے کہا کہ میری میز کے سامنے سے کرسی اٹھا کے ایک طرف رکھ دو اور چوہدری برکت کو بھیج دو۔ میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان آدمی نہایت اجلے اور سفید پارچات میں ملبوس اندر داخل ہوا اور نہایت بے تکلفی سے ہاتھ ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ برکت کیسے آنا ہوا تو اس نے چاپلوسی کرتے ہوئے کہا کہ حضور کی زیارت کرنے آیا ہوں۔ اگر کوئی حکم ہو تو تعمیل ہو گی۔

میں نے اسے کہا کہ اگر میں نے تمھیں آئندہ تھانے میں دیکھا تو تمھیں حوالات میں بند کر دوں گا اور جب تک میں اس تھانے میں تعینات ہوں، تم کبھی ادھر آنے کی غلطی نہ کرنا۔ وہ جلدی سے باہر چلا گیا اور پھر واقعی میں نے اس کی شکل نہ دیکھی اور اس طرح ایک بہت بڑے چٹی دلال سے چھٹکارا مل گیا۔

دوسرا شخص جو مجھ سے ملنے آیا، وہ سرفراز سمیترا تھا۔ گرمیوں کی ایک شام تھی۔ تھانے کے صحن میں دفتر لگا ہوا تھا کہ ایک سپاہی بھاگا بھاگا آیا اور سیلوٹ کر کے کہنے لگا کہ سرفراز سمیترا صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ذات شریف ہے؟ محرر تھانہ کہنے لگا کہ بہت بڑا زمیندار ہے اور مخدوموں کی ناک کا بال ہے۔ میں اس وقت تھانہ کا ریکارڈ ملاحظہ کر رہا تھا کہ کتنے اشتہاری مجرم کون کون سے رجسٹرڈ کیسوں میں مطلوب ہیں



اور کتنے گرفتار نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کے علاوہ کون کون سے بڑے بڑے رئیس رسا گیر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اتفاق سے سرفراز سمیترا والا صفحہ میرے سامنے تھا۔ میں نے اس صفحے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محرر تھانہ سے پوچھا کہ کیا یہ ہی سرفراز ہے؟ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اتنے میں سرفراز سمیترا صاحب دو سپاہیوں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہو کر بغیر میری اجازت کے کرسی پر بھی بیٹھ چکے تھے۔ سلام دعا کے بعد میں نے پوچھا کہ سرفراز کیسے آنا ہوا؟ اس نے کہا، میں جناب کے لیے کچا بستہ لے آیا ہوں۔ (کچے بستے سے مراد کھانے پکانے کا سامان ہے۔ اگر آپ کسی کو پکا ہوا امیرانہ کھانا بھجوائیں تو پکا بستہ اور اگر آپ کسی کو کھانا پکانے کے لیے سامان بھجوائیں، جیسا کہ بکرے، مرغیاں، گھی، چاول، گندم وغیرہ تو وہ کچا بستہ کہلائے گا)۔

میرے دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ باہر میری جیپ میں موجود ہے۔ میں نے اسے کہا کہ باہر جائے اور سامان اٹھوا کر یہاں میرے کمرے میں لے آئے۔ وہ جی حضور کہتا ہوا خوشی خوشی باہر سامان اٹھوانے چلا گیا۔ میں نے محرر سے کہا کہ اس کے خلاف جتنے کیس اس تھانہ میں رجسٹرڈ ہیں، اس کی فہرست بنائے اور تین ہتھکڑیاں اور تین سپاہی فوراً میرے حکم کے انتظار میں رہیں۔ محرر نے مجھے منع کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ جناب یہ سیکڑوں ایکڑ زرعی اراضی کا مالک ہے، مخدوم زادہ حسن محمود وزیر اعلیٰ بہاولپور کا خاص آدمی ہے، اسے آج تک کوئی بھی پولیس افسر گرفتار نہیں کر سکا، آپ یہ کیا کرنے لگے ہیں۔

میں نے جب گھور کر اپنے محرر کو دیکھا تو وہ سہم گیا اور کہنے لگا، جناب سوچ لیں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ اگر میرے حکم پر تم نے ہتھکڑی اس کے ہاتھوں میں نہ پہنائی تو میں خود تمھارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دوں گا۔ اسی اثناء میں، میں نے دیکھا کہ ایک بوری چاول، دو بوری گندم، چار بکرے، ایک ٹوکرا مرغیوں کا، دو ٹین دیسی گھی، گڑ اور شکر کے تھیلے لائے جا رہے تھے۔ میں نے محرر اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ تینوں کو گرفتار کر لیں۔ انھوں نے فوراً تینوں کو ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ میں نے محرر کو دوسرا حکم دیا کہ تمام سامان کی فرد بنا کر مال خانے میں جمع کرا دیں اور ایک نیا کیس رجسٹرڈ کر دیں۔ دیگر جتنے بھی کیس ان کے خلاف التواء میں پڑے ہیں، ان سب میں انہیں گرفتار کر لیں اور صبح انھیں پیدل ہی عدالت میں لے جا کر ان کا جسمانی ریمانڈ حاصل کریں تا کہ تفتیش کی جا سکے۔

میں نے ایک سپیشل رپورٹ تیار کی اور ڈسٹرکٹ کے دیگر تھانوں میں بھجوائی کہ میرے تھانے میں سرفراز سمیترا گرفتار ہے، اگر اس کے خلاف کسی بھی تھانے میں کوئی کیس رجسٹرڈ ہے تو آ کر ان کیسوں میں اس کی گرفتاری ڈالیں۔ پورے علاقے میں ہائے ہائے پڑ گئی کہ یہ کون تھانیدار آیا ہے جس نے سرفراز کو گرفتار کر لیا ہے۔ وہ بھی اس سے پہلے گرفتار نہ ہوا تھا اور میں نے ہی اس کو غنڈہ ایکٹ میں چالان کر کے اس کا قلندرہ کھول دیا کیونکہ وہ بہت بڑا رسا گیر تھا۔ ابھی وہ میرے زیر تفتیش ہی تھا کہ مخدوم زادہ حسن محمود وزیر اعلیٰ ریاست بہاولپور بذریعہ ٹرین کراچی جاتے ہوئے صادق آباد سے گزرے۔ چونکہ ٹرین نے صادق آباد ریلوے اسٹیشن پر رک کر جانا تھا اس لیے حفاظت کی ذمے داری میرے تھانہ کی تھی۔

ٹرین مقررہ وقت پر ریلوے اسٹیشن صادق آباد پہنچ گئی۔ وزیر اعلیٰ کا ریلوے سیلون ٹرین کے درمیانی حصہ میں تھا۔ وزیر اعلیٰ مخدوم زادہ حسن محمود اپنے سیلون کے دروازے میں کھڑے اپنے عوام کے پر جوش نعروں کا جواب ہاتھ لہرا لہرا کر دے رہے تھے کیونکہ صادق آباد ان کا اپنا آبائی علاقہ تھا اور وہ یہیں کے رہنے والے تھے، اس لیے عوامی جوش و خروش بہت زیادہ تھا۔ میں ان کے سامنے عوامی ریلے کو روکے کھڑا تھا کہ ٹرین نے روانگی کی سیٹی بجا دی جس پر میں نے سکھ کا سانس لیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سب خیریت رہی۔

اسی اثناء میں کیا دیکھتا ہوں کہ ٹرین کا گارڈ اور ڈرائیور بھاگے بھاگے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹرین کے انجن کے سامنے ایک ہجوم پٹری پر لیٹا ہے اور مصر ہے کہ وزیراعلیٰ صاحب جب تک ہماری فریاد نہیں سنیں گے ہم پٹری پر ہی جان دے دیں گے۔ وزیراعلیٰ نے بھی یہ بات سن لی اور مجھے حکم دیا کہ انہیں میرے سامنے پیش ہونے سے نہ روکا جائے۔ میں اور میرے سٹاف نے گاڑی کا دروازہ نہ چھوڑا کیونکہ وزیراعلیٰ کی حفاظت کا معاملہ تھا۔ میں نے اپنے دیگر عملے کو حکم دیا کہ جو لوگ بھی گاڑی کے آگے پٹری پر لیٹے ہوئے ہیں، انہیں وزیراعلیٰ صاحب کے سامنے پیش کیا جائے۔

اسی اثناء میں مجھے میرے محرر نے کان میں بتایا کہ یہ سب جرائم پیشہ لوگ ہیں اور پولیس کو مطلوب ہیں۔ اکثر کے خلاف عرصہ دراز سے تھانہ میں کیس رجسٹرڈ ہو کر التواء میں پڑے ہیں، سیاسی اثر و رسوخ کی وجہ سے انہیں گرفتار نہیں کیا جا سکا۔ میں نے اپنے محرر کو حکم دیا کہ وزیراعلیٰ کو میں خود جواب دوں گا۔ جیسے ہی گاڑی روانہ ہو، پولیس کی تمام نفری انہیں گھیرے میں لے کر گرفتار کر لے۔

کچھ ہی لمحوں میں سپاہی ان لوگوں کو لے کر وزیراعلیٰ کے سامنے پیش ہو گئے کہ یہ لوگ آپ سے ملنے کے لیے پٹری پر لیٹے ہوئے تھے۔ وزیراعلیٰ نے ان کی طرف دیکھ کر ان کی خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ انہیں کیا تکلیف ہے تو انھوں نے بہت واویلا کیا اور کہا کہ ایس۔ایچ۔او بہت ظالم شخص ہے، بہت ظلم کرتا ہے، اسے فوراً یہاں سے تبدیل کیا جائے۔ وزیراعلیٰ نے میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے جواب دیا کہ یہ شخص جو ریلوے کی پٹری پر لیٹنے والوں کا سرغنہ ہے اس کے خلاف اغوا، ڈکیتی اور آبروریزی کے چار کیس رجسٹرڈ ہیں جو کہ میری تعیناتی سے پہلے کے ہیں۔ اسی طرح میرے محرر نے سب لوگوں کے بارے میں بتایا کہ ان میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کے خلاف کیس رجسٹرڈ نہ ہوں اور یہ کہ یہ سب اشتہاری ہیں، رسا گیر ہیں اور سب کے سب جرائم پیشہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پولیس کو بھی دھمکاتے ہیں، اپنے اثر و رسوخ سے ڈراتے ہیں۔

میں نے فوراً وزیراعلیٰ سے کہا کہ جیسے ہی آپ کی گاڑی روانہ ہوگی، میں ان سب کو گرفتار کر لوں گا، یہ میرے گھیرے میں ہیں۔ ابھی یہ بیان جاری تھا کہ کچھ معززین کا ایک گروہ جو کہ صادق آباد کے کاروباری طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، جن میں کچھ تاجر اور کاشتکار تھے، وزیراعلیٰ مخدوم زادہ حسن محمود زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا وزیراعلیٰ کے سیلون کے سامنے آ کر رک گیا۔ وزیراعلیٰ نے جواب طلب نظروں سے دیکھا تو ان کے لیڈر نے بتایا کہ ایس۔ایچ۔او بہت نیک اور شریف آدمی ہے، رشوت بالکل نہیں لیتا، کھانا اپنے گھر سے کھاتا ہے، بازار سے جو چیز بھی منگواتا ہے، پہلے پیسے دیتا ہے پھر یہ چیز لیتا ہے۔ جب سے اس کی یہاں تعیناتی ہوئی، شہر میں چوری چکاری بالکل ختم ہو گئی ہے، دیگر جرائم بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ واحد ایس۔ایچ۔او ہے جس نے سرفراز جیسے رسا گیر کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کیا ہے۔ ہاں! شریف اور غریب آدمی کی بہت عزت کرتا ہے۔

چٹی دلالوں کا داخلہ تھانے میں بند ہے البتہ چوروں، لٹیروں اور رسا گیروں کو ٹھیک ٹھاک جوتے مارتا ہے۔ وزیراعلیٰ کو علاقے کے حالات کا علم تھا۔ انھوں نے ہی ڈی۔آئی۔جی محمد رحیم الدین بغاری کو یہ ذمے داری سونپی تھی کہ ایس۔ایچ۔او ایسے آدمی کو لگائیں جو ایماندار ہو اور علاقے کو جرائم سے پاک کر دے۔ موقع پر ہی وزیراعلیٰ نے مجھے کہا کہ آپ اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے جو بھی حد عبور کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور میری یعنی وزیراعلیٰ کی پیشگی اجازت کے بغیر ایس۔ایچ۔او کو تبدیل نہ کیا جائے۔

ٹرین نے روانگی کی سیٹی بجادی اور رینگنا شروع کر دیا۔ وزیراعلیٰ ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنے سیلون میں چلے گئے۔ میرے حکم دینے کی دیر تھی کہ تمام گارڈ بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے اور تمام جرائم پیشہ افراد جن کے خلاف تھانہ میں کیس رجسٹرڈ تھے اور وہ پولیس کو مطلوب تھے، گرفتار کر لیے گئے جن میں بڑے زمین دار، ان کے بدمعاش اور رسا گیر بھی تھے۔ جب گرفتاریاں مکمل ہو گئیں



تو میں نے محرر سے کہا کہ انھیں دیکھو، اگر کوئی بھاگنے میں کامیاب ہوا ہے تو فوراً گارڈ تیار کرو، میں ابھی ان کے پیچھے جاؤں گا۔ اس نے دیکھنے کے بعد جواب دیا کہ کوئی بھی بھاگنے میں کامیاب نہیں ہو سکا، سب گرفتار ہیں۔ میں نے دوسرا حکم یہ دیا کہ ان سب کو صادق آباد شہر میں سے جوتے مارتے ہوئے لے کر جاؤ تاکہ عام آدمی ان کا حشر دیکھے اور ان کی عوام پر جو دہشت ہے وہ ختم ہو۔ چھوٹے موٹے جرائم پیشہ افراد ان کا حشر دیکھ کر نصیحت پکڑیں۔

جب یہ لوگ حوالات میں بند تھے تو عوام کی طرف سے ان کے خلاف درخواستیں آنی شروع ہو گئیں۔ میں ان درخواستوں پر باقاعدہ تفتیش کرتا۔ اگر حالات و واقعات صحیح ہوتے تو فوراً کیس رجسٹر کرتا اور معمولی قسم کی شکایات پر صرف سرزنش کرتا اور ان کو شرم دلاتا تاکہ ان کا مردہ ضمیر جاگ جائے اور یہ جرائم کی دنیا ترک کر کے اچھے انسان بن جائیں۔

والدِ محترم پھر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے اگر میں رشوت لینا چاہتا تو ان سے فی کس مجھے پانچ ہزار رشوت کی پیشکش کی گئی تھی اور اکیلے سرفراز نے ایک لاکھ تک کی بولی لگا دی تھی جبکہ سونے کی قیمت اس وقت ۶۰ روپے فی تولہ تھی۔

ایک بار میں نے ان سے پوچھا ابا جان! کبھی آپ نے کسی کی سفارش پر کسی کو ناجائز فائدہ پہنچایا تو وہ ہنسنے لگے اور فرمایا کہ مجھے سفارش کرنے کی کوئی جرأت نہ کرتا تھا۔ ایک بار ایک ایم۔این۔اے نے کسی جرائم پیشہ کو سفارشی خط دے کر میرے پاس بھیجا۔ میں تھانے میں بیٹھا تھا کہ ایک سب انسپکٹر نے آ کر مجھے بتایا کہ جس ملزم کو گرفتار کرنے کے لیے کل آپ نے مجھے ایک مشل دی تھی، وہ تھانے میں محرر کے پاس بیٹھا ہوا ہے اور اس کے پاس ایک ایم۔این۔اے کا سفارشی خط ہے۔ خط کیا ہے، آپ کے نام پورا ایک حکم نامہ ہے۔ اب آپ کا مزید کیا حکم ہے؟

میں نے اس سب انسپکٹر سے کہا کہ اسے میرے پاس آنے دیا جائے۔ جب وہ آیا تو آتے ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا کہ کھڑے ہو جاؤ اور کھڑے ہو کر بیان کرو کہ کیسے آنا ہوا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور خط جو کہ لفافے میں تھا، میری طرف بڑھایا۔ میں نے اسی سب انسپکٹر سے کہا کہ خط پڑھ کر سناؤ۔ اس نے کہا کہ میں نے خط پڑھا ہے۔ میں نے کہا، نہیں، دوبارہ با آواز بلند اس کے سامنے پڑھ کر سناؤ۔ سب انسپکٹر نے خط نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ جب خط ختم ہو گیا تو میں نے کہا کہ اس میں سے السلام علیکم اور دیگر متبرک الفاظ پھاڑ لیے جائیں اور خط کو دس جوتے مارے جائیں۔ لہٰذا اسی طرح ہی کیا گیا۔ اب میں نے کہا کہ ۲۰ روپے جوتے اس چور اچکے کو لگائے جائیں اور اس کو رجسٹر شدہ مقدمے میں گرفتار کر لیا جائے۔ میں نے مزید کہا کہ اگر تمھارا ایم این اے خود آ کر تمھاری سفارش کرتا تو وہ بھی جوتوں کا حقدار ہوتا۔

ایک اور واقعہ انھوں نے بتایا کہ میں بہاولپور سے پندرہ بیس میل دور ایک تھانہ میں تعینات تھا کہ رات کے وقت ایک شریف آدمی نے آ کر ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے اسے اپنی رہائش گاہ پر ہی بلوالیا۔ خیریت وغیرہ دریافت کرنے کے بعد میں نے اسے کہا کہ اس وقت آنے کا مقصد بیان کرو تو وہ بولا کہ میں نے آپ کی نیک نامی اور اچھی شہرت سن رکھی ہے، اس لیے آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں گو کہ میرا ذاتی طور پر اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا، اگر اس سارے واقعہ میں میرا نام کہیں بھی آ گیا تو بڑا شیخ مجھے میرے خاندان سمیت قتل کرا دے گا۔ میں غریب آدمی ہوں اور صاحب اولاد

## صحیح طریقہ

شادی والے گھر میں اچانک کسی نے آواز لگائی۔

"مکان میں بم موجود ہے"۔

یہ سننا تھا کہ ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ تمام سامان باہر پھینک دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا گھر خالی ہو گیا۔ ایک صاحب گلی کے کونے سے اپنے نوکر کے ساتھ نمودار ہوئے اور چیخ کر بولے "مکان کو تالا لگا دے چھوٹو! کم بخت کرائے داروں نے آٹھ سال سے اس پر قبضہ جما رکھا ہے۔"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔ کوئی صاحب اولاد ہی کسی دوسرے کی اولاد کا غم محسوس کرسکتا ہے۔

اس کا انداز گفتگو بہت ہی دھیما تھا اور بہت نپے تلے الفاظ بول رہا تھا۔ میں اس کی بات بہت غور سے سن رہا تھا۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور کہا کہ فکر نہ کرو اور نہ ہی کچھ خطرہ محسوس کرو، سمجھو کہ آپ اپنے بڑے بھائی سے بات کررہے ہیں اور آپ کی حفاظت میرا فرض ہے۔ آپ بغیر پیشگی تمہید کے اصل بات بیان کریں۔

اس نے بتایا کہ اس کے گھر کے قریب ہی ایک غریب موچی کا گھر ہے۔ دو روز سے اس کی بیٹی غائب ہے۔ وہ کھیت میں بکری کے لیے گھاس کاٹ رہی تھی کہ غائب ہوگئی۔ لڑکی جوان اور بہت خوبصورت ہے۔ دونوں میاں بیوی اور ان کے دیگر بچے اس لڑکی کو تلاش کرتے رہے۔ آخرکار انھوں نے کسی نہ کسی طرح پتا چلالیا ہے کہ لڑکی بڑے شیخ نے اغوا کرائی ہے اور اس وقت شیخ کی حویلی میں لڑکی موجود ہے۔ چونکہ میں بھی دو بیٹیوں کا باپ ہوں اور خطرہ محسوس کرتا ہوں کہ کسی بھی غریب آدمی کی عزت محفوظ نہیں۔ پہلے بھی کئی دفعہ ایسی وارداتیں ہوچکی ہیں۔ لوگ اپنی عزت اور شیخ کے ڈر کی وجہ سے پولیس میں رپورٹ نہیں کرتے اور یہ کہ پولیس بھی شیخ سے ڈرتی ہے۔

میں نے اس شخص کو اپنے پاس ہی بیٹھا رہنے دیا اور فوراً دو سمجھ دار سپاہی موچی کو بلانے کے لیے روانہ کیے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد سپاہی موچی کو لے کر آگئے۔ میں نے اس کی خیر خیریت دریافت کی تو وہ رونے لگ گیا اور بولا، حضور مجھے کیوں بلوایا ہے؟ مجھ سے کیا غلطی ہوگئی ہے؟

میں نے اسے حوصلہ تسلی دی اور کہا کہ تم نے سنگین غلطی کی ہے، دو روز سے تمھاری بیٹی گھر سے غائب ہے اور تم نے تھانہ میں رپورٹ درج نہیں کرائی۔ وہ مزید رونے لگ گیا اور ہاتھ جوڑنے لگا کہ جو میرا مقدر تھا، مجھے مل گیا۔ میں مزید کوئی مصیبت مول نہیں لینا چاہتا اور نہ اپنے دیگر بچوں کی زندگیاں خطرے میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے معاف کردیں اور مجھے جانے دیں۔ مجھے کسی کے بھی خلاف رپورٹ درج نہیں کرانی۔

میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ تمھارے ساتھ انصاف ہوگا۔ اپنی بیٹی پر ظلم نہ کرو۔ آخر میں نے موچی کو اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی اور دونوں سپاہیوں، جو کہ موچی کو رات کے اندھیرے میں لیکر آئے تھے، کے حوالے کردیا اور انھیں کہا کہ یہ بہت پریشان ہے، اسے باہر لے جائیں اور پیار سے سمجھائیں کہ یہ اپنی بیٹی کے ساتھ انصاف نہیں کررہا اور میری طرف سے اسے تحفظ کا یقین دلائیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد وہ موچی کو لے آئے۔ اب وہ نیم رضامند تھا۔ میں وردی وغیرہ پہن کر تیار بیٹھا تھا۔ میں نے محرر کو رہائش گاہ پر ہی بلوالیا اور تمام واقعات وحالات من وعن درج کر کے کیس رجسٹر کرلیا۔ بڑے ملزم کے طور پر بڑے شیخ کا نام لکھا گیا۔ میں نے موچی اور اطلاع دینے والے کو فوراً اپنی حفاظت میں لے لیا اور محرر کو حکم دیا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، کوئی بھی اُن سے نہ ملے البتہ ان کے آرام اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھا جائے۔

میں فوراً بہاول پور ایس۔ پی صاحب ملک بشیر وارن کی کوٹھی پر پہنچا، انھیں سوتے ہوئے جگایا اور تمام حالات و واقعات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اسی وقت مجسٹریٹ سے تلاشی وارنٹ منگوایا، پولیس لائن سے سپیشل فورس دی۔ ایک ٹرک میں ہم سب سوار ہوکر تھانہ پہنچ گئے۔ موچی اور تھانہ کی نفری کو ساتھ لیا اور رات کے ڈھائی بجے شیخ کی حویلی جا پہنچے۔ میں نے شیخ کی بہت کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اس کی حویلی کیا تھی ایک قلعہ تھا۔ میں دروازے کے راستے سے اندر نہیں جانا چاہتا تھا، اس طرح لڑکی کے ملنے کے امکانات بہت کم تھے۔ آخر میں نے حکم دیا کہ ایک سپاہی کے کندھے پر دوسرا سپاہی کھڑا ہوکر دیوار کود جائے اور اندر سے جا کر دروازہ کھول دے۔ لہٰذا ایسا ہی کیا گیا اور میں بہت خاموشی کے ساتھ صدر دروازے کو نہ صرف کھلوانے میں کامیاب ہوگیا بلکہ صدر دروازہ اب میرے قبضے میں تھا۔ میری سرکردگی میں پوری کی پوری پولیس فورس قلعہ نما حویلی میں داخل ہوگئی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم کمروں کی تلاشی لیتے ہوئے زنان خانے میں جا پہنچے۔ میں نے سپاہیوں کو عورتوں کے کمرے میں نہ جانے دیا بلکہ دروازے پر دستک دی اور کہا کہ آپ میری بہنوں اور بیٹیوں جیسی ہیں، کارِسرکار میں مداخلت بالکل نہ کریں، آپ کی عزت واحترام کا بے حد خیال رکھا جائے گا۔ ایک عمر رسیدہ عورت جو کہ کافی سمجھ دار معلوم ہوتی تھی، بولی بھائی صاحب! آپ لوگ کیا تلاش کررہے ہیں۔ مجھے بتائیں میں آپ کو صحیح راستے پر لگاؤں گی۔ میں نے کہا، بہن! مجھے بڑے شیخ صاحب کا کمرا بتا دیں، باقی بات میں ان سے خود ہی کرلوں گا۔ اس نے کافی پس وپیش کے بعد اپنی راہ نمائی میں ہمیں بڑے شیخ صاحب کی خواب گاہ تک پہنچا دیا۔ میں نے خاتون سے کہا کہ اب آپ اپنے کمرے میں جائیں اور کمرے سے باہر بالکل نہ آئیں۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو اشارہ کیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ پاکر میں نے حکم دیا کہ دروازہ توڑ دیا جائے۔

ابھی دو چار ضربیں ہی ماری گئی تھیں کہ ایک طرف سے شور بلند ہوا اور سپاہی کھڑکی میں سے کودتے شیخ اور ایک نوجوان لڑکی پکڑ لائے۔ چونکہ میں نے تمام فورس حویلی کے ہر راستے پر متعین کی ہوئی تھی اور کوئی بھی اندر سے باہر نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی باہر سے اندر آسکتا تھا۔ میں نے فوراً شیخ کو حراست میں لے لیا اور لڑکی سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اس نے اپنے والد کا نام بتایا اور تسلیم کیا کہ شیخ کے غنڈے کھیت میں سے زبردستی اٹھا کر لائے تھے اور دو روز سے شیخ کی ہوس کا شکار ہورہی ہے۔ اس نے زور زور سے رونا شروع کردیا۔ تقریباً ساڑھے تین بجے یہ آپریشن ختم ہوا اور میں کامیاب و کامران واپس تھانے پہنچ گیا۔ سب سے پہلے میں نے باپ سے اس کی بیٹی کی شناخت کرائی۔

دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب دھاڑیں مار کر روئے۔ بہت رقت آمیز منظر تھا۔ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ شیخ بہت پریشان تھا اور بار بار کہہ رہا تھا کہ آپ لوگ میری حویلی میں داخل کس طرح ہوئے، آپ لوگوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا، میں پولیس کی اور خاص طور پر ایس۔ ایچ۔ او کی قبریں حویلی میں ہی بنادوں گا۔

جب اسے یقین ہوگیا کہ آج وہ نہیں بچ سکے گا تو پھر وہ منتیں کرنے لگا۔ اس نے ۲۰ ہزار روپے موچی کو دینے کی پیشکش کی۔ پہلے مجھے ایک لاکھ کی پیشکش کی، پھر رقم بڑھاتا چلا گیا اور پانچ لاکھ تک کی بولی لگانے کے بعد منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوگیا۔ میں نے اسے کہا کہ شیخ صاحب آج کی رات آپ حوالات میں گزاریں۔ صبح میں آپ کی پیشکش اور دھمکیوں کا جواب دوں گا۔

لڑکی میں نے باپ کے حوالے کردی اور گھر جانے کی اجازت بھی دے دی۔ جو آدمی اطلاع دینے آیا تھا، اسے خفیہ طور پر پہلے ہی فارغ کر کے گھر بھیج دیا گیا تھا تاکہ اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ دوسری صبح میں نے موچی سے کہا کہ جوتوں کا ہار تیار کر کے لے آؤ۔ جب وہ لے آیا تو میں نے اسے کہا کہ شیخ کے گلے میں ڈال دو اور سپاہیوں سے کہا کہ اسے ہتھکڑی لگا کر سارے بازار میں سے جوتے لگاتے ہوئے لے کر جاؤ تاکہ غریب آدمی کی عزت خراب کرنے اور پھر پیسے کے زور پر اپنے آپ کو بچانے کا مزا اس کو چکھا دیا جائے اور اسے کہا کہ شیخ صاحب آپ نے منہ مانگی رقم دینے کی جو پیشکش مجھے گزشتہ رات کی تھی، میرا آپ کی پیشکش کے سلسلے میں یہ ہی جواب ہے۔

پھر مجھے فرمانے لگے، بیٹا! اس وقت پانچ لاکھ بہت بڑی رقم تھی، سونا ۱۰۰ روپے تولہ تھا اور ایک لاکھ روپے سے چھ مربعے زمین خریدی جاسکتی تھی۔

**آئی۔ اے آفتاب**



فرشتے کی ایف آئی آر
ڈاکٹر آئی۔ اے آفتاب کی
جگ بیتی اور آپ بیتی
کا ایک تھوڑا سا حصہ ہے۔
حیران کردینے والی اس
کتاب کو ڈاکٹر صاحب کی
زندگی کے ماہ و سال کا عکس جانیے یا
صرف تحفہ۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس کہنے کو ہے بہت کچھ...

# آئیے
## بات کرتے ہیں

## ہم سیکھنے میں اتنے بُرے کیوں ہیں؟

دوستوں کا اجتماع ہو، عوامی اکٹھ ہو، عمر میں کوئی بڑا ہو یا تجربے کی بڑائی کا اعزاز اس کے پاس ہو، محفل چھوٹی ہو یا بڑی، منصب اور مرتبے کی سہولت ہو یا شہرت کا پائیدان ملا ہو، جب موقع ملتا ہے شکوہ کر دیتا ہے
کہ ہم سیکھنے میں بہت بُرے ہیں
اور یہ عادت ہے کہ
ہم اپنی غلطیوں سے، من حیث القوم نہیں سیکھتے
ملکی راہنماؤں کی کمزوریوں اور جھوٹے وعدوں سے
اپنے خاندانی جھگڑوں اور بڑوں کی زیادتیوں سے
لوگوں کی بدمزاجی، بداخلاقی اور بدلباسی سے
افسروں کی وعدہ خلافیوں سے
علماء کی بےعملیوں اور بےاعتدالیوں سے
تاجروں کی بدمعاملگی اور جھوٹ سے بھی
نہیں سیکھتے...... کیا یہ شکوہ درست ہے؟
یا بس بات برائے بات ہے

### آئیے بات کرتے ہیں

اس الزام میں جھوٹ کتنا ہے سچ کتنا ہے؟
اور سچ ہے تو میرے اور آپ کے پاس کتنا حل ہے؟
آپ کے جوابات مع تصویر ہمیں ۱۵ر نومبر تک مل جانے چاہئیں تا کہ اگلے شمارے کی زینت بن سکیں۔

مدیر اردو ڈائجسٹ
325/G-III جوہر ٹاؤن لاہور

# آئندہ شمارے کی جھلکیاں

- **پاکستان کی ۵۰ موثر ترین خواتین**
تازہ ترین تحقیقی فیچر۔ چشم کشا حقائق۔ سیاست، بزنس، دولت، سماجی بہبود، طاقت، مینجمنٹ، میڈیا، کھیل اور تفریح کے شعبوں کی اصل لیڈرز
- **۱۰ انقلابی تصورات**
جو دنیا کو بدل کر رکھ دیں گے
مستقبل کا انوکھا منظر نامہ، کیا زندگی آسانیوں سے بھر جائے گی
- **ورزش کے بغیر وزن گھٹایئے**
دنیائے طب کی نئی تحقیق۔ کچھ کیے بنا بہت کچھ کرنے کے خواہش مندوں کے لیے تحفۂ خاص
- **"تخلیقی انداز سے کیسے سوچا جائے؟"**
دنیا کی بہترین کتابوں میں سے ایک
Magic of Thinking کی تلخیص
آپ کو سوچنے اور آگے بڑھنے کی نئی راہیں نظر آئیں گی
- **امریکہ کا نظامِ تعلیم**
چوہدری محمد یوسف اپنے دورۂ امریکہ کی رُوداد سناتے ہیں
امریکہ کا نظامِ تعلیم حیرتوں کے کئی دروازے کھولتا ہے




ادب، مزاح، ایڈونچر، تاریخ، حالاتِ حاضرہ
اور وہ سب کچھ جو اردو ڈائجسٹ کی پہچان ہیں


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# خیالیے

## سوچ

معروف صنعت کار سمیع الدین چاولہ کے چار بچے تھے اور چاروں شہر کے بہترین تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم تھے۔ ان ہونہار بچوں کے تعلیمی اخراجات ۶۰ ر ہزار روپے ماہانہ تھے۔ سمیع الدین اور ان کی اہلیہ کی آنکھوں میں بچوں کے شاندار مستقبل کے خواب سجے رہتے تھے۔ سمیع الدین کی بیمار بوڑھی ماں نے ایک ملازم کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ وہ ان دِنوں



سخت بیمار ہیں اور اُن کے پاس دوا خریدنے کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ سمیع الدین آ کر ان کی خبر بھی لے جائے اور کچھ نہ کچھ خرچہ بھی دے جائے۔ ماں کے پیغام نے سمیع الدین کو پریشان کر دیا تھا، وہ پریشانی کے عالم میں صحن میں ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بوڑھے ماں باپ کو ہر مہینے تین ہزار روپے بھیجتا ہوں، معلوم نہیں یہ کیسے لوگ ہیں کہ ان کی زندگی لحہ بہ لحہ کم ہوتی جا رہی ہے مگر ان کے اخراجات بڑھتے جاتے ہیں، اب میں ان کی کتنی دیکھ بھال کروں! میری اپنی مصروفیات کیا پہلے کم ہیں؟

## نئی ملازمت

تھری سٹار ہوٹل کا کمرا قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ اشرف اور اس کے جگری دوست مے نوشی سے لطف اندوز ہو رہے

اُن کے لیے خاص جو وقت کی
کمی کا شکار رہتے ہیں
☆
روٹھے وقت کو منانے
کے لیے اکسیر
☆
فکر و احساس کی شدت
میں ڈوبی کہانیاں

خواجہ مظہر صدیقی (ملتان)

تھے۔ وقفے وقفے سے ان کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ وہ سارے بہت خوش تھے کہ آج اشرف کو نئی ملازمت مل گئی تھی..... پچھلے کئی ماہ سے اشرف سخت پریشان تھا۔ وہ ایک سرکاری محکمہ میں ساتویں گریڈ کا ملازم تھا۔ اُسے یہ نوکری پسند نہ تھی کیونکہ اس میں ترقی کے مواقع کم تھے۔ اس نے کئی اور اداروں میں ملازمت کے لیے درخواست دی ہوئی تھی۔ وہ شدت سے نئی ملازمت کا انتظار کر رہا تھا۔ اشرف کو ایک اور سرکاری محکمے میں گیارہویں گریڈ میں آج نئی ملازمت ملی تھی۔ اِس ملازمت کے لیے اُس نے ایک بڑی رقم رشوت کے طور پر دی تھی۔ آج پریشانی کے بادل چھٹ گئے تھے اور اِسے نئی ملازمت کا پروانہ ملا تھا۔ اِس خوشی میں اپنے تمام دوستوں کو اُس نے پہلے کھانا کھلایا اور اب ہوٹل کے کمرے میں مے نوشی جاری تھی۔

دوسری طرف بیگم اشرف قریبی کچی بستی کے غریب مکینوں میں خیرات بانٹنے پہنچی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے اپنے خاوند کی نئی ملازمت ملنے کی صورت میں اللہ کے نام کی خیرات اور ۱۰۰ رنفلوں کی منّت مانی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ اِس منت اور خیرات کی وجہ سے خیر پڑی ہے۔

## تہوار

میں نے تنویر کو نئے سال کی آمد پر ایک انتہائی خوبصورت ''پیپی نیو ائیر'' کارڈ بھیجا، جو اُس نے اپنے ملازم کے ہاتھ اس پیغام کے ساتھ واپس بھیج دیا کہ اُسے نئے سال

کی کوئی خوشی نہیں، کیونکہ یہ تہوار عیسائی مناتے ہیں اور ہم عیسائیوں کے تہوار بھلا کیوں منائیں؟ چند ماہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ تنویر اپنی سالگرہ منا رہا ہے۔ وہ مجھے اپنی سالگرہ میں مدعو کرنے کے لیے میرے گھر دعوتی کارڈ لے کر آیا۔ وہ بڑے فخر اور انتہائی مسرت سے بتا رہا تھا ''اُس نے سالگرہ کے موقع پر انتہائی شاندار تقریب منعقد کرنی ہے۔ اس یادگار موقع کو رنگا رنگ بنانے کے لیے شب موسیقی کا اہتمام بھی ہوگا۔'' وہ کہنے لگا ''اس کی سالگرہ پر بڑے بڑے لوگ آئیں گے، تم آنا بھول گئے تو پھر ایک سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

## پابندی

عرفان سکول سے واپس گھر آنے کے بعد مسلسل رو رہا تھا۔ اِس کی ضد تھی کہ اِسے بسنت منانے کے لیے پتنگیں اور ڈور لے کر دیے جائیں مگر اِس کے والد مسلسل انکار کر رہے تھے۔ عرفان نے اپنی خواہش کے رَد ہو جانے پر اور زیادہ

زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے والد سے پوچھنے لگا ''آخر آپ مجھے پتنگیں کیوں نہیں لے کر دیتے؟'' روہانسے انداز میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں باپ نے جواب دیا ''بیٹا! یہ بسنت ہندوؤں کا تہوار ہے، اس فضول سے تہوار کو منانے پر ویسے بھی سپریم کورٹ نے پابندی لگا دی ہے۔'' عرفان نے آنسو پونچھتے ہوئے پھٹی آنکھوں سے باپ کو دیکھتے ہوئے جواباً کہا ''پچھلی اتوار آپ انکل ضیا حسن کے ڈیرے پر پتنگیں اُڑانے اور بار بی کیو کے مزے لینے کیوں گئے تھے، اُس وقت آپ کو سپریم کورٹ کی پابندی اور ہندوؤں کا تہوار یاد کیوں نہ آیا تھا؟''

## جھگڑا

سکول میں یوم والدین کی تقریب اختتام پذیر ہوئی تو ایک تتی طالبہ روتی ہوئی معروف مہمانِ خصوصی کے پاس آ کھڑی ہوئی، جنھوں نے والدین کی باہم محبت پر بہت عمدہ

تقریر کی تھی۔ بچی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر تھا۔ مہمانِ خصوصی نے تسلی اور دِلاسہ دیا تو اُس نے رونا بند کیا۔ طالبہ نے اپنی نوٹ بک مہمان کو تھمائی کہ اِس پر میرے والدین کو تنبیہ لکھ دیں کہ وہ آپس میں جھگڑنا بند کریں۔ میرے ابو بلا وجہ امی کو ڈانٹتے رہتے ہیں۔ فضول جھگڑے سے امی ناراض ہو کر نانو کے گھر چلی جاتی ہیں۔ مجھے اپنے گھر سے ڈر لگتا ہے۔ سر! پلیز اِس میں میری امی کو لکھ دیں کہ وہ واپس گھر آ جائیں اور ابو کو بھی لکھ دیں کہ وہ امی سے خواہ مخواہ جھگڑا نہ کریں۔ بچی کے بے ترتیب جملے جاری تھے کہ مہمانِ خصوصی کا موبائل بجا۔ وہ غصے سے اپنے گھریلو ملازم سے کہہ رہے تھے ''کیا کہا بیگم صاحبہ پھر ناراض ہو کر میکے چلی گئی ہیں۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم کسی طریقے سے بچوں کو کھانا کھانے پر آمادہ کرو، میں شام سے پہلے گھر نہیں آ سکتا۔''

## سڑک

گلگشت کالونی کی فیصل سٹریٹ عرصۂ دراز سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ جگہ جگہ گڑھے بن گئے تھے۔ محلے کی اصلاحی کمیٹی نے سڑک کی خستہ حالی کو دیکھتے ہوئے اپنی مدد

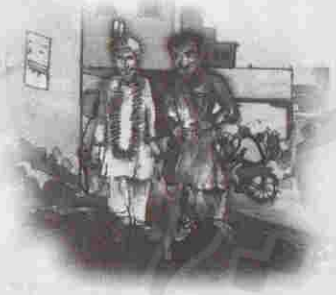

آپ کے تحت فنڈز جمع کیے تاکہ سڑک کی مرمت کروائی جا سکے۔ سیٹھ صاحب کمیٹی کے ارکان پر برہم ہوئے کہ یہ کام ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کا ہے، اصلاحی کمیٹی کیوں اپنے ذمے لے رہی ہے۔ ہمیں خواہ مخواہ اپنی جیبوں کو ہلکا نہیں کرنا چاہیے۔ سیٹھ کرم دین کے انکار کے باوجود اصلاحی کمیٹی نے سڑک کو بہت خوبصورتی کے ساتھ مکمل مرمت کروالیا۔ دو ہفتے بعد سیٹھ کرم دین کے بیٹے کا ولیمہ تھا۔ اُنہوں نے شادی ہال جانے کے بجائے ولیمے کے لیے شامیانے اسی نئی مرمت شدہ سڑک پر ہی لگوائے۔ وہ فیصل سٹریٹ میں کچھ لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ یہ سڑک ہمارے ہی خرچے سے بنی ہے تو پھر ہم لوگ کیوں نہ اِس سے فائدہ اُٹھائیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

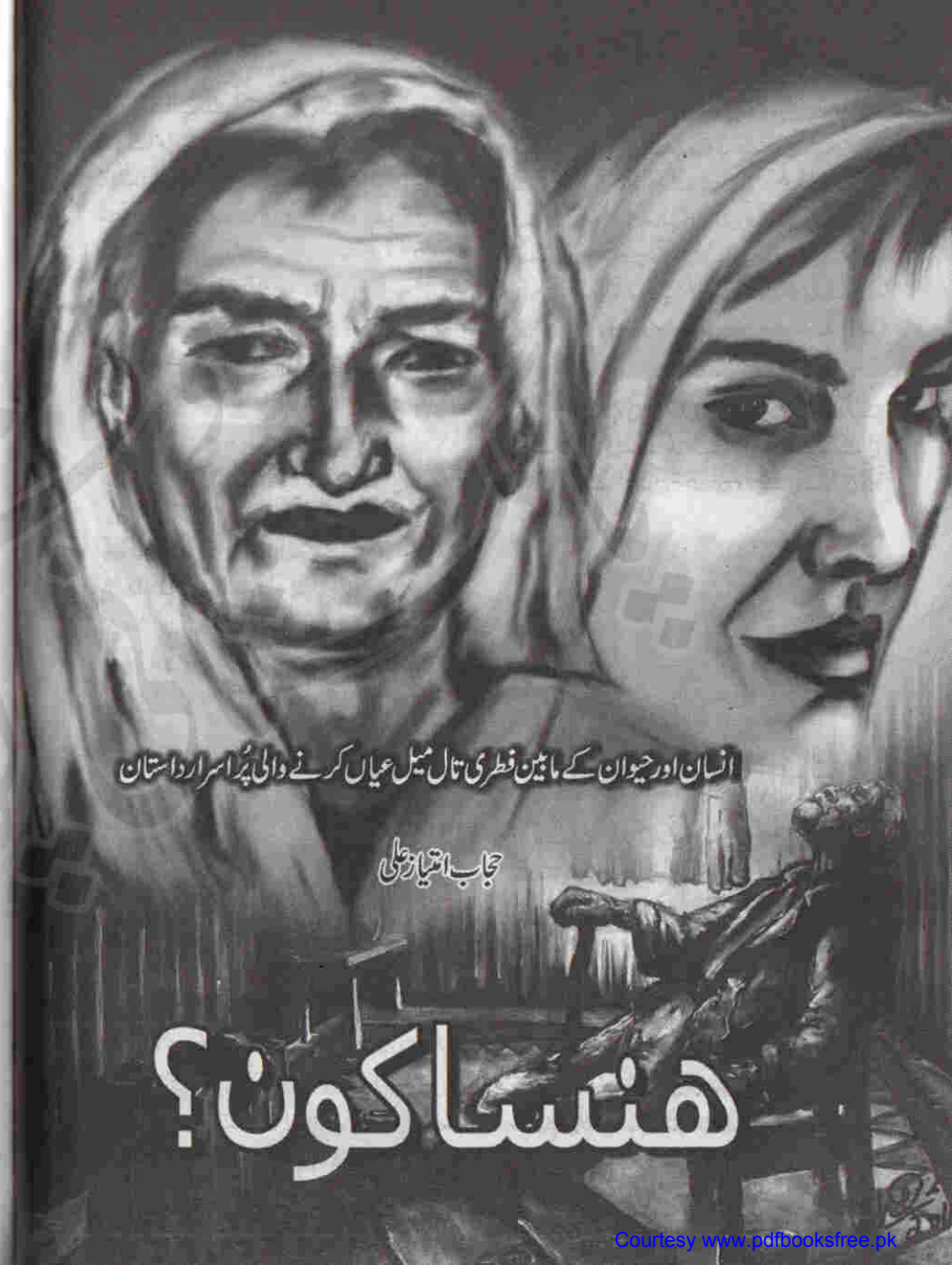

# ہنسا کون؟

انسان اور حیوان کے مابین فطری تال میل عیاں کرنے والی پُراسرار داستان

حجاب امتیاز علی

کئی دنوں سے میرا دستورالعمل اب یہ ہوگیا تھا کہ رات کے کھانے کے بعد اپنے کتب خانے میں جا بیٹھتی اور صبح کاذب کے وقت وہاں سے اُٹھتی...... ایک دن سرِ شام ہی سے احساس کی شدت مجھے کچلے ڈال رہی تھی۔ چنانچہ میں وقت سے پہلے ہی کتب خانے میں جا بیٹھی۔ کئی کتابیں مختلف موضوعات پر کھولیں۔ کسی میں دل نہ لگا۔ مالیخولیا کی سی کیفیت ذہن پر طاری تھی۔ ایسے میں اتفاقاً اچانک ہی میری نظر اس الماری پر جا پڑی، جس میں اپنے نامکمل مسودات اور گزشتہ برسوں کے روزنامچے رکھا کرتی تھی۔ الماری کھول کر بیٹھ گئی، اپنے پرانے روزنامچے نکالے۔ دل چسپی سے بیتے دنوں کے واقعات پڑھنے لگی۔ دل پر چوٹ سی لگی۔ ورق گردانی کے دوران ایک پرانے روزنامچے میں اپنا لکھا ہوا ایک دلچسپ واقعہ پڑھنے کو مل گیا۔ اسی کو میں کہانی کے پیرائے میں آپ کو سُناتی ہوں......

ایک اندھیری رات ہم سب باغ میں خاموش اور افسردہ بیٹھے تھے۔ تین دن پیشتر چچا جعفر کا عجیب طرح انتقال ہوا تھا۔ وہ ایک لطیفہ سن کر زور زور سے ہنس رہے تھے کہ چل بسے۔ ان کی اچانک موت ہم سب کے لیے ایک شدید المیہ تھا ہی...... مگر اس پر طرّہ ان کی اچانک موت کے بعد ایک ایسا پراسرار واقعہ پیش آیا جو ان کی موت سے بھی زیادہ سنگین اور لاینحل کہا جا سکتا ہے۔ لاینحل میں نے اس لیے کہا ہے کہ اس واقعے کے وقوع پذیر ہونے پر تھوڑی دیر کے لیے ہم سب کی قوتِ ادراک معطل سی ہوگئی تھی۔

چچا جعفر کی اچانک موت پر ہم سب انتشار جذبات میں مبتلا ہوئے ہی تھے مگر ان کے چہیتے جانوروں پر تو سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ گھوڑا اصطبل میں سرنگوں کھڑا رہ گیا تھا۔ کتا اپنے دونوں پنجوں پر سر دھرے ان کی خالی کرسی کے پاس بے حس و حرکت پڑا رہتا اور ان کا موٹا باتونی طوطا جو تمام دن ہم سب کی اور خصوصیت سے چچا جعفر کی نقلیں اتار اتار کر اپنی بکواس سے ہم سب کو شرمندہ کیا کرتا، اب ایک ٹانگ پر گونگوں کا گڑ کھائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ گویا اس کے منہ پر قفل لگا دیا گیا تھا۔ بکواسی اور شریر طوطے کی یہ حالت دیکھ کر کئی دفعہ میرے آنسو نکل آئے تھے۔

اگرچہ چچا جعفر کی موت کچھ عجیب طرح واقع ہوئی تھی تاہم کوئی خلاف فطرت بات نہ تھی۔ آئے دن انواع واقسام کی اموات کی خبریں ہم اخبارات میں پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ مگر اصل بات ہے کہ موت کے بعد کے اعجوبہ واقعہ نے ہمارے ہاتھوں کے طوطے اُڑا دیے تھے۔

میں ہفتہ بھر کی تعطیلات گزارنے کے لیے دادی زبیدہ کے ہاں اسی صبح پہنچی تھی جس رات چچا جعفر کی عجیب موت واقع ہوئی تھی...... کہاں تو میں اس نیت سے یہاں آئی تھی کہ چند دن یہاں تفریح میں گزاروں گی۔ چچا لوث سے لطیفے سنوں گی اور چچا جعفر سے شطرنج کی بازیوں میں نوک جھوک رہے گی...... اور کہاں یہ وحشت ناک واقعہ!!

اُس زمانے میں چچا لوث کو لطیفے سنانے کا چسکا ہوگیا تھا اور وہ لطیفے بھی اتنے فرسودہ، غیر دلچسپ اور پتھر کے زمانے کے سنایا کرتے تھے جنھیں سن کر سنانے والے کی حسِ مزاح پر رحم آتا تھا۔ دادی زبیدہ کو تو غصہ آجاتا تھا۔ میں چچا کی بزرگی کا خیال کر کے بادل ناخواستہ مسکرا دیا کرتی تھی مگر چچا جعفر کو چیخ چیخ کر ہنسنے کی عادت تھی۔

اس رات ہم سب صحنِ گلستاں میں ایک مرمریں چبوترے پر بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ رات بالکل معمول جیسی تھی۔ میری قدیم بوڑھی حبشن خادمہ زوناش ہمیں کھانا کھلا رہی تھی۔ ذرا دور کیلے کے درخت کے جھنڈ میں ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ آسمان پر کہکشاں کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ غرض رات بالکل معمول جیسی تھی۔ ہاں کبھی کبھی بائیں باغ کی طرف سے چچا جعفر کے چہیتے طوطے کی تیز آواز سنائی دے جاتی تھی، جسے سن کر ہم سب ہنس پڑتے۔ وہ بڑے ناصحانہ لہجے میں رہ رہ کر کہہ رہا تھا ”جعفر! جعفر!...... شرارت نہ کرو...... اب کھانا کھالو!“......

مگر طوطے کا کیا تھا، ہم سب اس کی بکواس کے عادی تھے۔ اس لیے رات میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھانا کھانے میں کوئی اصول نہ تھا، جس کا جو جی چاہا کھانے لگا۔ چنانچہ دادی زبیدہ حسب معمول بڑی نزاکت سے شوربہ پی رہی تھیں تو میں چاولوں پر زعفران کا عرق چھڑک رہی تھی۔ چچا جعفر تلی ہوئی مچھلی اور آلو کا ٹکڑا منہ میں بھرے ہوئے بیٹھے تھے۔

اس وقت اچانک چچا لوث نے ایک شفتالو کاٹ کر کھاتے ہوئے بڑے زور سے پوچھا: ''جعفر لطیفہ سنو گے؟''

دادی زبیدہ نے زانو پوش سے اپنے ہونٹوں کو چھوا اور فوری مداخلت کی: ''جی نہیں۔ شکریہ!''

اس پر چچا لوث برا مان گئے۔ یہ دیکھ کر میں نے کہا ''چچا لوث، فی الحال لطیفہ نہ سنائیے۔ دوران طعام میں ہنستے ہنستے چاول کا کوئی دانہ سانس کی نالی میں جا پھنسے تو خطرناک ثابت ہوگا۔''

دادی زبیدہ بولیں: ''خیر اس کا تو کوئی امکان نہیں کیونکہ لوث کے لطیفے ایسے نہیں ہوتے کہ کسی کو ہنسی آئے۔''

اس پر چچا لوث نے ان پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر احتجاجاً کہا تھا ''نہ جانے آپ روتے کھڑا کر دینے والی سنجیدگی کو کیوں پسند کرتی ہیں، لطیفہ سن کر بھی دیوارِ چین بنی رہتی ہیں۔ روحی کا کہنا ٹھیک ہے کہ دوران طعام میں لطیفہ سننے سے سانس کی نالی کا ڈر ہے۔''

چچا جعفر ٹھہرے سدا کے ضدی، چنانچہ زور سے بولے: ''سانس کی نالی ہو، یا چاول کا دانہ، میں سن کر رہوں گا لطیفہ۔''

''ذرا آہستہ بولو جعفر،..... تمھاری آواز دماغ کو شق کر رہی ہے۔''

دراصل دادی زبیدہ اس ساری گفتگو سے کچھ ناخوش سی ہوگئی تھیں۔ ان میں کبھی کسی قسم کی برداشت تو تھی ہی نہیں۔ چنانچہ ان کا چہرہ شعلے کی طرح دمک رہا تھا۔ اس رات وہ اپنی صندلی رنگ کے ایسٹ مین لباس اور سرا ندیپ کے موتیوں کی مالا میں بے حد دل کش نظر آ رہی تھیں۔ کانٹا چمچہ رکابی میں جوڑ کر رکھتے ہوئے بولیں ''میں اپنے کان بند کرلوں گی، تم شوق سے روحی اور جعفر کو اپنا لطیفہ سُناؤ!''

چچا لوث کو اپنی چھوٹی بہن کا ہمیشہ بڑا لحاظ رہا۔ فوراً اپنی کرسی سے تھوڑا سا اُٹھ کر بولے: ''میں معافی چاہتا ہوں زبیدہ کہ تمھیں میرے الفاظ ناگوار گزرے۔ لیکن آج میں آپ کو ایسا چیدہ لطیفہ سناؤں گا جسے سن کر تم بھی کھلکھلا کر ہنس پڑو گی۔''

''خیر کھلکھلا کر ہنسا تو ایک بہت ہی غیر شاعرانہ حرکت ہے جس کی میں عادی نہیں، البتہ ممکن ہے مسکراؤں تو مسکراؤں''..... دادی زبیدہ نے غرور سے کہا۔

آپس میں جو تلخی پیدا ہوگئی تھی وہ بارے رفع ہوگئی۔ میری بوڑھی جبشن زوناش جسے افیون گھول کر پینے اور عمر خیام کی رباعیات پڑھنے کے سوا دنیا میں اور کوئی کام نہ تھا، مُرغابی کی پلیٹ چچا لوث کو پیش کرتے ہوئے بولی:

''مگر میں لطیفے سن کر رو پڑتی ہوں۔ عمر خیام انسان کی بے ثباتی پر روتے روتے مر گیا۔ موت انسان کا مقدر رہی۔ وقتِ ہنسی کا فائدہ.....؟''

چچا لوث کو بڑا غصہ آیا..... ''اری نیک بخت جبشن! تو کیا عمر خیام کا خیال تھا کہ انسان کو اپنی مختصر اور فانی زندگی ماتم کناں رہ کر گزار دینی چاہیے۔ عمر خیام چھوڑ کر کبھی غالب کو بھی تو پڑھا کر۔ کیا خوب کہا ہے اس نے

عمر ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے!

خیر چھوڑو ان باتوں کو، لطیفہ سناتا ہوں۔

چچا جعفر لطیفہ سننے سے پہلے ہی ہنسنے کے عادی تھے چنانچہ وہ ہنس پڑے، بولے..... ''کو آن..... شروع کرو اپنا لطیفہ!''

دادی زبیدہ کے چہرے پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ تھی۔ دراصل ہمارے خاندان کا ہر فرد کچھ بہت زیادہ حساس اور نزاکت شعار واقع ہوا تھا اور سب کی اپنی اپنی مخصوص عادات تھیں۔

خدا خدا کر کے لطیفہ گوئی شروع ہوئی۔ حسب معمول چچا لوث کے لطیفے اس قدر غیر دلچسپ اور پھیکے تھے کہ کسی کو ہنسی نہ آئی۔ البتہ ان کے پھیکے پن پر مجھے دو ایک دفعہ کچھ ہنسی سی آئی، جسے چچا لوث نے غلطی سے اپنی کامیاب لطیفہ گوئی پر



محمول کیا۔ لطیفہ کے دوران دادی زبیدہ تمام وقت باغ کے ایک تناور درخت کی کسی ٹہنی پر نگاہ جمائے چُپ چاپ بیٹھی رہیں لیکن ادھر چچا جعفر تھے کہ ہر لفظ پر خواہ مضحکہ خیز ہو یا نہ ہو، کیسا ہی فضول ہو، بے اختیار ہنسے جا رہے تھے اور جب لطیفہ ختم ہوا تو ان کی چیخ نما ہنسی سے سارا باغ گونج اٹھا۔

چچا لوث فخر سے سر تر چھا کر کے بولے..... ''لطیفہ سن کر لطف اندوز ہونا بس جعفر پر ختم ہے!''..... یہ کہہ کر انھوں نے دادی زبیدہ پر اور مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی مگر چچا جعفر کی ہنسی ہمارے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، خاندان بھر میں ان کی نوکیلی ہنسی مشہور تھی۔ ان کی ہنسی کی آواز میں عجیب و غریب سر نکالا کرتے تھے..... قو قو قو..... ہاہاہا..... ہو ہو ہو۔ اور آخر میں..... حق حق حق حقی..... چنانچہ وہ حسب عادت اور حسب معمول ہنسے جا رہے تھے۔ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس ساری فضا کو خوفناک تو اس واقعہ نے بنا دیا جو لطیفے کے اختتام پر پیش آیا۔

چچا لوث لطیفہ ختم کر کے ایک ماہر فن کی طرح فاتحانہ انداز سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ چچا جعفر کرسی سے گر پڑے اور ختم ہوگئے۔

اس وہشت ناک واقعہ کو گزرے آج تین دن ہوگئے تھے۔ ان تین دنوں میں ہم پر کیا گزری، اس کی تفصیل بیان کرنا محال ہے۔ مختصر یہ کہ ہم پر گویا ایک بجلی گر پڑی تھی۔ ہماری دیکھ بھال کے لیے پُرانا اور خاندانی چہیتا ڈاکٹر گار بھی ہم میں موجود نہ تھا۔ دادی زبیدہ تین دن اپنے کمرے میں بند رہیں۔ میرے اعصاب تہہ و بالا ہوگئے۔ چچا لوث پر ایک غنودگی سی طاری رہنے لگی۔ زوناش کو بخار چڑھ آیا..... چنانچہ ڈاکٹر گار کو تار دے دیا گیا کہ ''فوراً پہنچو، حالتیں تباہ ہیں۔''

شام ہو رہی تھی کہ میں دادی زبیدہ کو دیکھنے ان کے کمرے میں گئی۔ وہ دریچے کے سامنے بیٹھی ٹھنڈا سوگھ رہی تھی۔ چچا لوث لڑکھڑاتے ہوئے ہمارے پاس پہنچے اور بولے:

''آج رات ڈاکٹر گار پہنچ جائیں گے۔ ان کے آنے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ اپنی حالتیں سنبھالیں تاکہ ان سے بات کی ہمت تو ہو، ایک کھیل اُڑ کر منہ میں نہیں گئی۔ چلو کچھ

## ''۶ فٹے'' سانپ سے زور آزمائی

میں نے اب تک درجنوں سانپ مارے، کچھ بندوق سے اور کچھ لاٹھی سے۔ ان میں کوبرا کے علاوہ دیگر اقسام کے سانپ بھی شامل تھے۔ اس دوران ایک دفعہ مجھ سے ایک ایسی حماقت سرزد ہوئی جسے میں آج تک بھول نہیں پایا۔

میں گھن میں نماز عصر ادا کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک چوہا مجھ سے کچھ فاصلے پر آکر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا شور مچاتا، پھر بھاگ جاتا۔ مجھے تجسس ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ میں نے اس طرف دیکھا جہاں چوہا شور مچاتا تھا۔ وہاں مجھے پیلے رنگ کا ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا نظر آیا جس کی لمبائی چھ فٹ سے زیادہ اور موٹائی دو انچ تھی۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے شور مچایا: ''لاٹھی لاؤ، لاٹھی لاؤ۔''

بچوں نے میری آواز سن لی اور وہ لاٹھی تلاش کرنے لگے لیکن بدقسمتی سے لاٹھی ان کے ہاتھ نہ لگی یہ اسی اثنا میں سانپ نے چلنا اور کچھ فاصلے پر موجود بل میں گھسنا شروع کر دیا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا، میں نے جا کر اس کی دُم پکڑ لی۔ اس وقت تک سانپ نصف لمبائی تک بل میں گھس چکا تھا۔ سانپ کی کھال بہت چکنی ہوتی ہے، پھر بھی میرے ہاتھ اُس پر جم گئے۔ سانپ کافی طاقتور تھا، اُدھر مجھ پر بھی طاقت کا جنون تھا۔ دونوں میں زور آزمائی شروع ہوگئی۔

میں اس بات سے بھی ڈر رہا تھا کہ اگر میں نے اسے بل سے باہر نکال لیا تو یہ مُڑ کر مجھے ڈس لے گا۔ لگ بھگ دس منٹ تک ہماری زور آزمائی جاری رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دُم کی طرف سے تقریباً ایک فٹ پر سانپ ٹوٹ گیا۔ اس کی دُم کا یہ ٹکڑا میرے ہاتھ میں رہ گیا جبکہ باقی سانپ جلدی سے بل میں گھس گیا۔ مجھے تسلی تھی کہ سانپ زخمی ہوگیا ہے، چیونٹیاں اور مکوڑے اسے چٹ جائیں گے۔ تاہم میں نے فوراً ملازموں کو بلا لیا۔ انھوں نے بل کھودا تو تھوڑے فاصلے پر سانپ موجود تھا۔ ملازموں کے ہاتھوں میں ڈنڈے سوٹے تھے۔ انھوں نے ہمت کی اور سانپ کچل ڈالا۔ اس واقعہ کو کئی سال گزر چکے لیکن جب بھی یہ واقعہ مجھے یاد آتا ہے، مجھے جھرجھری سی آجاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے اپنی موت کو خود آواز دی تھی۔

(ابن الامام شفقت، احمد پور شرقیہ)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھا پی لیں۔"

بمشکل ہم کمرۂ طعام میں پہنچے۔ ملازمین دم بخود کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی سب کے سب پھرتی سے آگے بڑھے اور کرسیاں کھینچ کر ہمیں بیٹھنے میں مدد دی۔ دادی زبیدہ میز کے سرے والی کرسی پر بیٹھی ہی تھیں کہ ان کی نظر چچا جعفر کی خالی کرسی کی طرف اُٹھ گئی۔ خالی کرسی دیکھ کر واقعی ہم تینوں کے دل دھک سے رہ گئے تھے۔.....

دادی زبیدہ نے آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ لرزاں آواز میں بولیں: "ہم تو ہم..... جعفر کے پالتو جانور تک دم بخود ہیں۔"

اسی وقت پاس والی ایک درپچی سے زوناش نے اپنا سیاہ چہرہ باہر نکالا اور بولی: "اصطبل میں گھوڑا سرنگوں ہے اور طوطے غریب کو تو سکتہ ہو گیا ہے۔"

میں بولی: "غضب کی ویرانی ہے۔ کمرے میں دم گھٹنے لگا..... باغ میں نہ جا بیٹھیں؟"

چچا لوث نے بڑھ کر جلدی سے چچا جعفر کی کرسی کا رُخ دیوار کی طرف پھیر دیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے:

"ٹھیک کہا روحی تم نے۔ چلو باغ میں سوئمنگ پول کے پاس جا کر بیٹھیں۔ میں نے کار ائیر پورٹ بھیج دی ہے۔ کوئی دم میں ڈاکٹر گار کا جہاز پہنچ جائے گا، وہیں چل ان کا انتظار کرتے ہیں۔"

میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر گار آجائیں تو ہم سب کا شاید کچھ دل بہلے!"

چچا لوث نے دادی زبیدہ کو سہارا دے کر اُٹھایا اور شہ نشین کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ طے کرتے ہوئے سوئمنگ پول کی طرف جانے لگے۔ وہ رات بڑی ویران رات تھی۔ چاند بھی نہیں نکلا تھا۔ البتہ سیاہ آسمان پر تاروں کی آگ لگی ہوئی تھی اور باغ کے آخری حصے سے کبھی کبھی نا معلوم پرندے کی غم زدہ سی سیٹی کی آواز آجاتی تھی۔

"شاید ابھی چاند نکل آئے!" میں نے محض بات کرنے کی خاطر کہا۔

اُسی وقت آسمان پر تاروں کے نیچے ایک ہوائی کشتی نظر آنے لگی۔

"وہ..... وہ آ گیا ڈاکٹر گار کا جہاز!" چچا لوث نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد باغ کی سڑک اور جنگلی گلابوں کی وسیع روش سے ہوتی ہوئی ایک لمبی کار برساتی میں آ کھڑی ہوئی۔

چچا لوث اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دادی زبیدہ اشتیاق سے دیکھنے لگیں اور میں وفورِ شوق سے برساتی کی طرف بھاگی۔

بوڑھا ڈاکٹر گار سُرمئی رنگ کا سوٹ پہنے منہ میں سگار دبائے ایک پرانے جن کی طرح کار سے اترا پڑا۔

"آہ، ڈاکٹر گار!..... بے چارے چچا جعفر!" اسے دیکھتے ہی میرے منہ سے نکلا۔

ڈاکٹر گار نے ایک ہاتھ میرے گرد حمائل کیا اور چلتے چلتے پوچھنے لگا: "کیا ہوا تھا روحی بیٹی؟..... اچانک بیمار ہو گئے تھے؟"

میں بھرّائی ہوئی آواز میں بولی: "نہیں..... بس ہنستے ہنستے ہی..... چلیے باغ میں سب آپ کے منتظر ہیں!"

ہم چنبیلی کی بیلوں سے ہوتے ہوئے سوئمنگ پول کی طرف جانے لگے۔ اچانک رستے میں بید مجنوں کے نیچے سے بوڑھی زوناش نے اپنا سیاہ چہرہ نکالا اور بولی: "گھوڑا اصطبل میں سرنگوں ہے اور طوطا گونگا۔"

ڈاکٹر گار کھبرا سا گیا..... "ہائیں یہ کیا تھا؟..... زوناش تھی.....؟"

"ہاں!"..... میں نے کہا۔

"اصطبل میں گونگا، کیا کہہ رہی تھی؟"..... وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

"وہ چچا مرحوم کے جانوروں کا ذکر کر رہی تھی"..... میرا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ہم سوئمنگ پول پر پہنچ گئے۔

"تم نے سن لیا ڈاکٹر؟" دادی زبیدہ نے بے ضبط ہو کر کہا۔

"بڑا دھچکا لگا بیگم زبیدہ!..... یعنی اچانک ہی؟..... لوث! کیا ہوا تھا نواب جعفر کو؟" ڈاکٹر گار ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

چچا لوث اداس لہجے میں بولے: "میں ایک لطیفہ سنا رہا تھا گار!..... وہ حسبِ معمول ہنس رہے تھے....."

دادی زبیدہ بولیں..... مگر وہ ہنسی بھی غضب کی ہنسی تھی



..... چیخ نکل رہی تھی جعفر کی!"

ڈاکٹر بولا: "وہ تو ان کی پرانی عادت تھی!"

"اور عام طور پر وہ ہنستے بھی فضول باتوں پر تھے..... بھلا لوث کے لطیفے اس قابل ہوتے ہیں کہ ان پر کسی کو ہنسی آئے؟ فرسُودہ اور پھیکے۔"

دادی زبیدہ نے کہا۔

ڈاکٹر گار کچھ سوچتے ہوئے بولا: "فرسُودہ ہوں یا پھیکے۔ ہوا یہ کہ لطیفہ سن کر انھیں ہنسی آ گئی..... یہی نا.....؟"

میں بولی: "ہنسی بھی غضب کی ہنسی تھی ڈاکٹر..... جیسے کوئی فوارہ اُبل رہا ہو!"

دادی زبیدہ بولیں: "فوارہ؟..... نہیں نہیں! یوں کہو، جیسے کوئی انجن چل رہا ہو.....!"

ڈاکٹر گار سگار کو انگلوں میں گھماتے ہوئے بولا..... "میں جعفر کو اکثر ہی ٹوکا کرتا تھا..... مجھے ہمیشہ ہی اندیشہ رہا۔"

"کس بات کا.....؟"

"جعفر کی بے تحاشہ ہنسی نے ان کو مار دیا..... دل کی نسوں پر زور پڑنے کی وجہ سے حرکتِ قلب بند ہو گئی"..... ڈاکٹر گار نے تشخیص کی۔

اور ہم سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

ادھر میں سوچنے لگی..... چچا لوث کو بھی لطیفے سنانے کا عجیب جنون ہے..... اور لطیفے بھی ایسے جنھیں ہم بچپن سے سنتے آئے تھے.....

اسی وقت زوناش پھر کسی جھاڑی سے اچانک برآمد ہوئی..... "دیکھیے دیکھیے! عجیب بات ہوئی..... کہاں تو طوطا نواب جعفر کے بعد بے حس و حرکت گونگا بنا بیٹھا رہا، اب جو آپ لوگوں نے دورانِ گفتگو نواب جعفر کا نام بار بار لیا تو چونک پڑا اور سر آگے بڑھا کر آپ کی باتیں سن رہا ہے۔ اپنے مالک کے نام پر وہ خوش ہو رہا ہے۔"

بوڑھی حبشن کی باتوں پر کسی نے توجہ نہ دی۔ وہ ہمیشہ اپنی قیاس آرائیوں میں محو رہتی تھی، اور افیون کھایا کرتی تھی۔

اب حنا کی میانہ قد جھاڑیوں کے اوپر چاند نکلنے لگا۔ ہوائیں آہیں بھر رہی تھیں۔ رات کے سناٹے اور باغ کی تنہائی میں ہماری باتوں کی مدھم آوازیں بالکل شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ معلوم ہو رہی تھیں۔

کچھ دیر ہم سب متاثر اور خاموش بیٹھے رہے۔ پھر ڈاکٹر گار نے پوچھا.....

"وہ کونسا لطیفہ تھا لوث جس پر مرحوم جعفر کو اتنی ہنسی آئی.....؟"

"غیر معمولی دلچسپ اور نیا تھا گار!"..... چچا لوث نے کہا۔

"خاک!"..... دادی زبیدہ نے سکون اعصاب کے لیے یوڈی کلون سونگھتے ہوئے کہا..... "ہم سب بچپن سے سنتے آئے ہیں۔ گزشتہ موسمِ گل میں یہی لطیفہ پچاس دفعہ لوث نے آپ کو سنایا تھا ڈاکٹر.....!"

## نوبل انعام

ڈائنامیٹ کے موجد کا نام ڈاکٹر الفریڈ نوبل تھا۔ وہ ۱۸۳۳ء میں سویڈن میں پیدا اور ۱۸۹۶ء میں فوت ہوئے۔ اُنہوں نے مرنے سے پہلے اپنی تمام جائیداد سے ایک ٹرسٹ قائم کیا اور وصیت کی کہ میری جائیداد کا منافع ہر سال ایسے پانچ افراد یا اداروں میں بطور انعام تقسیم کیا جائے جنھوں نے گزشتہ سال کے دوران میں طبعیات، کیمیا، طب، ادب اور قیامِ امن کے سلسلے میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہوں۔

چنانچہ یہ انعام جو "نوبل پرائز" کہلاتا ہے، ہر سال دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلا نوبل پرائز ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کو دیا گیا کیونکہ ۱۰ دسمبر ڈاکٹر الفریڈ نوبل کی پیدائش کا دن ہے۔ پاکستان کے مایہ ناز سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام کو بھی طبعیات کا نوبل انعام مل چکا ہے۔

(ابوتیسون اللہ بخش، ملتان)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”وہی لال بجھکڑ والا......؟“

”وہی وہی!“ ......دادی نے جواب دیا۔

چچالوث بولے: ”نہیں، یہ بالکل نیا تھا...... ایک شخص کی بھینس کا سر ایک گھڑے میں پھنس جاتا ہے۔ مشورے کے لیے وہ لال بجھکڑ کے پاس پہنچتا ہے۔ سوچ سوچ کر لال بجھکڑ صاحب رائے دیتے ہیں کہ: ”گھڑے سے سر نکالنا ہے تو سر کاٹ دو!“

چچالوث نے لطیفہ ختم کیا ہی تھا کہ وہ لرزہ خیز واقعہ وقوع پذیر ہوا جو میں آپ کو سنا رہی ہوں اور جس کے مقابلے میں چچا جعفر کی موت بھی معمولی واقعہ معلوم ہونے لگی تھی۔ لطیفے کے ختم ہوتے ہی نامعلوم سمت سے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔ ”قو قو قو...... شُر...... ہاہاہا...... شُر...... ہو ہو ہو ......اور آخر میں...... حق حق حق حقی“ ...... چچا جعفر بھی بالکل اسی طرح پرسوں رات لطیفے کے اختتام پر ہنسے تھے اور آج ان کی موت کے تیسرے دن قہقہے کی وہی خوف ناک آواز باغ کے سناٹے میں گونج رہی تھی۔ سکوت اور تحیر کا ایک دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور ہم سب بت بنے بیٹھے تھے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلتا تھا۔

مجھے ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی اور میں خاموشی سے اُٹھ کر دادی زبیدہ کے پہلو میں جا بیٹھی۔ وہ بھی کانپ رہی تھیں۔

اب چاند اوپر کو آچکا تھا۔ تناور درختوں کے اندھیرے سائے باغ کی خاموش روشوں پر جھکے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی چمگادڑ نیم تاریک فضا میں زور کا چکر کاٹ کر غائب ہو جاتی۔ سوئمنگ پول کا پانی نقرئی ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دادی زبیدہ مرتعش لہجے میں بولیں: ”یہ وہی ہنسی ہے جو پرسوں رات ہم سب نے لطیفے کے اختتام پر سنی تھی۔“

”چچا جعفر کی نا؟“ ......میں نے سرگوشی کی۔

”ہاں ہاں!...... انہی کی تھی!!“ دادی زبیدہ بولیں۔

”کیسے ممکن ہو سکتا ہے روجی؟“ ...... چچالوث بولے: ”جعفر کو ہم سے جدا ہوئے پورے تین دن گزر گئے ہیں“۔

دادی جان بولیں: ”ٹھیک ہے...... مگر بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ ہنسی جعفر مرحوم ہی کی ہے۔“

”مگر بیگم زبیدہ! دیومالائی خیالات کا فائدہ؟“ ......ڈاکٹر گار ناراض سا ہو رہا تھا۔ سبھی ایک انتشار میں مبتلا ہو گئے تھے۔

”حالات بد سے بدتر ہی ہوتے جاتے ہیں ڈاکٹر گار!“ دادی زبیدہ نے متفکر ہو کر کہا: ”آپ غیر قدرتی واقعات کے قائل نہیں تو پھر اس ہنسی کی کوئی معقول وجہ تلاش کیجیے...... ورنہ ہم سب کو مالیخولیا ہو جائے گا...... اور لوث! میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ آئندہ بھولے سے بھی کوئی لطیفہ......!“

چچالوث بولے: ”بھینس کا سر گھڑے میں پھنس جائے تو بھینس کی گردن تو نہیں کاٹی جاتی......؟ ابھی میں نے جعفر کو پورا لطیفہ سنایا ہی کہاں تھا...... میں تو ابھی کہنے والا تھا کہ سر کی بجائے گھڑا توڑا جائے...... مگر جعفر میں صبر کہاں؟...... لطیفہ آدھا سنا تھا کہ ہنس پڑے...... اور ہنستے چلے گئے...... قو قو قو ......شُر...... ہاہاہا......“

چچالوث کے اس جملے کے بعد قیامت گزر گئی...... ان کا قو قو قو، شُر...... کہنا تھا کہ وہی خوف ناک قہقہہ ایک دفعہ پھر اس زور سے باغ میں گونجنے لگا کہ ہم سب کے ہوش اُڑ گئے۔ ہم سب نے بلا ارادہ فوراً پیچھے پلٹ کر اس امید میں دیکھا کہ چچا جعفر ہمارے قریب کھڑے ہنس رہے ہوں گے ......مگر وہاں کوئی نہ تھا البتہ دو چار چمگادڑیں زور زور سے لڑتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزر کر دیودار کے جھنڈ میں غائب ہو گئیں۔

وہ رات ہم سب نے نہایت تشویش و اضطراب میں کاٹی۔

علی الصباح ہم سب چچالوث کے چمن والے کتب خانے میں تھکے ہوئے بیٹھے کافی پی رہے تھے اور رات کے واقعے پر اظہار خیال کر رہے تھے کہ زوناش زور زور سے بین کرتی ہوئی طوطے کا پنجرہ ہاتھ میں لٹکائے اندر داخل ہوئی......

”ہے ہے بیگم!...... نواب جعفر کا چہیتا طوطا بھی رات چل بسا......“

ہم سب کی نظر اٹھی...... پنجرے میں طوطے کی لاش اکڑی ہوئی پڑی تھی اور اس کا منہ اندھیرے غار کی شکل پوری طرح کھلا ہوا تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# خونی بھالو

ایک مہم جو باپ بیٹی کا سچا واقعہ، وہ نہیں جانتے تھے کہ خوبصورت نظاروں میں اِن کا واسطہ ایک بدصورت، وحشی اور آری جیسے دانتوں والے ریچھ سے پڑنے والا ہے

صبا شفیق

جوھن اور جینا، دونوں باپ بیٹی کو مہم جوئی کا بے حد شوق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب جینا نے ہائی سکول کا امتحان پاس کیا تو دونوں باپ بیٹی نے اپنی خوشی منانے کا پروگرام بنایا۔ انھوں نے گلیشیئر نیشنل پارک کو مہم جوئی کے لیے منتخب کیا تاکہ قدرت کے دلفریب نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ پہاڑوں پر چڑھنے کا اپنا شوق بھی پورا کر

لیں۔ جینا کی بہن اسٹیفینیہ اور ماں میرلین اکثر ایسی مہموں پر جانے کے بجائے گھر رہنا ہی پسند کرتی تھیں۔ جینا بہترین پرفارمر تھی اور جوہن عمدہ ایتھلیٹ..... دونوں ہی پہاڑوں پر چڑھنے کا شوق اکثر پورا کرتے تھے۔ جوہن کو بچپن سے بھالو بہت پسند تھے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو والدین اور بھائی کے ساتھ اکثر بھالو دیکھنے مختلف جگہوں پر جایا کرتا اور اُس کا یہ شوق اور جوش کبھی ختم نہیں ہوا تھا۔ مگر اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ گلیشیر نیشنل پارک کی مہم میں اُس کا واسطہ ایک خونی بھالو سے پڑنے والا ہے۔

منزل پر پہنچ کر جوہن نے پوری مہم ترتیب دے لی۔ مگر جب مہم کا پہلا دن بارش کی نظر ہوا تو اس کا جوش کچھ ماند پڑ گیا۔ باپ بیٹی گاڑی پر ہی اِدھر اُدھر گھوم کر مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اگلا دن بہت خوبصورت تھا۔ اِدھر اُدھر اُڑتے بادلوں میں سے جھانکتا سورج بے حد خوبصورت نظر آتا تھا۔ اردگرد کی چوٹیوں پر ہلکی ہلکی برف پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنا سفر شروع کیا۔ رستہ بے حد خوبصورت اور انواع واقسام کے پھولوں اور خوش رنگ جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک جگہ انھوں نے سنہری عقاب کو شکار کرتے دیکھا۔

کبھی وہ بلند آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے، کبھی اپنے اپنے خیالوں میں کھو جاتے۔ جینا سوچنے لگتی کہ کیسے ایک ہی وقت میں وہ ڈاکٹر بھی بنے اور بہترین رقاصہ بھی بن جائے۔ جوہن سوچتا کہ جانے وہ بوسٹن میں ہونے والی میراتھن میں شرکت کر سکے گا یا نہیں.....؟ اور پھر جیسے ہی وہ ایک گلیشیر کی جنوبی چوٹیوں کے پاس پہنچے جو وادی سے تقریباً ۳۵۰۰ فٹ بلند تھیں تو وہ اُس لمحے اور منظر کی خوبصورتی میں کھو گئے..... پہاڑوں سے جھیل میں اُترتا نالا اور پتھروں پر گرتے چشمے اور آبشاریں تمام منظر اتنا روح پرور تھا کہ دونوں باپ بیٹی خاموشی سے اس خوبصورتی کو اپنے اندر اُتارنے لگے۔

چند لمحے وہاں رُکنے کے بعد دونوں نے سفر پھر سے شروع کیا۔ انھیں پہاڑی پر چڑھتے ابھی گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ اُن کا خونخوار بھالو سے سامنا ہوگیا۔ اُس وقت وہ پہاڑ پر بنے ایک تنگ راستے پر تھے۔ وہاں چڑھائی آسان تھی مگر کل ہونے والی بارش کی وجہ سے کیچڑ بھی تھا۔ جوہن کچھ تصویریں اُتارنے لگا جبکہ جینا آگے بڑھ گئی۔

تنگ راستے کا موڑ مڑ کر جینا جونہی دوسری سمت کچھ آگے بڑھی، اُسے ایک بڑا بھالو اپنے دو بچوں کے ساتھ نظر آیا۔ بھالو اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا، جینا خوفزدہ ہو کر چیخیں مارتی واپس بھاگنے لگی۔ جوہن نے دیکھا، جینا اُس کی طرف بھاگی آرہی ہے، وہ چیخ رہی تھی مگر جوہن کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ مگر پھر اُس نے دیکھ لیا، وہ بڑا بھالو اور اُس کا کھلا ہوا منہ، جو جینا کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ جینا بھاگتی ہوئی اُس کے قریب سے نکل کر آگے بڑھی، مگر وہ ایک دم تمام صورتحال سمجھ کر بھاگنے سے قاصر رہا۔ تقریباً ۴۰۰ پاؤنڈ وزنی بھالو جوہن کے اوپر آگیا۔

بھالو اپنے دونوں ہاتھوں میں اُسے پکڑ کے یوں جھٹکے دینے لگا جیسے وہ کوئی چھوٹا سا بے جان پتلا ہو۔ پھر اُس نے اُسے کاٹنا شروع کر دیا۔ جوہن ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں گرفتار تھا۔ بھالو اُس کو بار بار کاٹ رہا تھا۔ دانت کسی تیز آری کی طرح گوشت کاٹتے ہوئے اُس کی ہڈیوں تک پہنچ رہے تھے۔ بھالو کے تیز نوکیلے پنجے اُس کے جسم کے مختلف حصوں کی کھال اُدھیڑ رہے تھے۔ پھر یک دم جوہن نے بھالو کو گردن سے پکڑ لیا۔ اُس کے بال یوں تھے جیسے کسی گندے کتے کے بال۔

ایک لمحے کو بھالو نے حیرانی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ نارنجی آنکھیں، اسے گھور رہی تھیں۔ پھر اُس کی تھوتھنی جوہن کے چہرے کے ساتھ جا لگی۔ اب وہ اُس کے چہرے پر کاٹنے لگا۔ جوہن نے اپنے گھٹنے سینے کے ساتھ لگا کر چہرہ اور سر بچانے کی کوشش کی تو بھالو اُس کے دائیں بازو پر کاٹنے لگا۔ جوہن نے بھالو سے لڑنے کا سوچا اور نیچے بیٹھتے ہوئے زمین سے ایک پتھر اٹھایا۔ مگر وہ بھربھری مٹی کا پتھر ہاتھوں میں ہی ٹوٹ گیا۔ بھالو دانتوں



اور پنجوں سے اُسے چیڑ پھاڑ رہا تھا۔ اُس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہنے لگا۔

اب جوہن کو شدید غصہ آیا۔ اس کا دل چاہا کہ بھالو کو اٹھا کر پہاڑ سے نیچے پھینک دے۔ کاش! وہ ایسا کر سکتا..... اچانک جوہن کو اپنے سر اور گردن پر بہت سا وزن محسوس ہوا۔ بھالو اب اُس کے سر پر کاٹ رہا تھا۔ اُس کے دانت کھوپڑی اُدھیڑتے دماغ کی ہڈی تک پہنچ گئے تھے۔ جوہن نے سوچا، شاید موت آگئی۔ اب اُس کا دایاں ہاتھ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ بھالو نے اُسے بری طرح کاٹا تھا۔ وہ بھالو کو پیچھے بھی دھکیل نہیں پایا۔ کاش! یہ کوئی فلم یا ڈراما ہوتا، جوہن نے سوچا، مگر یہ حقیقت تھی اور اُسے جلد کچھ کرنا تھا، موت اُس کے سامنے کھڑی تھی۔

اُس کے دائیں طرف پہاڑ کی دیوار تھی جبکہ بائیں سمت ایک ڈھلوان جس پر جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جوہن کی پرورش ہالینڈ میں ہوئی تھی اور وہ بچپن اور جوانی میں کئی بار ڈھلوانوں سے پھسلا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ جھاڑیوں سے رگڑ کھاتے ہوئے نیچے گزرنا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے، مگر اُس کے پاس کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ اُس نے سوچا شاید اس طرح وہ بھالو سے بچ جائے۔ بھالو سے دھینگا مشتی میں اُس کی دائیں آنکھ بھی زخمی ہوگئی تھی۔ اب دائیں آنکھ سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس کے پاس اب کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا، سو اُس نے خود کو ڈھلوان سے نیچے گرا لیا۔

وہ ایک پتلے سے نالے پر گرا جو کل کی بارش سے بہنے لگا تھا۔ ٹھنڈا پانی اس کی کمر چھونے لگا..... تقریباً بیس فٹ اوپر کھڑا بھالو اُسے گھور رہا تھا۔ جوہن کو لگا کہ وہ یہاں محفوظ ہے مگر پھر اُسے جینا کا خیال آیا جو اب بھالو کے ساتھ تنہا تھی۔ وہی ہوا، جوہن کے نیچے گرتے ہی خونخوار بھالو جینا کی طرف متوجہ ہوا اور اُس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ جینا کو اچانک زمین پر "Bear Spray" (بھالو اسپرے) کی بوتل نظر آئی جو پارک میں آنے والے تمام لوگوں کو ساتھ لانی پڑتی تھی۔ یہ بوتل اُس کے باپ کے

## قیمتی راز

TOP SECRET

ہالینڈ کے ایک کامیاب اور مشہور ڈاکٹر ہرمن بورہیو کی وفات کے بعد جب ان کے سامان کا جائزہ لیا گیا تو اس میں سے ایک کتاب بھی برآمد ہوئی، جس کا نام "طبی دنیا کا واحد اور بیش قیمت راز" تھا۔ کتاب سربمہر تھی۔ ایک امیر آدمی نے اس کتاب کو ۱۰ ہزار ڈالر میں خرید لیا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ اس کتاب میں ڈاکٹر نے کوئی حیرت انگیز قسم کے راز یا نسخے کا انکشاف کیا ہوگا۔ کتاب کی مہر توڑ دی گئی اور یہ دیکھ کر کتاب خریدنے والے کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ کتاب کے ننانوے صفحات بالکل کورے تھے۔ صرف اندرونی سرورق پر یہ جملہ تحریر تھا

"اپنا سر ٹھنڈا اور پیروں کو گرم رکھو گے تو تمہیں کبھی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

(طارق محمود چوہدری، لاہور)

بیگ سے گر گئی تھی مگر بوکھلاہٹ میں اُس کا ڈھکن نہیں کھل پایا۔ بھالو بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

جوہن نیچے سے چلایا "جینا یہاں آجاؤ" مگر وہ باپ کی آواز نہیں سن پائی اور پھر بھاگتے ہوئے ایک پتھر سے ٹکرا کر پہاڑ سے نیچے گرنے لگی۔ اس کے بازو اور ٹانگیں سخت چٹانوں سے ٹکرائے اور جھاڑیوں سے اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ آخر نیچے جھاڑیوں کے ایک بڑے جھنڈ میں جینا پھنس کر مزید گرنے سے رک گئی۔ جوہن چلایا: "جینا، جینا! تم ٹھیک ہو.....؟"

جینا اُس کی آواز نہیں سن پائی مگر چالاک بھالو نے سُن لی۔ وہ پلٹا اور تیزی سے ڈھلوان سے نیچے اُترتے ہوئے اُس کی جانب آنے لگا۔ جوہن نے پوری زندگی میں کسی کو اتنی ڈھلوان سے اُترتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھالو نے قریب پہنچ کر اُس پر دوبارہ حملہ کر دیا۔ اب وہ اُلٹا ہو گیا۔ بھالو اُس کی کمر پر کاٹنے لگا مگر سفری بستے نے اُسے بچایا جو اُس نے کمر پر باندھ رکھا تھا۔ جوہن کا ذہن تیزی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے سوچنے لگا۔ بیٹی کے پاس تو یہ سفری بستہ بھی نہیں تھا جو اُس کو بچا پاتا۔ ہمیشہ جوہن ہی پانی، خوراک اور دیگر ضروری سامان اٹھاتا تھا۔ وہ سوچنے لگا، اگر بھالو بیٹی تک پہنچ گیا تو وہ اُسے لمحوں میں چیر پھاڑ ڈالے گا۔ بھالو نے پھر اُس کی گردن پر کاٹنا چاہا۔ جوہن خود کو بچانے مڑا اور دائیں طرف جھولتے ہوئے ایک بار پھر پہاڑ سے نیچے گرنے لگا۔ اس بار وہ پہاڑ سے ذرا سی باہر نکلی ایک چٹان پر گرا۔ وہاں جگہ اتنی کم تھی کہ وہ وہاں ٹھیک سے بیٹھ سکتا تھا نہ لیٹ سکتا تھا۔ وہ پہاڑ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

جوہن چاہتا تھا کہ بھالو بیٹی کی طرف متوجہ نہ ہو مگر اُس کے نیچے گرنے سے وہ پھر ڈھلوانوں سے اترتے ہوئے جینا کی طرف بڑھنے لگا۔ جینا نے خود کو جھاڑیوں میں چھپانے کی کوشش کی مگر بے سود..... ہانپتا ہوا بھالو اُس کے قریب آ پہنچا اور اُسے کاٹنے لگا۔ گرنے کی وجہ سے اُس کی کمر پہلے ہی دُکھ رہی تھی، سر سوج گیا تھا اور گھٹنوں اور ٹخنے سے خون نکل رہا تھا۔ بھالو پھر اُس کے کندھوں اور چہرے پر کاٹنے لگا۔ جینا کی چیخوں نے صبح کا سکوت توڑ ڈالا اور پھر کچھ دیر بعد اُس کی چیخیں تھم گئیں۔

جوہن کا دل ایک لمحے کو بند سا ہو گیا۔ اُسے لگا کہ بھالو نے جینا کو مار ڈالا ہے۔ وہ چلایا ''..... جینا! جینا! .....''

جب جینا کی آواز آئی: ''جی ابو!.....'' تو اسے لگا کہ وہ پھر سے جی اٹھا ہے۔

جوہن نے پوچھا: ''بھالو کہاں ہے؟''

جینا چلائی: ''ابو! میں نے سانس روک کر مردہ ہونے کی اداکاری کی اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔'' جوہن نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بیٹی کی جان بچ گئی۔ جوہن پہاڑ کے ساتھ لگا خون سے لتھڑ رہا تھا۔ اُس پر کپکپی طاری تھی۔ اُس نے دائیں بازو کی طرف دیکھا جو بھالو نے بری طرح کاٹ کھایا تھا۔ وہ خود کو تسلی دینے لگا کہ اُس کا بازو ٹانکے لگ کر سِل جائے گا۔ جوہن کے لئے اب مزید کھڑے رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ اسے لگا کہ وہ گر جائے گا.....

اُس نے دیکھا کہ تھوڑی دور چند فٹ اوپر باہر کو نکلی ایک اور چٹان واقع ہے جس پر لیٹنے اور بیٹھنے کے لیے جگہ موجود تھی۔ مگر جوہن بیگ اور کیمرے کے ساتھ چٹان پر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ سو اس نے بیگ اور کیمرا وہیں چھوڑا اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچنے تک اُسے چکر آنے لگے تھے لہٰذا وہ چٹان پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ تبھی اسے جینا کی آواز آئی: ''ابو! آپ ٹھیک ہیں.....؟''

جوہن نے کہا: ''ہاں میں ٹھیک ہوں مگر اُس نے مجھے بری طرح کاٹا ہے۔ تم بتاؤ کیسی ہو.....؟''

جینا بولی: ''ابو! میرا خون بہہ رہا ہے۔''

جوہن نے پوچھا: ''تمہارا چہرہ تو محفوظ ہے نہ.....؟''

جینا نے کہا: ''جی! بس میرا ہونٹ ذرا سا کٹ گیا ہے۔''

جوہن نے بولا: ''تمھاری آنکھیں تو ٹھیک ہیں نہ..... بھالو نے ان پر تو حملہ نہیں کیا؟''

جینا بولی: ''جی ابو! میری آنکھیں محفوظ ہیں۔''

پھر وہ دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ جینا اپنے زخم دیکھنے لگی، اُس کے کندھے کا زخم ہڈی تک گہرا تھا۔ بال خون سے جم چکے تھے اور نچلا ہونٹ ٹھوڑی تک کٹ چکا تھا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے سے ۷۵ فٹ دور پہاڑ پر چڑھے وادی میں دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ دونوں مدد کے لئے چلانے لگے۔ اُن کی پکاریں پہاڑوں سے ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں..... سردی، ٹھنڈی ہوا اور سکوت سب انھیں غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ تقریباً ۴۵ منٹ بعد جینا چلائی: ''ابو! میں نے ابھی ایک کشتی کو جھیل پر دیکھا ہے۔''

جوہن کچھ مطمئن سا ہو گیا، وہ جانتا تھا کہ مزید مہم جو وہاں پہنچ گئے ہیں اور ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور اُن کی پکار سن لے گا۔ وہ مدد کے لئے چلا چلا کر بہت تھک گیا تھا، سو خاموش ہو کر اپنا دھیان درد اور زخموں سے ہٹانے کی کوشش اور خود کو تسلی دینے لگا کہ زخم گہرے نہیں ہیں اور معمولی جراحی سے جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ اور اس کی بیٹی ابھی تک زندہ تھے۔



وہ منجمد ہو رہا تھا کہ اچانک اُسے بیٹی کے کسی سے گفتگو کرنے کی آواز آئی اور پھر جینا چلائی: ''ابو! کچھ لوگ یہاں پہنچے ہیں۔ مدد بھی پہنچ رہی ہے۔'' جوہن کو انتظار بہت طویل لگا۔ پھر جوہن نے ایک آدمی کو دیکھا جو جھاڑیاں کاٹتے اس کی طرف بڑھ رہا تھا..... جوہن کو دیکھ کر ایک پل کے لئے وہ سکتے میں آ گیا۔ اس نے بھالو کے حملے کی وجہ سے اتنی خراب حالت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

جوہن کا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ ٹانگوں، بازوؤں اور سر سے بھی لہو بہہ رہا تھا۔ یہ نیپ تھا جو اپنی بیوی کے ساتھ مہم جوئی پر آیا تھا۔ جینا کی آواز سن کر وہ دونوں جوہن اور جینا کی مدد کرنے وہاں پہنچ گئے۔ نیپ نے اپنی قمیص اتار کر جوہن کی ٹانگ کے زخم پر باندھی اور اُسے پانی پلانے لگا۔ پھر وہ جینا کے لئے بھی پانی لے کر گیا۔ تھوڑی دیر میں دوسرے مہم جو بھی وہاں پہنچ گئے وہ اُن کی حالت پر افسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ مدد بس پہنچ رہی ہے۔ جوہن حیران تھا کہ وہ لوگ اسے اور جینا کو پہاڑ سے کیسے اتاریں گے۔ اُسے نیند آ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، مگر وہ جانتا تھا کہ اُس کے لیے جاگنا بہت ضروری ہے۔

جلد ہی بہت سے پارک رینجر بھی پہاڑ پر پہنچ گئے اور مدد کے لیے ٹیمیں تشکیل دی جانے لگیں۔ اب جوہن کو لگا کہ اُس کی گردن ٹوٹ رہی ہے۔ سر کے نیچے موجود پتھر دماغ میں چبھ رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر بیٹھنا چاہا مگر چکرا گیا۔ اُسی لمحے رینجر کیٹی وہاں ابتدائی طبی امداد کے لیے پہنچ گئی اور اس کی مرہم پٹی کرنے لگی۔ حملے کو تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ سرد ہواؤں اور خون کے مسلسل بہنے سے جوہن کے جسم کا درجہ حرارت گر رہا تھا۔ پندرہ منٹ بعد جوہن اور جینا کو ہسپتال لے جانے کے لیے ہیلی کاپٹر بھی پہنچ گیا، مگر وہ ایسی جگہ گرے تھے جہاں ہیلی کاپٹر اُتر نہیں پایا۔

مزید رینجر جوہن کے پاس پہنچ گئے۔ ایک خاتون رینجر اُسے دیکھ کر رونے لگی۔ اُس کی بطور رینجر پہلی نوکری تھی..... یہ اُس کے سامنے ہونے والا پہلا بڑا حادثہ تھا۔

## دلکش اندازِ بیاں

ایک شخص نے دوسرے سے اپنی بیوی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ''میری بیوی میرے آرام کا پورا خیال رکھتی ہے۔ اگر کبھی گرم پانی کی ضرورت ہو تو وہ فوراً دیتی ہے۔''

دوسرا شخص بولا ''یہ تو خیر اچھی بات ہے کہ وہ بہت اچھی ہے، لیکن تمہیں گرم پانی کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟''

پہلا شخص بولا ''بھئی آج کل سردیاں ہیں اور میں ٹھنڈے پانی سے برتن نہیں دھو سکتا۔''

(احمد لاریب، حاصل پور)

اُس کے آنسوؤں نے جوہن کو بتا دیا کہ اُس کی حالت بہت خراب ہے۔ انھوں نے پھر جوہن کی گردن پر پٹی کر کے اسے کالر لگایا اور پھر ایک تختے پر لٹا دیا۔ جوہن کو تختے سمیت ایک بڑے بیگ میں اچھی طرح لپیٹ دیا گیا۔ ایک رینجر نے اس کے ساتھ خود کو باندھا۔ پھر ہیلی کاپٹر سے ایک رسی جوہن کے قریب پھینکی گئی۔ چونکہ ہیلی کاپٹر کو اترنے کی جگہ نہیں ملی لہٰذا رینجروں نے ۱۵۰ فٹ اوپر سے رسی پھینک کر جوہن کو اوپر اٹھا لیا۔ جوہن کو ہسپتال پہنچانے کے بعد ہیلی کاپٹر جینا کو لینے گیا۔ پھر جوہن نے بے ہوش ہوتے ہوتے سنا کہ جینا بھی پہنچ گئی ہے۔ اس نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

اُسے معلوم تھا کہ وہ اور اُس کی بیٹی اب محفوظ ہیں۔ وہ جانتا تھا، وقت مقررہ سے پہلے موت کسی کو بھی اپنے شکنجے میں نہیں لے سکتی اور اُسے شاید ابھی زندہ رہنا تھا.....!



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شکوے اور توقعات سے بھرے معاشرے
سے ایک اچھوتی داستاں

ایک غریب آدمی کا ماجرا
وہ دل کی غربت سے آگاہ نہ تھا

اشفاق قریشی

# شام

ڈھلنے کا سوچ رہی تھی۔ ہوا بھی کسی کھوج میں گم تھی۔ میں گھر سے مغرب کی نماز کیلئے نکلا تھا۔ چونکہ ابھی وقت نے انگڑائی لینے کو ہاتھ نہ اٹھائے تھے اس لئے میں تسبیح ہاتھ میں لئے ورد کرتا ہُوا قریبی باغیچے کی طرف نکل آیا تھا۔ ایک جگہ میں سڑک کے کنارے چلتے چلتے ذرا رُکا اور ترچھی نظروں سے بائیں جانب دیکھا۔ وہاں لڑکے کرکٹ کی نیٹ پریکٹس کر رہے تھے۔ میں رُخ موڑ کر بیٹنگ کرتے ہُوئے لڑکے کی مہارت کا جائزہ لینے لگا۔ معاً مجھے احساس ہُوا کہ میری دائیں جانب سے سڑک کے کنارے کوئی لہراتا ہُوا میری طرف آرہا ہے۔ میں نے پُوری توجہ سے دیکھا تو ایک آدمی کٹی پتنگ کی طرح جھپ کھا کر میرے قریب آگیا اور زردی مائل دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ پہلے خیال نے سرگوشی کی کہ شاید یہ نیم دیوانہ اور کچھ طلب کرنے کو ہے۔ میں نے اُس کے نیالی رنگت کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہاں کسی طور بے ترتیبی کے آثار نہ تھے۔ اُس کے بال بہت چھوٹے تھے۔ مجھے وہ بھی نیالے لگے۔ لباس بھی نیالا، ہاتھ بھی نیالے، بازو بھی نیالے۔ مجھے یُوں لگا کہ ایک نیالا مجسمہ میرے سامنے کھڑا ہے۔ میری سوالیہ نظروں کے جواب میں اُس نے اپنے ہاتھ میں دبی ہُوئی ڈبیا مجھے دکھائی اور لہرا کر کہا۔

"میں نے سوچا کہ کسی سے پوچھ لینا اچھی بات ہے۔"

"کہو، کیا بات ہے؟"

"میرے جی بازو میں درد ہے۔" اُس نے بایاں بازو ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے اُس کے دُبلے سے نیالے بازو پہ نگاہ ڈالی اور بیتابی سے گہرا سانس لیا کہ اب یہ مطلب کی بات کرے اور جائے۔ اُس نے شاید میری بیتابی بھانپ لی۔ مسکراہٹ اُس کی نظروں سے جھانکنے لگی۔

"میں نے آپ جیسے ایک سیانے سے بات کی تو اُس نے مجھے یہ دوا لگانے کو دی ہے۔" اُس نے ڈبیا پھر میرے سامنے کی۔

"تو پھر اور کیا چاہیے؟" میں نے بھی اُسے مسکراہٹ کی بھیک دے ڈالی۔

"میں نے سوچا کسی اور سیانے کو دکھاؤں۔"

میں نے ڈبیا پکڑی اور اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ وہ مرہم مجھے آیوڈیکس جیسی لگی۔ میں نے جانا کہ یہ درد کیلئے ہی ہوگی۔ میں اب کیا کہوں؟..... میں نے سوچا اللہ کسی کو بے بس نہ کرے کہ وہ تنہائی کے زنداں میں پھنس جائے اور دیواروں سے باتیں کرنے لگے..... میں نے اُس کی تسلی کی خاطر توانا لہجے میں کہا۔

"یہ دوا بالکل ٹھیک ہے۔ صبح شام لگاؤ۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"بس جی میں نے یہی پوچھنا تھا۔"

اُس نے مُسکراتے ہوئے ڈبیا پکڑی اور لہراتی چال کے ساتھ آگے نکل گیا۔

دو دن بعد شام کی اُسی کیفیت میں میں اُسی باغیچے میں ٹہل رہا تھا۔ تسبیح پہ ورد بھی جاری تھا اور کرکٹ کی پریکٹس پہ بھی نظر تھی۔ ایک طرف جھولوں پر بچوں کے جھرمٹ تھے۔ خالی جگہ میں ایک محدود دائرے میں رہتے ہوئے چند لڑکے فٹ بال بھی کھیل رہے تھے۔ بنچوں پر بیٹھے چند لوگ رونقِ بزم سے بہلے ہوئے تھے۔ اُس ہنگامے سے بے نیاز سورج آہستگی سے ڈھل رہا تھا۔ روشنی سمٹ رہی تھی۔ تاہم میری نظروں کی آوارگی ابھی سمٹی نہ تھی۔ میری نظر باغیچے کے ٹیوب ویل کی طرف گئی تو مجھے وہ نیالا مجسمہ دکھائی دیا۔ وہ وہاں برقی کولر سے ٹھنڈا پانی ایک برتن میں بھر رہا تھا۔ پانی لے کر وہ وہاں نہ ٹھہرا اور لہراتا ہُوا اگلے گیٹ کی طرف چلا گیا جیسے رونقِ بزم سے اُسے کوئی مطلب نہ ہو۔ جیسے اُس کیلئے وہاں کوئی دل بہلانے کی چیز نہ ہو..... یا جیسے اُس پہ کوئی پابندی ہو کہ خبردار رُکنا نہیں، پانی لو اور پلٹ آؤ۔

اگلے چند روز بھی میں نے اُس پہ نظر رکھی۔ اُس کی وہی چال، وہی ادا تھی۔ نہ رُکتا، نہ کسی سے بات کرتا۔ ایک طرف سے باغیچے میں داخل ہوتا۔ سیدھا کولر کی طرف جاتا۔ برتن میں پانی بھرتا اور دُور اگلے گیٹ کی طرف چل دیتا۔ ایک روز مجھے خیال گزرا کہ بھلا یہ کیا بات ہُوئی کہ وہ اپنے گھر سے آتے ہُوئے قریبی گیٹ سے باغیچے میں داخل ہوتا ہے مگر جاتے ہوئے دُور والے گیٹ سے نکلتا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر واپس جاتا ہے.....!

ایک روز میں معمول سے قدرے دیر سے باغیچے کی

## اللہ مالک ہے

بغداد فتح ہو گیا۔ ہلاکو خان ایک گھوڑے پر سوار اُس صف کے سامنے آیا جو قتل کی سزا ملنے والوں کی تھی اور جلاد تلواریں سونت کر کھڑے تھے۔ جب قتلِ عام شروع ہوا تو ایک شخص قطار سے کھسک کر ذرا دُور ہو گیا۔ جلاد اپنا کام کرتے رہے اور وہ شخص قطار سے اپنی جگہ بدلتا رہا۔

ہلاکو یہ سب تماشا دیکھتے ہوئے اِس متوقع "مقتول" پر ہنس رہا تھا۔ جب جلاد اس کے قریب پہنچے تو ہلاکو نے اِس سے مذاق کیا کہ اب کہاں جاؤ گے؟ اُس نے جواب دیا "اللہ مالک ہے۔ اگر زندگی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔"

اسی گفتگو کے دوران اچانک کہیں دھما کا ہوا اور ہلاکو کا گھوڑا بدک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ رکاب میں ہلاکو کا پاؤں پھنس گیا اور وہ مر گیا۔ اس حادثے پر سب کچھ ختم ہو گیا، جلاد بھاگ گئے اور سپاہی بھی اپنے بادشاہ کو بچانے کے لیے دوڑے، لیکن وہ شخص جو قتل گاہ میں بچنے کی کوشش کر رہا تھا، بچ گیا اور اُس کی ہنسی اُڑانے والا مر گیا۔

(عمران رشید، لاہور)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف جارہا تھا کہ وہ مجھے سامنے سے آتا ہُوا نظر آیا۔ وہ پانی لے کر لوٹ رہا تھا۔ ہماری نظریں ملیں تو وہ کھل سا گیا۔ وہ میری طرف لہرا کر آیا اور جھک کر سلام کیا۔ میں نے اُس کا مصافحے کیلئے بڑھا ہوا مٹیالا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔

"کہو، اب کیا حال ہے؟"

اُس نے ذرا گردن اُٹھائی اور ایک اُنگلی آسمان کی طرف سیدھی کی اور کہا۔

"اللہ کا بڑا کرم ہے، رب کی بڑی رحمت ہے۔"

اُس کے لہجے کی توانائی اور یقین کی شدت سے میں چونک سا گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے اپنی فصل ٹھکانے لگانے کے بعد حواریوں میں بیٹھے کسی چوہدری نے حقے کا ایک کش لے کر دکھاوے کی خاطر اللہ کا شکر ادا کیا ہو۔ مگر میرے سامنے کھڑے آدمی کے لہجے میں محض دکھاوا نہیں، ایک رچاؤ سا تھا۔ جیسے اُس کی زبان بنی ہی شکر ادا کرنے کے لئے ہو۔ میں دل میں بے مزہ ہُوا جیسے اُس کے اِس کلام کے سامنے میرا تسبیح پہ ورد ایک سطحی سی بات ہو۔ میں تسبیح کو مٹھی میں دبا کر اس کے مٹیالے حلیے کا جائزہ لینے لگا..... میں نے سوچا، یہ مٹیالا ضرور ہے مگر کوئی اِسے گندا نہیں کہہ سکتا۔ خدایا یہ گھسے ہوئے خاکی مٹیالے کپڑوں کے علاوہ کوئی اور کپڑے کیوں نہیں پہنتا۔ طبع سے وہ بے پروا لگتا ہے جیسے اُسے ہر چیز میسر ہو۔ جیسے اُسے کسی چیز کی ضرورت نہ ہو..... اِس اثنا میں اُس نے مجھے رُخصتی سلام کیا اور لہرا کر آگے نکل گیا۔

ایک روز میں باغیچے میں ایسے حصے میں کھڑا تھا جو اُس کے واپسی کے رستے کے قریب تھا۔ اُس نے مجھے دیکھا تو ہنستے ہوئے میری طرف لپکا۔ اُس گھڑی میری طبع بھی قدرے فراخ تھی۔ میں نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"چوہدری یہ کیا بات ہوئی۔ اِس طرف سے آتے ہو اور لوٹتے ہُوئے اُس طرف سے اِتنا لمبا چکر کاٹ کر واپس جاتے ہو؟"

وہ اک ادا سے ہنسا۔ پھر میری طرف قدرے جھکا اور ہونٹ سنوارے جیسے کوئی راز کی بات کہنے لگا ہو۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"او جناب جب بندہ باہر نکلتا ہے تو سو بچن، سو دشمن۔ یہ بھی ایک چال ہے کہ اِدھر سے آؤ، اُدھر سے جاؤ۔ کسی کو سمجھ ہی نہ آئے کہ معاملہ کیا ہے..... سمجھ گئے نا آپ؟"

بات ختم کرتے ہُوئے اُس کا لہجہ پھر توانا ہُوا تو وہ ہنس دیا۔ میں نے بھی ہنسنے میں اُس کا ساتھ دیا جیسے اُس نے کوئی معرفت کی بات کہی ہو اور میں سمجھ گیا ہوں۔ میں نے اُس کی طلسماتی بات کے اثر سے نکلنے کی خاطر کہا۔

"او تم ہو کہاں کے؟"

"بورے والا کے پاس ایک گاؤں ہے۔ میرا گھر وہاں ہے۔"

"کوئی گھر والے ہیں؟"

"ہاں جی، بیوی ہے، لڑکی ہے، لڑکا ہے۔"

اُس کے مٹیالے حلیے اور نرا تواں بدن سے نکلتے ہوئے قوی لہجے سے مجھے اکتاہٹ سی ہوئی۔ میں نے قدرے چڑ کر پوچھا۔

تو یہاں کیا کرتے ہو؟

کرنا کیا ہے جی، وقت گزارنا ہے۔ وہ گزر رہا ہے۔

اُس کی یہ بات پھر مجھے کوئی معرفت کی بات لگی۔ میں لاجواب ہو کر کچھ نہ بولا۔ خفت کے لمحے سے نکلنے کی خاطر میں اُس کے مٹیالے کپڑے، مٹیالے کھچڑی خشخشی بال دیکھ کر سوچنے لگا..... اے کاش جہاں یہ ملازم ہے وہ اِسے کپڑے دھونے کے لئے صابن ہی دے دیا کریں۔

اچھا جی رب راکھا۔ اُس نے دایاں ہاتھ لہرا کر کہا اور جانے کے لئے پلٹا۔

ذرا سنو۔ میں نے تسبیح والا ہاتھ لہرایا۔ وہ متوجہ ہُوا تو اُس کی نظروں میں سوال نہ تھا۔ وہی ہلکی سی مُسکراہٹ تھی۔ میں نے بھی ہاتھ لہرا کر تمسخر سے کہا۔

کل یہاں سے گزرو تو مجھے ضرور ملنا۔

کل کوئی خاص بات ہے؟

بس تمہارے لئے ایک چیز ہے میرے پاس۔

اُس نے سینے پہ ہاتھ رکھا اور لہرا کر پلٹ گیا۔ میں بھی مُڑ کر کرکٹ کی پریکٹس دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے پھر اُسی سمت دیکھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہُوا جا رہا تھا جیسے



صحرا میں اُونٹ جا رہا ہو۔ جیسے پریشان ہو کہ گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ میری تسبیح تیز تر ہُوئی۔ میری طبیعت میں بیقراری سی آئی۔ میں نے سوچا..... خدایا یہ کس قید میں مبتلا ہے؟

اگلی شام میں اُس کے انتظار میں باغیچے میں ٹہلتا رہا۔ میری جیب میں ہزار کا ایک نوٹ دم سادھے پڑا تھا۔ ایک مکالمہ رہ رہ کے میرے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔

یہ تم رکھ لو۔ اِس دفعہ گھر جاؤ تو اپنے اور بیوی کے لئے نئے کپڑے لے جانا۔

شام نے گھونگھٹ دراز کر لیا۔ مگر وہ نہ آیا۔

وہ اُسی ڈھنگ کی ایک شام تھی۔

وہ برقی کولر سے پانی لے کر روانہ ہُوا تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ کسی پرندے کی طرح اُڑ کر میری طرف آیا۔ اُس نے لپک کر سلام کیا تو میں نے بھی خوش طبعی سے کہا۔

کیوں بھئی اتنے دن کہاں غائب رہے؟

میں جی گاؤں چلا گیا تھا۔

میں نے دل میں سوچا کیسا بے وقوف ہے۔ اُس روز مجھ سے مل لیتا تو گاؤں خالی ہاتھ نہ جاتا۔ اپنا نقصان بھی کیا، میرا مکالمہ بھی ضائع کروایا۔ میں نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔

تم اگلے روز کیوں نہ آئے؟

وہ کچھ دیر سوچ میں گم رہا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ سوچ سے باہر نکل آیا۔ اُس کے چہرے پہ مُسکراہٹ آ گئی تھی۔ جیسے اُسے کوئی بہانہ ہاتھ لگا ہو۔

اُس روز گھر گیا تو گاؤں سے فون آیا تھا۔ بیٹی بیمار ہو گئی تھی۔ اُسی رات میں گاؤں روانہ ہو گیا تھا۔

اوہ، اچھا۔ کیا عمر ہے اُس کی؟ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

خیر سے جوان ہے جی۔ ڈاکٹری پڑھتی ہے۔

مجھے اُس کی یہ بات پسند نہ آئی۔ میں دل میں ہنسا کہ یہ آدمی کیا بات کر رہا ہے۔ ذرا کوئی اِس کا حلیہ تو دیکھے۔ یہ بیٹی کو میڈیکل کیا پڑھائے گا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے اپنی بات پہ گرہ لگائی۔

اسے جی آپریشن کرنا بھی سکھاتے ہیں۔

مجھے پھر اُس کی بات ہضم نہ ہُوئی۔ میں نے دل کی تسلی کے لئے سوچا..... اِس غریب کو کیا معلوم، وہ ضرور نرسنگ کا کوئی چھوٹا موٹا کورس کر رہی ہوگی۔

اُس کی ایک جگہ بات بھی چلائی ہے۔ اُس نے آہستگی

## سکندر یونانی اور مچھر اعظم

ہم تاریخ کے ان طالب علموں میں سے ہیں کہ جو سکندر کو سکندر اعظم ہرگز ہرگز نہیں مانتے۔ وہ بنیادی طور پر ایک نیم پاگل اور اخلاق باختہ شخص تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مصر، ایران اور افغانستان سمیت ہندوستان کے چند شمال مشرقی علاقے تاخت و تاراج کرتا دریائے جہلم تک آن پہنچا تھا اور راجہ پورہ (Pooroo) جسے بعد میں یونانی مورخین نے سکندر کے کہنے پر پورس کا محبت بھرا خطاب دیا، نے صرف ۳۶ ہزار کی مقامی سپاہ کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ کے لشکر جرار کا سامنا کیا۔ دونوں طرف لاشیں گریں، پورہ کا نوجوان بیٹا لڑائی میں کام آیا۔ اگلے معرکے میں سکندر زخموں سے چور اپنی چہیتی گھوڑی کی شجاعت کے سبب میدان سے زندہ بچ نکلا۔ اِس کے بعد یہ کم نصیب شہنشاہِ معظم بہت برے حالات میں یہاں سے نکلا۔

یونانی لشکر کی تباہی میں مئی کی "گرمی" بچ دو آب یعنی دریائے چناب اور دریائے جہلم کے درمیانی علاقوں میں پائے جانے والے خطرناک مچھر اور ملیریا کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ سکندر بھی ملیریا میں مبتلا ہوا۔ ممکن ہے وہ ڈینگی ہی ہو، تب نہ علاج کی ایسی سہولتیں تھیں نہ تشخیص کی اور نہ سپرے کی۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سکندر جس انفیکشن کا شکار ہو کر یہاں سے نکلا اور تقریباً اڑھائی ماہ بیمار رہنے کے بعد مصر کی دلفریب بندرگاہ سکندریہ پہنچ کر قضائے اجل بنا، وہ ایک برچھے کا زخم تھا جو اسے پاکپتن (اُس دور کے دیپالپور) کی ایک نواحی بستی جہاں آج ملکہ بانس کا قصبہ آباد ہے، کے ایک مقامی جنگجو نے معرکے کے دوران مارا تھا۔

(عامر یعقوب، ہارون آباد)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کہا جیسے مجھے رازداں بنا رہا ہو۔
کیا رشتہ داروں میں؟
نہیں وہ ایک دوسرے گاؤں کے ہیں۔ لڑکا فوجی جوان ہے۔ وہ کہتے ہیں لڑکی بے شک پڑھتی رہے۔ بس نکاح کرا دیں۔
نکاح ہی کیوں؟ رخصتی کیوں نہیں؟
نکاح نامہ ہو تو فوجی کو الاؤنس زیادہ ملتا ہے۔
تو کیا اُسے الاؤنس کی فکر ہے!
اوجی ہمارا کیا جاتا ہے۔ لڑکی اور پڑھتی رہے گی۔
کیا تم نے لڑکے کو دیکھا ہے؟
نہیں جی۔ میں نے ابھی اُسے نہیں دیکھا۔
کیا مطلب؟ بیٹی کا رشتہ کرتے ہو اور لڑکا نہیں دیکھا!
اوجی فوجی جوان کا کیا دیکھنا؟
کیوں؟
فوجی تو جی فوجی ہوتا ہے۔
اُس کی یہ بات میرے دل میں پیوست ہُوئی۔ میں نے سوچا کہ یہ اُس نے ایک اور معرفت کی بات کہی ہے۔ یہ یا تو بے حد سادہ آدمی ہے یا پرلے درجے کا بے وقوف ہے۔ میرے دل نے کہا یہ سادہ آدمی ہے۔ تائید میں میر تقی میر کا ایک مصرع ذہن کے گوشے میں کونپل کی طرح پھُوٹا۔

کتنے سادہ ہیں میر بیمار ہوئے جس کے سبب

میں دل میں محظوظ ہُوا۔ پھر پیشتر اس کے کہ مصرعِ ثانی ذہن کے دریچے سے جھانکتا، میں تخیل کے کسی اور گرداب میں جا گرا..... اور اس اعتبار سے وہ لاٹھی اور بھینس والا پُرانا محاورہ ایک نئے لباس میں سامنے آ چکا ہے..... جس کی بندوق اُس کی حکومت۔ اُسی کی عدلیہ، اُسی کی مقننہ، اُسی کا دستور۔

اُس لمحے میں اپنی اِس آوارہ خیالی پہ ہنس دیا۔ میرے سامنے کھڑے سادہ لوح شخص کے چہرے پہ حیرت تھی۔
تم ٹھیک کہتے ہو۔ فوجی کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔
ایک شام وہ مجھے سڑک پر سامنے سے آتا ہُوا نظر آیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ ایک ہزار روپیہ اُس کی امانت ہے۔ مجھے اُسے دے دینا چاہئے۔ کیا خبر وہ گاؤں کب چلا جائے۔ مجھے مسجد کی سمت جانا تھا۔ اِس لئے اُس کے انتظار میں وہیں رُک گیا۔ وہ قریب آیا تو میں آہستگی سے مسجد کی طرف چلنے لگا اور اُسے کہا۔
کل شام اِس وقت سے ذرا پہلے مجھے باغیچے میں ملنا۔
اُس نے مجھ پہ مسکراہٹ نچھاور کی اور با آوازِ بلند کہا۔
ضرور آؤں گا جی۔
اگلی شام میں باغیچے میں معمول کے مطابق ٹہلتا رہا۔ وہ کہیں نظر نہ آیا۔ میری جیب میں تہ شُدہ ہزار کا نوٹ پڑا رہا۔ میں نے سوچا..... خدایا کیا یہ اِس کی قسمت میں نہیں ہے؟..... مغرب کی اذان ہوئی تو میں مسجد کو روانہ ہُوا۔ اگلی شام میں مغرب کی نماز پڑھ کے مسجد سے نکلا تو وہ مجھے دکھائی دیا۔ اُس کی وہی اونٹ کی سی چال تھی۔ وہ ذرا قریب آیا تو میں نے زچ ہو کر کہا۔
کل شام تم مجھے ملے کیوں نہیں۔
وہ کچھ شرمسار ہُوا اور خاموش رہا جیسے کوئی بہانہ سوچ رہا ہو۔ پھر ایک دم توانا لہجے میں بولا۔
کل وہاں ضرور آؤں گا جی۔
نہیں پرسوں اتوار ہے، صبح کسی وقت میرے گھر آنا۔
میرے لہجے کی بے پروائی سے وہ کچھ پریشان ہُوا۔ میں نے جانے کے لیے قدم آگے بڑھایا اور کہا۔
میرے گھر کا نمبر ۹۲ ہے۔
اچھا جی ۹۲ نمبر۔ اُس نے یاد رکھنے کے لئے نمبر دہرایا۔
میں نے اُس کی طرف نہ دیکھا اور چلتے چلتے خود کلامی کی۔
اب سزا کے طور پر ہزار کی بجائے پانچ سو روپے دوں گا۔
اتوار کی صبح وہ میرے گھر پہنچ گیا۔
ایک روز پہلے میں نے پروگرام کے تحت اُس کے لئے تین سو روپے میں شلوار قمیص کا کپڑا خریدا تھا۔ میں کپڑے کا پیکٹ اُٹھا کر اور دو سو روپے جیب میں ڈال کر گیٹ سے باہر نکلا۔ وہ اُسی طرح ملگجے لباس میں تھا۔ میں نے تمہیدی باتوں کے بعد پیکٹ اُس کی طرف بڑھایا اور کہا۔
یہ شلوار قمیص کا کپڑا میں نے تمہارے لیے لیا ہے۔ یہ تم رکھ لو۔



اُس کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگ آیا۔ اُس نے لپک کر پیکٹ پکڑ لیا اور کہا۔
اوحاجی یہ تم نے کیا کیا۔
میں نے اپنی جیب سے دو سو روپے نکالے اور اُس کی جیب میں ڈال کر کہا۔
یہ دو سو روپے بھی تم لے لو۔
وہ مزید خوش ہُوا، پھر ٹھٹکا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔
اِس سے بہتر تھا کہ تم مجھے جوتے لے دیتے۔
مجھے اُس کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ مجھے خیال گزرا کہ یہ اب پھیلنے لگا ہے۔ میں نے اُس کے پاؤں کی جانب دیکھا۔ مجھے احساس ہُوا کہ میں نے ہمیشہ اُس کے مَیلے کپڑے، مَیلا چہرہ اور بازو ہی دیکھے۔ اُس کے پاؤں کی طرف کبھی نظر نہ گئی۔ اُس کے جوتے اور پاؤں ایک ہی جیسے تھے۔ دونوں بدرنگ، دونوں بدحال۔ اُس لمحے مجھے خیال آیا کہ کہ غالب کے چاک گریباں کی کیا حالت ہو گی کہ ایک بار وہ کہہ اُٹھا۔

ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے ؟

میرا دل چاہا کہ اُس اُونٹ جیسی چال والے سے کہہ دُوں۔
تمہارے پاؤں کو جوتے کی کیا حاجت ہے؟
میں نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور گیٹ کے اندر لے آیا۔ میں نے باغیچے میں پڑی لوہے کی کُرسیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
تم بیٹھو، میں ابھی آیا۔
گھر کے اندر جا کر میں نے پرس سے سو روپے کا ایک نوٹ لیا اور باہر آ کر اُس کی جیب میں ڈال دیا۔ میں نے ترنگ میں کہا۔
لو جاؤ، جوتے بھی لے لینا۔
اُس نے میری طرف مُسکرا کر دیکھا اور کہا۔
حاجی تین سو روپے میں جوتے آتے ہیں؟
میں دل میں ہنسا اور اِسی لہر میں سوچا..... مجھے معلوم ہے کہ نہیں آتے مگر میں نے تو تمہیں پانچ سو روپے دینے کی ٹھان رکھی تھی..... یا اللہ، یہ کیا؟ اُس کی تمنا پھیل رہی ہے اور میرا دل سمٹ رہا ہے!..... میں نے اُسے ایک تسلی بخش اشارہ کیا اور اُٹھ کر پھر گھر کے اندر گیا۔ میں نے اپنے جوتوں میں سے دو جوڑے اُٹھائے اور باہر آیا۔ میں نے جوتے اُس کے آگے رکھے اور کہا۔
یہ جوتے میں آج کل پہن رہا ہوں۔ یہ میرے پاؤں میں قدرے بڑے ہیں۔ یہ دوسرا جوڑا بالکل نیا ہے۔ یہ جوتے میں نے حج کے موقع پر مکہ سے خریدے تھے۔ پہن کے دیکھو جو پورے آئیں وہ لے لو۔
وہ کرسی پر بیٹھا جوتوں کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔
یہ مجھے نہیں آئیں گے۔ میرے پاؤں کا نمبر دس ہے۔
اوہ اچھا۔ میرا نمبر تو آٹھ ہے۔
وہ خاموش بیٹھا جوتوں کو دیکھتا رہا۔ میں نے اُکتا کر جوتوں کو سمیٹتے ہُوئے کہا۔
چلو، چھوڑو رہنے دو۔
اُس نے نئے جوتوں پر ہاتھ رکھا اور حسرت سے کہا۔
یہ میرے چھوٹے کو پورے آئیں گے۔
میں نے دل میں سوچا..... لو اب خود کو بھول گیا اور بیٹا یاد آ گیا۔ میں نے بات ختم کرنے کی خاطر کہا۔
ٹھیک ہے، لے لو، اپنے بیٹے کو دے دینا۔
اگلے چند لمحوں میں ہماری مجلس برخاست ہُوئی۔ میں نے اُسے رخصت کر کے گیٹ بند کیا اور اندر جانے کیلئے پلٹا تو باہر سے اُس کی آواز آئی۔
حاجی تم بھی کہو گے۔ آیا تھا اور چپھا ہی مار لیا۔
میں نے گیٹ کھول کر کہا۔
اب کیا ہے؟'
تم بھی کہو گے اِس نے چپھا ہی مار لیا۔
کیا مطلب؟'
اُس نے اپنی جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور میری طرف بڑھا کر کہا۔
جب جوتے لے لیے تو اب اِس نوٹ پہ میرا حق نہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

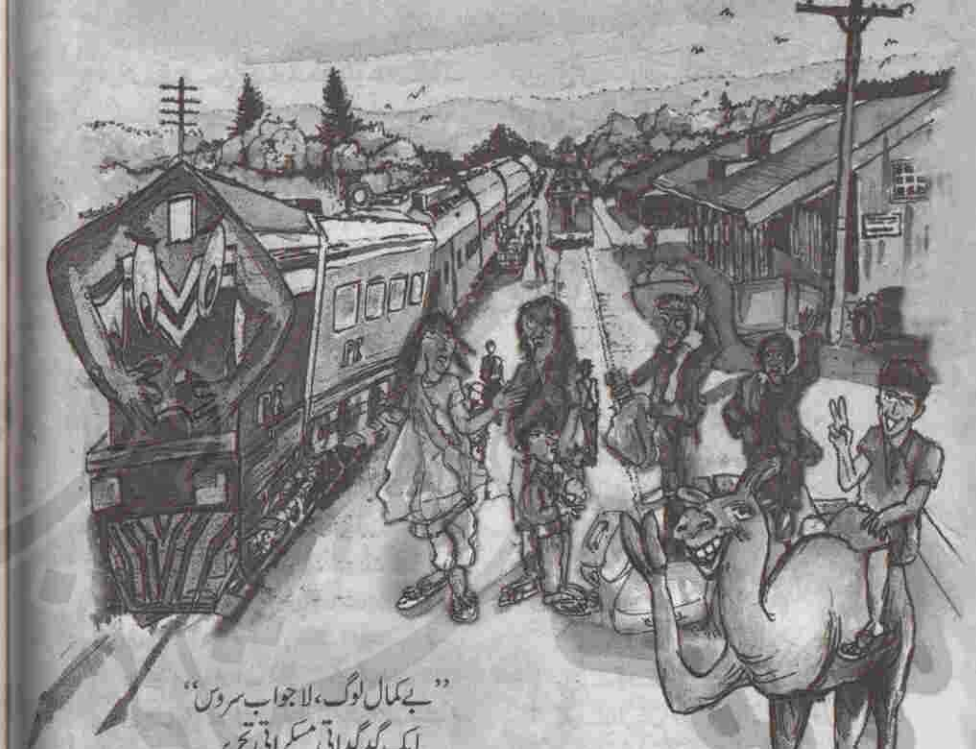

"بے کمال لوگ، لاجواب سروس"
ایک گدگداتی مسکراتی تحریر

محکمۂ ریلوے تو سب مسافر اور مال گاڑیاں بند کرنے کے لاجواب منصوبے پہ عمل پیرا ہے

# ریلوے سے اونٹ بہتر

خدا

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

جانے دیر آید درست آید کا مقولہ کس مردِ دانا کی تخلیق ہے؟ اس کا خالق ضرور کسی سرکاری محکمے کا افسر ہوگا اور محکمہ بھی کون سا ریلوے! جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ ریلوے سے تو اونٹ بہتر ہے۔ کل تو اس کی بھی ایک آدھ ہی بمشکل سیدھی ہوگی لیکن اونٹ کے سفر میں صبر، برداشت اور ضبط و تحمل کی قوتوں کو نسبتاً کم بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ پھر اونٹ کے سفر میں ہری جھنڈی بھی نہیں ہلانا پڑتی، بس خود ہلتے رہیے۔ اونٹ بغیر کھائے پیئے کئی روز تک سفر کر سکتا ہے، ریلوے والے بغیر کھائے پیئے کوئی کام نہیں کر سکتے، ریزرویشن تک نہیں کرتے۔

بات ہو رہی تھی مقولے دیر آید درست آید کی، ریلوے والوں نے غالباً اس مقولے کو اپنا موٹو (نعرہ) بنا رکھا ہے جیسے پی آئی اے والوں نے اپنا نعرہ "بے کمال لوگ لاعلاج سروس" رکھا ہے۔

مقولے تو اور بھی ہیں مثلاً صبر تلخ است لیکن ہو شیریں وارد، شکر ہے کہ ریلوے والوں نے اسے اپنا نعرہ قرار نہیں دے دیا۔ اسی طرح انتظار گاہ کی دیوار "ان اللہ مع الصابرین" کے الفاظ رقم کروائے جا سکتے ہیں، یا ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر "یہ منہ اور مسور کی دال" لکھوا دیا جائے۔ سیٹ پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں تو "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" پر عمل ہوتا ہی ہے۔

کہتے ہیں، اونٹ صحرا کا جہاز ہے، ہوگا لیکن رفتار میں ریل کو نہیں پہنچ سکتا مثلاً اگر ایک اونٹ اور ایک ریل کراچی سے بیک وقت لاہور روانہ کیے جائیں تو منزل تک پہنچنے میں اونٹ پانچ دن لے گا لیکن ریل بہت پہلے لاہور پہنچ جائے گی...... یعنی صرف چار روز میں اور یہ جو اونٹوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بغیر کھائے پیئے کئی روز تک سفر کر سکتے ہیں تو انھیں چاہیے، وہ اپنی اس تحسین پر مغرور نہ ہوں کیونکہ ان سے کہیں زیادہ لاغر و ضعیف اور قد میں کوتاہ حیوانات مثلاً ریل کے مسافر کئی روز تک بغیر کھائے پیئے اور بغیر سوئے سفر کرتے ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ ریلوے کا کھانا اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے حلق سے اتارنے کی جرات یا حماقت کی جائے۔ اگر شوقِ فضول اور جراتِ رندانہ سے کام لے کر چند نوالے معدے میں پہنچا دیے جائیں تو سفر کے سفرِ آخرت میں تبدیل ہونے کے خاصے روشن امکانات رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ناتجربہ کاری، بھوک اور ریلوے کی محبت سے مجبور ہو کر ہم نے تیز رو کا کھانا کھا لیا۔ ایک ہفتہ دردِ شکم میں مبتلا رہ کر ریلوے والوں کی جان و مال کو دعائیں دیتے رہے جو لگتا ہے کہ اب جا کر قبول ہوئی ہیں۔

کھانے میں جو کچھ پیش کیا گیا، اس کا احوال بھی سن لیجیے۔ سالن کے نام پر سرخ بھبھوکا پانی رکابی میں پڑا تھا جس میں تجریدی آرٹ کے دو نمونے مارے شرم کے منہ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن شوربہ نما پانی یا پانی نما شوربہ اتنی کم مقدار میں تھا کہ مرحوم گائے کی واحد بوٹی اس میں ڈوب کر مرنے سے قاصر تھی۔

تحقیق کرنے پر انکشاف ہوا کہ یہ بوٹی ربڑ کی بنی تھی۔ اسے دانتوں میں دبا کر چبانے کی کوشش کی تو چچا غالب کا یہ مصرعہ یاد آیا۔

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

اس ربڑ کی بوٹی کو آپ کتنا ہی کھینچیے، نہ ٹوٹنے کی ضمانت ہے۔ دراصل ریلوے کے سالن میں اعلیٰ قسم کا درآمد شدہ ولایتی ربڑ استعمال ہوتا ہے لہٰذا کوئی چھوٹی موٹی بتیسی اسے توڑنا تو درکنار اسے چھونے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ ایک ہمسفر بزرگ نے ہمارے سامنے کوشش بھی کی تھی۔ بوٹی کو دانتوں میں دبا کر زور سے کھینچا تھا کہ مصنوعی بتیسی کھٹاک سے نکلی اور غلیل سے نکلے پتھر کی مانند ٹکٹ چیکر کو لگی، اس نے شپٹا کر کہا "بزرگوار کاٹ کھانے کو کیوں دوڑ رہے ہیں؟ صرف ٹکٹ ہی تو مانگا ہے۔"

کھانے میں پلاسٹک کی بنی ہوئی دو عدد روٹیاں بھی شامل تھیں۔ ان کے متعلق طعام گاہ والوں کو خوش فہمی تھی کہ یہ روٹیاں شوربے میں تیرتی اس ناقابلِ فہم اور ناقابلِ ہضم شے کے ساتھ کھائی جا سکتی ہیں جسے وہ آلو کہنے پر مُصر تھے۔ حالانکہ اس آلو کو چبانا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔

چاول البتہ اچھے تھے۔ اصول ہے کہ اندھوں میں کانا راجہ، چاول چونکہ دیگر اشیاء کے مقابلے میں کم خراب تھے اس لیے اچھے لگے۔ البتہ گلاس ساتھ رکھنا ضروری تھا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تا کہ جب دانتوں میں ریت کچر کچر بجنے لگے تو لقمے کو پانی سے دھکا دے کر حلق سے نیچے اتارا جا سکے۔

ریلوے والوں کا خیال ہے کہ وہ کھانے کے ساتھ فرنی بھی دیتے ہیں۔ مگر ان کے بدخواہ اسے بھوسی کے ٹکڑوں کی لئی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بہرحال اس فرنی کا ایک فائدہ ہم نے اُٹھایا اور وہ یہ کہ اپنی کتاب کی پھٹی جلد اس سے چپکا لی۔

پینے کا جو پانی لنچ کے ساتھ فراہم کیا گیا تھا اس میں صرف ایک قباحت تھی اور وہ یہ کہ اسے پیتے ہوئے آنکھیں بند اور دل کھلا رکھنا پڑتا تھا تا کہ اس کا گدلا پن اور اس میں تیرتے ہوئے بے شمار ناقابلِ شناخت اجزاء بعد میں رہ رہ کر یاد نہ آسکیں۔ اس پانی میں ایک سہولت اس کا درجہ حرارت بھی تھا۔ گلاس میں اگر تھوڑی سی چائے کی پتی اور چینی ڈال دی جائے تو خوش ذائقہ قہوہ تیار ہو سکتا ہے اور اگر سفر میں ان اشیاء کی فراہمی مشکل ہو تو یونہی نوش جاں کیجیے کہ گرم پانی صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ معدے کے تمام جراثیم فوری ہلاک کرتا ہے۔

ہم شرط لگانے کو تیار ہیں کہ یہ "مینو" اگر کسی اونٹ کو بھی پیش کیا جائے تو وہ اسے کھانے سے انکار کر دے گا۔ لیکن اونٹ کو قدرت کی جانب سے یہ آسانی مہیا ہوئی ہے کہ وہ کئی دن کی بھوک ہڑتال کے بعد بھی مستانی چال چل سکتا ہے اور ریلوے کا محتاج نہیں۔ لیکن اشرف المخلوقات انسان بے چارہ اس قسم کے تجربات کا متحمل نہیں ہو سکتا اور متحمل ہو جائے تو جانبر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ریل میں اس کھانے کے ساتھ کئی دن سفر کرنا اچھی خاصی کشور کشائی کی مہم ہے۔

بشری تقاضوں سے مجبور ہو کر آپ کی آنکھ لگے تو ریل ایک دھچکے سے کسی بیاباں میں رک جاتی ہے اور دریافت احوال یہ معلوم ہوتا ہے کہ انجن فیل ہو گیا۔

اب قریبی جنکشن سے متبادل انجن آئے گا تو گاڑی چلے گی۔ ڈرائیور دراصل آپ کے سونے کا انتظار کرتا ہے، جیسے ہی آپ کی آنکھ لگی، گاڑی کو جھٹ کسی اسٹیشن پر اس مہارت سے جھٹکا دے کر روکے گا کہ برتھ پر رکھا ہوا سارا سامان اور کم وزن والے مسافر دھڑام سے نیچے آن رہیں۔ یہ جھٹکا غافلوں کو عین نماز کے وقت بیدار کرنے کو موجب ہے۔

آ گیا "ریل گاڑی" میں اگر وقت نماز کشش ثقل کی مدد سے محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کر کے ڈرائیور انھیں یہ موقع بھی دیتا ہے کہ نماز کے بعد اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگ لیں کیونکہ منزل مقصود سے پہلے راستے میں کئی اسٹیشن پڑتے ہیں اور ہر جگہ ڈرائیور بریکوں کی تیزی ضرور آزمائے گا۔ اور ضروری نہیں کہ ہم جیسے کمزور جثے والے ہر آزمائش میں پورا اتریں۔

ڈونگا بونگا یا شاید اونگا بونگا۔ رات کے تین بجے کا عمل ہے۔ ٹرین خدا جانے کون سے اسٹیشن پر کھڑی ہے۔ غالباً تہجد کے لیے مسافروں کو بیدار کرنے میں پھیری والے انجن ڈرائیور کا پورا پورا ساتھ دے رہے ہیں۔ بے شمار صدائیں آپ کے ساتھ آپ کی ہوسِ ناؤ نوش کو بھی بیدار کر رہی ہیں۔ پکوڑوں اور حلوہ پوری کا مژدہ جانفزا سنانے والوں سے تجاہل عارفانہ برتتے ہوئے آپ منہ لپیٹ کر پڑے ہیں اور سونے کی سعی ناکام میں مصروف ہیں۔ اتنے میں ایک صاحب کھڑکی میں سر ڈال کر پوری قوت سے چلائیں گے "ٹھنڈی، میٹھی، کھٹی بوتل۔" اس صورِ اسرافیل کو سن کر آپ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے اور آپ دل ہی دل میں لاحول پڑھ کر سوچیں گے بھلا یہ بوتل پینے کا کون سا وقت ہے؟ جلد ہی اس کا جواب ایک صاحب ذوق کی طرف سے آئے گا جب وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھیں گے اور چند لمحوں میں ٹھنڈی، میٹھی، کھٹی بوتل غٹا غٹ چڑھا جائیں گے۔

خدا خدا کر کے ٹرین چلے گی اور اسٹیشن کے ہنگاموں سے جان چھوٹے گی۔ خوش قسمتی سے اگر آپ کو نیند بھی آ گئی تو جلد ہی بیدار ہونا پڑے گا کیونکہ کوئی آپ کا شانہ زور زور سے ہلا رہا ہو گا۔ آپ ہڑبڑا کر اٹھیں گے تو سامنے ایک باریش صاحب کو پائیں گے جو آپ کو بڑی رازداری سے اطلاع دیں گے کہ قیامت بہت جلد آنے والی ہے۔ ان کے وثوق کا یہ عالم ہو گا گویا قیامت کا نہیں بلکہ اگلے اسٹیشن کا تذکرہ کر رہے ہوں۔ پھر آپ کو سمجھائیں گے کہ وقت بہت کم ہے۔ جلدی سے ایک مسجد کی تعمیر کے کارِ خیر میں حصہ لے کر



جنت میں محل بنوا لیں۔ یہ مسجد خدا جانے کون سے اسٹیشن پر بچانے کتنے سالوں بلکہ صدیوں سے بن رہی ہے۔ آپ انھیں یاد دلائیں گے کہ اس مسجد کا چندہ تو طویل عرصے سے وصول کیا جا رہا ہے اب تک کیوں نہیں بن پائی؟ تو آہ سرد کھینچ کر کہیں گے یہی تو رونا ہے۔ لوگ شقی القلب ہو گئے ہیں، کارِ خیر میں حصہ نہیں لیتے۔ واقعی قیامت قریب ہے۔

آپ کچھ دے دلا کر اپنے آپ کو شاباش دے ہی رہے ہوں گے کہ ایک اور صاحب وارد ہوں گے۔ یہ بھی آپ کو ضرور جگائیں گے اور نابینا ہونے کا دعویٰ کر کے آپ کی نیک کمائی میں برکت کی دعا دیں گے۔ جس کا فوری نتیجہ یہ ہو گا کہ آپ کی نیک کمائی میں پانچ دس روپے کی کمی ہو جائے گی۔ اسٹیشن آتے ہی یہ صاحب اپنی نیک کمائی گنتے ہوئے اسٹیشن کا نام پڑھ کر اطمینان سے بھیڑ میں گم ہو جائیں گے۔

اسی طرح سوتے جاگتے صبح ہو جائے گی۔ اسی دم مشرقی یا مغربی دروازے کی جانب سے ایک صاحب کھٹی میٹھی گولیاں فروخت کرنے تشریف لائیں گے اور کمپنی کی "مشہوری" کے لیے آپ کو تقریباً مفت دینے پر بضد ہوں گے۔ ان کے جاتے ہی ایک حضرت ایسا چورن لے کر نازل ہوں گے جو ہاضمے کی خرابی، کھٹی ڈکاروں، سینے میں جلن، گیس سے لے کر تپ دق اور سرطان تک کا علاج ہو گا۔ ایسے چورن کا ثانوی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اسے منجن، بوٹ پالش اور چوہے مار دوا کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اونٹ کے سفر میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ کوئی پھیری والا اونٹ پر گھوم پھر کر سودا نہیں بیچ سکتا۔ نہ ہی کوئی جیب کترا آپ کی جیب کاٹ سکتا ہے۔ اونٹوں کے حق میں یہ دلائل سن کر آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کراچی اور لاہور کے درمیان کوئی اونٹ سروس چلانے والے ہیں جس کے لیے یہ ساری اشتہار بازی ہو رہی ہے۔ رفع شر کی خاطر اونٹ کے چند عیب بھی بیان کرتے چلیں۔ مثلاً کہ آپ اونٹ پر پاؤں پسار کر کتاب نہیں پڑھ سکتے نہ ہی ٹہل سکتے ہیں۔ اس قسم کے شتر غمزوں کا اونٹ متحمل نہیں ہو سکتا، اگر ہو بھی تو یہ آپ کی صحت کے لیے خطرناک نتائج کا حامل ہے۔ پھر ہر چند اونٹ بغیر

## وقت

جج (ملزم سے) تم نے اس آدمی کو کیوں مارا؟

ملزم: حضور میں نے اس سے ٹائم پوچھا، اس نے مجھے ٹائم نہیں بتایا اس لیے میں نے اُسے مارا۔"

جج تمہیں معلوم ہے کہ وہ گونگا ہے۔

ملزم: نہیں جناب! اگر مجھے بتا دیتا کہ وہ گونگا ہے تو میں اسے نہ مارتا۔

(عمر بلال، حاصل پور)

کھائے پیئے سفر کر لیتا ہے مگر اس کے سواروں کو پیٹ بھرنے کا جتن کرنا ہی پڑتا ہے۔

اونٹ کے سفر کی طرح ریل کے سفر میں بھی کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑتا ہے چاہے اس کے لیے دل پر کتنا ہی جبر کیوں نہ کرنا پڑے۔ "کھانا" کھا کر ہمیں خاصی عبرت حاصل ہوئی تھی آزمودہ را آزمودن جہل است، چنانچہ ناشتہ ہم نے کسی اسٹیشن پر کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھیری والے سے کچھ کیک اور بسکٹ خریدے۔ ہر دو علی الترتیب ضرورت سے زیادہ سخت اور ضرورت سے زیادہ نرم تھے۔ بسکٹ ہم نے فوراً ان بزرگ کی نذر کر دیئے تھے جن کی بتیسی گزشتہ روز بوٹی چبانے کے حادثے میں کام آ گئی تھی۔ ان نرم بسکٹوں کو کھانے کے لیے دانتوں کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس نئی ایجاد کو دیکھ کر دل بے حد خوش ہوا۔ آخر کار ہم نے بھی اتنی ترقی کر لی ہے کہ بچوں کے لیے مغرب سے طرح طرح کی غذائی اشیاء درآمد کرنے سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ یورپ اور امریکہ والے اس سے زیادہ نرم خوراک بنا کر دکھائیں تو مانیں۔

اس کے بعد کیک کی باری آئی جسے کھانے کے لیے ہم



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے تھوڑا تلاش کرنا شروع کیا۔ تلاشِ بسیار کے بعد نامرادی ہاتھ آئی۔ آخر اسی پھیری والے سے اس کیک کا پرچہ ترکیب استعمال طلب کیا تو مسکرا کر بولا "صاب! سامنے پٹری پر رکھ دیجیے۔ ابھی دس منٹ میں خیبر میل آتی ہوگی۔ گزر جائے تو چورا اٹھا لیجیے گا اور چائے میں ڈال کر چمچ سے کھا لیجیے گا۔ ایمان سے بڑا لذیذ ہوتا ہے۔"

بسکٹ اور کیک پر فاتحہ پڑھ کر چائے پر توجہ کی۔ چائے

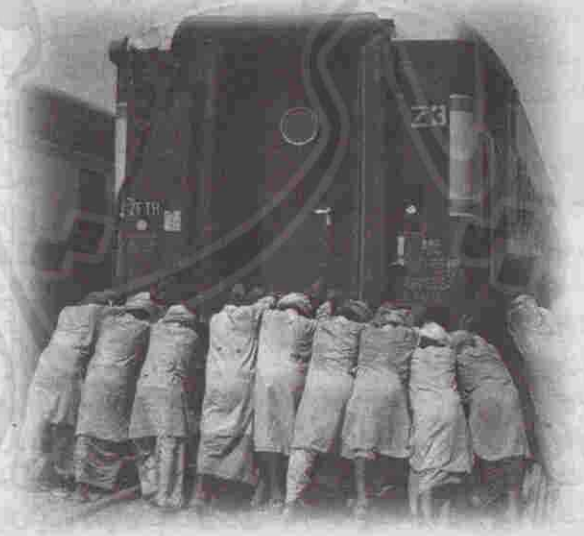



سے پہلے ہمیں اک گلاس میں نیم گرم اور گدلا پانی دیا گیا۔ ہم نے پوچھا یہ کیا ہے اور چائے کہاں ہے؟ پہلے مسکرائے کہ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا، پھر ہنس کر بولے یہی چائے ہے۔

ایک اسٹیشن پر ریل رکی تو اتر کر چائے کے نام پر چنے کے چھلکوں کا عرقِ شیریں زہر مار کیا، جب واپس چڑھے تو اپنی سیٹ پر ایک پہلوان جی کو براجمان پایا۔ موچھوں پر تاؤ دینے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ طاقت کو سب سے ٹھوس دلیل سمجھتے ہیں۔ تن و توش مدِنظر رکھتے ہوئے ہم ان کی دلیل کے فوراً قائل ہوگئے۔ اس نشست پر ہم نے اس وقت تک جو سفر کیا وہ محض ان کی خوش اخلاقی، ہمدردی اور وسعت قلبی کا نتیجہ تھا ورنہ چاہتے تو پہلے ہی گھسیٹ کر اٹھا دیتے۔ ورنہ لوگوں میں اب اتنی مروت کہاں رہی ہے؟ اسی بھلمنساہٹ سے کام لے کر انھوں نے ہم سے کوئی رقم طلب نہ کی ورنہ انداز سے تو صاف ظاہر تھا کہ غنڈہ ٹیکس وصول کرنا ان کا ذریعہ معاش ہے۔

بقیہ سفر انہی پہلوان جی کے قدموں میں بیٹھ کر کیا۔ وہ بھی اس طرح کہ ہمارے سوٹ کیس پر پہلوان جی کی صحت مند ٹانگوں کے بعد جو تھوڑی بہت جگہ بچ گئی تھی، وہاں اپنی جانِ ناتواں کو سمیٹ کر رکھ دیا۔

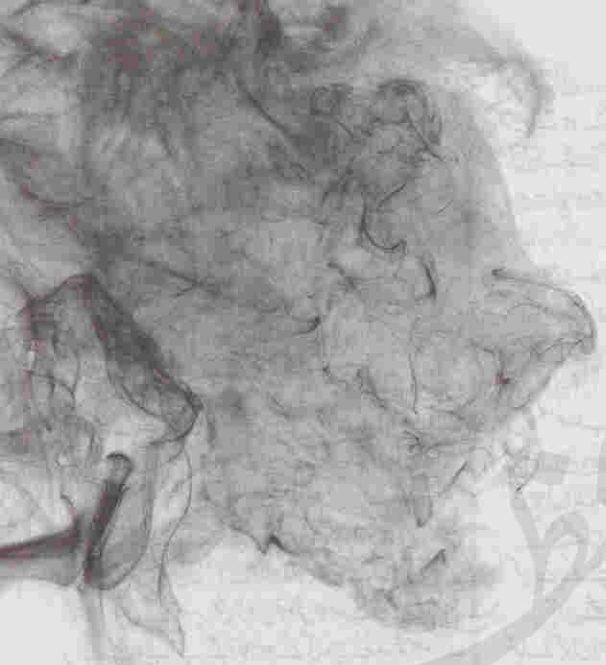



# زرد دُھواں

دورِ جدید کے ٹھگوں کا انوکھا ماجرا
اُنہوں نے دفتر کا صفایا ایسے کیا
کہ سب منہ دیکھتے رہ گئے

رضوان بھٹی

**بلند** وبالا عمارتوں کے درمیان وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔ کندھے پر زرد رنگ کا بیگ تھا، جبکہ دوسرا کندھا وزن برابر کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ایک فائل بغل میں تھامے بار بار سر اونچا کر کے وہ ہر عمارت کی بلندی ناپتا...... دو ایک بار تو اس نے رک کر منازل گننے کی ناکام کوشش بھی کی لیکن کمی وقت کے باعث ایسا نہ کر سکا۔ اس کی آنکھوں پر موٹے فریم میں بڑے بڑے چشمے جڑے ہوئے تھے۔ ناک ستواں ہونے کی وجہ سے چشمہ بار بار نیچے سرک رہا تھا مگر وہ بھی شاید اس عادت کا عادی تھا، تبھی شہادت کی انگلی ناک تک لا کر فریم اوپر کرتا......
قد کاٹھ کے حساب سے بھی وہ عمر کے متوازن حصے میں تھا، نہ تو بہت زیادہ تگڑا اور نہ ہی بہت زیادہ "ماڑا"۔ جسم ڈھانپنے کے لیے بوسیدہ سی قمیص پتلون پہنی ہوئی تھی...... وہ واضح کرتی تھی کہ یہ آدمی ابھی ابھی رختِ سفر باندھے ریل گاڑی سے اترا ہے۔

ایک عمارت کے سامنے پہنچ کر وہ رُک گیا۔ عجلت میں بیگ نیچے اتارا اور وہیں نیچے رکھ دیا۔ اس سے بھی زیادہ عجلت میں اس نے پتلون کی جیب سے ایک مڑا تڑا لفافہ نکالا...... لفافہ گھورا، اندر کا ایک کاغذ نکال کر کھولا اور کچھ پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اُٹھا کر سامنے والی عمارت کو دیکھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمارت کے چوتھے فلور پر ایک بورڈ چسپاں تھا۔ نظر اسی بورڈ کی طرف تھی۔ پورڈ ذرا اوپر ہونے کی وجہ سے اسے ٹھیک سے دکھائی نہ دیا..... تبھی اس نے تین چار بار پلکیں جھپکیں، چشمہ درست کیا، ایڑیوں کے بل پر مزید اونچا ہوا..... لیکن بدستور پڑھ نہ پایا۔

''ارے بھائی! یہ کیا تماشہ کر رہے ہو؟'' اسے قریب سے مترنم آواز سنائی دی تو اس نے چونک کر اپنی بائیں طرف دیکھا، مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اچانک اسے اپنے کندھے پر احساس ہوا کہ وزن بڑھ گیا ہے۔ شاید کسی نے ہاتھ رکھا تھا، وہ یک لخت اچھل پڑا اور دائیں طرف دیکھا، وہاں ایک خوبرو نوجوان کھڑا اس کی حرکات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''جی فرمائیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں نے آپ سے کہا کہ کوئی مسئلہ ہو تو بتا دیں، میں حل کیے دیتا ہوں۔'' آنے والے نوجوان نے کہا۔

اس کے جسم پر اعلیٰ تراش خراش کا سوٹ تھا۔ چہرے پر ہلکے ہلکے میک اپ کے آثار ہونے کی وجہ سے وہ خوبصورت بھی لگ رہا تھا۔ بال نہایت سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں اعلیٰ قسم کے بوٹ موجود تھے۔ نوجوان کے کپڑوں سے اٹھنے والی سوندھی سوندھی خوشبو محسوس کر کے اُس نے ایک خوشگوار سانس لی۔

''بس..... مسئلہ تو کچھ خاص نہیں۔'' اس نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اسی اثناء میں اس کا فریم سرک کر ناک کی نوک تلک آ گیا..... اس نے شہادت کی انگلی بڑھا کر فریم درست کیا اور مزید کہا: ''میں اس پتے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں..... مگر.....!''

اُس نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ بڑھا دیا۔ نوجوان نے پتا پڑھا اور مسکرا کر بولا ''تو تم بھی انٹرویو دینے آئے ہو؟''

''ہاں..... آیا تو ہوں..... مگر تم بھی سے کیا مطلب آپ کا؟''

''مطلب یہ کہ میں بھی حشمت برادرز کی ہی طرف جا رہا ہوں انٹرویو دینے۔ آؤ..... میرے ساتھ آ جاؤ، ہم دونوں کی منزل ایک ہی ہے۔'' اور کاغذ اس کی سمت بڑھا دیا۔

''مجھے رحمت کہتے ہیں۔'' اس نے کاغذ پکڑ کر مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور مجھے ارمغان۔'' نوجوان نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ نجانے کیوں اس کے چہرے پر بلا کی خود اعتمادی تھی۔

رحمت نے بیگ پھر کندھے پر ڈالا اور ارمغان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ عمارت میں داخل ہوتے ہی رحمت کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اتنی نفاست سے کاریگر نے عمارت کی تزئین و آرائش کی تھی کہ وہ اش اش کر اُٹھا۔

''ہمارے گاؤں میں ایسی عمارتیں نہیں ہوتیں، میں نے پہلی بار ایسا سب کچھ دیکھا ہے'' حیران رحمت کے منہ سے نکلا۔ ارمغان اس کی حالت سے خوب محظوظ ہو رہا تھا۔

چوتھی منزل پر حشمت برادرز کے دفتر میں بہت سے نوجوان لڑکے جمع تھے۔ ان کی تعداد چالیس تھی۔ وہ سب ہاتھوں میں فائلیں لیے ہوئے تھے۔ جیسے ہی رحمت اندر داخل ہوا، کئی قہقہوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ سب رحمت کی حالت پر ہنس رہے تھے۔

''ارے یہ گاؤں والا..... اب سونا فروخت کرنے والوں کے اکاؤنٹس سنبھالے گا.....!'' دو چار منچلوں نے کہا اور سب پھر ہنس دیئے۔

''میں تم سب کو سنبھال لوں گا، ذرا وقت آنے دو۔''

رحمت کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ قریب کھڑا ہوا ارمغان بھی حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

وقت کے مطابق انٹرویو شروع ہوئے اور خاصی دیر تک جاری رہے۔ اُن کا اُصول تھا کہ وہ نتیجہ اُسی وقت بتا دیتے تھے۔ جن حضرات کا انٹرویو ہو چکا، اُنہیں یہ کہہ کر رکوا لیا گیا کہ نوکری کی ہاں یا ناں سن کر جائیے۔ ارمغان سے پہلے رحمت کا نمبر آیا۔ جاتے جاتے وہ ارمغان کے ساتھ عجب کھیل کھیل گیا۔

''ارمغان بھائی! آپ کو کتنا یقین ہے کہ آپ اس انٹرویو میں کامیاب ہو جائیں گے؟''

''حشمت برادرز نے جو تجربہ اور قابلیت مانگی ہے، میں اس سے بڑھ کر قابل ہوں اور سب سے بڑھ کر میرے ایک انکل بھی یہیں کام کرتے ہیں، ان کی حشمت صاحب سے اچھی علیک سلیک ہے، بس یوں سمجھ لیں کہ اس آسامی کیلئے میں ہی ہوں، باقی آپ سب تو بس یونہی.....'' رحمت پہلی بار ارمغان کی باتوں پر ہنسا۔

''ہوں..... تو یہ بات ہے..... اچھا آپ ستاروں پر یقین رکھتے ہیں؟''

''بہت زیادہ اور ستاروں کے حساب سے ہی پتا لگایا ہے کہ اس کام کیلئے موزوں ترین آدمی میں ہی ہوں۔'' ارمغان نے کہا۔ مسکراہٹ بدستور اس کے چہرے پر عیاں تھی۔

''یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔'' رحمت نے کہا ''دراصل آج کا دن بدھ ہے، تاریخ بارہ، سال کا بارہواں ہفتہ، وقت بھی بارہ اور سب سے بڑھ کر میرے پاس زرد رنگ کا ایک بیگ ہے۔ زرد رنگ میرا خوش بختی کا رنگ ہے چنانچہ یہ نوکری تو میری ہے۔'' اس مرتبہ رحمت کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور حسب توقع ارمغان کا اعتماد پہلی مرتبہ ٹوٹتا محسوس ہوا۔

''ت..... ت..... تو..... تو اس کا مطلب میں.....''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، رحمت اُٹھ کر انٹرویو دینے جا چکا تھا۔

حشمت برادرز کے مالکان نے رحمت کی حالت دیکھی

## اخلاص کہاں سے سیکھا؟

حضرت جنید بغدادیؒ اخلاص کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ آپ نے اپنی زندگی کا واقعہ سُناتے ہوئے فرمایا:

''میں نے اخلاص ایک حجام سے سیکھا۔ وہ اس وقت مکہ معظمہ میں کسی رئیس کے بال بنا رہا تھا۔ میرے مالی حالات نہایت شکستہ تھے''۔ میں نے حجام سے کہا:

''میں اُجرت کے طور پر تمھیں ایک پیسہ نہیں دے سکتا، بس تم اللہ کے لیے میرے بال بنا دو۔''

میری بات سنتے ہی حجام نے رئیس کو ایک طرف کیا اور بولا:

''تم بیٹھ جاؤ۔''

مکہ کے رئیس نے اعتراض کیا تو حجام نے کہا:

''جب درمیان میں اللہ کا نام آ جائے تو میں سارے کام چھوڑ دیتا ہوں۔''

حجام کا جواب سُن کر میں حیران ہوا۔ پھر اس نے میرے بالوں کو بوسہ دیا اور بال بنانے لگا۔ بال بنانے کے بعد اُس نے مجھے ایک پوٹلی دی جس میں رقم تھی۔

''آپ اسے استعمال میں لائیے۔'' اُس کے لہجے میں بڑا خلوص تھا۔ میں نے رقم قبول کر لی اور اس کے ساتھ ہی منت مانگی کہ مجھے جو پہلی رقم حاصل ہوگی، وہ حجام کی نذر کروں گا۔

بھر چند روز بعد میرے پاس کچھ رقم آئی۔ میں سیدھا حجام کے پاس گیا اور اسے رقم پیش کی۔

''یہ کیا ہے؟'' حجام نے حیران ہو کر پوچھا۔

میں نے سارا واقعہ اُسے سُنایا۔

حجام ناراض ہوا اور بولا: ''تم کیسے مسلمان ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی۔ پہلے اللہ کے نام پر بال بنانے کو کہا اور اب رقم لے آئے ہو۔ کبھی کوئی ایسا مسلمان دیکھا ہے جو اللہ کے لیے کام کرے اور پھر مزدوری لے۔''

حضرت جنید بغدادیؒ فرمایا کرتے تھے: ''میں نے اخلاص کا مفہوم اسی حجام سے سیکھا۔''

(عمیر افتخار، فیصل آباد)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## ڈاکا

ایک بنک میں ڈاکہ پڑا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے لوٹی ہوئی تمام رقم ایک تھیلے میں بھر کر اپنے ساتھی کو دی اور کہا کہ جاؤ باہر گاڑی میں بیٹھ جاؤ، کچھ دیر بعد وہ آدمی واپس آیا اور بولا!

سردار! ہماری کار چوری ہوگئی ہے ہم واپس کیسے جائیں گے؟ (عمار رؤف، لاہور)

تو وہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے چند سوال کیے لیکن رحمت جواب ٹھیک سے نہ دے پایا۔ حسبِ خیال وہ انٹرویو میں پاس نہ ہوسکا۔ حشمت برادرز نے اِسے انتظار گاہ میں جانے کو کہا اور وہیں سے رحمت اپنے کام کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔

حشمت برادرز کے دفتر میں قریباً دواڑھائی لاکھ کی نقد رقم تھی اور لاکھوں روپوں کا سونا بھی پڑا تھا۔ رحمت نے یہ سب باتیں نوٹ کرلیں تھیں۔

رحمت نہایت تھکے تھکے قدموں سے باہر آیا۔ ابھی اس نے دفتر کا گیٹ بند بھی نہیں کیا تھا کہ ایک منچلے نوجوان نے کہا ”لوٹ کے بدھو گھر کو آیا......“

رحمت کو اس کی بات اور دوسرے لوگوں کی ہنسی نہایت گراں گزری۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے چشمہ اُتارا اور نیچے زمین پر پھینک دیا...... زمین پر گرتے ہی فریم اور شیشوں کا ساتھ چھوٹ گیا اور شیشے گرتے ہی چکنا چور ہوگئے۔ رحمت نہایت تیزی سے چلتا باہر نکل گیا۔ سب کی نظریں جاتے ہوئے رحمت پر تھیں۔ کسی نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ چشمے کے فریم سے ہلکا ہلکا زرد رنگ کا دھواں نکل رہا ہے۔ رحمت اپنا زرد بیگ بھی کمرے میں چھوڑ کر باہر جاچکا تھا۔

ارمغان جیسے ہی انٹرویو دینے کمرے میں داخل ہوا، اس کے نتھنوں سے فریم سے نکلنے والا زرد رنگ کا دھواں ٹکرایا۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا اور چند سیکنڈ میں ہی زمین پر گر گیا۔ دو چار لڑکے اس کی طرف بڑھے۔ لیکن جب ان کی ناک سے بھی زرد رنگ کا دھواں ٹکرایا تو وہ بھی بے ہوش ہوتے چلے گئے۔ کسی کے بھی وہم وگمان میں نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔ دھواں آہستہ آہستہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سب ہی بے ہوش ہوتے جارہے تھے۔

رحمت دفتر سے نکل کر سیدھا ایک دُکان پر گیا اور وہاں سے نئی پتلون قمیص خریدی۔ پھر ایک حمام میں پہنچا وہاں نہانے دھونے کے بعد اعلیٰ قسم کا سوٹ پہنا، بالوں میں کنگھی کی، اعلیٰ پرفیوم اور آنکھوں پر کالے رنگ کا خوبصورت چشمہ لگایا۔ اب وہ کسی طور سے گاؤں کا رہنے والا نہیں لگتا تھا۔ حمام سے نکل کر وہ سیدھا حشمت برادرز کے دفتر کی طرف بڑھا۔

دفتر میں داخل ہوتے ہی رحمت نے دروازہ اندر سے بند کیا اور اپنا کام شروع کردیا...... یعنی لوٹ مار، کیونکہ اسے دیکھنے کے لیے کوئی نہ تھا...... حشمت برادرز سمیت سب ہی وہاں مڑے تڑے بے ہوش پڑے تھے۔

دفتر میں موجود سارا پیسہ اور سونا چند لمحوں میں رحمت کے زرد بیگ میں تھا اور جو لوگ انٹرویو دینے آئے تھے، ان کی جیبوں سے نکلا ہوا پیسہ اور سامان، رحمت کے لیے بونس تھا۔

ایک بار پھر رحمت حشمت برادرز کے دفتر کے سامنے کھڑا تھا۔ زرد رنگ کا بھرا ہوا بیگ اس کے کندھے پر تھا کہ اچانک اسے اپنے کندھے پر مزید وزن کا احساس ہوا۔ یہ کوئی انسانی ہاتھ تھا، رحمت نے جلدی سے ہاتھ رکھنے والے کی صورت دیکھی...... وہ ارمغان تھا۔

”تم نے اندر کیا کرڈالا......؟“ ارمغان کا لہجہ تلخ تھا۔

”وہی جو ہم دونوں نے مل کر منصوبہ بنایا تھا۔“

رحمت نے زوردار قہقہہ لگایا...... اس قہقہے کی بازگشت میں ارمغان کے قہقہے کی آواز بھی شامل تھی۔

”ویسے تُو اداکاری بڑی اچھی کرتا ہے...... ایسا بے ہوش ہوا کہ میں سمجھا کہ تُو تو سچ میں گیا۔“ رحمت نے کہا۔

”اور تُو بھی تو کم نہیں...... کیا ڈرامہ کیا......!“

دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ تھی...... اَب اُن کا اگلا قدم لوٹا ہوا مال آپس میں تقسیم کرنا تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# رموزِ لغت

مرتب: محمود جمال

**عرصہ** سے غلط املا کی بے شمار مثالیں مشاہدے میں آرہی ہیں۔ یہ غلط املا جن اصحاب کے قلم کی ”مرہونِ منت“ ہے، ان میں بہت سے صحافی، اُدبا اور شُعرا شامل ہیں (نہ صرف نو آموز بلکہ کچھ بزرگ بھی۔) یہاں ایسے الفاظ درج ہیں جن کی املا عام طور پر غلط کی جا رہی ہے۔ ان میں جو الفاظ غلط العام کے زمرے میں آتے ہیں، ان سے تو صرفِ نظر کیا جاسکتا ہے مگر دوسرے تمام الفاظ کی غلط املا سے احتراز لازم ہے۔

| غلط املا | صحیح املا |
|---|---|
| آذان | اذان |
| آسامی | اسامی |
| احتیاط | احتیاطاً |
| استعفیٰ (غلط العام) | استعفا |
| اسلام علیکم | السّلامُ علَیکُم |
| اصلذر | اصل زر |
| اغلبًا | غالبًا |
| انہوں (غلط العام) | انھوں |
| انہیں (غلط العام) | انھیں |
| اوللعزم | اولوالعزم |
| آذوقہ (بمعنی دانہ پانی، تھوڑی غذا زندگی کی لازمی ضروریات گزارنے کا سامان) | آزوقہ، آزقہ |
| ابھی بھی | ابھی (اس کے ساتھ صحیح املا بھی لکھنا غلط ہے) |
| غلط املا | |
| اعلانیہ | علانیہ |
| اندازاً (اندازہ پر تنوین غلط ہے) | اندازے سے یا تخمیناً |
| اوسطً (آخر میں تنوین غلط ہے) | اوسط |
| ایزاد | ازدیاد۔ زیادہ |

| غلط املا | صحیح املا |
|---|---|
| برائے کرم | براہِ کرم |
| بدیہ گوئی | بدیہہ گوئی |
| بالمشافہ | بالمشافہہ |
| بھروسہ (غلط العام) | بھروسا |
| پایہ تخت | پائے تخت |
| پرواہ (آخر میں ہ غلط ہے) | پروا |
| پہیہ | پہیا |
| تشبیہہ | تشبیہ |
| تقاضہ | تقاضا |
| تنبیہہ | تنبیہ |
| توجیہہ | توجیہ |
| ٹکر گدا | ٹکڑ گدا |
| جائیداد | جائداد |
| چاق و چوبند | چاق چوبند |
| چوہدری | چودھری |
| حامی بھرنا | ہامی بھرنا |
| حیرانگی | حیرت۔ حیرانی |
| خوردونوش | خورونوش |

| غلط املا | صحیح املا | غلط املا | صحیح املا |
| --- | --- | --- | --- |
| درشگی | درستی | سہولیت | سہولت |
| دولہا | دولھا | شان گمان، | سان گمان |
| دونو | دونوں | سان وگمان | |
| بچگانہ (گ کے ساتھ غلط ہے) | بچکانہ | غرضیکہ | غرض کہ |
| برس ہابرس۔ برسہابرس | سالہا سال | فوتیدگی | وفات، انتقال |
| غلط املا | صحیح املا | فی الواقعہ، فی الواقعی | فی الواقع |
| بمع، بمعہ | مع | غلط املا | صحیح املا |
| بےنیل ومرام | بےنیلِ مرام | قمیض | قمیص |
| یا بےنیل ومرام | | قریب المرگ (غلط العام) | قریب الموت |
| پٹاخہ | پٹاخا | کانٹ چھانٹ | کاٹ چھانٹ |
| پشیمانگی | پشیمانی | کُرتہ | کُرتا |
| پیسہ | پیسا | کمہار | کمھار |
| تماشہ | تماشا | کوائف (غلط العام) | کیفیات |
| تمہارا، تمہیں، تمہارے | تمھارا، تمھیں | کلہاڑا، کلہاڑی | کلھاڑا، کلھاڑی |
| (غلط العام) | تمھارے | کلیجہ | کلیجا |
| ٹانگہ | تانگہ | گرم مصالح | گرم مسالا |
| جنہوں، جنہیں | جنھوں، جنھیں | گذارہ | گزارہ |
| (غلط العام) | | گذرنا | گزرنا |
| چولہا | چولھا | دوئم | دوم |
| چیخ وپکار | چیخ پکار | ذکریا | زکریّا |
| حلوہ | حلوا | رجعتِ قہقری | رجعتِ (قہقرٰی) |
| خورد | خُرد | زرا | ذرا |
| دائم المریض | دائم المرض یا دائمی | سوئم | سوم |
| | مریض | طلاطم | تلاطم |
| دوکان | دُکان۔ دُکّان | عیدالضحیٰ | عیدالاضحیٰ، عیدِ اضحیٰ |
| دلہن | دلھن | غیض وغضب | غیظ وغضب |
| دھوکہ (غلط العام) | دھوکا | فی البدیہ | فی البدیہہ |
| دھیلہ | دھیلا | قرأت، قیرات | قراءت |
| ذخّار | زخّار | قہقہ | قہقہہ |
| رُجحان | رُجحان | | |



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایرانی ایٹمی مرکز پر اسرائیلی حملے کی سنسنی خیز تفصیلات پہلی بار منظرِ عام پر

# اکیسویں ۲۱ صدی کا پہلا سائبر بم

اسرائیل کے سائبر بم کا خوفناک ماجرا

ایران کی ایٹمی تنصیبات کے ۱۰۰۰ سے زائد کمپیوٹر اُس کا نشانہ بنے

سٹکس کا معما کیسے حل ہوا؟ اِس حملے کا سراغ کس نے لگایا؟

سیّد عاصم محمود

یہ ۱۷ جون ۲۰۱۰ء کی بات ہے جب سرگئی الاسین کو ایران سے اپنے ایک گاہک صنعتی ادارے کی ای میل موصول ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ان کے کئی کمپیوٹر خود بخود بند ہو کر چل رہے تھے۔ آپریٹروں نے انھیں قابو کرنے کی سرتوڑ کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ لگتا یہی تھا کہ کمپیوٹروں پر کوئی وائرس حملہ آور ہے۔

یورپی ملک، بیلا رس کے دارالحکومت، منسک میں مقیم سرگئی الاسین کمپیوٹر سائنسدان تھا۔ آج کل وہ ایک کمپیوٹر سیکورٹی سے متعلق کمپنی، وائرس بلاک ایڈا میں اینٹی وائرس ڈویژن کا سربراہ تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی کمپنی تھی اور بیلا رس میں بھی صرف کمپیوٹر سیکورٹی سے منسلک لوگ ہی اسے جانتے تھے لیکن جلد یہ پوری دنیا میں مشہور ہونے والی تھی۔

سرگئی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایران پہنچا اور

جنوری ۲۰۱۰ء میں حسب معمول بین الاقوامی ایٹمی توانائی کمیشن کے ماہرین وسطی ایران میں واقع شہر نطنز پہنچ گئے۔ وہ مضافات شہر میں واقع یورینیم افزودہ (Enrich) کرنے والے پلانٹ کا دورہ کرنے آئے تھے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ان کمروں میں خاصی چہل پہل ہے جہاں یورینیم افزودہ کرنے والی مشینیں، سینٹری فیوج رکھی جاتی تھیں۔ سفید لباس میں ملبوس کئی کارکن سینٹری فیوج مشینیں پکڑے آجا رہے تھے۔

ماہرین کو علم تھا کہ نطنز افزودگی پلانٹ میں ایک وقت میں تقریباً ۹ ہزار سینٹری فیوج نصب ہوسکتی ہیں اور ہر سال ان میں سے ۱۰ فیصد تکنیکی وجوہ کی بنا پر خراب ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ ان کی جگہ نئی نصب ہوتیں۔ ایٹمی توانائی کمیشن نے پلانٹ میں نگہداشتی (Surveillance) کیمرے لگا رکھے ہیں تاکہ یورینیم افزودگی کے ایرانی منصوبے پر نظر رکھی جاسکے۔

چھ ماہ بعد ماہرین ان کیمروں کے ریکارڈ کی پڑتال کرتے تھے۔ اب انھوں نے کیمروں کی فلمیں دیکھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پچھلے سال چند ماہ میں ایرانیوں نے ۱۰۰۰ سے ۲۰۰۰ کے درمیان سینٹری فیوج تبدیل کر ڈالی ہیں۔ قدرتاً ان کے اذہان میں یہ سوال چکر کھانے لگا کہ ایسی انہونی کیا ہوئی کہ چند ماہ میں دو ہزار مشینیں خراب ہوگئیں؟

سرکاری طور پر ماہرین ایرانی حکومت سے یہ پوچھنے کے مجاز نہیں تھے کہ مشینیں کیوں خراب ہوئیں؟ ان کا کام صرف ایٹمی مواد کی نگرانی کرنا تھا۔ ایرانی حکومت نے بھی انھیں کوئی وجہ نہ بتائی، یوں یہ معاملہ گومگو کا شکار رہا۔ تاہم ماہرین کو یقین تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

ان یورپی ماہرین کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ وہ جس سوال کا جواب ڈھونڈ رہے ہیں، وہ وہیں، پلانٹ کے کمپیوٹروں کی ہارڈ ڈسکوں اور میموری میں پوشیدہ تھا۔ دراصل جون ۲۰۰۹ء میں کسی نے ایسا تباہ کن ڈیجیٹل وائرس چھوڑا تھا جس کا مقصد صرف ایک تھا..... ایران کا ایٹمی منصوبہ تباہ کرنا تاکہ ایرانی کبھی ایٹم بم نہ بنا سکیں۔

لیکن سائبر دنیا کے انتہائی حیرت انگیز انکشافات میں سے یہ ایک انکشاف بہت بعد میں سامنے آیا۔ یہ راز تب کھلا جب کمپیوٹر سیکورٹی سے وابستہ درجن بھر ماہرین نے رات دن تحقیق کی اور آخر کار وائرس کی اصلیت دریافت کرنے اور اس کے خالق تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ تبھی پتا چلا کہ یہ ایسا پیچیدہ وائرس ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں بنا تھا..... درحقیقت وہ کمپیوٹر کی دنیا کا پہلا ہتھیار تھا جس نے کام بھی کر دکھایا۔ اس وائرس کی سنسنی خیز داستان اُردو میں پہلی بار قارئین اُردو ڈائجسٹ کے لیے پیش ہے۔

کمپیوٹروں کا معائنہ کیا۔ ابتدائی پڑتال میں کوئی وائرس نہ پکڑا گیا، تفتیش کاروں کو احساس ہوا کہ ان کا سامنا ایک خطرناک وائرس سے ہے۔ چنانچہ منک سے زیادہ طاقتور اور جدید آلات منگوائے گئے۔ آخر ایک ہفتے کی مغز ماری کے بعد انھوں نے وائرس پکڑ لیا جو زیرو۔ڈے (Zero-Day) سے فائدہ اٹھا کر ہر کمپیوٹر میں داخل ہوا تھا۔

اصطلاح میں زیرو ڈے سے مراد ونڈوز یا کوئی بھی آپریٹنگ سسٹم یا سافٹ ویئر کی وہ خامی ہے جو کسی وجہ سے خالقوں کی نظر میں نہیں آپاتی۔ چنانچہ آپریٹنگ سسٹم میں یہی خامی یا خامیاں وائرس، ٹروجن ہارس، سپائی ویئر اور دیگر ڈیجیٹل غارت کنندہ بنانے والے ہیکروں کا سب سے بڑا ہتھیار ہیں۔ ہیکر پھر ان خامیوں سے یوں فائدہ

رالف لینگر

نکولاسن فلیری

سرگئی الاسین

ایرک شین



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لائم اومرشو

اٹھاتے ہیں کہ انھی کے راستے وائرس وغیرہ کمپیوٹر میں داخل کرتے ہیں۔

لیکن آپریٹنگ سسٹم یا سافٹ ویئر میں کوئی خامی تلاش کرنے کے لیے بڑی مہارت، صلاحیت اور وقت درکار ہے اور یہ باقاعدہ ایک کاروبار ہے۔ ایک کمپیوٹر سائنسدان کو کسی اہم سافٹ ویئر خصوصاً ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں کوئی خامی مل جائے تو وہ بلیک مارکیٹ میں ایک لاکھ ڈالر (۸۹ لاکھ روپے) تک کسی ہیکر کے ہاتھ بیچ سکتا ہے لیکن انھیں کھوجنا جان جوکھم کا کام ہے۔ اینٹی وائرس سے متعلق اینٹی وائرس ماہرین ہر سال مختلف اقسام کے ایک کروڑ ٹیس لاکھ غارت کنندہ دریافت کرتے ہیں۔ ان میں سے چند ہی خامیوں سے منسلک ہوتے ہیں۔

ایران میں بیٹھے سرگئی نے جانا کہ اس معاملے میں بھی وائرس خامی سے فائدہ اٹھا کر یو۔ایس۔بی کے ذریعے کمپیوٹروں میں پھیل گیا۔ یہ خامی ونڈوز کے ایک لازمی حصے، ایکسپلورر کی فائل ایل۔این۔کے (LNK) میں تھی۔

جب متاثرہ یو۔ایس۔بی کمپیوٹر میں ڈالی جائے تو ایکسپلورر خود کار طریقے سے اسے سکین کرتا ہے۔ اس دوران خامی کو عیاں کرنے والا وائرس کا کوڈ جاگ اٹھتا ہے۔ وہ پھر چوری چھپے وائرس کی رموزی (Encrypted) فائل کمپیوٹر میں پھینک دیتا، جیسے ملٹری طیارہ دشمن کے علاقے میں کیموفلاج ہوئے فوجی اتارتا ہے۔

یہ بظاہر کسی ذہین اور تیز فہم موجد کی اختراع تھی، کیونکہ انتہائی خفیہ طور پر کمپیوٹر میں انسٹال ہو جانا ایک حیرت انگیز عمل تھا۔ تاہم بعد ازاں تفتیش کار یہ جان کر حیران رہ گئے کہ ہیکر نے جس خامی سے فائدہ اٹھایا، وہ پہلے ہی عیاں ہو چکی تھی۔

## وائرس کی دریافت

بہرحال وائرس بلاک ایڈا نے مائیکروسافٹ کارپوریشن سے رابطہ کر کے اُسے خامی کے متعلق بتایا۔ مائیکروسافٹ والے خرابی دور کرنے کی خاطر پیچ (Patch) بنانے میں محو ہو گئے۔ ۱۲ جولائی کو وائرس بلاک ایڈا نے ایک سیکورٹی فورم (ویب سائٹ) کے ذریعے دنیا بھر میں یہ خبر پھیلا دی کہ ایک نیا وائرس وجود میں آچکا ہے۔

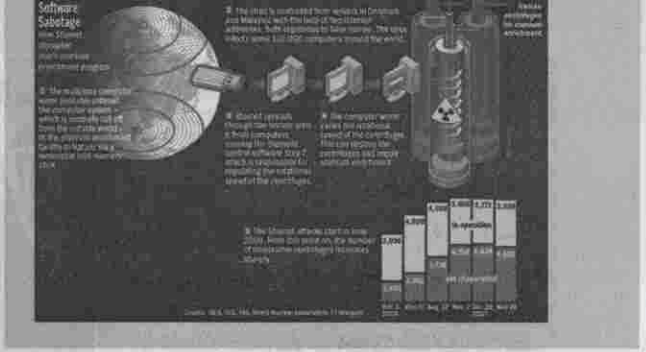


مائیکروسافٹ والوں نے وائرس کی دو بڑی فائلوں کے نام پر اس نووارد کو "سٹکس نیٹ" (Stuxnet) کا نام دیا۔ اب بہت سی اینٹی وائرس کمپنیاں سٹکس نیٹ کی بابت معلومات حاصل کرنے لگیں۔ ماہرین اسے بے اثر بنانے کے لئے تحقیق کرنے لگے۔ یوں رفتہ رفتہ وائرس کے متعلق انکشافات سامنے آئے۔

ماہرین نے دریافت کیا کہ یہ وائرس جون ۲۰۰۹ء میں کھلا چھوڑا گیا اور اس کے پُراسرار خالق اب تک سٹکس نیٹ میں تبدیلیاں لا کر اور اُسے اپ ڈیٹ کر کے وائرس کی تین اقسام بنا چکے تھے۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ وائرس کی پہلی اور دوسری قسم کی فائلوں نے کمپیوٹروں میں انسٹال ہونے کے لئے جو ڈرائیور انسٹال کیا، وہ تائیوان کی ایک ہارڈ ویئر کمپنی، رئیل ٹیک سیمی کنڈکٹر کا تصدیق شدہ سرٹیفکیٹ رکھتا تھا۔ اسی سرٹیفکیٹ کے باعث کمپیوٹر میں موجود اینٹی وائیر پروگرام ان فائلوں کو نہ روکتے کیونکہ وہ تصدیق شدہ تھے۔

انٹرنیٹ کی انتظامیہ نے بہت جلد اس سرٹیفکیٹ کو ناکارہ بنا دیا لیکن سٹکس نیٹ کی تیسری (اور آخری) قسم ایک اور سرٹیفکیٹ استعمال کرتے پکڑی گئی۔ یہ سرٹیفکیٹ تائیوان ہی کی سرکٹ بریکر بنانے والی کمپنی، جے مائیکرون ٹیکنالوجی نے بنایا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں تائیوانی کمپنیوں کے صدر دفاتر ایک ہی علاقے میں واقع تھے۔

اس موقع پر سوال اٹھتا ہے کہ وائرس بنانے والوں نے کیا کمپنیوں میں چوری کی تا کہ سرٹیفکیٹ چرا سکیں؟ یا پھر وہ کسی طرح کمپنیوں کی ویب سائٹ میں اس جگہ پہنچنے میں کامیاب رہے جہاں سرٹیفکیٹوں کے کوڈ محفوظ تھے؟ یا کمپنیوں نے خود ہی یہ سرٹیفکیٹ دے ڈالے؟ ابھی تک کوئی ماہر یہ سوال حل نہیں کر سکا۔

تاہم ماہرین نے یہ معما ضرور حل کر لیا کہ سٹکس نیٹ وائرس کا نشانہ کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سافٹ ویئر کارخانوں میں آنے والے ایک سافٹ ویئر، سٹیپ ۷ (Step7) کو ٹارگٹ بناتا تھا۔ یہ سافٹ ویئر مشہور جرمن کمپنی، سائمنز نے تیار کیا اور کمپیوٹر نظام کے ذریعے چلنے والے کنٹرولر چلاتا ہے۔ یہ کنٹرولر خوراک کے کارخانوں سے لے کر کار سازفیکٹریوں، گیس پائپ لائنوں اور پانی صاف کرنے والے پلانٹوں تک میں موٹریں، والو اور سوئچ چلاتا ہے۔

روایتی طور پر ہیکر (ویب سائٹوں اور سافٹ ویئروں پر حملہ کرنے والے) صنعتی کمپیوٹری کنٹرول نظاموں کو نشانہ نہیں بناتے کیونکہ یوں انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ پھر سٹکس نیٹ نے سٹیپ ۷ کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ کوئی خاص نہیں تھا۔

وہ بس سافٹ ویئر کی کنفیگریشن (اندرونی نظام) اور ڈیزائن ڈیٹا چرانے کی کوشش کرتا رہا۔ ماہرین نے اندازہ لگایا کہ یہ وائرس سائمنز کی مخالف کسی کمپنی نے ہیکروں سے بنوایا ہے تا کہ وہ سٹیپ ۷ کی اندرونی ہیبت چرا کر اپنا زیادہ بہتر سافٹ ویئر تیار کر سکے۔ چنانچہ یہ صنعتی جاسوسی کا معمولی سا کیس بن گیا۔

اینٹی وائرس کمپنیوں نے پھر اپنے شناختی (ڈی ٹیکشن) انجنوں میں سٹکس نیٹ وائرس کو پہچاننے والے متعلقہ کوڈ بھرے اور پھر دیگر وائرسوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ حقیقت میں اس پُراسرار وائرس کی کہانی یہیں ختم ہو جاتی لیکن یہ ایسے چند محققوں کے ہاتھ لگ گیا جو اس کے اسرار جاننے کے درپے ہو گئے۔

## لائم اور مرشو کی آمد

سمینٹک دنیا کی مشہور اینٹی وائرس پروگرام، نارٹن بنانے والی کمپنی ہے۔ اس کمپنی کے ماہرین نے بھی نارٹن اینٹی وائرس میں سٹکس نیٹ کھوجنے والے کوڈ داخل کیے، پھر اسے ۳۳ سالہ اومرشو کے پاس بھیج دیا گیا۔ مرشو کمپنی میں بحیثیت سیکورٹی ریسپونس افسر کام کرتا ہے۔ اس کا کام یہ تھا کہ جو وائرس زیادہ خطرناک ہو، اس کی اندرونی ساخت کا پتا لگائے۔ امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر، کولورسٹی میں اس کا دفتر ہے۔

یہ واضح رہے کہ سمینٹک اور دیگر اینٹی وائرس کمپنیوں کو ہر سال دس لاکھ سے زائد وائرس، ٹروجن ہارس وغیرہ ملتے ہیں۔ ان کی اکثریت مروجہ وائرسوں کی اقسام ہوتی ہیں، لہٰذا طاقتور کمپیوٹر انسانی مداخلت کے بغیر خود ہی انھیں ٹھکانے لگانے کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ لیکن جو وائرس آپریٹنگ نظام کسی خرابی (زیرو ڈے) سے پھیلیں، ان پر

## سینٹری فیوج ہے کیا؟

تہران سے ۲۵۰ کلومیٹر دور جانب جنوب واقع شہر نطنز کے نزدیک وہ ایرانی ایٹمی پلانٹ موجود ہے جہاں تقریباً ۹ ہزار سینٹری فیوج مشینیں نصب ہیں۔ المونیم سے بنی ایک سینٹری فیوج ۵ فٹ ۱۰ انچ لمبی اور ۴ انچ چوڑی ہے۔ یہ تمام مشینیں زمین دوز عمارتوں میں واقع ہیں۔ واضح رہے کہ معدن یورینیم کا ایک آکسوٹوپ، یورینیم ۲۳۵ ایٹم بم بنانے اور ایٹمی بجلی گھر چلانے میں کام آتا ہے مگر خالص یورینیم کا صرف ۷۱۱ء۰ فی صد یورینیم ۲۳۵ پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ سینٹری فیوج میں خالص یورینیم سے یورینیم ۲۳۵ الگ کیا جاتا ہے تا کہ اس کی زیادہ مقدار حاصل کی جا سکے۔ ایٹمی بجلی گھر میں بطور ایندھن استعمال ہونے والے یورینیم میں ۳ تا ۵ فیصد یورینیم ۲۳۵ ہوتا ہے۔ لیکن ایٹم بم بنانے کے لئے ضروری ہے کہ یورینیم ۲۳۵ کا حصہ ۸۵ فیصد سے زیادہ ہو۔

پاکستان میں زیر قیادت ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایٹمی سائنسدانوں نے سینٹری فیوج ہی میں یورینیم افزودہ کیا (یعنی خالص معدن سے یورینیم ۲۳۵ علیحدہ کیا)۔ بعد ازاں ایران کو بھی سینٹری فیوج مشینیں فراہم کی گئیں تا کہ وہ بھی ایٹم بم بنا کر اپنا دفاع مستحکم کر سکے۔

سینٹری فیوج کے اندر روٹر فی سیکنڈ ایک ہزار سے زیادہ تعداد میں چکر لگاتا ہے۔ اتنی تیزی سے چکر لگانے کے باعث اندر موجود یورینیم کے آکسوٹوپ الگ ہو جاتے ہیں یوں یورینیم ۲۳۵ وسط میں جمع ہوتا ہے جسے حاصل کر لیا جاتا ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاص توجہ دی جاتی ہے اور پھر کمپیوٹر سائنسدان ان کا معاینہ کرتے ہیں۔

اومرشو کے دفتر میں ایک کمپیوٹر انجینئر نووارد تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ سٹکس نیٹ کی چھان بین کا کام اسی کے سپرد کیا جائے تاکہ موصوف کی تربیت ہو سکے لیکن جب اس نے وائرس کا مطالعہ کیا تو بھونچکا رہ گیا..... وہ تو اس کی سوچ سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھا۔

عام وائرس ۱۵ یا ۱۰ کلوبائیٹ کا ہوتا ہے لیکن سٹکس نیٹ ۵۰۰ کلوبائیٹ کا تھا۔ دراصل اس میں آپریٹنگ نظام کی خرابی سے اٹھانے والی فائل کئی فائلوں کے نیچے چھپائی گئی تھی۔ جب اومرشو ذرا گہرائی میں گیا تو اسے احساس ہوا کہ یہ وائرس نہیں ہزار ہا احکامات اور ڈیٹا (معلومات) کا طلسم ہوش ربا ہے جسے فتح کرنے کے لئے بہت بڑا سورما چاہیے۔ نتیجۃً اومرشو نے خود اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اومرشو نہایت تجربے کار اینٹی وائرس ماہر تھا۔ وہ ۲۰۰۲ء سے اس شعبے میں تھا اور اس نے لاکھوں وائرس، ٹروجن، سپائی ویئر دیکھے تھے۔ اکثر وہ وائرس کا واجبی سا جائزہ لے کر اس کی پوری تاریخ جان جاتا تھا لیکن سٹکس نیٹ نے تو اُسے حیران پریشان کر دیا۔ اس وائرس میں چھوٹے چھوٹے کئی حصے تھے تاکہ وہ اپنا کام آسانی سے انجام دے سکے اور اگر ضرورت پڑے تو وائرس میں تبدیلیاں بھی کر دی جائیں۔

سٹکس نیٹ ایک مرتبہ کمپیوٹر میں داخل ہو کر جس طرح خود کو چھپاتا تھا، اسے دیکھ کر اومرشو سب سے زیادہ حیران ہوا۔ جب کمپیوٹر چلایا جائے تو ونڈوز ہارڈ ڈسک میں محفوظ ڈی۔ایل۔ایل (DLL) فائل کے ذریعے اپنے تمام سافٹ ویئر لوڈ کرتی ہے۔ چونکہ وائرس بھی ڈی۔ایل۔ایل فائل ہارڈ ڈسک میں رکھتے ہیں لہٰذا اینٹی وائرس پروگرام آخر کار انھیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔

لیکن سٹکس نیٹ اپنی رموزی، تباہ کن ڈی۔ایل۔ایل فائل ہارڈ ڈسک کے بجائے میموری میں کسی ورچوئل (غائب) شے کی طرح محفوظ کرتا اور خالقوں نے اس فائل کو خاص نام دیا تھا۔ اس کے بعد سٹکس نیٹ ونڈوز اور انسٹال شدہ پروگراموں کا انٹرفیس ہی بدل ڈالتا، یعنی وہ طریق کار جس کے مطابق پروگرام (یا سافٹ ویئر) ونڈوز میں چلتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی پروگرام خاص طور پر سٹیپ ۷ چلایا جاتا اور وہ کام کرنے کے لئے درکار کوڈ ورڈ ہارڈ ڈسک میں محفوظ ڈی۔ایل۔ایل فائل سے لینے کی سعی کرتا تو انٹرفیس میں تبدیلی کے باعث وہ میموری میں موجود وائرس کی ڈی۔ایل۔ایل فائل میں پڑے احکامات اٹھا لیتا۔ گویا سٹکس نیٹ نے ایسی نئی قسم کی ''جادوئی'' ڈی۔ایل۔ایل فائل تخلیق کر ڈالی کہ یہ ہارڈ ڈسک میں محفوظ ہی نہیں ہوتی تھی..... لہٰذا اُسے کھوجنا تقریباً ناممکن تھا۔

اومرشو نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ایسی تکنیک نہیں دیکھی تھی۔ وہ بتاتا ہے: ''حتیٰ کہ میری نگاہوں کے سامنے سے جو پیچیدہ اور جدید ترین وائرس گزرے تھے، ان میں بھی یہ تکنیک عنقا تھی۔ یوں رفتہ رفتہ یہ شواہد جنم لینے لگے کہ سٹکس نیٹ انتہائی تجربے کار اور تربیت یافتہ کمپیوٹر ماہرین کی تخلیق ہے۔ وہ ۵۰۰ کلو بائیٹ کا تھا اور اومرشو ابھی صرف ۵ کلو بائیٹ کا مطالعہ کر پایا تھا۔ گویا یہ بات عیاں تھی کہ اس کی چھان بین کے لئے ٹیم کی ضرورت پڑے گی۔

لیکن اب اومرشو کے سامنے یہ سوال آ کھڑا ہوا کہ آیا سٹکس نیٹ کے راز افشا کیے جائیں؟ سیمنٹکس کمپنی کا کام صرف یہ تھا کہ وائرسوں کو پتا چلائے اور انھیں کمپیوٹر سے نکال باہر کرے۔ یہ اس کی ذمے داری نہیں تھی کہ معلوم کرے کہ آخر یہ ہے کیا بلاتا کہ مستقبل میں ایسے وائرسوں سے جلد نمٹا جا سکے۔ چنانچہ افسروں نے اومرشو کو بڑھنے کا اشارہ دے دیا۔ اب تو اومرشو جوش و جذبے سے بھر گیا۔ وہ مہم جوئی کا شوقین تھا اور سٹکس نیٹ کا چیلنج اس پر ایسا سوار ہوا کہ رات کی نیند ہی اُڑ گئی۔

جب اومرشو وائرس کی ابتدائی کھوج سے فارغ ہوا تو



جمعہ کی رات تھی۔ گویا دو چھٹیاں آ گئیں مگر اس نے سٹکس نیٹ کا اگلا کام ٹوکیو میں بیٹھی تحقیقی ٹیم کے سپرد کر دیا۔ دراصل سیمنٹکس نے امریکہ کے علاوہ پیرس اور ٹوکیو میں بھی لیبارٹریاں قائم کر رکھی ہیں تاکہ اہم خطرات سے نمٹنے کے لیے مختلف منطقہ وقت (Time Zone) میں بیٹھے محقق تیار ہوں۔ چنانچہ اگلے دو دن ضائع نہ گئے اور کچھ پیش رفت ہو گئی۔

پیر کی صبح تازہ دم اومرشو اپنے دو نائبین، ایرک شین، ٹیکنیکل ڈائریکٹر، سیکورٹی ریسپونس اور نکولاسن فلیری، سافٹ ویئر انجینئر کے ساتھ وائرس کے اگلے مرحلوں کی کھوج میں جت گیا۔ پیر کی شام آخر کار ایک اہم انکشاف ہوا۔

## دو ویب سائٹوں کی دریافت

معلوم ہوا کہ جب بھی وائرس کسی کمپیوٹر میں داخل ہو تو وہ ''گھر فون کر کے'' اس امر کی اطلاع دیتا ہے۔ یہ گھر دو ویب سائٹوں mypremierfutbol.com اور todaysfutbol.com پر مشتمل تھے۔ ان ویب سائٹوں کے سرور بالترتیب ملائیشیا اور ڈنمارک میں موجود تھے۔ وائرس جس کمپیوٹر پر حملہ کرتا اس کی مخصوص معلومات ان سرورز کو بھجواتا تھا۔ یہ معلومات کمپیوٹر کے اندرونی و بیرونی آئی۔پی ایڈریس، نام، آپریٹنگ سسٹم، ورژن اور اس امر پر مبنی ہوتی کہ اس میں سٹیپ ۷ انسٹال ہے یا نہیں۔ وہی سرور پھر وائرس کو حکم دیتے تھے کہ کمپیوٹر پر دھاوا بولو یا چھوڑ دو اور اکثر اوقات مزید شیطانی فائلیں اس میں داخل کر دیتے۔

جب ماہرین نے مزید تحقیق کی تو انکشاف ہوا کہ سرور جعلی نام اور جعلی کریڈٹ کارڈ کے ذریعے دنیا کی سب سے بڑی انٹرنیٹ رجسٹریشن کمپنی کے ہاں رجسٹرڈ تھے۔ اس کمپنی کا صدر دفتر امریکی ریاست ایری زونا میں واقع ہے۔ یہ سرور مردہ ہو چکے تھے۔ لہٰذا اب حملہ آوروں تک پہنچنا ناممکن تھا۔ تاہم اومرشو کے ذہن میں ایک نادر ترکیب آئی۔

اس نے سرور رجسٹرڈ کرنے والی انٹرنیٹ کمپنی سے رابطہ کیا اور اسے اس امر پر آمادہ کر لیا کہ ان دونوں ویب سائٹوں کی طرف وائرس جو پیغامات بھیج رہا ہے، اُسے ''سنک ہول'' یعنی سیمنٹکس کے سرور کی طرف بھیج دیا جائے جو ڈبلن (آئرلینڈ) میں واقع تھا۔ یوں ماہرین کو پتا چل جاتا کہ وائرس کہاں کہاں سرگرم ہے۔ منگل کی شام تک سیمنٹکس کے سرور میں وائرس سے متاثرہ کمپیوٹروں کی طرف سے پیغام آنے لگے۔

''سنک ہول'' نصب کرنے کے ایک ہفتے بعد اُسے دو درجن بھر ممالک سے ۳۸ ہزار متاثرہ کمپیوٹروں کی رپورٹس موصول ہوئیں۔ جلد ہی وائرس سے آلودہ ایک لاکھ سے زائد کمپیوٹر سامنے آ گئے۔ گویا اینٹی وائرس پروگراموں میں اس کا کوڈ شامل کرنے کے باوجود سٹکس نیٹ پوری دنیا میں

### موساد کا خفیہ منصوبہ

تل ابیب سے حیفہ جانے والی شاہراہ پر ایک پہاڑی واقع ہے۔ اسی پہاڑی پر اسرائیل کی بدنام زمانہ خفیہ موساد کا صدر دفتر ہے۔ جنوری ۲۰۱۰ء میں موساد کے (سابق) سربراہ میئر داگان نے یورپی صحافیوں کو اپنے ہیڈ کوارٹر کا دورہ کرنے کی دعوت دی، اس موقع پر میئر داگان نے صحافیوں کو بتایا کہ اسرائیل ہر حال میں ایرانی ایٹمی تنصیبات تباہ کرنا چاہتا ہے لیکن ایران پر اسرائیلی طیاروں نے حملہ کیا تو خدشہ ہے کہ جنگ پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بمباری سے تنصیبات تباہ نہ ہوں۔ چنانچہ اب اسرائیلی کی توجہ اس امر پر مرکوز ہے کہ کسی طرح ایرانی ایٹمی منصوبے کی رفتار سست کر دی جائے۔

اس گفتگو سے یہ عیاں ہے کہ اسرائیلیوں نے یہی بات ذہن میں رکھ کر سٹکس نیٹ وائرس بنایا کہ ایرانی ایٹم بم بنانے میں زیادہ سے زیادہ دیر لگا دیں۔ چنانچہ اسرائیلی فوج سے منسلک کمپیوٹر ماہرین نے کم از کم ایک سال کی محنت کے بعد اور کروڑوں روپے خرچ کر کے یہ وائرس بنایا۔ ماہرین کے مطابق اس منصوبے سے تقریباً ۳۰ کمپیوٹر ماہر منسلک تھے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیزی سے پھیل رہا تھا۔

جب اومرشو اور شین نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ سب سے زیادہ متاثرہ کمپیوٹر کس خطے میں ہیں تو ایک اور انکشاف سامنے آگیا۔ ابتدائی متاثرہ ۳۸ ہزار کمپیوٹروں میں سے ۲۲ ہزار ایران میں تھے۔ دوسرا نمبر انڈونیشیا کا تھا جہاں ۷۶۰۰ آلودہ ہوئے۔ پھر بھارت میں ۳۷۰۰ کمپیوٹروں پر وائرس نے حملہ کیا۔ امریکہ میں صرف ۴۰۰ ایسے کمپیوٹر تھے۔ ان تمام کمپیوٹروں میں صرف ۲۳۳ کمپیوٹروں میں سافٹ ویئر سٹیپ ۷ انسٹال تھا۔ ان میں سے ۲۱۷ ایران اور ۱۶ امریکہ میں تھے۔

یہ صورت حال ماضی میں وائرس پھیلنے کے نمونوں سے قطعاً مختلف تھی۔ جن ممالک میں وائرس بڑی تعداد میں حملہ آور ہوئے ان میں ایران کبھی شامل نہیں رہا تھا۔ حتیٰ کہ جن وائرسوں نے مشرق وسطیٰ میں جنم لیا، انھوں نے بھی بطور خاص ایران کو ٹارگٹ نہ بنایا لیکن اب یہ حقیقت واضح تھی کہ سٹکس نیٹ کا بنیادی شکار ایران تھا۔

## نشانہ ایران ہے

وائرس کی انتہائی پیچیدہ رموزی ہیت، چوری شدہ سرٹیفکیٹ اور اب ایران کو نشانہ بنانے سے یہی لگتا تھا کہ وائرس کسی ملک کی سرکاری سائبر فوج نے تیار کیا ہے..... اور ماہرین نے سب سے پہلے امریکی حکومت پر شک کیا لیکن اسی بات نے سیمنٹکس کمپنی کے افسروں کو متوحش کر دیا۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ کمپنی نے سنک ہول بنا کر ''بڑی گستاخی'' کی ہے۔ کیونکہ اب شاید امریکی حکومت کے کسی انتہائی خفیہ منصوبے کا ڈیٹا ان کے پاس چلا آرہا تھا۔

تاہم یہ تشویش عارضی تھی۔ کمپنی کی نمائندگی کرتے ہوئے شین بتاتا ہے: ''ہمارے نزدیک لوگ اچھے ہوتے ہیں نہ بُرے لیکن ہم ان لوگوں کو بُرا سمجھتے ہیں جو شیطانی وائرس تخلیق کریں۔ وہ وائرس پھر بے گناہ انسانوں کے کمپیوٹر خراب کرتے اور انھیں ذہنی اذیت پہنچاتے ہیں۔''

کمپنی کو اس بات سے سروکار نہیں تھا کہ ''بُرے آدمی'' امریکی ہیں یا کوئی اور، اُسے بس یہ غرض تھی کہ ان کے بنائے ہوئے وائرس نے ہزاروں کمپیوٹر خراب کر ڈالے ہیں۔ لہٰذا شین بات صاف کرتے ہوئے کہتا ہے: ''گو ہماری کمپنی امریکی ہے لیکن اس کے گاہک پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا ہی ہمارا اصل کام ہے۔''

اُدھر وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ماہرین یہ تو جانتے تھے کہ سٹکس نیٹ ایک لاکھ سے زائد کمپیوٹروں میں گھسا بیٹھا ہے لیکن وہ کیا کر رہا ہے؟ اس کے متعلق انھیں کچھ خبر نہ تھی۔ انھیں زیادہ تشویش یہ تھی کہ وائرس پانی کی صفائی کے پلانٹ یا ڈرین کنٹرول میں گھس گیا تو بڑی تباہی مچا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے وائرس کے اندرونی نظام کو سمجھنے کی کوششیں تیز کر دیں۔

## نئی خامیوں کا انکشاف

ماہ اگست کے اواخر میں اومرشو کی ۳۳ ویں سالگرہ تھی۔ وہ اس نے دوست احباب کے ساتھ ایک ریستوران میں منائی۔ جب محفل عروج پر تھی تو رات کے نو بجے شین وہاں پہنچا لیکن اُسے سالگرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ اپنے باس کو ایک چشم کشا ای میل دکھانا چاہتا تھا۔ یہ ای میل پیرس سے کمپنی کے ایک محقق نے بھجوائی تھی۔ اومرشو نے شین کے بلیک بیری پر یہ ای میل پڑھی ''سٹکس نیٹ میں آپریٹنگ سسٹم کی مزید خامیوں سے فائدہ اٹھانے والے کوڈ ورڈ (یا فائلیں) موجود ہیں۔''

ای میل پڑھ کر اومرشو کچھ دیر گنگ بیٹھا رہا، پھر اس نے شین کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ایک ماہ سے وائرس کے اندر جھانک رہے تھے۔ انھیں بھی مزید خامیوں کے آثار ملے تھے لیکن جان نہ پائے۔ گو ای میل بھی مبہم تھی لیکن اس خبر نے اومرشو میں آگ لگا دی کہ سٹکس نیٹ میں ابھی مزید ''زیرو ڈے'' پوشیدہ ہیں۔

اومرشو پھر اگلے دن صبح سویرے دفتر پہنچ گیا حالانکہ



تقریب رات گئے تک جاری رہی تھی۔ اومرشو نے تحقیق کا مرکز وائرس کے اس حصے کو بنایا جس کے ذریعے وہ کمپیوٹر میں داخل ہوتا تھا۔ تحقیق نے جو نتائج نکالے، ان پر پھر تجربات ہوئے۔ شام کو اس نے اپنی تحقیق شین کے حوالے کر دی۔ اس طرح دو شفٹوں میں کام کرتے ہوئے پُرتجسس محققوں نے مزید ایک دو نہیں پورے تین زیرو ڈے تلاش کر لیے۔

ایل۔این۔کے کی خامی کے علاوہ سٹکس نیٹ پھیلنے کے لیے ونڈوز سسٹم والے کمپیوٹر میں ایک پرنٹر سپولر خامی سے بھی فائدہ اٹھاتا تھا۔ یوں وہ ان کمپیوٹروں میں پھیل جاتا جو ایک ہی پرنٹر سے منسلک تھے۔ تیسری اور چوتھی خامی ونڈوز کی کی بورڈ فائل اور ٹاسک شیڈولر سے متعلق تھیں۔ ان خامیوں کی بدولت وائرس پورے کمپیوٹر میں پھیل جاتا اور یوں حملہ آور اس کا پورا کنٹرول حاصل کر لیتے۔

مزید براں وائرس اپنے پھیلاؤ میں اس جامد پاس ورڈ سے بھی مدد لیتا جو سائمنز کمپنی نے سٹیپ ۷ پروگرام کے اندر بھر رکھا تھا۔ پاس ورڈ کے ذریعے سٹکس نیٹ اس سرور تک رسائی پاتا جس میں سٹیپ ۷ کا ڈیٹا بیس موجود ہوتا۔ وہاں سے پھر وہ سرور سے جڑے دیگر کمپیوٹر بھی آلودہ کر دیتا۔

یہ عیاں تھا، حملہ آور چاہتے تھے کہ ان کا انتہائی خطرناک وائرس لازماً منزل تک پہنچ جائے لیکن حیرت انگیز طور پر محدود طریقے سے! عام وائرس ای میل یا آلودہ ویب سائٹوں کے ذریعے حملہ کرتے ہیں لیکن سٹکس نیٹ کو اس طریقے سے تخلیق کیا گیا کہ وہ لوکل ایریا نیٹ ورکوں کے ذریعے پھیل سکے۔ ایک سے دوسری جگہ وائرس پہنچانے کا بنیادی طریقہ کار یہ تھا کہ اسے یو۔ایس۔بی میں ڈال کر وہاں سمگل کر دیا جائے۔ گویا حملہ آوروں کو علم تھا کہ وہ جو کمپیوٹر آلودہ کرنا چاہتے ہیں، انٹرنیٹ سے منسلک نہیں۔ پھر چار زیرو ڈے پر مشتمل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وائرس نے کسی انتہائی اہم جگہ کو نشانہ بنانا تھا۔

ماہرین نے سٹکس نیٹ کی ایک خاصیت مزید دریافت کی، یہ کہ ہر وائرس کا نمونہ جب کسی کمپیوٹر میں داخل ہوتا تو وہ وقت اور ڈومین نام بھی اپنے سرور کو بھجواتا تھا۔ اس خاصیت کی بدولت ماہرین کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ ان اولین وائرسوں تک پہنچ سکیں جنھوں نے سب سے پہلے کمپیوٹروں پر حملہ کیا تھا۔

انکشاف ہوا کہ سٹکس نیٹ نے جون، جولائی ۲۰۰۹ء میں اول اول پانچ ایرانی اداروں کے کمپیوٹروں پر حملہ کیا۔ وہاں سے پھر وہ پورے ایران میں پھیلے کمپیوٹروں میں پھیل گیا۔ بہرحال سیمنٹکس کے ماہرین نے ونڈوز میں جو مزید خامیاں دریافت کی تھیں، وہ مائیکروسافٹ کو بتا دیں۔ نیز اینٹی وائرس ڈیٹا بیس میں یہ کھوج لگایا گیا کہ خامیاں پہلے تو کبھی سامنے نہیں آئیں؟

یہ بھی انکشاف ہوا کہ نومبر ۲۰۰۸ء میں ایل این کے کی خامی زلوب (Zlob) نامی وائرس کی ایک قسم میں سامنے آئی تھی۔ اینٹی وائرس کمپنیوں نے اپنے ڈیٹا انجن میں اس قسم کو تو شامل کر لیا، لیکن زیرو ڈے خامی مائیکروسافٹ والوں تک نہیں پہنچیں۔ اسی طرح اپریل ۲۰۰۹ء میں پولش زبان کے ایک کمپیوٹر میگزین میں پرنٹر سپولر کی خامی کے متعلق مضمون شائع ہوا لیکن اس کی معلومات بھی مائیکروسافٹ تک نہ پہنچی۔ حتیٰ کہ جرمنی میں سائمنز کا کوڈ پاس ورڈ بھی ایک آن لائن رسالے میں چھپ گیا تھا۔

ماہرین کا خیال ہے کہ سٹکس نیٹ کے خالقوں نے یہ تمام زیرو ڈے یا تو اکٹھے کر لیے یا پھر لاکھوں ڈالر دے کر انھیں خرید لیا گیا۔ یوں انسانی تاریخ کا خطرناک ترین وائرس منظر عام پر آیا۔

## وائرس کے اندرونی راز

اومرشو اور شین ایک ماہ سے سٹکس نیٹ پر کام کر رہے تھے۔ انھوں نے اس میں پھیلنے کے طریق کار تو ڈھونڈ لیے مگر یہ نہ جان سکے کہ اسے کیوں تخلیق کیا گیا اور یہ کیا کرتا ہے۔ یہ راز وائرس کی گہرائی میں چھپی فائلوں میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوشیدہ تھا۔ یہ راز کھوجنے کی ذمے داری ۲۸ رسالہ نکولاس فلیری کے سپرد ہوئی۔ فلیری محض کمپیوٹر انجینئر ہی نہیں ریورس انجینئرنگ کا بھی ماہر تھا جو وائرسوں کا اندرونی نظام جاننے کے کام آتی ہے۔

تحقیق کے ذریعے فلیری نے دریافت کیا کہ سٹکس نیٹ کے تین بنیادی حصے ہیں جو پندرہ ذیلی حصوں میں منقسم ہیں۔ یہ تمام تہ در تہ موجود تھے۔ وائرس جب کسی کمپیوٹر میں داخل ہوتا تو صورت حال کے مطابق مطلوبہ حصوں سے فائدہ اٹھالیتا۔

فلیری کو وائرس میں mdmcpq3.pnf نامی کنفیگوریشن فائل بھی ملی۔ اس فائل میں ایسے چار سو احکامات محفوظ تھے جو حملہ آور وائرس کو دے سکتے تھے۔ مثلاً یہ کہ اسے کب تک پھیلنا ہے، ہر زیرو ڈے کب تک کارآمد رہے گی، وغیرہ۔

لیکن سٹکس نیٹ کا خطرناک ترین حصہ اس کے کام کرنے کا انداز تھا۔ جب وائرس کسی کمپیوٹر میں سٹیپ ۷ انسٹال پاتا، تو فوراً اپنے اندر محفوظ زہریلی ڈی۔ایل۔ایل فائل اس کی میموری میں پھینک دیتا۔ یہ آلودہ فائل پھر قانونی فائل (S7otbxdx.dll) کو بے اثر کر کے اس کی جگہ لے لیتی۔ اب سٹیپ ۷ دوران کار مطلوبہ احکامات اسی زہریلی فائل سے لیتا۔

یہ واضح رہے کہ سٹیپ ۷ کی پروگرامنگ اور جانچ پڑتال (مانیٹرنگ) کا کام ایک آلہ، پی۔ایل۔سی (پروگرام ایبل لوجک کنٹرولر) کرتا ہے۔ اس کو ٹوسٹر جتنا چھوٹا سا کمپیوٹر سمجھئے، جب بھی سافٹ ویئر سے کام لینا ہو، کارکن اپنا کمپیوٹر پی۔ایل۔سی سے جوڑ دیتے ہیں۔ وہ پھر پیچیدہ اسمبلی لائن میں موٹروں سے لے کر گیس پائپ لائنوں میں اہم والو کنٹرول کرتا ہے۔

فلیری نے دریافت کیا کہ جب سٹیپ ۷ سافٹ ویئر سے احکامات پی۔ایل۔سی کو جاتے تو سٹکس نیٹ انھیں پکڑتا اور ان کی جگہ اپنے تباہ کن احکام بھجوا دیتا۔ اسی دوران وائرس کا ایک حصہ وہ خودکار الارم نہ چلنے دیتا جو نظام کو زہریلے احکامات ملنے پر بول اٹھتے ہیں۔ مزید براں دوران کار پی۔ایل۔سی سٹیپ ۷ کو اپنی سرگرمیوں کی جو رپورٹ بھجواتا ہے، سٹکس نیٹ اُسے بھی روک لیتا۔ یوں کسی کو معلوم نہ ہو پاتا کہ پی۔ایل۔سی اب ناجائز احکامات پر چل رہا ہے۔

اس طرح پی۔ایل۔سی کی مانیٹرنگ پر مامور کارکنوں کو یہی نظر آتا کہ آلہ جائز احکامات پر صحیح طرح کام کر رہا ہے۔ ہالی ووڈ کی فلموں میں اکثر دکھایا جاتا ہے کہ چور

## زر کثیر ضائع ہو گیا

اس وائرس کے ذریعے اسرائیلی اور امریکی دراصل یہ چاہتے تھے کہ وہ نطنز میں زیادہ سے زیادہ سینٹری فیوج مشینیں خراب کر ڈالیں۔ یوں یورینیم کی افزودگی کا کام سست پڑ جاتا۔ اس وائرس نے یقیناً تقریباً ایک ہزار مشینیں ناکارہ بنا دیں لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ وجہ یہ ہے کہ ایرانیوں نے سُرعت سے نئی سینٹری فیوج لگا لیں اور یورینیم کی افزودگی کا کام مزید تیز کر دیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسرائیلی ماہرین ابھی سٹکس نیٹ کو مزید بہتر بنا رہے تھے۔ ماہرین کو اس کے کوڈ میں حملہ کرنے والی ایسی فائل ملی جسے خاموش رکھا گیا تھا۔ بہرحال وائرس بلاک ایڈا کے ایک غیر معروف ماہر نے سٹکس نیٹ دریافت کر کے اسرائیل کے مذموم عزائم پر پہلی ضرب لگائی۔ پھر سیمنٹکس کے ماہرین نے اس امر کو اپنی ذمے داری سمجھا کہ وائرس میں چھپے رازوں کا کھوج لگائیں۔ آگے چل کر انھیں لینگر جیسے ماہر کی مدد بھی حاصل رہی جس کے گھر میں انٹرنیٹ کنکشن تک موجود نہ تھا۔

یہ بات عیاں ہے کہ اسرائیل اور امریکہ نے سٹکس نیٹ تخلیق کرنے میں لاکھوں ڈالر کا زر کثیر خرچ کیا لیکن وہ اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ بلکہ اب امکان موجود ہے کہ ایرانی کمپیوٹر ماہرین سٹکس نیٹ سے بھی خطرناک وائرس بنا کر اسرائیل یا امریکہ کی ایٹمی تنصیبات تباہ کرنے کی کوشش کریں۔ یوں کمپیوٹروں کی دنیا عجیب و غریب جنگ کا مرکز بن جائے گی۔



نگران کیمروں میں اپنی وڈیو داخل کر دیتے ہیں، یوں مانیٹر کرنے والے گارڈ سمجھتے ہیں کہ حالات قابو میں ہیں لیکن اُدھر چور ہیرے لے اُڑتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال سٹکس نیٹ نے بھی پیدا کر دی۔

## تباہی کا فرستادہ

سٹکس نیٹ کی یہ ساری کارروائی سیمنٹکس کی خصوصی لیبارٹری میں نوٹ کی گئی جہاں پی۔ایل۔سی منگوایا گیا تھا اور ایک کمپیوٹر میں سٹیپ ۷ بھی انسٹال تھا۔ جب ماہرین نے دیکھا کہ وائرس اپنے احکامات پی۔ایل۔سی میں داخل کر رہا ہے تو انھیں احساس ہوا کہ یہ جاسوسی کرنے نہیں کوئی چیز تباہ کرنے کے واسطے تخلیق ہوا ہے۔

اس انکشاف نے انھیں بھونچکا کر دیا۔ یہ دنیائے انٹرنیٹ میں سامنے آنے والا پہلا وائرس تھا جو حقیقی دنیا میں کوئی شے تباہ کرنے کے لیے بنا تھا۔ ہالی ووڈ میں اس موضوع پر چند برس پہلے ایک فلم ''ڈائی ہارڈ فلک'' بنی تھی لیکن اب تصور حقیقت میں بدل چکا تھا۔

شین بتاتا ہے: ''ہمیں اُمید تھی کہ سٹکس نیٹ جاسوسی کی غرض سے بنایا گیا ہے یا پھر کریڈٹ کارڈ کے نمبر چوری کرنا مقصود ہوگا، لیکن ہمیں اس بات کی توقع نہیں تھی کہ وہ وائرس کے بھیس میں بم ہوگا۔''

۶ اگست ۲۰۱۰ء کو سیمنٹکس نے اپنی ویب سائٹ میں یہ خبر پوسٹ کر دی کہ سٹکس نیٹ دراصل ایک حملہ آور وائرس ہے جو پی۔ایل۔سی میں انسٹال سائمنز کنٹرول کو ہائی جیک کر کے اس سے من مانا کام کراتا ہے۔ یہ ایک اہم دریافت تھی لیکن ماہرین اب بھی سو فیصد کامیابی سے دور رہے..... وہ یہ نہیں جان سکے کہ سٹکس نیٹ پی۔ایل۔سی سے کام کیا کراتا ہے؟ چنانچہ اومرشو نے اپنے بلاگ پر ساتھی کمپیوٹر ماہرین سے درخواست کی کہ کیا وہ اس ضمن میں کچھ بتا سکتے ہیں۔

انھوں نے ویب سائٹ پر یہ خبر چلائی تو ایک ہفتے بعد اچانک ایران سے آلودہ کمپیوٹروں نے کمپنی کے ''سنک ہول'' سے تعلق ختم کر دیا۔ گویا ایرانی حکومت نے کوئی ایسا تکنیکی راستہ تلاش کر لیا تھا کہ کمپیوٹروں میں موجود وائرس کمپنی کے سرور سے رابطہ نہ کر سکے۔ یہ امر بھی عیاں تھا کہ ایرانی حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ دوسروں کو پتا چلے، وہاں کس قسم کے کمپیوٹر خراب ہوئے ہیں۔

اومرشو اور شین کو اُمید تھی کہ ان کی درخواست کے جواب جلد موصول ہوں گے۔ کیونکہ جب کوئی نیا وائرس آئے تو پوری دنیا کے کمپیوٹر ماہرین اس کا جائزہ لے کر کوشش کرتے ہیں کہ اپنی تحقیق پہلے شائع کر دیں لیکن کسی محقق نے جواب نہیں دیا حالانکہ سٹکس نیٹ اپنی نوعیت کا پہلا اور انکلوتا خطرناک وائرس تھا۔

## جرمن ماہر کا تجسس

لیکن اومرشو اور شین کو علم نہ تھا کہ جرمنی میں ایک ۵۲ رسالہ شخص، رالف لینگر نے بڑی دلچسپی سے سٹکس نیٹ کے متعلق خبر پڑھی ہے۔ لینگر کو ونڈوز سسٹم یا انٹرنیٹ وائرسوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس کے گھر میں نیٹ ہی نہیں لگا تھا۔ دراصل وہ صنعتی کنٹرول نظام (انڈسٹریل کنٹرول سسٹم) کی سیکورٹی کا ماہر خصوصی تھا۔ اس کی کمپنی بھی یہی کام کرتی تھی جس میں تین شخص ملازم تھے۔

چنانچہ لینگر نے خبر تجسس نے پڑھی کہ سٹکس نیٹ پی۔ایل۔سی پر دھاوا بول کر اس پہ قابض ہو جاتا ہے۔ تب اُسے خیال آیا کہ سائمنز کنٹرولر استعمال کرنے والے ہزارہا گاہکوں کے کمپیوٹری نظام میں وائرس موجود ہے لیکن حیرت انگیز طور پر وہ جرمن کمپنی خاموش تھی۔ سائمنز نے بس یہ اعلان کیا کہ اس نے سٹکس نیٹ کا جائزہ لینے کے لیے ماہرین بٹھا دیئے لیکن انھوں نے کیا تحقیق کی، اس کے متعلق کسی کو خبر نہ تھی۔

یہ حقیقت مدنظر رکھ کر لینگر نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ خود معلوم کرے گا کہ وائرس پی۔ایل۔سی میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھس کر کیا گل کھلاتا ہے۔ لینگر کمپیوٹر کے متعلق عام لوگوں جتنی ہی معلومات رکھتا تھا لیکن وہ اور اس کے کارکن سائمنز کی مصنوعات کے متعلق اتنی وسیع معلومات رکھتے تھے کہ کمپنی اپنے ملازمین کو انھی کے زیرِ سایہ اپنی ہی مشینیں اور آلات چلانے کی تربیت دلوا رہی تھی۔

اب تینوں آدمی اپنے چھوٹے سے دفتر میں بیٹھے سٹکس نیٹ کا بغور معاینہ کرنے لگے۔ انھوں نے خاص طور پر وائرس کی کنفیگریشن پر غور کیا اور دیکھا کہ وہ کس آلے کو نشانہ بناتا ہے۔ تین ہفتے تحقیق کرنے کے بعد انکشاف ہوا کہ سٹکس نیٹ محض سائمنز کے مخصوص کنٹرولر ہی کو نشانہ نہیں بناتا بلکہ وہ ٹھیک ٹھاک طریقے سے نشانے والا (Precision) ایسا بم ہے جو ایک خاص شے کی کھوج لگاتا ہے۔

وائرس کے کوڈ میں وہ خاص شے تلاش کرنے کی خاطر تمام تکنیکی تفصیل موجود تھی۔ جب وہ کنٹرولر کو اس خاص شے سے وابستہ نہ پاتا، تو خود کو بے اثر بنا دیتا یا سو جاتا۔ اب لینگر کو بھی یہ احساس ہوا کہ یہ وائرس بے پناہ وسائل رکھنے والی کسی حکومت نے تیار کیا ہے جو اپنے ٹارگٹ کو خوب جانتی تھی۔

لینگر بتاتا ہے: ''میرا خیال تھا کہ سائمنز پی۔ایل۔سی کو نئی قسم کا وائرس نشانہ بنا رہا ہے لیکن سٹکس نیٹ نے تو ہمارا دماغ گھما کر رکھ دیا۔ ہمیں یقین ہی نہیں آیا کہ چار زیرو ڈے اور دو چوری شدہ سرٹیفکیٹوں کے ذریعے ایسا خصوصی وائرس بنایا گیا جس نے صرف ایک خاص شے کو تباہ کرنا ہے۔''

گو وہ وائرس کا نشانہ نہیں جان سکے، تاہم لینگر کو یقین تھا کہ اس کا ٹارگٹ بوشہر ہے جہاں ایرانی ایٹمی بجلی گھر واقع تھا۔ اس بجلی گھر نے اگست ۲۰۱۰ء میں کام شروع کر دینا تھا لیکن نا معلوم وجوہ کی بنا پر اسے روک دیا گیا۔ جب لینگر نے اپنے شک کا اظہار ساتھیوں سے کیا تو وہ دم بخود رہ گئے۔ تاہم وہ اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ یہ انتہائی خطرناک وائرس اسرائیل اور امریکہ نے بنایا ہے اور شاید جرمنی بھی اس ٹارگٹ جنگ میں شریک تھا۔

لینگر نے پھر اپنے ایک دوست سے رابطہ کیا جو اسی کمپنی میں ملازم تھا جو یورینیم افزودہ کرنے والے آلات بناتی تھی۔ لینگر نے اس سے پوچھا: ''کیا یہ ممکن ہے کہ کنٹرولر کوڈ میں تبدیلی کر کے سینٹری فیوج تباہ کر دی جائے؟''

دوست نے بتایا: ''لینگر! یہ خفیہ معلومات ہے میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔''

## نطنز ٹارگٹ تھا

لیکن لینگر کو یقین تھا کہ وہ درست راہ پر گامزن ہے

### امریکہ نے کیسے مدد کی؟

ماہرین کمپیوٹر کے مطابق امریکیوں نے دو اعتبار سے اسرائیلیوں کو بھرپور مدد دی تاکہ وہ سٹکس نیٹ جیسا ''تاریخ ساز'' وائرس تخلیق کر سکیں۔ اول انھوں نے سائمنز کے تیار کردہ سٹیپ ۷ کی مکمل معلومات فراہم کیں۔ امریکہ نے ریاست اوہیو میں باقاعدہ ایک تحقیقی مرکز قائم کر رکھا ہے جہاں ایران میں استعمال ہونے والی سائمنز کنٹرول ٹیکنالوجی پر تحقیق ہوتی ہے۔ چنانچہ سٹکس نیٹ پر ابتدائی کام وہیں ہوا۔

اس کے بعد امریکہ ہی نے پی۔ا سینٹری فیوج کا ایک نمونہ اسرائیلیوں کے حوالے کیا۔ امریکیوں نے یہ نمونہ لیبیا سے تب پایا تھا جب قذافی نے اپنا ایٹمی منصوبہ بند کر دیا تھا۔ اسرائیلی پھر اپنے ڈیمونا ایٹمی مرکز میں اس سینٹری فیوج پر وائرس بنانے کے سلسلے میں تجربات کرتے رہے اور سٹکس نیٹ تخلیق کر لیا۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کی دوستی بڑی گہری ہے اور وہ کسی بھی اسلامی ملک کو مل کر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔



چنانچہ اس نے ۱۶ ستمبر کو اپنے بلاگ میں اعلان کر دیا کہ سٹکس نیٹ کا نشانہ بوشہر ایٹمی بجلی گھر تھا۔ اس نے جرمن اور بین الاقوامی میڈیا کو پریس ریلیزیں بھی جاری کیں۔ لینگر بتاتا ہے: ''میرے اعلان پر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ سب یہی سوچنے لگے کہ لینگر پاگل ہو گیا۔ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ احمق ہے، اب اس نے ثبوت بھی فراہم کر دیا۔''

لیکن جرمنی میں ایک شخص تھا جس نے لینگر کے دعویٰ پر اعتبار کیا۔ فرینک راجر جرمن سیکورٹی فرم، جی۔ایس۔ایم۔کے (G.S.M.K) میں چیف ٹیکنالوجی افسر تھا۔ مگر فرینک کا کہنا تھا کہ وائرس نے بوشہر نہیں نطنز کو ٹارگٹ بنانا تھا جہاں ایرانی یورینیم افزودہ کر رہے ہیں۔ اگر وہ اپنے منصوبے میں کامیاب رہے تو ان کے لیے ایٹم بم بنانا مشکل نہیں رہے گا۔

راجر نے اپنے بلاگ میں یہ اشارہ بھی کیا کہ سٹکس نیٹ جولائی ۲۰۰۹ء میں سامنے آیا تھا۔ اسی ماہ خفیہ راز افشا کرنے والی ویب سائٹ، وکی لیکس نے باخبر ذرائع کے حوالے سے ایک انوکھا انکشاف کیا 'نطنز پلانٹ میں ایک سنگین حادثہ ہوا ہے۔ وکی لیکس نے یہ بھی بتایا کہ حادثے کے بعد ایران کی ایٹمی توانائی تنظیم کے سربراہ نے استعفا دے دیا ہے۔''

لینگر نے پھر اپنی کمپنی کی ویب سائٹ کے ذریعے عام و خاص کو آسان فہم تکنیکی زبان میں بتایا کہ سٹکس نیٹ کیونکر پی۔ایل۔سی کو جانے والے احکامات دبوچتا، انھیں ضائع کرتا اور پھر اپنے احکام بجھواتا ہے۔ نیز وہ ہدایات بھی دیں جن پر چل کر منتظم (ایڈمنسٹریٹر) اپنی مشینوں کو وائرس سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

سٹکس نیٹ کے متعلق رفتہ رفتہ جو نئے انکشافات ہوئے، لینگر انھیں بھی اپنی ویب سائٹ میں دیتا رہا۔ جلد ہی دنیا بھر کے کمپیوٹر سائنس دان اور عام لوگ بھی اس ویب سائٹ کا دورہ کرنے لگے۔ حتیٰ کہ امریکی سرکاری اداروں کے افسروں نے بھی سائٹ کا وزٹ کیا۔ گو لینگر نے اہم صنعتی و سرکاری تنصیبات کو وائرس سے بچا کر زبردست انسانی خدمت انجام دی تھی لیکن اُسے علم نہ تھا کہ یوں اس نے ایک نہایت خفیہ مشن بھی تباہ کر دیا۔

## فضا میں چلتی گولیاں

اُدھر سیمنٹکس میں شین اور اس کے ساتھی پروگرامیبل لوجک کنٹرولر چلانے کی فوری تربیت پا رہے تھے۔ دراصل انھیں یہ تو علم تھا کہ وائرس کنٹرولر کو نشانہ بناتا ہے، لیکن کس لیے؟ وہ یہی راز جاننا چاہتے تھے۔ محققوں نے ایس۔ٹی۔ایل (S.T.L) کے بارے میں کتابیں بھی خریدیں۔ اسی کمپیوٹر زبان کے ذریعے سٹکس نیٹ پی۔ایل۔سی سے تبادلہ خیال کرتا تھا۔

اس وقت کمپنی میں تین محقق شین اور اومرشوکیلی فورنیا میں جبکہ پیرس میں فلیری خصوصی طور پر سٹکس نیٹ کی چھان بین میں جتے ہوئے تھے۔ انھیں کام کرتے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا، لیکن وہ وائرس کا ایک حصہ ہی افشا کر پائے۔ آج شین یاد کرتے ہوئے بتاتا ہے: ''ہمیں لگتا تھا کہ وائرس کی حقیقت کا کھوج لگاتے لگاتے برسوں بیت جائیں گے۔''

جب دنیائے انٹرنیٹ میں وائرسوں کا جنم ہوا، تو وہ آغاز میں بڑے سادہ تھے۔ پھر ''سائبر ورلڈ'' تجارت و صنعت کی منبع بنی تو ہیکر زیادہ پیچیدہ وائرس بنانے لگے تاکہ لوگوں کے کمپیوٹروں میں گھس کر کریڈٹ کارڈ ڈیٹا، آن لائن بنکاری کی معلومات اور کمپنیوں کے راز چرا سکیں۔ پھر ایسے وائرس سامنے آئے جو کسی کمپیوٹر یا نیٹ ورک میں گھس کر کئی ماہ یا برسوں چھپے بیٹھے رہتے۔ عموماً ایسے وائرس حکومتیں تیار کرتی ہیں تاکہ دشمنوں کے کمپیوٹروں سے قومی راز، خفیہ کوڈ اور دیگر حساس مواد حاصل کر سکیں۔

لیکن سٹکس نیٹ ان سب سے مختلف تھا۔ وہ وائرسوں کی دنیا میں ترقی یافتہ نہیں انقلابی حیثیت رکھتا تھا۔ محققوں کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ کوئی ایسا پیچیدہ وائرس تخلیق کر ڈالے گا جو کسی وحشی کی طرح ٹارگٹ کی تلاش میں نیٹ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ورکس کے اندر مارا مارا پھرے گا۔ اومرشو کہتا ہے: ’’مجھے یقین ہے کہ اگر میں مزید بیس برس ایسی انڈسٹری میں کام کروں، تب بھی ایسا وائرس نہیں دیکھ پاؤں گا۔‘‘

ستمبر کے آخر تک ماہرین نے آخر کار سٹکس نیٹ کے نشانے کا خاکہ تیار کر لیا۔ فلیری ریورس انجینیرنگ کے ذریعے وہ کوڈ جان گیا جو وائرس پی۔ ایل۔ سی میں داخل کرتا تھا۔ یہ انکشاف ہوا کہ وہ آلے سے جڑی کسی شے کی قدر تبدیل کر ڈالتا ہے۔ لیکن ماہرین یہ نہیں جان سکے کہ وہ شے کیا ہے اور قدر بدلنے سے کیا عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی تھا کہ وہ آسمان پر چلتی گولیاں تو دیکھ رہے تھے مگر انھیں یہ علم نہ تھا کہ وہ کسے لگ رہی ہیں۔

ماہرین کو یہ بھی پتا لگا کہ سٹکس نیٹ جس خاص کمپیوٹری نظام کو نشانہ بناتا ہے وہ پروفیبس نیٹ ورک کارڈ استعمال کرتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ٹارگٹ شدہ پی۔ ایل۔ سی پر حملہ کرنے سے پیشتر وائرس ایک خاص قدر......2C.CB00.01 تلاش کرتا ہے۔

شین کو شک تھا کہ یہ نمبر کسی قسم کی آئی۔ ڈی (شناختی نشان) ہے جو سٹیپ ۷ میں کسی خاص ہارڈ ویئر سے متعلق ہے۔ چنانچہ ماہرین نے اپنی لیبارٹری میں سٹیپ ۷ پر مبنی پی۔ ایل۔ سی چلایا اور پھر ایک ایک کر کے مختلف ہارڈ ویئر اس سے جوڑنے لگے۔ جب اس نظام کے ساتھ پروفیبس نیٹ ورک کارڈ لگا تو مانیٹر پر یہ نمبر نمودار ہو گیا۔

لیکن سٹکس نیٹ دو اور نمبر......۹۵۰۰۴ اور ۷۰۵۰۴ بھی کھوجتا تھا اور محقق ان کے متعلق نہیں جان پائے کہ یہ کیا بلا ہیں۔ جب انھوں نے اپنے نظام سے سارے ہارڈ ویئر حصے لگائے، کوئی بھی نمبر سامنے نہیں آیا۔ انھوں نے پھر گوگل میں انھیں سرچ کیا تب بھی نتیجہ ڈھاک کے پات نکلا۔ وہ چکرائے ہوئے تھے کہ نومبر ۲۰۱۰ء میں آخر اندھیرے میں روشنی نظر آ گئی۔

اومرشو نے دراصل اپنے بلاگ میں یہ اپیل کی تھی کہ جو کمپیوٹر پروفیبس نیٹ ورک کارڈ اور اس کے ہارڈ ویئر کے متعلق معلومات رکھتا ہے، وہ اس سے رابطہ کرے۔ تبھی ایک ولندیزی پروگرامر اوب ہولیسوس نے اومرشو سے رابطہ کر کے اُسے پروفیبس کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچائیں۔ بیشتر مواد محققین کا دیکھا بھالا تھا لیکن ایک جملے پر ان کی ساری توجہ مرکوز ہو گئی۔ لکھا تھا: ’’پروفیبس کا ہر حصہ اپنا مخصوص شناختی نمبر رکھتا ہے جو عموماً پانچ عدد پر مشتمل ہوتا ہے۔‘‘

یہی جملہ پڑھ کر شین نے کہا: ’’اوہو! وہ دو جادوئی نمبر یقیناً پروفیبس کے کسی حصے کے آئی۔ ڈی ہیں۔‘‘ اب اس نے اومرشو کے ساتھ انٹرنیٹ میں پروفیبس سے متعلق دستاویزات تلاش کیں۔ کافی کھوج کے بعد انھیں ایسی پی۔ ڈی۔ ایف فائل ملی جس میں پروفیبس نیٹ ورک کارڈوں کے ساتھ نصب ہونے والے تمام آلات کی فہرست موجود تھی۔ فہرست کے آخر میں انھیں مطلوبہ نمبر مل گئے۔

یہ دو اقسام کے فریکوئنسی کنورٹروں کے مصنوعہ آئی۔ ڈی تھے جن میں ایک فن لینڈ اور دوسرا ایران میں بنتا تھا۔ پہلا نمبر ۹۵۰۰۴ واکون این ایکس کنورٹروں سے متعلق تھا جو فن لینڈ میں واکون کمپنی بناتی تھی۔ دوسرا نمبر ۷۰۵۰۴ ایک نامعلوم فریکوئنسی کنورٹر کا تھا جو ایران میں فرارو پیا نامی کمپنی تیار کرتی تھی۔

فریکوئنسی کنورٹر مختلف مشینوں میں موٹروں اور روٹروں کی رفتار بڑھانے یا گھٹانے میں کام آتے ہیں۔ مثلاً فیکٹریوں میں نصب ہائی سپیڈ ڈرل مشینوں میں جو دھاتیں کاٹتی ہیں۔ جب کنورٹر کے ذریعے ڈرائیو کی فریکوئنسی بڑھائی جائے تو روٹر زیادہ تیزی سے گھومنے لگتا ہے۔

ماہرین نے پروفیبس کی جو دستاویزات نیٹ سے ڈھونڈی تھی، اسی میں کنٹرول فریکوئنسیوں کو دی جانے والی کمانڈیں (احکامات) بھی درج تھیں۔ بالکل ایسی ہی کمانڈیں سٹکس نیٹ میں بھی لکھی ہوئی تھیں۔ شین بتاتا ہے ’’ہم نے سٹکس نیٹ کے اندر ایس۔ ٹی۔ ایل کوڈ میں یہ لکھا دیکھا، ورڈ ۴۷ ایف اور ا۔‘‘ جب ہم نے فریکوئنسی کنورٹر کے ہدایات نامہ کا مطالعہ کیا تو اس میں درج تھا ’’فریکوئنسی کنورٹر شروع کے لیے ورڈ ۴۷ ایف لکھئے اور اس کی قدر ا


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر سیٹ کر دیں۔‘‘ ہم یہ دیکھ کر گنگ رہ گئے۔

## سینٹری فیوج کی تباہی

اب نئی معلومات سے لیس ہو کر ماہرین نے مزید پیش رفت کی اور پتا چلایا کہ سٹکس نیٹ ایسی شے کو نشانہ بناتا ہے جو ۳۳ یا زیادہ فریکوئنسی کنورٹر استعمال کرتی ہے۔ نیز یہ تمام کنورٹر ۸۰۷ ہرٹز سے ۱۲۱۰ ہرٹز کی فریکوئنسی کے مابین کام کرتے ہیں۔

مزید تجربات سے انکشاف ہوا کہ جب وائرس ٹارگٹ میں داخل ہو جاتا تو تقریباً دو ہفتے تک کمپیوٹر میں خاموشی سے چھپا جاسوسی اور جانچ پڑتال کرتا رہتا۔ وہ پھر بڑے خاموش انداز میں لیکن پھرتی سے پہلا حملہ کرتا اور کنورٹروں کی فریکوئنسی پندرہ منٹ تک ۱۴۱۰ ہرٹز تک پہنچا دیتا۔ جب ۱۵ منٹ گزرتے تو کنورٹر دوبارہ معمول کی ۱۰۶۴ ہرٹز فریکوئنسی پر چلنے لگتا۔ یہ فریکوئنسی اگلے تین ہفتوں تک یہی رہتی، پھر سٹکس نیٹ دوبارہ جاگ اٹھتا۔ اس بار وہ پچاس منٹ کے لئے کنورٹروں کی فریکوئنسی صرف ۲ ہرٹز کر دیتا۔

اس کے بعد کنورٹر معمول کی رفتار سے گھومتے رہتے، یہاں تک کہ وائرس پھر ان پر حملہ آور ہوتا۔ وہ دوبارہ اسی چکر سے کنورٹر چلاتا۔ فریکوئنسی کی انتہائی حدود ظاہر کرتی تھیں کہ ان سے جو شے منسلک تھی، سٹکس نیٹ اس کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہے۔ نطنز کے ایٹمی پلانٹ میں وائرس نے یہی خفیہ حرکت کر دکھائی۔ چنانچہ جب سینٹری فیوج مشینیں غیر معمولی رفتار سے گھومی، تو ان میں نصب آلات ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ اسی ٹکراؤ نے یہ مشینیں تباہ کر دیں۔

شین نے جب گوگل پر تحقیق کی تو انکشاف ہوا کہ جو فریکوئنسی کنورٹر ۶۰۰ ہرٹز سے بلند فریکوئنسی پر چلتے ہیں، امریکہ میں ان کی برآمد کا انتظام امریکی ایٹمی کمیشن نے سنبھال رکھا ہے۔ شین بتاتا ہے: ’’تب ہمیں احساس ہوا

## گھاس کے فوائد

استاد (شاگرد سے) ’’گھاس کھانے کو جملے میں استعمال کرو۔‘‘

شاگرد ’’جناب! گھاس کھانے سے کبھی آنکھیں خراب نہیں ہوتیں۔‘‘

استاد: ’’وہ کیسے؟‘‘

شاگرد (معصومیت سے) ’’میں نے کبھی گھوڑوں کو چشمہ لگائے ہوئے نہیں دیکھا۔‘‘

(عبدالمقیت، لیہ)

کہ ارے یہ آلات تو یورینیم کی افزودگی کرنے میں کام آتے ہیں۔‘‘ تب تک لینگنر دنیا والوں پر عیاں کر چکا تھا کہ سٹکس نیٹ ایٹمی پلانٹ میں سینٹری فیوجوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ اب سیمنٹکس کے ماہرین کو ٹھوس ثبوت بھی مل گیا۔

## ایک خفیہ کھیل

لیکن اب تک اومرشو اور شین کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ بہت اونچے پیمانے میں کوئی نہایت خفیہ سیاسی و عسکری کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان کے دل و دماغ پر خدشات بھی چھانے لگے۔ ان کی سوچ یہ تھی: ’’کیا ہمیں بھی اس کھیل کا حصہ بن جانا چاہیے؟‘‘

پھر جب سٹکس نیٹ کی اصلیت کھل کر سامنے آئی تو یہ اہم سوال سامنے آیا کہ وہ اُسے گمنام بن کر جاری کریں یا اپنے پاس دبا کر رکھ لیں؟ بحث مباحثے کے بعد فیصلہ ہوا کہ پوری تحقیق افشا کر دی جائے۔ دلیل یہ تھی کہ یوں لوگوں کو موقع مل جائے گا کہ وہ اپنی قیمتی اشیا کو سٹکس نیٹ اور بعد ازاں آنے والی نقول سے محفوظ رکھ سکیں۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سیمنٹکس کمپنی کے کسی ڈائریکٹر نے یہ سعی نہیں کی کہ وائرس پر ماہرین کی تحقیق روکیں یا اس پر اثرانداز ہوں۔ انھوں نے یہ بھی فیصلہ کیا

کہ ساری تحقیق ظاہر کر دی جائے۔ کمپنی کا متفقہ فیصلہ یہ تھا: ''یہ ایک خطرہ ہے جو لوگوں کو نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ چنانچہ اسے روکنا ہمارا فرض ہے۔'' شین کہتا ہے: ''اس فیصلے نے ہماری ہمت بڑھائی اور ہم ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئے۔''

ابھی تک یہ واضح نہیں تھا کہ یہ موذی وائرس کس کی تخلیق ہے تاہم دو اشارے ضرور ملے تھے۔ پہلا اشارہ یہ کہ سکس نیٹ جب کسی کمپیوٹر کو داغدار کرتا تو ونڈوز میں ایک نمبر ''19790509'' کی کھوج لگاتا۔ جب یہ نمبر مل جاتا تب ہی آگے بڑھتا۔ اگر ونڈوز میں یہ نمبر نہ ہوتا، تو اس کمپیوٹر کو نشانہ نہیں بناتا اور مردہ ہو جاتا۔

اس نمبر کی خصوصیت یہودیوں کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے کمپنی کے ایک ملازم نے دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ یہ نمبر 9 مئی 1979ء کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی تاریخ کو تہران میں جیب نامی ایک یہودی تاجر کو پھانسی دی گئی تھی۔ بعد ازاں اسی پھانسی کے بعد ایران سے تقریباً تمام یہودی ہجرت کر کے اسرائیل چلے گئے۔

دوسرا اشارہ وائرس کی ایک خاص فائل میں موجود لفظ ''مائرٹس'' (Myrtus) کی طرف ہوا ہے جسے سکس نیٹ کے تخلیق کاروں نے دانستہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے متعلق بھی یہودیوں کی تاریخ کے واقف کار نے بتایا کہ یہ یہودی ملکہ ایتھر کی طرف خفیہ اشارہ ہے جس نے چوتھی صدی قبل مسیح میں فارسی یہودیوں کو قتل عام سے بچایا تھا۔ دراصل ایتھر کا عبرانی نام، یہودہ، مائرٹس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان اشاروں کے سبب محققین کا شک اسرائیل اور امریکہ ہی کی طرف گیا کہ انھوں نے ایرانی ایٹمی تنصیبات پر بمباری کرنے کے لئے یہ خطرناک وائرس تیار کیا ہے تاکہ وہ اپنا کام دکھا سکے۔

اسی دوران امریکہ اور بیرونِ ممالک کی حکومتیں ماہرین کی تحقیق میں دلچسپی لینے لگیں۔ ایک دن ماہرین نے امریکی ایف۔بی۔آئی، محکمہ امور قومی سلامتی اور محکمہ دفاع سے متعلق ماہرین کو سکس نیٹ کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ اگرچہ شین مذاق کرتے ہوئے کہتا ہے: ''مجھے یقین ہے کہ امریکی حکومت سب رازوں سے واقف ہو گی۔''

ماہ نومبر ہی میں اچانک خوف کے سائے ماہرین پر لہرانے لگے۔ اس ماہ موٹر سائیکل سواروں نے تہران کے دو مختلف مقامات پر ایرانی ایٹمی منصوبے سے منسلک دو سائنس دان قتل کر دیئے۔ ایران نے الزام لگایا کہ یہ حملہ اسرائیلی خفیہ ایجنسی، موساد نے کرایا ہے۔

او مرشو، شین وغیرہ کو یقین تھا کہ سکس نیٹ افشا کرنے سے ان کی زندگیاں خطرے میں نہیں پڑیں تاہم وہ چوکنے ضرور ہو گئے۔ او مرشو کو اپنے فون میں عجیب سی کلک کلک کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک دن شین نے اپنے ساتھیوں کو مذاقاً کہا ''اگر کل میں مرا ہوا پایا جاؤں تو دوستو! یقین جانو میں خودکشی بالکل نہیں کرنا چاہتا۔''

اب تک کے انکشافات سے صاف ظاہر تھا کہ وائرس کا نشانہ ایرانی ایٹمی منصوبہ تھا، تاہم صرف بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی ہی کی طرف سے یہ شہادت آئی تھی کہ نطنز میں اوائل 2010ء میں بہت سی سینٹری فیوج مشینیں خراب پائی گئیں۔ ایرانی حکومت نے بس یہ اطلاع دی کہ بوشہر ایٹمی تنصیبات میں کسی نامعلوم وائرس کے باعث چند ملازمین کے ذاتی کمپیوٹر خراب ہو گئے۔

آخر 23 نومبر کو ایران کے ایٹمی توانائی کمیشن کے سربراہ، علی اکبر صالحی نے پہلی بار انکشاف کیا کہ سکس نیٹ کا ٹارگٹ ایرانی ایٹمی منصوبہ ہی تھا۔ انھوں نے ایرانی صحافیوں کو بتایا اور کہا ''ہمارے کارکنوں نے بہت جلد اُسے دبوچ لیا اور وہ مشینوں اور آلات کو نقصان نہیں پہنچا سکا۔''

چھ دن بعد موٹر سائیکل سواروں ہی نے دو مزید ایرانی ایٹمی سائنس دان قتل کر دیئے۔ شاید یوں اسرائیلی ایرانیوں کا مذاق اُڑانا چاہتے تھے کہ وہ اپنی ایٹمی تنصیبات کا دفاع نہیں کر سکے۔ اسی دن آخر ایرانی صدر احمدی نژاد نے اپنی پریس کانفرنس میں اقرار کیا کہ ایران کے دشمنوں نے ایک شیطانی وائرس بنا کر ایران کی کچھ سینٹری فیوج ناکارہ کر دی تھیں لیکن اُسے مزید پھیلنے سے روک دیا گیا۔ یوں سکس نیٹ کا معما آخر حل ہو گیا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk


جارج سیل کے ترجمہ قرآن کو اگلے ڈیڑھ سو برس تک مقبولیت حاصل رہی

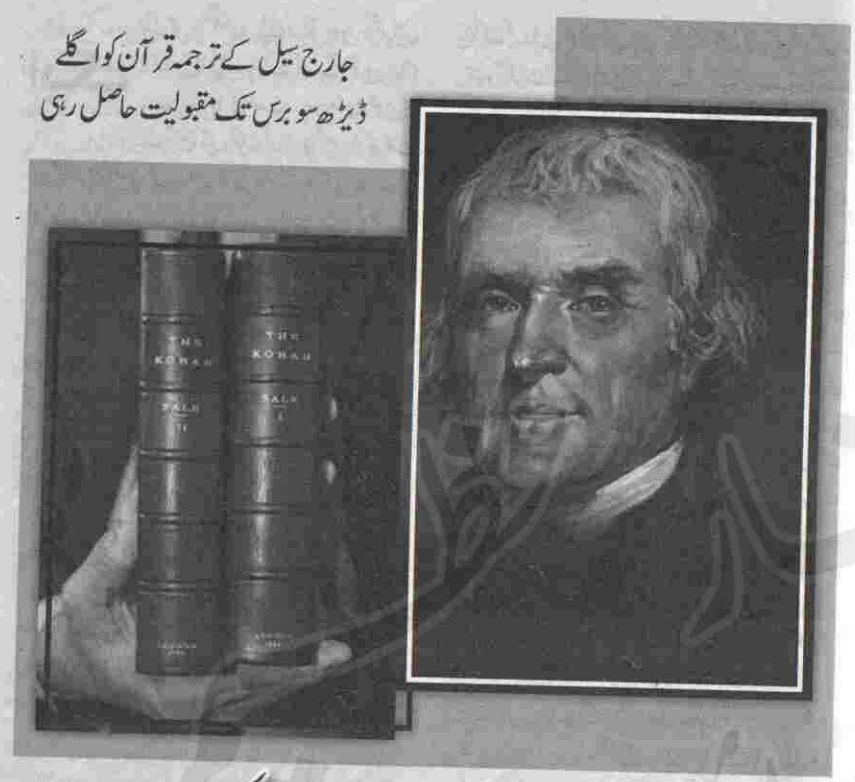

امریکہ کے بانیوں میں شامل امریکی صدر کی فکر و نظر پر عظیم ترین آسمانی کتاب نے کیا انقلابی اثر ڈالا؟

ایک حیرت انگیز انکشاف

امریکی صدر تھامس جیفرسن نے قرآنِ مجید کیوں خریدا

جیفرسن کے نسخہ قرآن پاک کے علاوہ کانگریس لائبریری میں اسلام سے متعلق تقریباً دس لاکھ کتب موجود ہیں

ع۔ محمود

ایک سیاح واشنگٹن پہنچے، تو وہ کانگریس لائبریری کی زیارت کرنے ضرور جاتا ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی لائبریری ہے جس میں ایک کروڑ چالیس لاکھ کتب اور مخطوطے محفوظ ہیں۔ اس وسیع و عریض کتب خانے کی مرکزی عمارت ''جیفرسن بلڈنگ'' کہلاتی ہے۔ نوکلاسیکی اندازِ تعمیر، تانبے کا گنبد اور سنگِ مرمر والے ہال پر مشتمل اس عمارت کا نام تھامس جیفرسن کے نام پر رکھا گیا۔

تھامس جیفرسن معمولی شخصیت نہیں، یہ امریکہ کے بانیوں میں شامل ہیں۔ انھوں نے ہی ۱۷۷۶ء میں سامنے آنے والا مشہورِ عام ''اعلان آزادی'' لکھا تھا اور پھر ۱۸۰۱ء تا ۱۸۰۹ء نوخیز جمہوریہ کے تیسرے صدر رہے۔ آپ کا شمار عظیم ترین امریکی صدور میں ہوتا ہے۔ مزید براں عمارت کے نام سے یہ بھی عیاں ہے کہ وہی لائبریری کے بانی بھی تھے۔

جب جیفرسن صدر بنے، تو انھوں نے ایک قانون جاری کرکے کانگریس لائبریری کو سرکاری سرپرستی میں لے لیا۔ ۱۸۱۴ء میں جب امریکہ اور برطانیہ کے مابین جنگ ہوئی، تو برطانوی فوجیوں نے لائبریری کی عمارت جلا کر خاک کر دی۔ یوں تین ہزار قیمتی کتابیں بھی مٹی ہوئیں۔ تب جیفرسن نے لائبریری کو اپنے کتب خانے میں سے تقریباً ۶۵۰۰ کتب واجبی قیمت پر فروخت کر دیں، تاکہ وہ نئے سرے سے اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے۔

امریکہ کے لیجنڈری صدر کی فروخت شدہ کتب میں دو جلدوں پر مشتمل قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ بھی شامل تھا..... وہ عظیم ترین آفاقی کتاب جسے اربوں مسلمان دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس موقع پر قدرتاً ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ تھامس جیفرسن نے یہ کلام پاک کیوں خریدا، اُسے کیونکر استعمال کیا اور پھر یہ کیوں ضروری سمجھا کہ اُسے قوم کی نئی نویلی لائبریری کا حصہ بن جانا چاہیے؟

دورِ جدید کے بعض امریکی تاریخ دانوں کا دعویٰ ہے کہ جیفرسن نے یہ کتاب ۱۷۸۰ء میں خریدی۔ تب وہ امریکہ اور بربری ممالک (مراکش، الجزائر، تیونس اور لیبیا) کے مابین تنازع حل کرنا چاہتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ جیفرسن نے امریکہ کے پہلے وزیرِ خارجہ کی حیثیت سے اس تنازع سے قریبی تعلق رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۷۸۶ء میں انھوں نے مراکش سے معاہدہ دوستی کیا۔ یہ امریکہ کا کسی دوسرے ملک کے ساتھ پہلا معاہدہ تھا۔

امریکی وزیرِ خارجہ نے مراکش کو تو دوست بنا لیا لیکن وہ الجزائر سے مفاہمت نہیں کر سکے۔ الجزائر کا مطالبہ تھا کہ پہلے امریکہ معین رقم فراہم کرے، پھر وہ بحرِ اوقیانوس میں گشت کرتے قذاقوں پر زور ڈالے گا کہ وہ امریکی بحری جہازوں پہ حملے نہ کریں۔ لیکن جیفرسن نے یہ رقم (یا بھتہ) دینے سے انکار کر دیا۔ امریکی مؤرخین لکھتے ہیں کہ تب ہی وزیرِ خارجہ نے قرآن پاک خریدا تاکہ وہ دشمن کو جان سکیں اور اس کی چالیں سمجھ لیں۔

لیکن جب یہ انکشاف ہوتا ہے کہ قرآن پاک جیفرسن کے کتب خانے میں ان کی اپنی سوچ کے مطابق کس جگہ موجود تھا اور پھر ہم انگریزی میں ترجمہ کردہ قرآن کے مندرجات پڑھتے ہیں تو ایک مختلف داستان عیاں ہوتی ہے۔

تھامس جیفرسن کا تعلق ایک امیر خاندان سے تھا۔ چنانچہ نوجوانی میں انھیں کتابیں جمع کرنے کا شوق ہوا، تو رقم کی کمی آڑے نہ آئی۔ انھوں نے پھر ہزارہا عظیم کتب خریدیں۔ جیفرسن نے کانگریس لائبریری کو جو تقریباً ساڑھے چھ ہزار کتابیں فروخت کیں، وہ کلاسیکی فلسفہ سے لے کر کھانا پکانے کے مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق جیفرسن نہ صرف اپنی کتب کی فہرست مرتب کراتے بلکہ ان پر اپنے دستخط..... ٹی۔ جے بھی کرتے تھے۔ انہی دستخطوں کی بنا پر آج بھی کانگریس لائبریری کی لاکھوں کتب میں صدر جیفرسن کی کتابیں صاف پہچانی جاتی ہیں۔ قرآن پاک پر بھی یہی دستخط ثبت ہیں۔

صدر نے کتب خانے کی کتابوں کو ۴۴ مختلف موضوعات میں تقسیم کر رکھا تھا۔ کتب خانے کی فہرستیں بنانے میں دراصل جیفرسن نے مشہور مدبر، فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء۔۱۶۲۶ء) کی پیروی کی تھی۔ جیفرسن کی مانند بیکن نے بھی بحیثیت وکیل عملی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر سیاست کے میدان خارزار میں جا نکلا اور آخر میں فلسفے کا اسیر ہوا۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ جیفرسن کی لائبریری کے انتظام کو ان کے ذہن کا خاکہ (بلیو پرنٹ) سمجھیے۔ جیفرسن نے قرآن پاک کو مذاہب کی شاخ میں رکھا جہاں دیومالا سے متعلق کتابیں اور انجیل کا نسخہ بھی موجود تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جیفرسن نے قرآن شریف سمیت تمام مذہبی کتابوں کو تاریخ یا اخلاقیات کے شعبوں میں نہیں بلکہ ان کی اصل جگہ، اصولِ قانون کے خانے میں رکھا۔

قرآن پاک خریدنے کی داستان جان کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ صدر جیفرسن نے اس عظیم کتاب کو اصولِ قانون کے خانے میں کیوں جگہ دی؟ کچھ عرصہ قبل امریکی دانشور، فرینک ڈیوی ورجینیا گزٹ کی قدیم فائلوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جیفرسن اسی اخبار میں نئی کتابیں خریدنے کے لیے اشتہار دیتے تھے۔ چنانچہ ایک اشتہار سے انکشاف ہوا کہ انھوں نے ۱۷۶۵ء میں قرآن پاک خریدنے کا اشتہار دیا تھا تاکہ کسی کتب فروش کے پاس ہو، تو وہ رابطہ کر لے۔

اس زمانے میں جیفرسن ایک نوجوان طالب علم اور ورجینیا کے کالج آف ولیم اینڈ میری میں وکالت کی تعلیم پا رہے تھے۔ گویا یہ بات سراسر غلط ہے کہ جب بربری ممالک نے امریکی بحری جہازوں کی ناکہ بندی کی، تو جیفرسن اسلام کا مطالعہ کرنے لگے بلکہ انکشاف یہ ہوتا ہے کہ قانون کی تعلیم پاتے ہوئے وہ قرآن پاک میں دلچسپی لینے لگے۔ یہ نتیجہ لائبریری میں قرآن پاک کی جگہ دیکھتے ہوئے بھی موزوں قرار پاتا ہے۔

جیفرسن نے قانونی لحاظ سے قرآن پاک میں دلچسپی ایک خاص وجہ سے لی۔ ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں تقابلی قانون پر بہترین کتاب ''فطرت اور اقوام کا قانون'' (دی لا آف نیچر اینڈ نیشنز) تھی۔ جرمن دانشور، سیموئیل وان پفن دروف (Von Pufendrof) کی تحریر کردہ یہ کتاب پہلی بار ۱۶۷۲ء میں شائع ہوئی۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ زمانہ طالب علمی میں جیفرسن نے سب سے زیادہ اسی کتاب کا مطالعہ کیا۔ چنانچہ ان کی اپنی قانونی تحریروں میں اسی کتاب کا حوالہ سب سے زیادہ ملتا ہے۔

وان پفن دروف نے اپنی کتاب میں جابجا اسلام اور قرآن پاک کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے کی مخصوص روایات کے مطابق جرمن دانشور نے کئی مواقع پر مخالفانہ طرزِ فکر کا مظاہرہ کیا لیکن بعض جگہوں پر پفن دروف نے قرآن پاک کے قانونی فیصلوں کو سراہا ہے۔ مثلاً انسانوں پر قرآن پاک کا یہ زور کہ وہ اخلاقی رویہ درست رکھیں، جنگ کے بجائے امن کو ترجیح دیں اور یہ زیادہ بہتر ہے کہ فریقین لڑائی کے بجائے صلح کر لیں۔ جیفرسن کی مشہور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوانح کا مصنف، کیون ہائیس لکھتا ہے: ”جیفرسن کی تمنا تھی کہ وہ تمام اہم قانونی کتب کا مطالعہ کرلیں۔ اسی لیے ان کی نظر قرآن پاک پر بھی جا ٹکی۔“

قرآن پاک کا بحیثیت قانونی کتاب مطالعہ کرتے ہوئے جیفرسن کو اپنے نئے ترجمے سے مدد ملی جو نہ صرف ابتدائی ترجموں سے تکنیکی طور پر اعلیٰ تھا بلکہ مترجم نے اُسے اسی حساسیت سے کیا تھا جو جیفرسن کے اپنے رویّوں میں جنم لے رہی تھی۔ یہ ترجمہ کلام پاک ”دی قرآن“ کے نام سے معروف ہوا اور برطانوی دانشور، جارج سیل نے کیا تھا۔ یہ ۱۷۳۴ء میں لندن سے طبع ہوا۔ دوسری اشاعت ۱۷۶۴ء میں شائع ہوئی اور اسے جیفرسن نے ہی خریدا۔

جیفرسن کے مانند سیل بھی بنیادی طور پر وکیل تھے لیکن انھیں مشرقی علوم سے ازحد دلچسپی تھی۔ وہ ترجمے کے دیباچے میں رقم طراز ہیں: ”میں نے اپنی انتہائی مصروف پیشہ ورانہ زندگی کے فارغ اوقات میں یہ ترجمہ انجام دیا ہے۔“ اسی دیباچے میں سیل نے وہ مقاصد واضح کیے جن کی بنا پر انھوں نے ترجمے کا بیڑا اٹھایا: ”اگر ہم غیر ملکی اقوام کے مذہبی اور قانونی اداروں کو اہمیت دیتے اور ان کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، تو عربوں کے قانون ساز، محمد ﷺ کے قوانین قابلِ غور ہیں۔ انھوں نے ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی، جو صرف ایک صدی میں دنیا کے اتنے بڑے علاقے میں پھیل گئی کہ اتنا علاقہ رومیوں نے بھی فتح نہیں کیا تھا۔ گویا پفن دروف کی طرح سیل نے بھی بحیثیت ”قانون ساز“ حضور اکرمؐ کی اہمیت واضح کی اور یہ امر نمایاں کیا کہ قرآن پاک مخصوص قانونی روایات کا حامل ہے۔

اگرچہ جارج سیل کے دیباچے میں بھی اسلام کے متعلق اختلافی باتیں ملتی ہیں، جیسا کہ اس زمانے میں یورپی دستور تھا لیکن انھوں نے خواہ مخواہ اختلافات نہیں اُچھالے اور نہ ہی انھیں ہوا دی۔ بلکہ وہ تہذیب و شرافت کے دائرے میں رہے، خصوصاً سیل نے حضور اکرمؐ کی جو تعریف کی، اس کے آپؐ بجا طور پر مستحق تھے۔ سیل نے دیباچے میں شہادت دی ہے:

”آپؐ فطری صلاحیتوں سے مالامال تھے، شخصیت جاذبِ نظر و پُرکشش تھی، بہترین حسِ مزاح کے حامل تھے، دوسروں سے محبت و احترام سے پیش آتے، غریبوں پر شفقت و رحم فرماتے، ہر کسی سے نرمی کا سلوک کرتے، دشمنوں پر رحم فرماتے اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے انتہائی عبادت گزار تھے۔“

نبی کریمؐ کے متعلق جارج سیل کا درج بالا مؤقف ان قدیم مترجموں سے یکسر مختلف تھا جن کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ عیسائیت کو ”سپر پاور“ کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

مشہور فرانسیسی مفکر، والٹیر نے اپنی لغتِ فلاسفہ میں یہ غلط معلومات بہم پہنچائی ہیں کہ سیل نے ۲۵ سال عربوں کے درمیان رہ کر عربی سیکھی۔ بلکہ انھیں لندن کی ایک تنظیم، پروموشن آف کرسچن نالج نے یہ کام سونپا تھا کہ وہ بائیبل کا عربی ترجمہ کریں۔ یہ ترجمہ پھر عیسائی شامیوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ چنانچہ اسی منصوبے کے لیے سیل نے عربی سیکھی۔

درج بالا منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے شام سے بھی عیسائی دانشور آئے۔ سیل بھی ان کے ساتھ چند سال رہے۔ اس دوران وہ عربی بولنے، لکھنے اور پڑھنے میں اتنے طاق ہوگئے کہ انھیں عربی متون کا پروف ریڈر بنادیا گیا۔

عربی سے بخوبی واقف ہونے کے بعد سیل نے پھر مختلف عربی کتب کا مطالعہ کیا۔ قدرتاً قرآن پاک بھی ان کے زیر مطالعہ آیا۔ وہ کلام پاک کی فصاحت و بلاغت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اُسے انگریزی میں ڈھالنے کا فیصلہ کرلیا۔

سیل کے ترجمہ قرآن کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ایک ابتدائی باب میں انگریز داں طبقے کو اسلام سے متعارف کرایا۔

سوال یہ ہے کہ جیفرسن نے اپنے نسخہ کلام پاک سے کیونکر استفادہ کیا؟ اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ انھوں نے اپنے بعض مضامین میں قرآن پاک کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان سے یہ پتا نہیں چلتا کہ کلام الٰہی کے متعلق ان



کے خیالات و نظریات کیسے تھے؟ اگرچہ بعد میں جیفرسن کی سرگرمیوں سے عیاں ہے کہ قرآن پاک نے مذہبی آزادی کے سلسلے میں ان کا نکتہ نظر تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں دو مثالیں درج ہیں۔

۱۷۷۷ء میں اعلانِ آزادی پیش کرنے کے بعد تھامس جیفرسن کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ ریاست ورجینیا کے قوانین میں زمانہ نو آبادی سے متعلق جتنے قانون ہیں، وہ نکال دیئے جائیں۔ جیفرسن نے محض یہ قانون نکال کر نوآبادیاتی طوق سے چھٹکارا نہیں پایا بلکہ انھوں نے ورجینیا اسمبلی میں مذہبی آزادی کے سلسلے میں ایک بل بھی پیش کیا۔ اس کا جوہر یہ تھا کہ ہر امریکی کو یہ آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ وہ اپنی مرضی سے مذہبی عبادت کرے اور یہ کہ ریاست اس کے مذہبی خیالات پہ اثرانداز نہیں ہوگی۔

تھامس جیفرسن نے اپنی آپ بیتی میں ان لمحات کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے جب کسی بھی امریکی ریاستی اسمبلی میں مذہبی آزادی کا پہلا بل پیش کیا گیا۔ جیفرسن لکھتے ہیں: ”میری ازحد کوشش تھی کہ عیسائیوں کے تمام فرقوں کو ہی نہیں، یہودی، غیر یہودی، مسلمان اور ہندو کو بھی مذہبی آزادی مل جائے اور میں اپنی کوششوں میں کامیاب رہا۔“ یہ بل ۱۷۸۶ء میں منظور ہوا اور ورجینیا قوانین کا حصہ بن گیا۔

یہ قرآن پاک اور اسلامی روایات ہی کا اثر ہے کہ جیفرسن مذہبی آزادی کے متوالے بنے، ورنہ اس زمانے میں یورپیوں کی طرح بیشتر امریکی سیاست دان اور ادیب خصوصاً اسلام کے مقابلے میں متعصب تھے۔ اس وقت اسلام کے متعلق غلط فہمیاں اور مغالطے پھیلانے والی کتب کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ امریکی مدبرین کا مغالطہ تھا کہ اسلام اسی آمریت، جبر اور شہنشاہیت کو ترویج دیتا ہے، جس سے انھوں نے حال ہی میں چھٹکارا پایا ہے۔ بطور مثال وہ اسلامی دنیا کو پیش کرتے، حالانکہ انھیں یہ علم نہ تھا کہ وہاں کن حالات و واقعات کی بنا پر آمریت نما صورت حال پیدا ہوئی۔

## موت کا خوف

ایک دن ملا نصیر الدین نے سوچا کہ اخروٹ کھایا جائے، انہوں نے اخروٹ رکھا اور زور سے پتھر مارا، اخروٹ اچھل کر دور چلا گیا۔

ملا نصیر الدین اسے ڈھونڈتے ہوئے کہنے لگے، واہ بھئی ہر چیز موت سے بھاگتی ہے۔

اسلام کے متعلق مخالفانہ خیالات ۱۷۸۸ء میں بھی عیاں ہوئے جب امریکی ریاستوں نے آئین امریکہ منظور کرنے کے سلسلے میں ووٹ دینا تھا۔ تب بھی جیفرسن ہی اسلام مخالفوں سے ٹکرائے اور انھیں اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

تھامس جیفرسن کی خواہش تھی کہ اس شق (اب آرٹیکل چہارم، سیکشن ۳) کو آئین کا حصہ بنایا جائے۔ ”جب ایک امریکی کوئی بھی سرکاری عہدہ سنبھالے گا تو مذہب انتخاب کا معیار نہیں بنے گا۔“ یعنی مذہب کو مدِنظر رکھے بغیر کسی بھی امریکی شہری کو ہر قسم کا سرکاری عہدہ مل سکے گا۔

درج بالا حقائق مدِنظر رکھتے ہوئے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ قرآن شریف کے مطالعہ سے تھامس جیفرسن پر اسلام کی حقانیت آشکار ہوئی اور وہ دیگر امریکیوں کے مانند اس سچے مذہب کے سلسلے میں عناد و تعصب کا شکار نہیں ہوئے۔ اسی لیے انھیں یقین ہوگیا کہ تمام مذہبی گروہوں کی طرح مسلمان بھی اس نئی مملکت میں تمام قانونی حقوق کے حقدار ہیں۔

اس بات کا ثبوت یوں بھی ملتا ہے کہ گو جیفرسن مسلم بربری ریاستوں کے خلاف جنگ کرنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے اس مسئلے کو ہمیشہ سیاسی تناظر میں دیکھا۔ وہ کبھی جنگ کی حمایت میں دلائل دیتے ہوئے مذہب کو درمیان میں نہیں لائے۔ چونکہ وہ قرآن پاک کا مطالعہ کرچکے تھے، لہٰذا وہ اپنے مخالفین کے ذہن پڑھنے میں کامیاب رہے اور انھوں نے یہ درست نتیجہ اخذ کیا کہ مسئلے کی بنیاد معاشی ہے، مذہبی نہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روس زوال پذیر ہوا تو کھیلوں میں بھی پیچھے چلا گیا

# ترقی کرنے والی قومیں کھیلوں میں آگے کیوں ہوتی ہیں؟

کم وقت اور تھوڑی جگہ گھیرنے والے کھیل ترقی میں اہم کیوں ہو چکے ہیں

پروفیسر ارشد جاوید

ایک دور تھا جب روس اور امریکہ اولمپک کھیلوں میں آگے ہوتے تھے اور یہ دونوں ملک بڑی عالمی طاقتیں، یعنی سُپر پاورز تھیں۔ روس زوال پذیر ہوا تو کھیلوں میں بھی پیچھے چلا گیا۔ گزشتہ اولمپک میں چین نے اول اور امریکہ نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ باقی ترقی یافتہ ممالک ان کے بعد آئے۔ اب چونکہ چین معاشی لحاظ سے بہت ترقی کر چکا ہے، اس طرح وہ کھیلوں میں بھی آگے ہے۔

دنیا میں دو طرح کے لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں، ایک وہ جو سگریٹ نہیں پیتے یا کوئی نشہ نہیں کرتے۔ دوسرے جو ورزش کرتے ہیں۔ جب کوئی فرد نشہ سے دور ہو اور ورزش کرتا ہو، وہ جسمانی اور ذہنی طور پر توانا اور صحت مند ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے سیاسی اور مذہبی راہنماؤں اور اہلِ علم کی اکثریت ورزش نہیں کرتی جس کی وجہ سے پچاس کی عمر تک اکثریت کو ایک آدھ بار دل کے دورے کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ورزش نہ کرنے کی وجہ سے ہمارے ہاں اوسط عمر ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

ورزش کا سب سے شاندار طریقہ کھیل ہے، آپ کی پسند کا کھیل۔ کھیل سے نہ صرف ورزش ہوتی ہے بلکہ یہ ذہنی دباؤ اور پریشانی سے نمٹنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ کھیل سے انسان کو تفریح، خوشی اور سکون بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے ترقی یافتہ ممالک میں کھیلوں پر بہت توجہ دی جاتی ہے۔ امریکہ میں حکومت کی طرف سے ہر شہر میں کھیل کے بے شمار میدان بنائے جاتے ہیں۔ یہ میدان رات کو بجلی کی روشنی سے منور ہوتے ہیں۔ شہریوں کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ اپنے پسندیدہ کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ دن رات ورزش کر سکتے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک (جرمنی اور فرانس وغیرہ) میں ایسے کھیل کھیلے جاتے ہیں جن میں تھوڑی جگہ اور کم وقت میں زیادہ لوگ ورزش کر سکیں۔ لہٰذا برطانیہ کے علاوہ کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں کرکٹ نہیں کھیلی جاتی۔ برطانیہ نے یہ کھیل صرف وقت گزارنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ اس کھیل میں ورزش نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ برطانیہ نے وقت گزارتے گزارتے ایک عظیم سلطنت گنوا دی۔ وقت گزارنا دراصل زندگی گنوانے کے مترادف ہے۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کا دنیا میں کھیل کے علاوہ اور کوئی مقام نہیں۔

کرکٹ میں وقت کا زیاں بہت زیادہ ہوتا ہے جب کہ ورزش نہ ہونے کے برابر۔ ہمارے ہاں کرکٹ میچ کے دوران دفتروں میں کام نہیں ہوتا۔ اس طرح ایک میچ کی وجہ سے پاکستان کے کروڑوں گھنٹے ضائع ہو جاتے ہیں۔ جو قوم اتنا قیمتی وقت بے دردی سے ضائع کر دے وہ ترقی کیسے کر سکتی ہے؟ پاکستان کا قومی کھیل ہاکی ہے۔ کبھی ہم ہاکی میں نمبر ایک تھے۔ کرکٹ کی وجہ سے ہاکی ختم ہو چکی۔ پاکستان ایک غریب ملک ہے جہاں جگہ کی قلت ہے لہٰذا یہاں ورزش اور جگہ کے لحاظ سے بہترین کھیل باسکٹ بال ہے۔ جس میں بہت تھوڑی جگہ اور بہت تھوڑے وقت میں زیادہ لوگ ورزش سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ کرکٹ کے ایک سٹیڈیم میں باسکٹ بال کے تقریباً ایک سو گراونڈ بن سکتے ہیں جس میں ایک گھنٹہ میں کم از کم چودہ سو لوگ ورزش کر سکتے ہیں جب کہ کرکٹ میں صرف چار لوگ، دو بیٹس مین، ایک باؤلر اور ایک وکٹ کیپر ورزش کرتے ہیں۔

ایک اخباری اطلاع کے مطابق حکومتِ پنجاب نے صوبے میں کھیلوں کی سرگرمیوں میں اضافے کے لیے چھ منی کرکٹ سٹیڈیم سمیت تمام اضلاع اور تحصیلوں میں اسپورٹس کمپلیکس بنانے کا اعلان کیا ہے۔ اس کے لیے موجودہ سال کھیلوں کے لیے گیارہ سو ملین روپے یعنی ایک ارب روپے سے زیادہ کا بجٹ مختص کیا گیا ہے۔ آئندہ یہ بجٹ بڑھ کر پندرہ سو ملین یعنی ڈیڑھ ارب روپے کا ہو جائے گا۔ پاکستان جیسے غریب ملک میں اتنی بڑی رقم کرکٹ اور ٹینس پر خرچ کرنا ظلم ہو گا۔ بہتر ہے کہ ان سٹیڈیمز میں باسکٹ بال، والی بال اور ہاکی کو ترجیح دی جائے۔ اس طرح تھوڑی جگہ اور تھوڑے وقت میں بے شمار لوگ ورزش سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# چھوٹی سی زندگی بڑی کامیابی

کارر نگ ساز کی بیٹی، منصورہ ڈگری کالج کی طالبہ سارہ عباس نے بورڈ میں اوّل پوزیشن کیسے حاصل کی؟

عمر وسیم پنسوتہ

## انٹرمیڈیٹ

۲۰۱۱ء کا نتیجہ آ چکا تھا۔ اس کو پاتے ہی سارہ عباس کی پریشانی میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ والدین، دوست، احباب، اساتذہ اسے مبارک بادیں پیش کر رہے تھے لیکن وہ دل ہی دل میں پریشان تھی۔ تفکرات میں مبتلا ان لمحات میں سارہ کو انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ لاہور کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ وہ اپنی تعلیمی درسگاہ، منصورہ گرلز کالج کی پرنسپل محمودہ صدیق کے ہمراہ لاہور بورڈ کے دفتر پہنچیں تو اکرم حشمیری (سابق چیئرمین انٹرمیڈیٹ بورڈ لاہور) نے خوشخبری سنائی کہ کمپیوٹر میں نمبر اندراج کرنے کے وقت سارہ کے نمبر کم درج ہوئے تھے۔ اب درستی کے بعد سارہ ۱۱۰۰/۹۵۵ نمبر لے کر لاہور بورڈ ایف۔اے میں پہلی پوزیشن کی حق دار ٹھہری ہے۔

سارہ نے فوراً اپنی امی کو فون کر کے یہ خوشخبری سنائی تو انھوں نے تصدیق چاہی ''تم سچ کہہ رہی ہو؟'' پھر بے اختیار بولیں ''الحمدللہ!'' سونے کا تمغا اور بیس ہزار روپے کا انعام لیے سارہ گھر پہنچی تو اس کی والدہ رو رہی تھیں۔

وہ لمحے یاد کرتے ہوئے سارہ خود بھی آبدیدہ ہو گئی۔ کچھ سکوت کے بعد سارہ بولی: ''امی نے اس وقت مجھے کہا کہ بیٹا یہ دنیا کی کامیابی ہے۔ تم آخرت کی کامیابی کو بھی ضرور سامنے رکھنا۔ اللہ تمھیں دونوں جہانوں میں کامیاب کرے۔''

سارہ عباس کا تعلق نہایت غریب گھرانے سے ہے۔ وہ لاہور کے علاقے ٹھوکر نیاز بیگ کی رہائشی ہیں۔ والد کار رنگ ساز ہیں، والدہ گھر سنبھالتی ہیں۔ دوران ملاقات جب سارہ سے تعلیمی سفر کے متعلق دریافت کیا گیا، تو انھوں نے بتایا: ''میٹرک تک تعلیم میں میری دلچسپی نہیں تھی حالانکہ گھر کا ماحول دینی ہے، نماز چھوڑنے کا تصور بھی نہیں لیکن اس کے باوجود کوئی مقصدِ زندگی نہیں تھا۔ جب منصورہ گرلز کالج میں داخلہ ہوا تو میری اساتذہ

سارہ عباس، محمودہ صدیق (پرنسپل) اور دیگر طالبات ساتھیوں کے ہمراہ

اور اسلامی جمعیت طالبات نے مجھے زندگی کا اصل شعور دیا۔ یوں میرے سامنے مقصدِ حیات واضح ہوا اور پھر میں نے علم کو مشعلِ راہ بنا لیا۔ تعلیم میں معاشی مشکلات کالج کا وظیفہ ملنے سے قدرے کم ہو گئیں اور میرا ہر دن محنت اور لگن سے بھرپور گزرا۔''

مستقبل کے بارے میں بات کرتے ہوئے سارہ نے کہا کہ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے شیخ زاید اسلامک سینٹر میں بی۔ایس اسلامک سٹڈیز میں داخلہ لے لیا ہے اور ان کا مقصدِ زندگی دین کی خدمت ہے۔ سارہ اسلامک سٹڈیز میں پی۔ایچ۔ڈی کر کے دورِ حاضر کی پریشانیوں کا مداوا کرنا چاہتی ہیں۔ اس پر ان سے پوچھا گیا کہ یہ تو لمبا سفر ہے، آپ کو مشکلات کا اندازہ ہے؟

سارہ کا کہنا تھا ''میں اب مشکلات سے نہیں گھبراتی، میری امی نے مجھے اللہ پر اعتماد کرنا سکھا دیا ہے۔ جب ایف۔اے پارٹ ٹو کے امتحان ہو رہے تھے تو ہمارا چھوٹا سا گھر سڑک میں توسیع کی نظر ہو گیا۔ نیا گھر ڈھونڈنا، اس میں منتقل ہونا اور وہاں کی تنگی بھی میرے راستے میں رکاوٹ نہیں بنی۔

اگلا سوال یہ کیا گیا کہ آپ نے اول پوزیشن حاصل کر لی، اب تعلیم پاتے ہوئے کوئی مشکل تو درپیش نہیں ہو گی؟ سارہ نے بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے پاس خصوصی درخواست دینے پر انھیں پہلے دو سمسٹر میں فیس میں خصوصی رعایت ملی ہے، باقی سمسٹروں میں پوری فیس ادا کرنا ہو گی۔ میرے اندازے کے برعکس سارہ نے بتایا ''سرکاری طور پر کہیں سے بھی مزید تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے کسی نے رابطہ نہیں کیا لیکن میرا اللہ پر پختہ اعتماد ہے، وہ میرے مسئلے کا حل ضرور نکالے گا۔'' پھر وہ پورے یقین سے بولیں ''دنیا و آخرت میں کامیابی کے دو اصول ہیں اللہ تعالیٰ سے مضبوط تعلق، والدین و اساتذہ کا دل سے احترام اور بھرپور محنت۔ اس سوچ نے مجھے چھوٹی سی زندگی میں بہت بڑی کامیابی کا تحفہ دیا ہے۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# پاکستان ہے، سب چلتا ہے

پاکستان میں سب چلتا ہے، اسی لیے یہ ملک نہیں چلتا

ایک دُکھ دینے والا جملہ، جس سے بار بار واسطہ پڑتا ہے
قارئین کی بے لاگ رائے
جو سوچنے کی کئی راہیں کھول سکتی ہے۔ یہ دُکھ کبھی تو کم ہوگا......

وہ لوگ جو"سب چلتا ہے" کا نظام مستحکم کریں، نہایت ناعاقبت اندیش، موقع پرست اور خودغرض ہیں۔ وہ انجانے میں یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ جس درخت کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں، اسی کے سائے تلے ان کا کاروبارِ زندگی چل رہا ہے۔ بیشتر پاکستانی وطن سے محبت کے دعویدار تو ہیں مگر عملاً اکثر وقتی فائدے کی خاطر کہیں نا کہیں پاکستان کا استحصال کر جاتے ہیں۔

بہرحال آپ جس حیثیت یا عہدے پر ہیں، عملاً اس جملے "پاکستان ہے سب چلتا ہے!" کو ترک کر دیجیے۔ بارش کا پہلا قطرہ بنیے اور پھر دیکھیے، ایک دن انشاءاللہ ایسا دن بھی آئے گا کہ ہم سب فخر سے کہہ سکیں گے، یہاں زندگی کا پہیہ امانت، دیانت، صداقت اور شرافت سے چلتا ہے۔

ان شاءاللہ ۔

سبق پڑھ پھر لیاقت کا، شجاعت کا صداقت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(زرنگار ذیشان گل، نوکھر قدیم منڈی فاروق آباد، شیخوپورہ)

## مثبت سوچیے

جو لوگ صرف دوسروں کو الزام دیتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے، ایسے جملے ادا کرنا ان کا وتیرہ ہے۔ خود کو ہمیشہ مثبت سوچنے کا عادی بنائیے۔ اگر کچھ بُرا ہو رہا ہے تو تنقید کرنے کے بجائے یہ سوچیے کہ آپ اسے روکنے یا اُسے اچھائی میں بدلنے میں کس طرح اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اُردو ڈائجسٹ شمارہ اکتوبر میں مونس رحمان اور سلیم غوری کے بارے میں پڑھا۔" اگر یہ لوگ یہی کہتے، یہ پاکستان ہے، یہاں سب چلتا ہے، تو کچھ بھی نہ کر پاتے، مگر آج لوگ انھیں دیکھ کر کہتے ہیں کہ پاکستان میں ایسے گوہرِ نایاب بھی ملتے ہیں۔"

(زبیدہ بلال، بیوٹمس آباد کالونی ملتان)





## پہلے خود کو سنواریے

اس دردناک جملے کی ادائیگی روکنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب پہلے خود سنور جائیں۔ ہم اصلاح خود سے شروع کریں کیونکہ مشہور انگریزی کہاوت ہے "جب ایک انڈے کو باہر سے طاقت لگا کر توڑا جائے تو زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اگر اندر سے طاقت لگ کر انڈہ ٹوٹے تو زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔"

ایک مثال یہ بھی ہے کہ اسلام طاقت کے بل پر نہیں پھیلا، بلکہ نیک سیرت صوفیا اور علما دور دراز سے ہندوستان پہنچ کر کافروں کے درمیان رہے۔ ان کی نیک عادات نے کافروں کو متاثر کیا اور یوں اسلام پھیلتا چلا گیا۔ چنانچہ اپنے آپ سے تبدیلی شروع کیجیے، تمام بُری عادات ترک کر دیجیے اور پھر دوسروں کو ترغیب دیں۔ اپنے گھر، محلے، ادارے اور ہر ملنے والے کو مائل کریں کہ وہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا شیوہ بنائیں۔ بقول غالب ؎

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

(آمنہ رحمٰن، لاہور)

## حکمرانوں کا فرق

پاکستان بھی یورپ، امریکہ اور ترقی یافتہ ممالک کی طرح زمین کا ایک ٹکڑا اور ہماری ملکیت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ باہر بسنے والے بیشتر لوگ محنتی، دیانت دار اور انصاف پسند ہیں اور وہ اپنا حکمران بھی اپنے جیسا ہی منتخب کرتے ہیں۔ آج وہ ممالک اسی لیے کامیاب ہیں جبکہ ہم بددیانت راہنماؤں کو منتخب کر لیتے ہیں۔ پھر ظلم، رشوت، ناانصافی اور بددیانتی کا بازار گرم ہو جائے تو بوکھلاہٹ میں صرف یہی کہہ کر اپنی جان چھڑا لیتے ہیں: "یہ پاکستان ہے، یہاں سب چلتا ہے۔"

(عبداللہ رشید، روپڑ کلاں راولپنڈی)

## ہم خود پاکستان ہیں

کھرا کھوٹا سکہ تو ہر ملک میں چلتا ہے، پھر یہ داغ اپنے ملک پر ہی کیوں؟ وجہ صرف یہ ہے کہ ہم اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں اور ہماری صفوں میں اتحاد نہیں۔ ہم اپنی بے حسی اور گناہوں کا بوجھ یہ کہہ کر اس ملک پر ڈال دیتے ہیں: "یہ پاکستان ہے، یہاں سب چلتا ہے۔" حالانکہ ہم خود ہی تو پاکستان ہیں۔ کاش کوئی اس نہج پر سوچے!

(بشریٰ ذیشان۔ چنیوٹ)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## وطن سے محبت کیجیے

یہ تکلیف دہ جملہ سنتے وقت دل پر گھونسا سا پڑتا ہے! پاکستان ایک اسلامی ملک ہے مگر یہیں سب کیوں چلتا ہے؟ دوسرے ملکوں میں کیوں نہیں چلتا؟ کسی دوسرے ملک میں جا کر دیکھیں، ہر کوئی اپنے وطن سے محبت کرتا ہے، ہم پاکستانی ہیں کہ اپنے ہی ملک کے ساتھ زیادتی کر دیتے ہیں۔

(نور صبا یوسف کاشمیری)

## بدعنوانوں کا پسندیدہ قول

مجھے یقین ہے کہ برائیاں اور بدعنوانیاں اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھنے کے باوجود دس فیصد اہلِ پاکستان بھی ایسے نہیں ہوں گے جو یہ الفاظ بولتے ہوں۔ اگر کبھی کہتے بھی ہوں گے تو یقیناً بعد میں ان کا ضمیر انھیں ضرور ملامت کرتا ہوگا۔ ''صدقِ دل'' سے اس قول کو تسلیم کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہاں، مٹھی بھر بدعنوان، سیاسی مداریوں، چمک سے کام نکلوانے والوں اور گناہ یا جرم کو مشغلہ یا فرض سمجھنے والوں کا یہ پسندیدہ قول ہے۔

(پروفیسر محمد ظریف خان۔ کراچی)

## لاکھوں شہیدوں کے قاتل

ہمارے وہ ہم وطن بھائی جنھیں غلام اقوام کی حالتِ زار کا علم نہیں، وہ گاہے بگاہے ایسی باتیں کرتے ہیں کہ پاکستان نہ بنتا تو کتنا اچھا ہوتا، سب قومیں مل جل کر رہتیں۔ برصغیر بر عظیم ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہی لوگ یہ کہیں کہ پاکستان ہے، سب چلتا ہے، تو دراصل وہ اس مٹی سے غداری کرتے ہیں جس نے انھیں عہدے دیئے، عزت دی، آزادی دی۔ وہ اس پاک دھرتی پر جہاں چاہے نماز پڑھ اور اپنے حقوق کے لیے حکومت کا گریبان پکڑ سکتے ہیں۔ ''پاکستان ہے سب چلتا ہے'' کہنے والے اُن لاکھوں شہیدوں کے قاتل ہیں جنھوں نے اپنے خون سے اس دھرتی کو آزادی کی نعمت کے رنگ دیئے۔ وہ اپنے ملک کو معمولی نہ سمجھیں، زندہ قومیں ایسی خرافات سے اجتناب کرتی ہیں۔

(ریاض احمد، ایبٹ آباد)

## پاکستان کا کیا قصور؟

بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا: ''ہم علیحدہ وطن اس لیے نہیں بنانا چاہتے کہ ہمیں زمین کا ٹکڑا درکار ہے بلکہ ہم تو پاکستان کی صورت میں اسلامی اصول آزمانے کے لیے تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

حکمران ہمارے ہی ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں، سرکاری دفاتر میں رشوت بھی ہم ہی دیتے ہیں، ٹیکس چوری اور بجلی و گیس کی چوری میں بھی ہم ہی ملوث ہیں، کرپٹ حکمران ہماری وجہ سے ہی ہم پر مسلط ہیں تو پھر اس میں وطنِ عزیز پاکستان کا کیا قصور ہے؟ اپنے وطن کے بارے میں ہم خود ہی یہ جملہ کہیں یا سنیں کہ ''پاکستان ہے سب چلتا ہے''، تو یہ جملہ وطن کے چہرے پر ایک داغ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ملک پاکستان کو اتنا عظیم بنا دیں کہ ''پاکستان ہے سب چلتا ہے'' کی جگہ یہ جملہ لے لے کہ ''یہ پاکستان ہے، یہاں اسلام چلتا ہے۔''

(محمد معین الدین سیالوی، میانوالی)

## عمل ضروری ہے

یہ سوچ، لہجہ، انداز، رواج اب بھی بدل سکتا ہے۔ ہمیں انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی سوچ کو بدلنا ہوگا۔ تبدیلی تربیت سے آتی ہے اور تربیت علم سے اور علم سے عمل پسندی آتی ہے۔ مثبت سوچ، توانا لہجہ اور مصمم ارادے زندۂ جاوید قوموں کی نشانیاں ہیں۔ صرف باتیں کرنے سے ''ناداری'' ہاتھ آئے گی، عمل کرنا بے حد ضروری ہے ؎

بدلنا ہے تو مئے بدلو، نظامِ مئے کشی بدلو
فقط ساغر و مینا بدل جانے سے کیا ہوگا!

(مجید ارشد، کروڑ ضلع لیہ)

## جملے کے نقصان دہ اثرات

یہ سوچ پھیلنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک میں کسی درجے پر قانون کی حکمرانی نہیں، خواہ وہ نچلی عدالتیں ہوں یا ملک کی اعلیٰ ترین عدالتیں۔ انصاف کا حصول مشکل، صبر آزما اور مہنگا ہے۔ روپے پیسے اور سیاسی جوڑ توڑ سے انصاف کی دھجیاں اُڑائی جاتی اور کمزور اور ناتواں پر انصاف کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں۔ اگر قانون پر عمل درآمد حکومت کی اعلیٰ ترین سطح سے شروع ہو تو معاشرے میں امن و سکون واپس آسکتا ہے۔ پھر بھی کسی اور کے لیے ہو نہ ہو میرے لیے تو یہ انتہائی تکلیف دہ جملہ ہے۔ میں مقدور بھر کوشش بھی کرتا ہوں کہ یہ جملہ استعمال کرنے والا اس کے نقصان دہ اثرات کو سمجھے اور پھر اسے دوبارہ نہ کہے۔

(حاجی ظفر اقبال۔ چکوال)

## جذبہ حب الوطنی کی ضرورت

یہ تکلیف دہ جملہ ہر محبِ وطن پاکستانی کو سننے کو ملتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی ہم اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکے۔ چنانچہ ہر کام صرف ''ڈنگ ٹپاؤ'' اور ''چلو تم اُدھر کو، ہوا ہو جدھر کی'' کے مصداق کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم سچی بات یہ ہے کہ اس طرح کے جملے ہماری بیمار اور مایوس ذہنی کیفیت ظاہر کرتے ہیں۔ ہم خود کوئی کام استحقاق پر نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ صحیح طریقے سے کام کرنے کے لیے خود کو اخلاقی قدروں کا پابند کرنا پڑتا ہے جو ہماری طبع نازک پہ گراں گزرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس صورت حال کا ایک بڑا ذمہ دار الیکٹرونک میڈیا بھی ہے۔ میڈیا کا کام عوام کی کردار سازی ہے جسے وہ صحیح طرح نہیں نبھا رہا۔ وہ بجائے لوگوں میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرنے کے ہر وقت سیاست دانوں کو بدنام کرنے اور منفی خبریں اور مایوس کن تجزیوں کے ذریعے لوگوں میں ملک سے بیزاری، مایوسی اور یہاں تک کہ نفرت پیدا کر رہا ہے۔

(عمار عبدالرحمان۔ گولڈن ٹاؤن، کراچی)

## کرپشن کا خاتمہ

آپ جو سوچ روکنا چاہتے ہیں۔ وہ تبھی ختم ہوگی جب ملک سے کرپشن کا خاتمہ ہو جائے اور جب تک حکمران صالح نہیں ہوں گے، کرپشن ختم نہیں ہو سکتی۔

(ماسٹر محمد اکرم جدون۔ ایبٹ آباد)

## کردار کا غازی بنئے

تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ اگر ایک طرف ہم اس جملے کی مخالفت کرتے ہیں تو دوسری طرف کچھ حد تک یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ نظام ہے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ پاکستان آج دنیا کے ایسے مقام پر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے جہاں بدامنی، افراتفری اور بے سکونی کا دور دورہ ہے، جو آج خونریزی، قتل و غارت، آہ و زاری کا بازار بن چکا ہے، جہاں مارنے والے کو مارنے کی وجہ معلوم نہیں ہے اور نہ مرنے والے کو مارے جانے کی، جہاں موت نہایت سستی اور انسانیت حقوق کی تلاش میں بھٹک رہی ہے، جہاں ہر شخص حقوق و فرائض سے غافل ہے اور حق کی تلاش میں جائز و ناجائز کی حد تک پھلانگ رہا ہے، جہاں انصاف سستے داموں بیچا جا رہا ہے، جہاں گھر سے نکلنے والے کا خیریت سے گھر لوٹ آنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ اس طور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ ''پاکستان ہے سب چلتا ہے۔'' یہ دم بدم بڑھتی ہوئی مایوسیاں اور مستقبل کے بارے میں چبھتے ہوئے اندیشے بے یقینی کی فضا پیدا کر رہے ہیں۔

اگر ہم اس نظام کے خلاف ہیں تو ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو صحیح کرنے کی کوشش کرے کیونکہ یہ نظام بھی ہم لوگوں سے ہی بنا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے ملک کو نقصان برے لوگوں کی برائی نہیں بلکہ اچھے لوگوں کی خاموشی سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ اب ملک کی بقا کی خاطر ہم سب کو آواز بلند کرنا ہوگی، نوجوان نسل کو متحد کرنا ہوگا کیونکہ نوجوان ہی ملک کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ہمیں فرقہ واریت کا خاتمہ کرنا اور اپنی سوچ کو مثبت بنانا ہوگا۔ ہم نے آج تک لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ آخر پاکستان نے ہمیں کیا دیا؟ لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ آخر ہم نے پاکستان کو کیا دیا ہے۔ ہمیں گفتار نہیں بلکہ کردار کا غازی بننا ہوگا۔ یاد رہے کسی برائی کے خلاف آواز بلند کرنے میں جتنی دیر کی جائے، اتنی ہی بڑی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔

(طوبیٰ حسن۔ ڈیرہ اسماعیل خاں)

## پاکستانی ہونے پر فخر

یہ جملہ صرف پاکستان میں زبان زدِ عام ہے۔ سنگاپور، چین، جاپان، مغربی ممالک اور متحدہ عرب امارات کی ریاستوں میں یہ جملہ ادا کرنا ناقابلِ تلافی جرم ہے کہ کوئی اپنے ملک کو برا بھلا کہے یا قانون پر عمل نہ کرے۔

ہمارے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم قابل تقلید مسلمان بن جائیں۔ مسلمان ہونا ہمارے لیے باعثِ فخر ہوگا۔ صحت اور تعلیم کی پالیسی بنانے کے لیے ڈاکٹر عبدالقدیر خاں صاحب کی خدمات فوری طور پر حاصل کی جائیں۔ جب نوجوانوں کو روزگار ملے گا، عوام کو بنیادی سہولتیں میسر کی جائیں گی تو آپ یہ دیکھیں گے کہ آپ کے کانوں میں یہ جملہ ہرگز نہیں پڑے گا۔ ''اجی پاکستان ہے سب چلتا ہے، بلکہ یہ جملہ ہر طرف گونجے گا ''ہمیں پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔''

(آفتاب حسین جعفری۔ اسلام آباد)

## ترقی معکوس کا شکار

ذرا ایک لمحہ آپ ٹھہر کر سوچیں کہ یہ جملہ بولنے والے کی مراد کیا ہے؟ وہ اصل میں کیا کہنا چاہتا ہے کہ یہ ملک ایک اخلاقی و قانونی فری زون ہے اور یہاں مال حرام کمانے، کسی پر ظلم و زیادتی کے پہاڑ توڑنے اور کوئی بھی غیر اخلاقی حرکت کرنے پر کوئی پابندی نہیں اور اس عمل میں کوئی ناگوار رکاوٹ آنے کا امکان بہت کم ہے۔

وطن کے موجودہ حالات کا تجزیہ کریں تو سوچنا پڑے گا کہ ہم اس وقت ترقی معکوس کا شکار ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو پھر جو شخص ''یہاں سب چلتا ہے'' کے ثمرات سے فیض یاب ہونے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اس تک یہ پیغام پہنچانے کی اشد ضرورت ہے کہ جو ناجائز کام بھی وہ کرے گا اس کے چھینٹے اُڑ کر اس کے اپنے دامن کو داغدار ضرور کریں گے۔

(فیاض ہرل۔ لاہور)



## ایک بہت بڑا ظلم

یہ ایسا فقرہ ہے جو محبِ وطن طبقہ کے دلوں اور احساسات پر چھری چلا دیتا ہے۔ لیکن جب کسی محبِ وطن کے ساتھ ناانصافی ہو، تو وہ بیزار اور ناامید ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ''پاکستان ہے سب چلتا ہے۔''

''پاکستان ہے سب چلتا ہے'' دراصل اعتراف ہے کہ یہاں صحیح غلط، حق و باطل، انصاف ناانصافی، سب چلتا ہے۔ یہ ایک غیر مہذب اور غیر منظم قوم کے رویہ کی نشانی ہے۔ اگر بحیثیت پاکستانی، یہاں کی آزادی سے لطف اندوز ہو کر، یہاں کی نعمتیں استعمال کر کے، یہاں پیدا ہو کر، پھل پھول کر بھی یہی جملہ کہیں ''پاکستان ہے سب چلتا ہے''، اس سے بڑا ظلم پاکستان پر اور کوئی نہیں۔

(پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد۔ نکانہ صاحب)

## ایک اور زاویہ نظر

یہ فقرہ پاکستان کی پیشانی پر داغ نہیں بلکہ سرشاری میں ڈوبے الفاظ ہیں۔ آپ ذرا بیرونی ممالک میں قیام پذیر پاکستانی تارکین وطن سے ان الفاظ کا مفہوم پوچھیں۔ جب وہ اپنے وطن واپس آتے ہیں اور ہوائی اڈے سے لے کر گھر پہنچنے تک جگہ جگہ ناروا سلوک کے باوجود بھی، زیادتیاں سہنے کے باوجود بھی آخر میں یہی کہتے ہیں کہ یہ پاکستان ہے سب چلتا ہے۔ اس میں کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ اپنے فلسطینی بھائیوں کے دلوں کو ٹٹولیں۔ اپنے افغان بھائیوں سے پوچھیں، کیا یہ فقرہ وہ اپنے اپنے وطن کے بارے میں بول سکتے ہیں؟ یہ ہمارا اپنا وطن ہے جناب! یہاں سب چلتا ہے اور چلتا رہے گا۔ پاکستان بھی آگے بڑھتا رہے گا۔

(قاسم ذیشان علی۔ چنیوٹ)

یہ کس نے کہہ دیا کہ پاکستان میں سب چلتا ہے۔ یہاں ایک غریب، بھوکا اور تنہا انسان انصاف کے نام پر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ انصاف کی اس ترازو کو توازن پر رکھنے کے لیے کسی بڑے سے بڑے غاصب و جابر و قابض حاکم کو کسی خاطر میں نہیں رکھتا کہ یہ کون ہے؟ اس بات کا ثبوت ہمیں چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار احمد چوہدری کی معطلی، نظر بندی اور پھر بحالی سے لے کر انصاف کے قیام تک سب کے سامنے ہے کہ کون سرخرو ہوا؟ اور یہ خطہ جو کہ اسلام کے نام پر سوچا پھر کوشش کیا گیا اور آخر کار حاصل کیا گیا۔

## بے ضمیری کی علامت

یہ جملہ محبِ وطن پاکستانیوں کے لیے کسی طعنہ سے کم نہیں مگر اپنی کم ظرفی کا یہ عالم ہے کہ اکثریت اسی سوچ سے میلا پیرہن زیب تن کیے ہوئے ہے۔ عزت، شہرت اور روزگار سب اسی کے طفیل پا لینے کے بعد بھی اس طرح کی سوچ بے ضمیری کی علامت نہیں تو اور کیا ہے۔ رشوت لینے اور دینے والا، جرم کرنے، حق تلفی کرنے والا، ناانصافی کرنے والا، وعدہ خلافی، دھوکہ فریب، حرص، ہوس اور لالچ یہ سب ایسی برائیاں ہیں جو مسلمانوں کے لیے ویسے ہی اسلامی تعلیمات کے مطابق منع ہیں اور انہی کی وجہ سے ہمیں یہ سننا پڑتا ہے کہ ''پاکستان ہے سب چلتا ہے۔'' ضرورت اپنے کردار کو الائشوں سے پاک کرنے، خوفِ خدا پیدا کرنے اور اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کی ہے۔

(حافظ عبدالوحید مغل۔ نارنگ منڈی)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

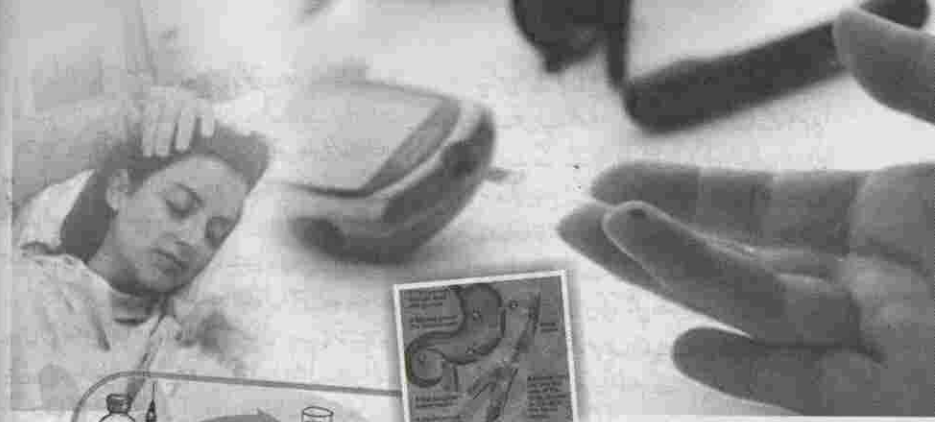

۱۴ر نومبر ذیابیطس کے عالمی دن
کے حوالے سے بطور خاص

## شوگر نارمل ہو تو

# دل کے دورے کا خطرہ نہیں رہتا

شوگر کے شکار قارئین کے لیے
یہ خصوصی راہ نمائی کتنی مشکلوں سے بچا سکتی ہے

کئی مرتبہ احتیاط ہی سب سے بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے

ڈاکٹر جاوید اقبال

**ایک** زمانے میں کہا جاتا تھا کہ اس بیماری سے نسبتاً کم لوگ متاثر ہوتے ہیں لیکن کچھ عرصے سے یہ بیماری انتہائی سرعت سے پھیلی ہے۔ ذیابیطس ایک قدیم مرض ہے۔ ماہرین کے مطابق اس بیماری کے شکار افراد میں دل کی شریانوں کے امراض پیدا ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ ایسے افراد جنھیں پہلے دل کی شریانوں کے امراض لاحق ہوں، انہیں اگر ذیابیطس کا عارضہ لاحق ہو جائے تو ان کا مرض بہت پیچیدگی اختیار کر سکتا ہے۔ ذیابیطس کے سبب خون کے نظام میں بے قاعدگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ تب عموماً حیاتیاتی اور کیمیائی بے قاعدگیاں، شریانوں میں ایتھروما (چربیلے ملغوبے) کے فروغ کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ یاد رکھیں کہ ذیابیطس جسم کے دیگر پٹھوں کی طرح دل کے پٹھوں کو بھی بتدریج ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتا ہے۔

ذیابیطس کیا ہے؟

انسانی جسم میں معدہ سے ذرا نیچے لبلبہ (Pancrea) واقع ہوتا ہے جو انسولین نامی ہارمون پیدا کرتا ہے، انسان جو بھی خوراک کھائے، اس خوراک کا اکثر حصہ خاص طور پر میٹھی اور نشاستہ دار اشیا، مثلاً روٹی یا آلو، وہ شوگر میں تبدیل ہو جاتا ہے، اس شوگر کو گلوکوز کہتے ہیں۔ گلوکوز دورانِ خون کے ذریعے انسانی جسم میں گردش کرتا رہتا ہے۔ کئی افراد میں ذیابیطس کے علاوہ کسی دوسرے عارضے کے سبب ایسی علامات پیدا ہو سکتی ہیں جن سے یہ شبہ ہو کہ ذیابیطس کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔ جیسے حاملہ عورتوں میں حمل کی وجہ سے بھی زیادہ پیشاب کی حاجت ہو سکتی ہے۔

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب گردے خون میں شوگر کی زیادتی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیں تو بھی زیادہ سے زیادہ پیشاب پیدا کر کے شوگر خارج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دورانِ حمل جسمانی ہارمونز کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ ہارمونز خون میں شوگر کی مقدار بڑھا دیتے ہیں جس کی وجہ سے خون میں شوگر کی زیادتی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مرض موروثی ہو۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ اگر ماں کو

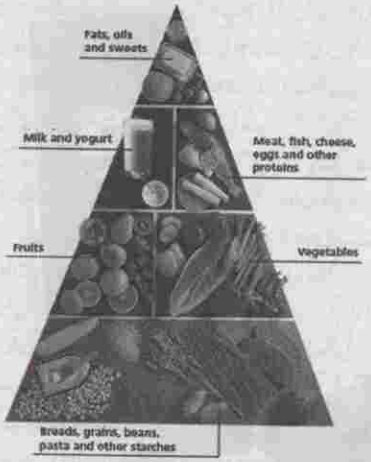


ذیابیطس ہو تو بچے کو بھی لاحق ہونے کا ایک فیصد امکان ہوتا ہے۔ جب کہ باپ کو یہ مرض لاحق ہو تو بچے میں اس کی منتقلی کا امکان چھ فیصد ہوتا ہے۔ انگریزی میں ذیابیطس کا طبی نام Diabetes Mellitus ہے۔ اس کی تین اقسام ہیں:

۱۔ پہلی قسم کی ذیابیطس پیدائشی طور پر بچوں کو لاحق ہوتی ہے، عرفِ عام میں اسے ذیابیطس ٹائپ۔۱ کہتے ہیں۔ اس کا علاج سوائے انسولین کے اور کوئی نہیں۔

۲۔ ذیابیطس کی دوسری قسم عموماً پختہ عمر کے افراد کو لاحق ہوتی ہے۔ اسے ذیابیطس ٹائپ۔۲ بھی کہا جاتا ہے۔

۳۔ ذیابیطس کی تیسری قسم دورانِ حمل خواتین کو وزن کی زیادتی کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے۔

## ذیابیطس کا اچھا کنٹرول

اچھے کنٹرول کے معنی یہ ہیں کہ ذیابیطس میں مبتلا افراد کے خون میں گلوکوز کی مقدار جس حد تک ہو سکے، ان لوگوں کے قریب تر رکھا جائے جو ذیابیطس سے محفوظ ہیں۔ اس کا حصول دن میں کئی مرتبہ گلوکوز کے ٹیسٹ، مناسب غذا کے

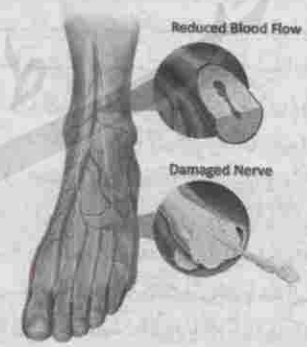




Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Postparandial 1 hr<140 mg/dl
2 hr<120 mg/dl

☆نہار منہ یا کھانے سے فوراً پہلے شکر کا کنٹرول:
☆اچھا کنٹرول۔110 - 80 ملی گرام فیصد
☆قابلِ قبول کنٹرول۔126 - 110 ملی گرام فیصد
☆خراب کنٹرول۔126 ملی گرام فیصد سے زیادہ
☆ناشتے یا کھانے کے 2 گھنٹہ بعد شکر کا کنٹرول:
☆اچھا کنٹرول۔126 - 80 ملی گرام فیصد
☆قابلِ قبول کنٹرول۔ - 126 180 ملی گرام فیصد
☆خراب کنٹرول۔180 ملی گرام فیصد سے زیادہ

## ذیابیطس اور دل کے عوارض

بظاہر ذیابیطس اور دل کے عوارض دو مختلف چیزیں ہیں' لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ذیابیطس میں مبتلا افراد کی اکثریت کئی ایک پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان پیچیدگیوں میں امراض قلب سرفہرست ہیں۔ایک اندازے کے مطابق ذیابیطس میں مبتلا افراد میں سے پچاس فیصد کی اموات کا سبب عارضہ قلب ہی ہوتا ہے۔ ایک شخص میں مختلف وجوہ کے باعث ذیابیطس کا نشانہ بنتا ہے۔اس کے لیے ہائی بلڈ پریشر کے امکانات بھی کیساں ہیں لیکن ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا شخص ذیابیطس میں مبتلا ہو سکتا ہے، خصوصاً اس صُورت میں جب وہ عام لوگوں کی نسبت ذیابیطس میں مبتلا ہونے کے زیادہ خطرات رکھتا ہو۔ اسی طرح ذیابیطس میں مبتلا افراد ذیابیطس کے خراب کنٹرول کے باعث گردوں کی خرابی کی زد میں آجاتے اور اس کے بعد ہائی بلڈ پریشر کے مریض بن جاتے ہیں۔

عالمی اندازے کے مطابق دنیا بھر میں ذیابیطس کے

استعمال، ورزش اور مناسب دوا/انسولین کی صحیح مقدار کے تعین کے ذریعے ممکن ہے۔

ضروری نہیں کہ ذیابیطس کی وجہ سے کوئی مخصوص پیدائشی نقص لاحق ہو لیکن دماغ، ریڑھ کی ہڈی اور دل کے نقائص ہونے کے امکانات ذیابیطس کے خراب کنٹرول کے باعث بڑھ جاتے ہیں۔ پیدائشی نقائص کا خطرہ ذیابیطس کی وجہ سے نہ صرف تین گنا زیادہ ہوتا ہے بلکہ شدت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ذیابیطس کے اچھے کنٹرول کے ذریعے خون میں شکر کی مقدار درج ذیل حدود میں ہونی چاہیے:

ناشتے سے قبل
Preparandial 70-100 mg/dl
ناشتے کے بعد



مریضوں کی تعداد ۲۰۰۰ء میں ۱۵۰ ملین سے زائد تھی۔ یہ تعداد بڑھ کر ۲۰۲۵ء تک ۳۰۰ ملین سے تجاوز کر جائے گی۔ عام افراد میں دل کی شریان کی بیماری ایک فیصد سے ۴ فیصد تک ہوتی ہے۔ ذیابیطس سے متاثرہ افراد میں اس کا تناسب چار گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ دل کے بند ہونے کا امکان، مردوں میں دگنا زیادہ ہو جاتا ہے جبکہ خواتین میں یہ امکان ۵ گنا بڑھ جاتا ہے۔

ذیابیطسی مریضوں کے گردوں کی شریان میں تصلب و سوزش کے سبب تنگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ حالت غیر ذیابیطسی مریضوں میں بھی پیدا ہو سکتی ہے، جس سے بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ بلڈ پریشر کی مقدار اور کنٹرول کا انحصار دل سے خون کے خروج اور بیرونی و سطحی خون کی نالیوں کی مزاحمت سے ہوتا ہے۔ بڑی عمر کے ذیابیطسی مریضوں میں انقباضی دباؤ زیادہ پایا جاتا ہے اور اس کا سبب تصلب شریانی مانا جاتا ہے۔

امراض قلب اور ہائی بلڈ پریشر کی صُورت میں ذیابیطس کا آسان ہدف بننے والے (موروثیت یا بے تحاشہ موٹاپے کے باعث) ہائی بلڈ پریشر کے سبب پیدا ہونے والی انسولین کے خلاف مزاحمت سے ذیابیطس میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کنٹرول کرنے والی کچھ ادویات کے استعمال پر ان دواؤں کے ذیلی اثرات کے باعث بھی ذیابیطس میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ طبی ماہرین کے مطابق ہائی بلڈ پریشر اور ذیابیطس دونوں میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس کی الگ الگ وجوہ کے ساتھ یہ قدر بھی مشترک ہے کہ یہ دونوں امراض، ایک دوسرے کے لیے سازگار ماحول فراہم کرتے ہیں۔ ہائی بلڈ پریشر پر کنٹرول اس اعتبار سے اہم ہے کہ بہت سی صُورتوں میں صرف احتیاط ہی سے یہ مرض کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

## غیر علامتی یا بغیر درد کے دل کا دورہ

دل مضبوط پٹھوں سے تشکیل پایا ہوا ایک عضو ہے اور اس کا کام سارے جسم کو خون سیراب کرنا ہے۔ ہر پٹھے یا عضو کی طرح دل کو بھی پمپ کا فعل انجام دینے کے لیے آکسیجن اور خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ دل کی سطح پر پائی جانے والی شریان قلب (coronary arteries) دل کو خون اور آکسیجن فراہم کرنے کی ذمے دار ہوتی ہے لیکن اگر ان میں سے ایک یا کئی شریانیں تنگ ہو جائیں تو دل کے پٹھوں میں دورانِ خون اور آکسیجن کم ہونے لگتی ہے جو انجائنا کا باعث بنتی ہے۔ یہی درد یا انجائنا کی کیفیت خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے۔

عموماً یہ درد چند سیکنڈ سے لے کر چند منٹ تک رہتا اور آرام کرنے سے دُور ہو جاتا ہے اور دل کے عضو کو مستقل طور پر کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ لیکن اگر یہ عارضہ کافی عرصہ برقرار رہے تو قلب کو بہت زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے اور نتیجے کے طور پر دل کا دورہ واقع ہوتا ہے۔ ایسے دل کے دورے کو خاموش دل کا دورہ (silent ischaemia) کہا جاتا ہے۔ ذیابیطس سے متاثرہ افراد میں درد کا احساس دلانے والی نسیں متاثر ہو جاتی ہیں اور دل کے درد کا احساس دماغ تک نہیں پہنچا پاتیں۔

## میٹابولک سینڈروم
### امراضِ قلب اور ذیابیطس کی بنیادی وجہ

میٹابولک سینڈروم جسے انسولین مزاحمت سینڈروم یا سینڈروم ایکس بھی کہا جاتا ہے، ان پُرخطر عوامل کا مجموعہ ہے جو موٹاپے کا شکار نیز ذیابیطس قسم دوم میں مبتلا افراد میں قلب، شریانوں کی بیماری اور ان کی خرابیوں کا ذمے دار ہے۔ جسم میں چکنائی کی تقسیم کے فرق (I.E Gynecoid Versco andriod) کا تعلق ترمیم یا تبدیل شدہ میٹابولک پروفائل' طبی لٹریچر میں پچاس برس قبل دستاویزی صُورت میں سامنے آیا تھا اور اسے ۱۹۸۸ء میں سینڈروم ایکس کا نام دیا گیا۔ سینڈروم کا جز و قلب اور شریانی بیماری کے بڑھتے ہوئے خطرے سے منسوب کیا گیا۔

میٹابولک کی نمایاں خصوصیات میں انسولین مزاحمت، پیٹ کے گرد چربی کا اکٹھا ہونا، ہائی بلڈ پریشر اور کولیسٹرول کی بڑھی ہوئی سطح (ٹرائی گلیسرائیڈ کی بڑھی ہوئی سطح اور ایچ ڈی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایل کی کمتر سطح) شامل ہیں۔ میٹابولک سینڈروم کا اندازہ لگانے کے لیے یا کارڈیووسکیولر کی بیماری اور ذیابیطس کا خطرہ رکھنے والے مریضوں کی نشاندہی کے لیے معمول کی طبی اور خاندانی ہسٹری مدد کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے حالیہ اور ماضی میں وزن کی تبدیلی، خوراک اور جسمانی سرگرمیوں کا مختصر احوال بشمول پیشہ ورانہ اور فرصت کے اوقات کی جسمانی مصروفیات کے بارے میں معلومات اہم ہیں۔ عمومی خوراک، خوراک میں چکنائی کی کمی کی کوششوں یا غذا میں کسی خاص تبدیلی کے متعلق سوالات معالج کو مریض کی اپنے طرز زندگی اور عادات میں تبدیلی کے لیے آمادگی کا اندازہ لگانے میں مدد دیتے ہیں۔

میٹابولک سینڈروم کا شکار مریضوں کو پیٹ کے گرد چربی کو گھٹانے کے لیے موثر کوششیں کرنی چاہئیں۔ اس کے علاوہ اگر ٹرائی گلیسرائیڈ کی سطح معمول سے زیادہ ہو تو اس مقصد کے لیے چکنائی سے پرہیز کے ساتھ ساتھ مناسب ورزش ضرور کرنی چاہیے اور خوراک ہمیشہ کم کیلوریز والی استعمال کرنی چاہیے۔ نیز ایسے مریضوں کو ہائی بلڈ پریشر اور گلوکوز کی بڑھی ہوئی سطح سے بھی بچنا چاہیے۔

## سینڈروم ایکس

نشاستے دار اشیا، آٹا، چاول، آلو اور میٹھے بسکٹ وغیرہ کھانے سے خون میں شکر کی سطح بڑھ جاتی ہے جسے جسم کا حصہ بنانے کے لیے لبلبہ زیادہ مقدار میں انسولین تیار کرتا ہے۔ یہ کیفیت طب کی اصطلاح میں سنڈروم ایکس (Syndrome X) کہلاتی ہے۔ خون کی شکر میں اضافے سے حملہ قلب کی راہ ہموار ہونے لگتی ہے۔ یہ کیفیت یا علامت ظاہر ہو اور اس کے باوجود خون میں ٹرائی گلیسرائیڈ، قلب دوست کولیسٹرول کے علاوہ بلڈ پریشر بھی نارمل سطح پر ہو تو ایسی صورت میں حملہ قلب کا خطرہ نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا نہ ہونے کی صورت میں خون میں شکر کی سطح ناشتے سے پہلے اور بعد میں ضرور دیکھتے رہنا چاہیے۔

ماہرین کے مطابق ایسی صورت میں نشاستے دار اشیا کو ترک کر کے گوشت، جمنے والی چکنائیوں، مکھن، بناسپتی گھی اور مارجرین وغیرہ کا استعمال بھی خطرناک ہے کیونکہ اس طرح سے کولیسٹرول کی سطح بڑھ جائے گی۔ ایسی صورت میں مناسب یہی ہے کہ مغزیات جیسے مونگ پھلی، زیتون کا تیل، کینولا کا تیل، چکنی یا روغنی مچھلی وغیرہ کھائے جائیں۔ مچھلی اور کینولا میں مفید قلب چکنائی اومیگا۔۳ بکثرت پائی جاتی ہے۔

## ذیابیطس سے متاثرہ مریضوں کے لیے خطرے کا اندازہ

ہائی بلڈ پریشر اور دل کے عوارض کے ساتھ ساتھ اگر ذیابیطس کا عارضہ بھی لاحق ہو تو مریض کے لیے موت کا خطرہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ مختلف تحقیقات اور مشاہدات کی روشنی میں خون میں شوگر کی مقدار مخصوص حد سے تجاوز کر جائے تو خطرات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ درج ذیل جدول کی مدد سے ہر فرد اپنے بلڈ پریشر کے ساتھ ساتھ شوگر لیول کو دیکھ کر رسک کا اندازہ کر سکتا ہے:

| بلڈ شوگر (Blood Sugar) mg% | خالی پیٹ شوگر کی مقدار (Fasting Level) | ناشتے کے بعد شوگر کی مقدار (Post Prandial Level) | |
|---|---|---|---|
| | | 1 گھنٹے بعد | 2 گھنٹے بعد |
| نارمل (Normal) | 100 سے کم | 160 سے کم | 120 سے کم |
| ہائی رسک (High Risk) | 130 - 100 | 160 - 220 | 120 - 150 |
| قطعی خطرہ (Definite Risk) | 130 سے زائد | 220 سے زائد | 150 سے زائد |



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## عنایت علی خان

پیدائش ریاست ٹونک، راجستھان، بھارت میں ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ والیانِ ریاست ادب نواز تھے چنانچہ گھر گھر شاعری کا چرچا تھا۔ میرے خاندانی بزرگ بھی ماشاء اللہ سب موزوں طبع تھے۔ والد ہدایت علی خاں ناظر مرحوم مزاح گو تھے۔

تشکیل پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے حیدر آباد سندھ آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ تعلیم اور تدریس کا سلسلہ یہیں رہا۔ ایم۔اے اُردو جامعہ سندھ سے بدرجہ اوّل پاس کیا اور انجمن ترقی اُردو سے بابائے اُردو طلائی تمغا حاصل کیا۔ اسکول کے زمانے میں سے شعر گوئی کا مشغلہ جاری رہا۔ کم و بیش ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن وجہ تعارف کلامِ طنز و مزاح بنا۔

مجموعہ ہائے کلام میں ازراہِ عنایت، عنایات، ”کچھ اور“ اور ”اور کچھ“ شامل ہیں۔

پارسا کا پندار اپنی جگہ
فضلِ رنجا کی جھنکار اپنی جگہ

گھر میں بیوی ہے، آفس میں ہے سیکرٹری
نُور اپنی جگہ ، نار اپنی جگہ

رات پھر واپس پریشان ہوئی
وصل اپنی جگہ ، مار اپنی جگہ

گل رخوں کے ہیں نوکیلے ناخن تو ہوں
پھول اپنی جگہ ، خار اپنی جگہ

رونقِ بزم ان کی مسز ہی تو ہیں
ان کے چہرے کی پھٹکار اپنی جگہ

تاکنا جھانکنا مسلکِ میر ہے
یہ بڑھاپے کا آزار اپنی جگہ

طنزیہ شعر کی کاٹ ہی اور ہے
خنجر و تیر و تلوار اپنی جگہ

جب سے ہیومن کلوننگ کا چکر چلا
دونوں بیٹھے ہیں بے کار اپنی جگہ

وہ جو کہتے ہیں سب ٹھیک ہے ملک میں
سارے اخبار و خبار اپنی جگہ

کیا صفائی وزیروں نے دکھلا دی ہے
بلدیہ کے جمعدار اپنی جگہ

ڈاکٹر پہلے دیکھیں گے سسٹرز کو
آئی سی یو* کے بیمار اپنی جگہ

مسخرہ پن عنایت سے چھٹتا نہیں
اس کے سنجیدہ اشعار اپنی جگہ

* (ICU اور I see you)

انتہائی پُرگو اور کامل فن شاعر تھے۔ فی البدیہہ بھی عمدگی سے کہتے تھے۔ ان کی طرز میں ان کا کوئی مماثل نہ تھا۔ بعض اشعار و مصرع زبان زدِ عام ہیں۔

لے کے رشوت پھنس گیا ہے
دے کے رشوت چھوٹ جا

نہایت خوش مزاج اور خوش گو شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے کلام میں انتہائی شائستہ طنز کے نمونے ملتے ہیں۔ ان کی نثر بھی نظم کی طرح شائستہ اور شگفتہ ہوتی تھی۔ وطن کی محبت اور فلاح کا جذبہ دونوں بے حد نمایاں تھے۔

نہ دانائی پسند آئی نہ بینائی پسند آئی
مجھے یورپ میں سارے ایک نکمائی پسند آئی

اپنے بچوں سے جو گھبراتے ہیں گھر پر اور ہم
ورنہ خود ہی سوچیے صاحب کہ دفتر اور ہم

تُو تو گھر میں سو رہا ہے یار تجھ کو کیا خبر
گیٹ پر زخمی پڑے ہیں گیٹ کیپر اور ہم

ہے جگہ دل میں تو اک گھر میں گزارا کرتے ہیں
آٹھ بچے، ایک بیگم، تین نوکر اور ہم

گھر کی تہذیب اور ہے، دفتر کا کلچر اور ہے
گھر کے اندر اور "ہم" ہیں، گھر کے باہر اور "ہم"

بیوی بچے سب تو اپنے اپنے کاموں پر گئے
گھر میں ایک کتا ہے (امریکہ کا کلچر) اور ہم

(دلاور فگار)

شوق سے لختِ جگر نورِ نظر پیدا کرو
ظالمو! تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو

ارتقا تہذیب کا یہ ہے کہ پھولوں کے بجائے
توپ کے دھڑ، بم کے دھڑ، راکٹ کے سر پیدا کرو

میں بتاتا ہوں زوال اہلِ یورپ کا پلان
اہلِ یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

میری دشواری کا کوئی حل مرے چارہ گرو
جلد تر پیدا کرو اور مختصر پیدا کرو

میری درویشی کے جشنِ تاجپوشی کے لیے
ایک ٹوپی اور کچھ مرغی کے پر پیدا کرو

حضرتِ اقبال کا شاہین تو کب کا اُڑ گیا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

(سید ضمیر جعفری)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارے دور کے ممتاز ترین طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کے ہاں دردِ وطن کی کسک بھی موجود ہے، زبان و بیاں کی شگفتگی بھی۔ ادائی اس انداز میں کرتے ہیں کہ گویا لفظوں میں جان ڈال دیتے ہیں۔

معاشرتی رویوں کی بے اعتدالی پر بڑی سلیقہ مندی سے نشتر زنی کرتے ہیں۔ محکمہ موسمیات کی سربراہی کے بعد انسانی موسموں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ بطورِ خاص صنفِ نازک کے حوالے سے لطیف طنز ان کا خاصہ ہے۔

ہے آپ کے ہونٹوں پہ جو مُسکان وغیرہ
قربان گئے اس پہ دل و جان وغیرہ

بلی تو یونہی مفت میں بدنام ہوئی ہے
تھیلے میں تو اور ہی سامان وغیرہ

بے حرص و غرض فرض ادا کیجیے صاحب
جس طرح پولیس کرتی ہے چالان وغیرہ

اب ہوش نہیں کوئی کہ بادام کہاں ہیں
اب اپنی ہتھیلی پہ ہیں بادام وغیرہ

کس ناز سے وہ نظم کو کہہ دیتے ہیں نثری
جب اس کے خطا ہوتے ہیں اوزان وغیرہ

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
گھوڑوں کی طرح بکتے ہیں انسان وغیرہ

ہر شرٹ کی بش شرٹ بنا ڈالی ہے انور
یوں چاک کیا ہم نے گریبان وغیرہ

(انور مسعود)

منافع مشترک ہیں اور خسارے ایک جیسے ہیں
کہ ہم دونوں کی قسمت کے ستارے ایک جیسے ہیں

میں اک چھوٹا سا افسر ہوں، وہ اک موٹا سا مل اونر
مگر دونوں کے انگم گوشوارے ایک جیسے ہیں

وہ تھانہ ہو، شفاخانہ ہو یا پھر ڈاک خانہ
رفاہِ عام کے سارے ادارے ایک جیسے ہیں

اُسے ضعفِ بصیرت ہے، اسے ضعفِ بصارت ہے
ہمارے دیدہ ور سارے کے سارے ایک جیسے ہیں

ہر اِک بیگم اگرچہ منفرد ہے اپنی سج دھج میں
مگر جتنے بھی شوہر ہیں، بے چارے ایک جیسے ہیں

مٹن اور دال کی قیمت برابر ہوگئی ہے جب
یقین آیا کہ دونوں میں حرارے ایک جیسے ہیں

محبت کی کہانی ہو کہ رودادِ گرانی ہو
ترے اشعار اے شاہد، کرارے ایک جیسے ہیں

(سرفراز شاہد)

خالد عرفان کے کلام میں زبان و بیان کی پختگی کے ساتھ برجستگی قابلِ ذکر ہے اور اب تو مشرقی رویوں کی کج روی کے ساتھ ساتھ مغربی معاشرت کی بے اعتدالیوں پر بھی اُن کی نظر ہے۔

میں تو اہل ہوں کسی اور کا، میری اہلیہ کوئی اور ہے
میں ردیفِ مصرعِ عشق ہوں مرا قافیہ کوئی اور ہے

میں ترا کزن تُو مری کزن، کریں رقص پھر سرِ انجمن
نہ ترا چچا کوئی اور ہے، نہ مرا چچا کوئی اور ہے

ترا مرا ایک رسولؐ ہے، ترا میرا ایک خدا مگر
مرا مولوی کوئی اور ہے، ترا پیشوا کوئی اور ہے

ترے دستِ ناز نے عالیہ، یہ کہاں کا گوشت پکا لیا
ترا لنچ کھا کے پتا چلا کہ یہ کوفتہ کوئی اور ہے

کسی تجربے کی تلاش میں مرا عقدِ ثانوی ہوگیا
مری اہلیہ کو خبر نہیں مری اہلیہ کوئی اور ہے

(خالد عرفان)



کلام میں پختگی کے ساتھ زبان و بیان کی صحت کا اہتمام نمایاں ہے۔ منظومات میں جس موضوع پہ قلم اُٹھاتے ہیں اُسے تشنہ نہیں چھوڑتے اور نہایت پُر اعتماد انداز سے پیش آتے ہیں۔

لڑی اس ٹھاٹھ سے منکوحۂ کافر بیاں میری
فرشتے لکھتے لکھتے چھوڑ بھاگے داستاں میری

عجب اک کتھا ہے، کہتے ہیں میاں بیوی
کہ شادی ہوگئی لیکن کہاں تیری کہاں میری

مسلماں ہوں مگر یہ سوچ کر مرنے سے ڈرتا ہوں
نہ جانے کس کے گھر جائے بلائے ناگہاں میری

وہی ہے اختلافِ باہمی کی انجمن اب تو
فقط شادی کے دن جس نے ملائی ہاں میں ہاں میری

بہت شائستہ اندازِ گفتن ہے زباں اس کی
نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری

(طٰہٰ خان)



# اتنی زیادہ "قربانیوں" کے باوجود لوگوں کی بھوک کم کیوں نہیں ہوتی؟

فریدہ خانم

## عید

قربان کا ذکر جب ہمارے سامنے آئے تو آنکھوں اور ذہن میں اس منظر کا تصور آجاتا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کے حکم سے اپنے بیٹے کی قربانی دینی چاہی۔ اللہ نے بیٹے کی جگہ ایک مینڈھا بھیج دیا۔ اس طرح ہم پہ قربانی فرض ہوگئی تاکہ ہم اس قربانی اور اطاعت کو یاد کر سکیں۔ لیکن آج کے دور میں قربانی تو دی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود نہ اطاعتِ رب کا جذبہ بڑھتا ہے اور نہ غریبوں کی امداد اور سرپرستی کا۔ جس قربانی کے تین حصے کرنے کا حکم تھا، ایک اپنے لیے، ایک عزیزوں کے لیے اور ایک غریبوں کے لیے۔ لیکن اب قربانی کرنے والے اکثر سارے حصے خود رکھ لیتے اور گوشت کی قربانی کے بجائے ایمان کو ہی قربان کر دیتے ہیں۔ اتنا گوشت کھانے اور رکھنے کے باوجود لوگوں کی بھوک کم نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ جاننے کے لیے مدیرِ محترم نے ایک سروے کا کام سونپا۔ آپ پڑھیے کہ مختلف شعبوں کے لوگ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

**ولید اقبال** ایڈووکیٹ (پوتے ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ)



اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ پاکستان کی جو اصل بھوک ہے، وہ ایک ذمے دار، مخلص، باضمیر اور بصیرت والی قیادت کی ہے جو اتنے سال گزر جانے کے باوجود نہیں مل سکی۔ اس لیے ہم جہاں کھڑے تھے، آج بھی وہیں ہیں۔ اتنے ہی لالچی اور اتنے ہی غیر ذمے دار......!

**ڈاکٹر اجمل نیازی** (دانشور)

بھوک تو ہمارا مقدر ہے، ہم ہمیشہ دوسروں سے یہ قربانی مانگتے ہیں کہ کوئی اور قربان ہو جائے۔ عیدِ قرباں اور عیدالفطر عیدین نہیں وعید ہے۔ لوگ جہنم میں رہ رہے ہیں۔ قربانی تو حکمرانوں اور اُمرا کو دینی چاہیے لیکن وہ غریبوں سے مانگتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لوگ منافق اور ظالم ہیں۔ غُربت ختم کرنے کے جھوٹے دعوے کرتے ہیں۔ میں ان سے صرف یہ گزارش کرتا ہوں کہ غریبی ختم نہ کریں، تھوڑی سی امیری کم کردیں۔

**مہناز رفیع** (سابق ایم۔ این۔ اے)

بھوک ختم ہونے کا تعلق عیدِ قربان سے نہیں، اصل میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آج کی دنیا وہ نہیں جو چار ہزار سال پہلے تھی اور جب اسلام آیا تھا۔ اُس دور میں آبادی کم تھی اور لوگوں میں کرپشن نہ تھی۔ اپنی ذات کے ساتھ اتنا تعلق نہ تھا۔ اسلام نے ہمیں درس دیا کہ اپنے پڑوسی کو بھوکا سونے نہ دو مگر اب اسلام کی وہ سوچ ختم ہوگئی۔ مفاد پرستوں اور نفس پرستوں نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کیا ہے، لوگوں میں وہ جذبہ نہیں رہا، صرف نعرے رہ گئے۔ ایسے میں آپ عیدِ قرباں کا کیا کریں گے؟ اللہ نے تو آپ سے نفس کی قربانی مانگی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمان غنیؓ، کسی ایک کی بھی مثال آج کے دور میں نہیں ملتی۔

**بانو قدسیہ** (ادیبہ/ڈرامہ نگار)

بھوک اس لیے بھوک کم نہیں ہوتی کہ ہمارے اعمال درست نہیں، نیت ٹھیک نہیں۔

**فدا احمد کاردار** (سینئر صحافی/ادیب)

پاکستان کی آبادی زیادہ اور قربانیاں کم ہوتی ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ جہاں پیٹ زیادہ ہوں گے، وہاں بھوک بھی زیادہ ہوگی، پھر ہماری تربیت ہی لینے کی ہو رہی ہے، دینے کی نہیں۔ یہی محرومی کا باعث ہے۔

**ڈاکٹر شہناز مزمل** (شاعرہ/ریٹائرڈ لائبریرین قائداعظم لائبریری)

بھوک ایک وقت کا مسئلہ نہیں، بھوک انسانی خواہشات کا حصہ ہے اور انسانی جسم کی ضرورت بھی۔ قربانی ایک مختصر دورانیے کے لیے لوگوں کو لذتِ کام و دہن فراہم کرتی ہے اور قربانی کا یہ گوشت ہر مستحق تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ جن محدود لوگوں تک پہنچتا ہے، وہ اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ اسے چند دنوں تک بھی محفوظ رکھ سکیں۔ نتیجتاً ایک دو دن کے علاوہ ان کی بھوک کا مسئلہ حل نہیں ہو پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی قربانی کے باوجود لوگوں کا لالچ کم نہیں ہوتا۔

**ڈاکٹر نادرہ زیدی** (چیئرپرسن ایوان اقبال بزم خواتین)

ہم لوگ اقربا پروری میں اتنے زیادہ مشغول ہو چکے ہیں کہ یہ نہیں سوچتے، ہمارے مذہب میں قربانی کے تین حصے ہوتے ہیں۔ (۱) رشتہ دار، (۲) غُربا، (۳) اپنا۔ ہم انصاف نہیں کرتے، غریبوں کا حصہ اُن تک نہیں پہنچتا بلکہ افسروں کو اور جہاں فائدہ ہو، وہاں بکرے کی رانیں اور زیادہ گوشت دیتے ہیں اور باقی اپنا فریزر بھر لیتے ہیں۔ غریبوں کو دیں بھی تو صرف ہڈیاں اور چربی، حالانکہ اُنہیں اُن کا حصہ دینا چاہیے۔ یہی بے برکتی کی وجہ ہے۔

**فرح ہاشمی** (سینئر صحافی/سماجی کارکن)

معاشرتی طور پر ہم ایک ایسی بھوک کا شکار ہیں جس کے ختم ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔ قربانی پر بے تحاشا گوشت جمع کرنا، شادیوں کے اجتماعی کھانوں پر جھپٹنا، دیگر تقریبات میں طعام و انصرام پر ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑنا، اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ من حیث القوم ہم ندیدگی یا عدم تحفظ کا شکار ہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

**عدیل نیاز** (ایڈمنسٹریٹر/جنرل سیکرٹری رہائی آرگنائزیشن لاہور)

بھوک کی بھی دو اقسام ہوتی ہیں۔ ایک پیٹ اور دوسری نیت کی بھوک۔ نیت کی وجہ سے بہت سارے پیٹ بھوکے رہ جاتے ہیں۔ اگر نیت والی بھوک بھی نہیں مٹتی تو قیامت تک انسانی بھوک نہیں مٹ سکتی۔

**صائمہ کاردار** (سخاوی)

ہمارے ہاں عید کی قربانی ایک دکھاوا اور دولت کی نمائش بن گئی ہے۔ جس مقصد کے لیے یہ قربانی ہم پر فرض کی گئی، وہ مقصد ہم نے پسِ پشت ڈال دیا۔ غریبوں کی مدد کرنے کا جذبہ بہت کم لوگوں میں ہے۔ لوگ صرف فریج بھرتے یا اپنے قریبی لوگوں کو اہمیت دیتے ہیں۔

**واثق حسن** (ایچ۔آر ہالیڈے اِن ہوٹل لاہور)

قربانی کہاں سے کریں، یہ وہ موضوع ہے جس کا مضمون ہم کبھی مکمل ہی نہیں کر سکتے۔ قربانی کیا ہے، اس کا مفہوم سمجھ لینا ہی قربانی ہے۔ ہماری زندگی اتنی مصروف ہے کہ ہمارے پاس اسے سمجھنے کا بھی وقت نہیں تو بھوک کیسے کم کی جا سکتی ہے؟

**ریحانہ کوثر** (مصنفہ)

خوب سے خوب تر کی کشمکش ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گی۔ اسی "ہل من مزید" نے ہوس کا درجہ اختیار کر لیا ہے جس کی وجہ سے انسان کی نیت اور ایمان بھی کمزور ہو چکا۔ قربانی کا جذبہ ختم ہو گیا اور ایسی محرومیاں کسی بھی معاشرے کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ ایسی قربانیاں زمین پر بھی رد ہو جاتی ہیں اور آسمان پر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بھوک کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے، کم نہیں ہوتا۔

**لیاقت علی** (پرنسپل سیٹین کالج لاہور)

میرے خیال میں تو سب سے بڑی وجہ مہنگائی ہے جس نے غریب کا زندہ رہنا اجیرن کر دیا ہے۔ حکومت عوام کے مسائل حل کرنے کے بجائے ان کو بجلی، پٹرول اور لوڈشیڈنگ کا عذاب دے رہی ہے۔ عوام کو اس حال تک پہنچا دیا ہے کہ وہ دو وقت کی روٹی کے لیے ترستے ہیں۔ پہلے گھر کا ایک فرد کما کر سارے گھر کے اخراجات پورے کرتا تھا، آج تنخواہ بلوں اور کرایوں میں خرچ ہو جاتی ہے تو عوام کی بھوک کیسے ختم ہوگی؟

**عبدالماجد ملک** (کالم نگار)

آج کل جو بھی کام کیا جا رہا ہے، وہ نیکی اور اللہ کی رضا نہیں محض دکھاوے کے لیے کیا جاتا ہے۔ بھوک اس لیے کم نہیں ہوتی کیونکہ اللہ کے احکامات مدنظر نہیں رکھے جا رہے۔ اس وجہ سے برکت اُٹھ جاتی ہے۔ اگر ہم قربانی کو مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے کریں تو کوئی شک نہیں کہ اللہ بھی راضی ہوگا اور ہماری بھوک بھی مٹ جائے گی۔

**محمد اویس** (کیمسٹ/کاروبار)

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے دین سے دور ہوتے گئے۔ ہم اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکامات

پر عمل کرنا چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اس وقت ہمارا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ ہم دولت حاصل کرلیں، کسی بھی طریقے سے صرف اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے تاکہ عیش و عشرت کی زندگی گزار سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی کوئی بھی قربانی رنگ نہیں لا رہی۔

**شاہین اختر شاہین** (ہوسٹل وارڈن فاطمہ میموریل میڈیکل کالج)

بھوک کی اہم وجہ اسلام سے دوری اور غلط تقسیم ہے۔ قناعت پسندی کی کمی ہے، پھر ایک اور وجہ مہنگائی ہے۔ جو لوگ سارا سال گوشت خرید نہیں پاتے، وہ عید قرباں کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ انتظار ان کی بھوک اور بڑھا دیتا ہے۔ اتنی زیادہ قربانی کے باوجود لوگوں کی بھوک کم کیسے ہو؟ اُمرا گوشت کی قربانی دیتے ہیں اور عوام اپنی خواہشات کی۔ عوام کی حسرتیں پوری نہیں ہوتیں۔ قربانی کا گوشت عید پر بھی مستحق لوگوں تک نہیں پہنچتا تو بھوک کیسے کم ہو سکتی ہے؟

**سید کاشف بخاری** (استاد)

پاکستان میں نہ صرف پڑھے لکھے لوگ بلکہ ان پڑھ بھی اس عذاب میں مبتلا ہیں۔ پڑھے لکھوں کو اُن کی تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اُنہیں قابلیت کا صلہ نہیں ملتا۔ اُن کے والدین اُن کی تعلیم و تربیت پر بہت سارا پیسہ خرچ کرتے ہیں، اس کا نتیجہ بے روزگاری کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جو چند روپے وہ کماتے ہیں، ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں ہوتیں۔ بس وہ اس لیے بھوک کا شکار ہو جاتے ہیں۔

**سلیم طاہر** (سابق پروڈیوسر پی۔ٹی۔وی/شاعر)

عیدِ قرباں کے دن تو دو تین ہوتے ہیں جن میں قربانی فرض ہے۔ اس کے ذریعے دراصل آپ کو درس دیا گیا کہ اپنے مال میں سے دوسروں کو حصہ دیں۔ یہ دو تین دن کا عمل نہیں، آپ اسے جاری رکھیں۔ اگر آپ صاحبِ حیثیت ہیں تو اُن لوگوں کی مدد کریں جو بے اختیار اور ضرورت مند ہیں۔ اُن کو بھی موقع ملے کہ وہ آپ کی طرح گوشت سے لطف اندوز ہوں، اپنی بھوک مٹا سکیں۔ اپنے مال میں سے اُن لوگوں کو حصہ دیا جاتا رہے تو بھوک کم ہونے کی صورت نکل آئے گی۔

**ڈاکٹر عشرت عالیہ** (اُمنگ این۔جی۔او لاہور)

قربانی کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ اپنی ذات اور خواہشات کی قربانی۔ اپنے نفس کی قربانی ہی اصل قربانی ہے۔ ہم صرف جانوروں کی قربانی کو ہی قربانی سمجھتے ہیں۔ نفس کو سمجھ لینا ہی اصل بات ہے۔ اگر ہم اپنے نفس کی قربانی دیں تو زندگی خوبصورت اور بہترین ہو جائے گی۔ پھر بھوک کا ایشو نہیں رہے گا اور نیت بھر جائے گی۔

**سیّد عطاالرحمٰن ہاشمی** (ایڈووکیٹ/مذہبی سکالر)

عید جیسے مذہبی اجتماعی تہوار ہمیں اس بات کا سبق دیتے ہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس خوشی میں شامل کریں اور عید قربان کا مقصد بھی مستحق لوگوں تک گوشت پہنچانے کے پیچھے یہ عمل کارفرما ہے کہ غریب لوگوں کو بھی اس خوشی میں شامل کیا جائے۔ لوگوں کو چاہیے کہ اللہ پر توکل رکھیں، پرندوں کی طرح۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں خوراک جمع کر کے نہیں رکھتے، وہ ہر روز ایک نئی اُڑان کے ساتھ اور اللہ پر توکل رکھتے ہوئے پرواز کرتے ہیں۔ انسان بھی اگر توکل اور فکر اختیار کرے تو بھوک مٹ سکتی ہے۔

**حسن اختر ملک** (چیئرمین زکوٰۃ کمیٹی/الیکٹریکل انجینئر)

زیادہ تر لوگ فریج میں گوشت رکھ لیتے اور غریبوں کو کم دیتے ہیں۔ جانور بہت زیادہ مہنگے ہو چکے ہیں، اس لیے اب متوسط طبقے کا آدمی قربانی نہیں کر سکتا۔ اس سے بھی لوگوں کی بھوک بڑھتی ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# مشورہ حاضر ہے

اُردو ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ، آپ بھی اِن مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں
چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

صغیرہ بانو شیریں

## انناس

چند دنوں سے میں تھکن کا شکار ہو رہی ہوں۔ کام کرتے کرتے تھک کر لیٹ جاتی ہوں۔ کبھی مجھے بلند فشارِ خون کی شکایت بھی ہو جاتی ہے۔ تھکن کی وجہ سے سارا نظام خراب ہو رہا ہے۔ میں دوائیاں نہیں کھانا چاہتی۔ مجھے مشورہ دیں تاکہ میں میرا چڑچڑا پن بھی دور ہو جائے اور میں پہلے کی طرح کام کر سکوں۔ (کرن خالد۔لاہور)

بی بی! جسم پر زیادہ بوجھ پڑے تو پھر کام کی کارکردگی متاثر ہونے لگتی ہے۔ آپ ناشتا بھرپور کریں۔ ہماری ہاں خواتین خود ناشتا نہیں کرتیں بچوں کو اور شوہر کو ناشتا دے کر کام میں لگ جاتی ہیں۔ ایک پیالی چائے سے کچھ فائدہ، روٹی پہ گھی یا مکھن لگا کر چند روز کھائیے۔ انڈے کی سفیدی کھا سکتی ہیں۔ بازار سے انناس منگائیے۔ اس میں حیرت انگیز فوائد ہیں۔ قوتِ بخش پھل ہے۔

انناس ڈبے میں بھی دستیاب ہے۔ اس میں حیاتین اور کئی معدنی اجزاء ہوتے ہیں۔ میں نے اس کا استعمال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بہت دیکھا ہے۔ ملائیشیا کی خواتین کے ہاتھوں میں صبح صبح انناس کے ڈبے ہوتے ہیں۔ بڑے مزے سے کھا رہی ہوتی ہیں۔ پنڈلیوں کی درد، ورم میں بہت مفید ہے اور تھکن کے لیے لاجواب پھل ہے۔ تھکن، کمزوری یا جسم میں درد ہو تو انناس کھائیے۔ آپ کا بلند فشارِ خون بھی صحیح ہو گا اور مزاج کا چڑچڑا پن بھی دور ہو جائے گا۔ انناس کے چند قتلے کھاتے ہی آپ کا مزاج خوشگوار ہو گا۔ آپ گھر کا کام کاج دوبارہ آسانی سے کر سکیں گی۔ انناس کھانے سے پیشاب بھی کھل کر آتا ہے۔ بازار میں ملنے والے ڈبہ بند انناس کو مشین کے ذریعے خاص طور پر کاٹا جاتا ہے، پھر اس کے ٹکڑے کر دیے جاتے ہیں۔ تازہ انناس دستیاب نہ ہو تو بازار سے دستیاب انناس استعمال کیا سکتا ہے۔ اپنی غذا کا خاص خیال رکھیے، آپ کی تھکن خود بخود دور ہو جائے گی۔ ہمارے ہاں خواتین بھرپور غذا نہیں لیتیں بلکہ کام میں جتی رہتی ہیں، اسی لیے تھکن ہو جاتی ہے۔

## کیل مہاسے

میری عمر اٹھارہ سال ہے۔ پچھلے سال سے چہرے پر کیل مہاسے نکل رہے ہیں۔ ڈاکٹر سے پوچھ کر علاج بھی کیا۔ خاص فرق نہیں پڑا۔ ناک کے آس پاس اور چہرے پر نشان پڑ رہے ہیں۔ یہ کب ٹھیک ہوں گے۔ اس بارے میں ضرور بتائیے۔ کیا کرنا چاہیے جس سے ان کی بڑھوتری کم ہو جائے۔ (فرزانہ حسین۔لاہور)

بی بی! یہ ایک عام مسئلہ ہے جو اکثر تیرہ برس کی عمر سے شروع ہو جاتا ہے۔ احتیاط کی جائے تو یہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لڑکیوں کو اکثر یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ صفائی سب سے زیادہ ضروری ہے۔ چہرے کے دانوں کو بار بار نہیں چھیڑنا چاہیے اور نہ ہی پھیلنا چاہیے۔ کوئی دانہ چھل جائے تو ہاتھ مت لگائیں بلکہ صاف ٹشو سے صاف کریں۔ ہاتھ لگانے سے کیل مہاسے بڑھ جاتے ہیں۔ چہرے کو صاف رکھنا چاہیے۔ جو بچیاں نماز پڑھتی ہیں، وہ دن میں پانچ بار وضو کرتی ہیں۔ چہرہ دن میں پانچ دفعہ دھلے تو صاف رہتا ہے۔

اسی طرح قبض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ صاف ستھری پکی پکی سبزیاں، موسمی پھل اور دہی کو اپنی غذا میں شامل کریں۔ چاکلیٹ، برگر، بازاری چیزیں، کولا مشروبات، گائے کا گوشت، چکنائی والی چیزیں کیل مہاسے زیادہ کرنے کا باعث ہیں۔ شہد کھائیے۔ نوجوان بچیوں کے لیے خون صفا دوائیاں بھی مفید ہیں۔ ہمدرد کی صافی پینے سے بھی فائدہ ہوتا ہے اور اکثر کو فائدہ ہوا ہے۔ چہرے کو چکنائی سے بچانا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے سب سے اچھی چیز بیسن ہے۔ تھوڑا سا بیسن لے کر اس سے مُنہ دھوئیے اور پھر گلاب کا عرق ضرور لگائیے۔ بیسن سے مُنہ دھویا جائے تو چکنائی ختم ہو جاتی ہے۔

نیم کے پتے سکھا کر سفوف بنا لیا جائے اور اسے دانوں پر لگایا جائے تو دانے خشک ہو جاتے ہیں۔ اپنا تولیا اور صابن علیحدہ رکھیے۔ آپ کی تھوڑی سے احتیاط کیل مہاسوں کی بڑھوتری کو دور کرتی ہے اور سادی غذا قبض نہیں ہونے دیتی۔ آزما کر دیکھئے۔

## منہدی (مہندی)

منہدی (مہندی) لگانے سے بال روکھے خشک ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے سر پر منہدی (مہندی) لگانا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے بتائیے۔ منہدی (مہندی) کے فائدے بھی لکھئے۔

(عرفانہ انجم۔ راولپنڈی)

منہدی (مہندی) یا حنا کا استعمال آج سے نہیں بلکہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ہاتھوں، پیروں اور بالوں پر لگانے کے علاوہ اسے بطور دوا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ آج کل منہدی (مہندی) کیمیکل کے ساتھ مل رہی ہے۔ سادی منہدی (مہندی) خریدیئے۔ اس کا رنگ بھی سبز ہونا چاہیے۔ آملہ سکاکائی کا پسا ہوا سفوف بازار سے مل جاتا ہے۔ آپ پانی گرم کر کے اس میں ایک ایک چمچہ سفوف ڈالیے اور پکائیے، پھر اسے منہدی (مہندی) میں ملا دیجئے۔ اس میں سرسوں کے تیل کا ایک بڑا چمچ بھی ڈالئے۔ ٹھنڈا ہونے پر سر میں لگائیے۔ منہدی (مہندی) لگا کر آپ پلاسٹک کا لفافہ بھی سر پر چڑھا سکتی ہیں۔ بالکل خشک بالوں میں آپ ایک انڈا پھینٹ کر ملائیے۔ نارمل



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بالوں میں آپ تین لونگ پیس کر ملائیے اور ایک انڈا۔ سرسوں کا تیل ملا کر لگائیے۔ منہدی (مہندی) رات کو بھگو کر صبح لگائیں تو رنگ اچھا آتا ہے۔ کچھ خواتین سادی منہدی (مہندی) میں آدھے لیموں کا عرق بھی ملا لیتی ہیں۔ منہدی (مہندی) میں تیل ضرور ملانا چاہیے، اس سے بالوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

بہت سے لوگ بے خوابی کا شکار ہوتے ہیں۔ پرانے طبیب تکیہ میں بجائے روئی کے منہدی (مہندی) کے خشک پتے بھر کر بے خوابی کا علاج کرتے تھے۔ اس تکیہ پر سر رکھا جائے تو اچھی نیند آتی ہے۔ منہدی (مہندی) مصفّی خون بھی ہے۔ منہدی (مہندی) کے پھول زیتون کے تیل میں ڈال کر کچھ دن دھوپ میں رکھ کر پھر ہلکی آنچ پر پکا کر چھان کر رکھ لیں۔ یہ تیل پٹھوں کی اکڑاہٹ کے لیے مفید ہے۔ ممتاز مفتی مرحوم کے منہ میں چھالے تھے۔ میں اُن کے گھر گئی تو دیکھا منہدی (مہندی) کی باڑ لگی ہے۔ ان سے کہا کہ منہدی (مہندی) کے مٹھی بھر پتے توڑ کر ایک لٹر پانی میں پکا کر رکھ لیں۔ اس پانی سے غرارے کریں تو منہ کے چھالے، زخم ٹھیک ہوں گے۔ منہدی (مہندی) کے پتے بہت فائدہ مند ہیں۔ ان کو بھی اس ٹوٹکے سے فائدہ ہوا۔

## مچھر مار سپرے سے حساسیت

آج کل ڈینگی کا موسم ہے۔ گھر میں بھی احتیاط کی جاتی ہے۔ مجھے اس کی بو سے الرجی ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسی دیسی دوا نہیں جس سے مچھر بھی بھاگ جائیں اور تکلیف بھی نہ ہو۔ مشورہ دیجئے۔

(عمارہ سعید، بہاولپور)

مچھروں کا مسئلہ سب کو درپیش ہے۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے بازار میں ملنے والی مچھر مار جلیبی لگائی جاتی ہے، اس کی بو تیز ہوتی ہے جو برداشت نہیں ہوتی۔ آپ پنساری سے یہ دوائیں منگائیے: حرمل آدھ پاؤ، صعتر فارسی ایک چھٹانک، حب الرشاد ایک چھٹانک۔ صعتر فارسی اور مرکی بھی اتنی مقدار میں لے لیں۔ ان سب کو ملا کر رکھ لیں۔ دو چار کوئلے جلا کر کڑاہی میں رکھیں اور مٹھی بھر لے کر اس پر ڈال دیں۔ کمرا بند کر دیں۔ اس کی دھونی سے بہت فرق پڑے گا۔ ہمارے پیارے رسول ﷺ نے لوبان اور صعتر فارسی کی دھونی کو صحت کے لیے مفید قرار دیا ہے۔

حشرات الارض سے نجات دلانے کے لیے لوبان کے ساتھ صعتر یا اشخ ملا کر دھونی دینے سے کوئی بھی الرجی نہیں ہوتی۔ اگر رات کو ان کی دھونی دے کر خالی کمرا بند کر دیا جائے تو مچھروں کے علاوہ لال بیگ، مکھیاں اور چھپکلیاں صبح مری ہوئی نظر آئیں گی۔ محترم بھائی ڈاکٹر خالد غزنوی مرحوم نے اس بارے میں اپنی کتاب میں تفصیل بیان کی ہے۔ آپ بھی آزما کر دیکھئے۔

پہلے زمانے میں اسپرے نہیں ہوتے تھے۔ گھروں میں دھونی دی جاتی تھی۔ بچے کی ولادت کے بعد روزانہ شام کو حرمل کی دھونی لازمی دی جاتی تھی تاکہ کوئی بھی جراثیم یا کیڑے کمرے میں نہ رہیں۔ لوبان جلاتے تھے۔

## دفتر میں تھکن

میں ایک دفتر میں کام کرتا ہوں۔ ابھی شادی نہیں ہوئی۔ پچھلے ماہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ عجیب سی تھکن ہو جاتی ہے۔ بار بار جمائیاں آتی ہیں۔ مجھے خود بہت کوفت ہوتی ہے۔ میں صرف چائے پی کر دفتر جاتا ہوں، دوپہر کو تھوڑا بہت کھا لیتا ہوں چائے بھی دو تین مرتبہ پیتا ہوں۔ کوئی ایسا مشورہ دیجئے جس سے میں دفتر میں اچھی طرح کام کر سکوں۔

ریحان علی، کراچی

جناب! آپ نے خود لکھا ہے کہ ناشتا نہیں کرتے بلکہ صرف چائے پی کر دفتر چلے جاتے ہیں۔ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ جسم میں توانائی ہوگی تو آپ تمام دن کام کر سکیں گے ورنہ نہیں۔ آپ دلیہ دودھ میں ڈال کر یا انڈے کا آملیٹ بنا کر روٹی کے ساتھ کھائیے۔ بھرپور ناشتا کریں گے تو دفتر میں خوش باش رہیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ پانی کی ایک بوتل ضرور اپنے پاس رکھئے۔ کام کے دوران آپ پانی نہیں پیتے۔ دفتر میں کم از کم پانچ چھ گلاس پانی ضرور پئیں۔ دن میں کم از کم آٹھ گلاس پانی پینا چاہیے۔ پانی سے ہی زندگی رواں دواں ہے۔ پانی کی کمی صحت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اچھا ناشتا کریں گے، پانی زیادہ پئیں گے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ تھکن نہیں ہو رہی اور آپ دفتر کے کام اچھی طرح انجام دے رہے ہیں۔

بھنے ہوئے چنے، مکئی کے بھنے ہوئے دانے کھانے سے وزن بھی نہیں بڑھتا بلکہ توانائی ملتی ہے۔ چاکلیٹ وغیرہ کھانے سے بہتر یہ دانے ہیں۔ آپ کو چائے اچھی نہیں لگتی تو سبز چائے پی سکتے ہیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھئے۔

## بالوں کی خشکی

میں نے اپنے بالوں کو بالکل سیدھا کرایا تھا۔ مگر اب وہ روکھے، بے جان اور خشک لگتے ہیں، ٹوٹ بھی رہے ہیں۔ اس کے بارے میں بتائیے۔

(اُمِّ خالد، ملتان)

آپ آدھی پیالی دہی میں دو چمچے سرسوں کا تیل ڈالئے۔ تھوڑا سا شیکوار کا گودہ کاٹنے سے پھینٹ کر ملا کر بالوں میں آدھے گھنٹے کے لئے لگائیے۔ اس کے بعد سر دھو لیجئے۔ بالوں میں ہفتہ میں دو بار تیل، دہی، شیکوار لگائیے۔ اس طرح میتھی دانہ پسوا کر رکھئے، دو چمچے میتھی دانہ لے کر تھوڑے سے گرم پانی میں بھگوئیے۔ اس میں تھوڑا سا دہی ملا کر بالوں میں لگانے سے خشکی دور ہوتی ہے۔ بال نرم ملائم رہتے ہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## ہم غریب لڑکیاں کیا کریں؟

بازار میں طرح طرح کی کریمیں، لوشن، اسکرب نظر آتے ہیں جو ہماری قوت خرید سے باہر ہیں۔ یقین کریں میک اپ کی چیزیں دیکھ کر دل چاہتا ہے اٹھا کر لے آئیں۔ آڑو کا اسکرب بہت اچھا لگتا ہے، مگر دور سے۔ غریب لڑکیاں کیا کریں؟ بتائیے۔

(آمنہ، ساندہ، لاہور)

دکانوں میں چیزیں اس لیے سجائی جاتی ہیں لوگ خرید لیں۔ حالانکہ گھریلو چیزیں ان سے لاکھ درجے بہتر ہیں۔ ایک ملازمہ لڑکی ہمارے ہاں آئی۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا، بال بھی چمکدار گھنے۔ اس سے پوچھا تم کیا لگاتی ہو۔ تمھارا چہرہ اتنا خوبصورت کیوں ہے؟ کہنے لگی، ہم لوگ بہت غریب ہیں، کبھی صابن بھی استعمال نہیں کیا۔ میرا باپ کولہو سے سرسوں کی کھل لے آتا ہے۔ ماں رات کو ایک ٹکڑا مٹی کے پیالے میں بھگو دیتی ہے۔ ہم اسی سے منہ دھوتے اور اسی سے بال صاف کرتے ہیں۔ تیل بھی نہیں لگایا۔ سرسوں کی کھل چکنی ہوتی ہے۔ اس سے بال گھنے اور لمبے ہو جاتے ہیں۔

سرسوں کی کھل میں تیزی ہوتی ہے، اسی لیے ہم اسے استعمال نہیں کرتے۔ بادام اور تلوں کی کھل اچھی ہوتی ہے، اسی سے ابٹن بناتے ہیں۔ آپ کینو، مالٹے کے چھلکے جمع کر کے سکھا لیں۔ ان میں دو چار لیموں کے چھلکے بھی شامل کر لیں۔ ایک چمچہ لے کر پانی میں بھگوئیے۔ آپ دودھ میں بھی بھگو کر چہرے پر لگا سکتی ہیں۔ آہستہ آہستہ مل کر اتاریئے۔ منہ اچھی طرح دھو کر خشک کریں۔ تھوڑا سا عرق گلاب لے کر چہرے پر لگائیے۔ گھر میں پپیتا آئے تو چھلکا اتار کر ایک پھانک لیں، اسے چمچے سے کچل کر چہرے پر لگائیں۔ دس پندرہ منٹ بعد منہ دھو لیں۔ پپیتا بھی چہرے کو صاف کرتا ہے۔ آڑو لے کر آدھا کاٹ لیں۔ اس کا چھلکا اتار کر اسے چمچے سے خوب مسل لیں۔ ایک چمچہ خشک دودھ ملائیں اور چہرے پر لگا لیں۔ سوکھنے پر آہستہ آہستہ مل کر اتار دیں۔ آڑو کے اسکرب کی طرح کام دے گا۔

## پتھر چٹ

مجھے پتھری کی تکلیف ہے۔ کسی نے پتھر چٹ کے بارے میں بتایا ہے۔ کیا اس سے پتھری ختم ہو جاتی ہے۔ بتائیے۔

(بشیر چودھری۔ رحیم یار خاں)

پتھر چٹ عام طور پر مل جاتا ہے۔ سننے میں یہی آیا ہے کہ اس سے پتے کی پتھری کو رنگ بنا کر نکالتے ہیں۔ کسی بھی نرسری سے آپ اس کا گملا لے سکتی ہیں۔ اس کے پتے رس سے بھرے ہوتے ہیں۔ تھوڑے سے موٹے، انہیں ہاتھ سے موڑا جائے تو ٹوٹ جاتے ہیں۔ بارہ مہینے پتھر چٹ کا پودا ہرا بھرا نظر آتا ہے۔ میرے ایک عزیز کو پتھری کی وجہ سے درد لاحق ہوا تو میں نے انہیں ایک گملا پتھر چٹ کا دے دیا۔ انہیں کہا کہ صبح نماز پڑھ کر ایک یا دو چھوٹے پتے لے کر تین یا پانچ کالی مرچوں کے ساتھ چبا کر کھا لیں۔ ایک گھنٹہ بعد ناشتا کریں۔ دس پندرہ دن میں ان کو بہت فائدہ ہوا۔ پھر ان کو پتھری کی شکایت نہیں ہوئی۔ سورج نکلنے سے پہلے پتے چبائیں تو تلخی یا کھارے پن کا احساس نہیں ہوتا، بعد میں کھانے سے تلخی محسوس ہوتی ہے۔

ہر دو تین ماہ بعد میں پکوڑے بناتی تو پتھر چٹ کے پتے توڑ کر دھو کر بیسن لگا کر تل لیتی۔ بڑے مزے کے بنتے تھے۔ بچوں کو ایک ایک پکوڑا دیتی۔ اس کے پتوں کا رس آج بھی ہندوستان میں مختلف امراض کے علاج کے لیے دیا جاتا ہے۔ پتھری کے لیے لیموں کا رس اور زیتون کا تیل بھی مفید ہے۔ کسی اچھے حکیم کی زیرِ نگرانی استعمال کرنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ پتھری کی ابتدا میں پتھر چٹ مفید ہے۔ آپ الٹراساؤنڈ کرائیے۔ پتھری بڑی ہے تو نکلوانی پڑے گی۔ آپ غذا میں بھی احتیاط کریں۔ گوشت زیادہ نہ کھائیے۔ سبزیاں اور پھل آپ کے لیے مفید ہیں۔ ٹماٹر بالکل نہ کھائیے۔ تھوڑی سی غذائی احتیاط سے آپ محفوظ رہ سکتے ہیں۔ پتھر چٹ دس پندرہ دن کھا کر دیکھئے، اس سے نقصان نہیں ہوگا۔ پتھری کے علاج کے لیے بنی ہوئی دیسی ادویات حکیموں کے مطب سے مل جاتی ہیں۔ آپ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ دکھا کر لے سکتے ہیں۔ محترم بھائی حکیم عبدالوحید سلیمانی سے مشورہ کر کے ان کی دوا کھائیے۔ آرام آئے گا ان شاء اللہ۔

## انجیر

میری عمر پچاس سال ہے۔ سردی میں میرا جسم سن ہونے لگتا ہے۔ کبھی پنڈلی، کبھی بازو اور کبھی سارا جسم سو جاتا ہے۔ جوڑوں میں بھی درد رہتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ میری یادداشت خراب ہوتی جارہی ہے۔ پڑھا ہوا بھول جاتا ہوں۔ کوئی ایسی چیز بتائیے جس سے میں سردی کا مقابلہ کرسکوں۔

(ریاض احمد۔ بہاولنگر)

انجیر قدرت کا بہترین تحفہ ہے۔ جنت کا پھل کہلاتا ہے۔ اس میں لحمیات، سوڈیم، پوٹاشیم، میگنیشیم، فولاد، فاسفورس وغیرہ ہونے کی وجہ سے انسانی صحت برقرار رکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ناک اور گلے کی سوزش دور ہوتی ہے۔ پیشاب کھل کر آتا ہے۔ چھوٹی پتھری بھی نکل جاتی ہے۔ قبض دور ہوتی ہے۔ اس سے جسم کی حرارت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ آپ بھی انجیر کھائیے۔ ساری شکایت دور ہو جائے گی۔ دماغی کمزوری کے لیے انجیر اور بادام مفید ہیں۔ تین انجیر سے لے کر پانچ انجیر۔ سات بادام نہار منہ کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ آپ انجیر کھا کر سات بادام، ایک اخروٹ کی گری، ایک چھوٹی الائچی کے دانے پانی میں گھوٹ کر چینی ملا کر ناشتا کریں۔ ایک ماہ کھائیں۔ دماغ کی کمزوری دور ہو جائے گی۔ جوڑوں کا درد بھی ٹھیک ہوجائے گا۔ جسم بھی سن نہیں ہوگا۔ آپ تین دانے انجیر اور سات بادام چھلے ہوئے کھا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک چمچہ شہد پانی میں ملا کر پیئیں۔ انجیر جسم کی حرارت کو قائم رکھنے میں مدد دے گا۔ بڑھاپے میں انجیر ضرور کھانا چاہیے، اس سے قبض بھی نہیں رہے گی اور بھوک بھی لگے گی، طاقت بحال رہے گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک قوم کی تعمیر وترقی
میں زبان بنیادی کردار
ادا کرتی ہے۔ لیکن ہمارا عالم یہ ہے کہ کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا۔ ہم نے انگریزی کو سر پر ایسا سوار کیا کہ اُردو سے غلاموں جیسا سلوک کرنے لگے۔ حتیٰ کہ نئی نسل تو کئی اُردو الفاظ غلط تلفظ و لہجے میں بولتی ہے۔ اسی خرابی کو ڈاکٹر اسدار یب نے محسوس کیا اور ایک فرہنگ مرتب کر ڈالی۔

ملتان کے زرخیز شہر سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر اسدار یب جانے پہچانے ادیب، نقاد اور معلّم ہیں۔ اجداد کا تعلق ادب، انشا و خطابت سے رہا، لہٰذا آپ لغت نویسی سے بے خبر نہیں۔ نیز اب تک تین سفرناموں کے علاوہ مختلف موضوعات پر تیرہ کتب تخلیق کر چکے جن میں اُردو مرثیے کی سرگزشت، تہذیب غم (رسوم اعزا) اور اُردو میں بچوں کا ادب (پی۔ایچ۔ڈی مقالہ) قابل ذکر ہیں۔

ارشاد الاریب میں اُردو کے چیدہ الفاظ کے درست تلفظ، اعراب، صوتیے اور لہجے، فک اضافیت، متشابہ حروف، اصلاحات، قواعد وانشا، علائم رموز، اصول املا، تکلمات اور صحت معانی کے سلسلے میں مفید معلومات درج ہیں۔ تلفظ درست کرنے کی خاطر دیئے گئے اساتذہ کے اشعار تحریر کی چاشنی بڑھاتے ہیں۔ گویا یہ کتاب طلبہ و طالبات، محققین، دانشوروں اور ان عام لوگوں کے لیے بھی مفید ہے جو اُردو صحیح طور پر بولنا، لکھنا اور پڑھنا چاہتے ہیں۔

وطن عزیز میں انگریزی الفاظ کو اُردو میں سمونے کے شائق عموماً یہ دلیل دیتے ہیں ''ان الفاظ کے اُردو مترادف بولنے میں مشکل ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں ایک قصہ لکھا ہے۔ مشہور شاعر، احمد فراز جب نیشنل بک فاؤنڈیشن کے عہدے سے معزول ہوئے تو موصوف نے ایک ٹی۔وی ادبی مذاکرے میں لفظ ''مقتدرہ'' کا مذاق اُڑایا، اس معنی میں کہ اسے کون سمجھتا ہوگا۔

اس اعتراض کا بڑا معقول جواب ڈاکٹر صاحب نے اپنے دیباچے میں کچھ یوں دیا ''ہمارے اس غزل گو کو معلوم ہونا چاہیے کہ ''مقتدرہ'' اس وقت تک مشکل ہے جب وہ آپ کو نیا محسوس ہو۔ جب لوگ اُسے بولنے لگیں (اور وہ زبان پر چڑھ جائے) تب اُسے بھی ڈائلسز، ہیپا ٹائیٹس وغیرہ کی طرح بولنا آسان ہوگا۔''

اس فرہنگ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مرتب نے استعارے، محاورے اور واقعات بیان کر کے اُردو گرائمر کے خشک مضمون کو تر بنایا ہے۔ مثلاً صفحہ ۶۴ پر رقم طراز ہیں ''نفی امر یا عام کے لیے زیر استعمال نا، نہ اور مت کے درست تصرف سے آگاہی ہونی چاہیے۔ چنانچہ ''نہ'' اگر نفی کے لیے استعمال کیا جائے تو یوں آئے گا: ناوقت، نادان، ناکردہ، نامناسب۔ یہ اسم یا صفت سے قبل لگتا ہے۔ بطور تاکید بھی آتا ہے، مگر کلمے کے آخر میں جیسے: آؤنا، بیٹھونا، کھاؤنا۔

آؤنا، ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
(غالب)

یہ صرف ایک مثال ہے ورنہ اُردو کی باریکیاں اور نکات جاننے کے لیے یہ کتاب کسی خزانے سے کم نہیں۔ کتاب کی پیش کش عمدہ ہے، طباعت معیاری اور کاغذ بہترین! اس لحاظ سے کتاب کی قیمت مناسب ہے۔ اسے اپنی لائبریری کا حصہ ضرور بنائیے۔

ملنے کا پتہ: بیکن بکس، گلگشت ملتان
کتاب نگر، حسن آرکیڈ، ملتان چھاؤنی
قیمت: ۵۰۰/روپے

افسانہ یا کہانی ابلاغ کا وہ طاقتور سفیر ہے جو قاری کو زندگی کے تلخ و شیریں حقائق اور سب سے بڑھ کر اِن قیمتی تجربات سے واقف کراتا ہے جو عموماً اُسے حاصل نہیں ہوتے۔ گویا افسانہ اپنے خالق کی آنکھوں سے ٹپکا وہ آنسو ہے جس میں معاشرے کے دُکھوں، خوشیوں، غموں، ناکامیوں، کامیابیوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ اگر اِسی کو افسانہ کی تعریف سمجھا جائے، تو جناب اختر عباس کے افسانے اِس پہ پورے اُترتے ہیں۔

اختر صاحب تعارف کے محتاج نہیں، آپ کے دو افسانوی مجموعے ''پھٹا ہوا دُودھ'' اور ''مما مارشا'' شائع ہو کر قارئین سے داد پا چکے ہیں۔

''خاموشی پیچھے شور'' کے خالق ایسے جذب پذیر دل و دماغ کے مالک ہیں جو روز مرہ زندگی میں پیش آنے والے معمولی واقعات سے بھی بہت کچھ اخذ کرتے ہیں۔ عام انسان اِن معمولی واقعات سے وابستہ پیچ و خم اور اونچ نیچ سے صرف نظر کر جاتے ہیں۔ لیکن یہ عمدہ افسانہ نگاری کا کمال ہے کہ وہ کسی ایک معمولی بات ہی سے پوری کہانی تخلیق کر ڈالتا ہے۔ زیرِ تبصرہ مجموعے کی یہی انفرادیت ہے کہ خالق نے معمولی باتوں کو بنیاد بنا کر ایسے افسانے تخلیق کر ڈالے جو قاری کو رُوح پرور سبق دیتے اور اُسے نت نئے جہانِ معانی سے روشناس کراتے ہیں۔

ایک اور خصوصیت ورق در ورق دِل چھو لینے اور غور و فکر کی دعوت دینے والے خوبصورت جملوں کا ورود ہے۔ یہ جملے حقیقتاً قلب پر جمی گناہوں کی سیاہی دھونے اور اُسے چمکانے کی سعی کرتے ہیں۔ ذرا صرف ایک افسانے ''خاموشی پیچھے شور'' کے جملوں پر نظر دوڑائیے:

☆.....دوستی ہو محبت یا دُنیا داری، ہر جگہ کچھ نہ کچھ مشترک ہوتا ہے، تبھی دل کے تار ملتے، زبان چلتی اور بات سے بات نکلتی ہے۔

☆.....محبت عجیب چیز ہے۔ اس کی بھی خو ہوتی ہے۔ یہ اکثر کم قامتوں کو بالا، چھوٹوں کو سربلند اور دل و نگاہ بدل دیتی ہے۔ محبت کی یہ فضیلت سب پر بھاری کہ کرنے والے کو بادشاہ بنا ڈالتی ہے۔

☆.....کاش تعلقات اور محبت کا اعتبار ایک ہی بار ایسے ہو جائے کہ اُسے روز پانی نہ دینا پڑے۔

☆.....کیا ضروری ہے کہ ہمیشہ منصب جیتے اور منصب والا اپنی خواہشوں سے ہار جائے؟ اللہ جانے، کوئی انسان ایسا نکل آئے جو منصب سے نہ ہارے۔

شاید اِنہی کاٹ دار جملوں کو پڑھ کر جناب ڈاکٹر افتخار کھوکھر نے اختر صاحب کے افسانوں پر یہ دلفریب تبصرہ کیا ''اختر عباس کی کہانیاں بظاہر محبت سے بھری ہیں، مگر وہ پڑھنے والے کو بہت دیر بے چین رکھتی ہیں۔ وہ اُسے بہتر بننے پر اُکساتی اور نئے فیصلوں کی راہ دِکھاتی ہیں۔ آج کے انسان کو ایسی ہی کہانیوں کی ضرورت ہے۔''

درج بالا تبصرے کا آخری جملہ قابلِ غور ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دورِ جدید کا انسان اِن اقدار و روایات سے دُور ہو چکا جو اُسے محبت، دیانت، برداشت، قناعت، جبر اور زندگی کی دوسری قدروں سے آشنا کرتی ہیں۔ اِس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان نے اچھے ادب..... اچھے افسانے..... اچھی شاعری..... اچھے ناول کا مطالعہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ آج وہ مادہ پرستی، ہوس اور زر و زمین کی چاہت میں گرفتار ہو چکا۔ ''خاموشی پیچھے شور'' کے تمام افسانے ہماری اعلیٰ مشرقی اقدار کے امین اور پیغام بر ہیں۔ اُنہیں جی جان سے پڑھیے اور اپنی ویران زندگی میں بہار لے آئیے۔

ملنے کا پتہ: منشورات، ملتان روڈ لاہور ۳۵۴۳۴۹۰۹

قیمت: ۱۲۰/روپے

(تبصرہ نگار: سید عاصم محمود)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تبصرہ: محمود جمال

باغِ بہشت سے جب انسان کو حکمِ سفر ملا تو ساتھ ہی یہ بات بتا دی گئی کہ دنیا تمہارے لیے پھولوں کی سیج ثابت نہیں ہوگی، وہاں آزمائشیں تمہاری منتظر ہیں۔ وہ ایک امتحان گاہ ہوگی جہاں قرطاسِ عمل حل کرنا ہے۔ اس کے لیے ستر اسی سال کی مہلت عمومی دی گئی۔ قرطاس میں سرفہرست تو اللہ سے راز و نیاز کی باتیں ہیں جن کے ساتھ چند رسوم عبادت منسلک ہیں تاکہ انسان کو یاد رہے کہ اس کی ذات کا مکمل احاطہ کرنے والی ایک ہستی کائنات کے اوپر بلکہ یہاں، وہاں ہر جگہ موجود ہے۔ جو میری نگران ہے اور محافظ ہے۔ ورنہ یہ راستہ اتنا کٹھن اور طویل ہے کہ عمریں کھپ جاتی ہیں۔ پھر بھی پتا نہیں ہوتا کہ منزل کا کوئی نشانِ راہ ملا ہے یا نہیں۔

ممتاز عالم دین جناب نجم اللہ عباسی کے دیے گئے خطبات پر مشتمل کتاب بعنوان خطباتِ عباسی میں اسی قرطاسِ عمل کے متعلق مفید نکات ملتے ہیں۔ خطبات میں عباسی صاحب وہ تمام امور زیرِ بحث لائے ہیں جو ایک مسلمان کی حیاتِ اجتماعی کے لیے لازم حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطبات میں ان کے تبحرِ علمی، زیرک نگاہی اور عالمانہ تحقیق نمایاں ہے۔ کوئی مسلمان چاہے تو زندگی کے کٹھن مرحلوں میں اس کتاب سے دنیاوی آلائشوں سے پاک اور مصفّٰی زندگی کے لیے اصول و مبادی اخذ کر سکتا ہے۔ اہم تر امور زیرِ بحث لائے گئے ہیں کیونکہ وہ اہم ترین ہیں۔ اچھی زندگی کے لیے زریں اُصولوں پر مبنی یہ ایک اہم کتاب ہے۔

ملنے کا پتہ: اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مولانا مناظر احسن گیلانی برصغیر کے سربرآوردہ علما اور بزرگوں میں سے تھے۔ یکم اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے ننھیال، موضع استھاواں (بہار) میں پیدا ہوئے۔ دادا، مولانا احسن گیلانی اپنے وقت کے جید عالم دین اور نامور استاد تھے۔ مولانا کی زندگی کا یہ پہلا واقعہ عجیب ہے کہ انہوں نے شادی بلکہ اولاد ہونے کے بعد تعلیم حاصل کی۔ پھر ان کی زندگی میں اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ رونما ہوا۔ انہیں غالباً کسی نے طنزاً غیر تعلیم یافتہ ہونے کا طعنہ دیا۔

مولانا یہ سن کر گھر بار اور بچے سب کچھ چھوڑ کر حصولِ علم کے لیے عازمِ سفر ہوئے اور کامل چودہ سال تحصیلِ علم کے بعد مراجعت اختیار کی۔ گھر پہنچے تو بیٹا جوان ہو چکا تھا۔ یہ بہت منفرد واقعہ ہے۔ واپسی پر انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ گیلانی میں شروع کیا۔ مولانا نے اکتوبر ۱۹۱۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور وہاں اس وقت کے جید علماء سے تحصیلِ علم کیا جن میں شیخ الہند محمود الحسن، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا غلام رسول شامل تھے۔

اس کتاب میں وہ خطوط مجتمع ہیں جو مولانا نے وقتاً فوقتاً مختلف علمائے کرام مشائخ عظام اور مفکرین کو تحریر کیے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے قاری کو دین کی روشنی اور علمی بصیرت ملتی ہے اور خصوصیت سے ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۵۶ء تک کے مختلف ادوار اور ان میں پیش آمدہ احوال و ظروف سے آگاہی ہوتی ہے۔ مولانا کے خطوط کی خاص صفت ان کا انکسار ہے۔

ملنے کا پتہ: مکتبہ عمر فاروق، ۴۹۱، شاہ فیصل کالونی کراچی

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

# چمنِ خیال

## ''پورے کپڑے پہنا دیئے''

ہمارا سارا خاندان اُردو ڈائجسٹ کا قاری ہے۔ بھائی جسٹس افتخار چیمہ صاحب بھی شوق سے پڑھتے ہیں اور بھائی ذوالفقار چیمہ بھی بڑے مداح ہیں۔ والدہ گزشتہ سال انتقال کر گئی تھیں ان کے لیے ایک نظم لکھی تھی۔ میں نے یہ شمارہ تفصیلاً دیکھا اور اسی لیے فون کیا۔

(ڈاکٹر نثار احمد چیمہ، گوجرانوالہ)

(ہم نے ڈاکٹر صاحب سے گوجرانوالہ میں ڈینگی کے اثرات کا پوچھا۔ ہنستے ہوئے بولے: ''ویسے تو قابو میں ہے مگر چھوٹے سے مچھر نے بڑے بڑوں کو پورے کپڑے پہنا دیئے۔ ڈاکٹر صاحب گوجرانوالہ کے ڈائریکٹر ہیلتھ ہیں۔)

## ''بائنڈنگ''

میں ڈائجسٹ کا ریکارڈ رکھتا ہوں۔ بائنڈنگ کھل گئی، بڑی پریشانی ہے۔ ۲۶۵ سے پڑھ رہا ہوں۔ تب والد صاحب لایا کرتے تھے۔

(پروفیسر مسعود راجپوت۔ ٹنڈو جان محمد، میر پور خاص)

(ہم نے بتایا کہ ان شاء اللہ اس ماہ سے دوبارہ پن والی بائنڈنگ بھی ہوگی تاکہ جلد نہ کھلے۔ مشورے اور توجہ کا شکریہ۔ زحمت کی معذرت۔)

## ''ہر چیز ترتیب میں''

ہر چیز ترتیب میں آگئی ہے۔ مضامین، کہانیاں، فیچر، سلسلے الگ الگ اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

(صغیر و بانو شیریں۔ لاہور)

## ''حسن انتخاب کا مرقع''

پرچہ بہت دنوں بعد دیکھا۔ حسن انتخاب کا مرقع کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ پرچہ بہت اچھا لگا۔ ہاں پہلے مجھے لگا کہ یہ کیا کرکٹ پہ کلڑ صفحات ضائع کر دیئے ہیں مگر جب پڑھا تو آپ نے اظہر الدین کے بیٹے کا جو لکھا ہے بہت اچھی بات کی ہے۔ یہ والدین کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ اس طرح کی تحریریں بھی بے حد ضروری ہیں۔

(ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ ممتاز۔ کالر، ماہر اقبالیات)

## ''یہ تو ہمارا اثاثہ ہے''

مجھے علم نہیں تھا کہ آپ آگئے ہیں۔ میں نے اُردو ڈائجسٹ کا شمارہ دیکھا پڑھا۔ جب فیملی میگزین کے لیے اس پر تبصرہ کرنے کے لیے لکھنے لگا تو محسوس کیا کہ اُردو ڈائجسٹ تو نئے سرے سے زندہ ہوگیا ہے۔ پھر ایک دم سے خیال آیا، کوئی نیا ایڈیٹر تو نہیں آیا۔ پڑھا تو علم ہوا۔ بہت اچھا کام کیا ہے۔ یہ ہمارا اُثاثہ ہے۔ اس کو سنبھالا ہے اور خوب سنبھالا ہے۔ تعریف نہیں کروں گا۔ کسی روز آیئے تو اچھی سی چائے پلواؤں گا۔

(علی سفیان آفاقی۔ ایڈیٹر فیملی میگزین، ممتاز مصنف، دانشور)

## ''قدر دانی''

بندہ کی تحریر ''لو بھ کے مارے'' پچیس سال بعد شائع کر کے اُردو ڈائجسٹ والوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے قدر دانوں کو بھلاتے نہیں۔ حالانکہ بندہ کی تحریروں ''وہ پگلی تھی'' اور ''واں جنت نشان'' کو شائع نہ کر کے اُسے مایوس کر دیا گیا تھا۔ اب لکھنے پڑھنے کے میدان میں کوتاہی کے عوض بندہ یہ عرض کرے گا کہ اُس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چند مطبوعہ مضامین ایک دفعہ پھر سے شائع کر دیے جائیں کیونکہ کئی قارئین نے اُسے ''عطر فروش'' کا خطاب دیا اور اُس کی نگارشات کو علمی عطر کہہ کر پکارا۔ آپ لوگوں کی قدر دانی کا شکریہ۔

(محمد اکرم رانجھا۔ آئی۔ ایٹ۔ ون اسلام آباد)

## ''خوشی نہ ہوئی''

نیا شمارہ دیکھا، پڑھا، خوشی نہ ہوئی۔ میری کہانی ۲۰۰۷ء میں چھپی تھی۔ بڑا دُکھ ہوا۔

(آصف ضیا۔ حیدر آباد)

(ہم نے پوچھا کیا کہانی چھپنے پہ دکھ ہوا تھا۔ جواب ملا نہیں اس کے بعد اتنا وقفہ آنے پر اور نہ لکھ سکنے پر ابھی جلدی میں بول گئی)

## ''بچے بھی شوق سے پڑھتے ہیں''

سکول ٹیچر ہوں۔ رسالہ پڑھ کر بچوں کے لیے لائبریری رکھوا دیتا ہوں۔ مجھے کمپیوٹر پہ معلومات اچھی لگتی ہیں۔ آپ کا رسالہ سکول کے بچے بھی بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

(حافظ سرفراز بلو۔ اصلاح معاشرہ لائبریری بچوں عاقل، سکھر)

## ''سوٹوں والے لفافے میں''

رسالہ ہمارے گھر میں سوٹوں والے لفافے میں آیا۔

(مسز کرنل قدیر، ثمینہ قدیر۔ لاہور)

(یہ سن کر ہم مسکرا دیے اور پوچھا کہ سوٹ کا لفافہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کیا؟ پھر بتایا کہ طیب صاحب نے تو بطور خاص اُردو ڈائجسٹ کے سائز کے لفافے بنوائے ہیں تا کہ جس ہاتھ میں ہو اچھا تو لگے۔)

## ''سچی پاکستانیت کا نمائندہ''

سلام مسنون!

''اُردو ڈائجسٹ'' کی ادارت مبارک۔ فیروز سنز لاہور سے آغاز کر کے اب ''اُردو ڈائجسٹ'' میں شرکت آپ کا نیک نام اداروں کی تعمیر میں خلوص کا سفر ہے۔ بچوں کے رسالے ''پھول'' کو آپ نے تازگی اور توانائی دی۔

مجھے یقین ہے کہ ''اُردو ڈائجسٹ'' میں آپ کی ''کہانی نگاری'' کا فن خلقِ خدا کو نئی حقیقتوں سے روشناس کرائے گا۔

میں نے ''قومی ڈائجسٹ'' کی پانچ سال تک ادارت کی۔ ڈائجسٹ قسم کے پرچے کے تنوع اور قارئین کی ضرورتوں سے شناسا ہوں۔ مجھے آپ کی صلاحیتوں کا بھی علم ہے۔ ستمبر کے پرچے میں چند بالکل نئے موضوعات پر مضامین پڑھنے کا موقع ملا اور یہ آپ کے حسنِ انتخاب اور حسنِ نظر کا نتیجہ ہے۔ مجھے اعتماد ہے کہ آپ اُردو ڈائجسٹ کو بھی بہت آگے لے کر جائیں گے۔

میں اب اپنی زندگی کے ۸۴ ویں برس میں قدم رکھنے والا ہوں۔ کمزور صحت اور بیماری کے باعث حافظہ معدوم ہو گیا ہے لیکن مقدور کے مطابق کام کر رہا ہوں اور آپ کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں نیز ممنون ہوں کہ اس کی ترسیل کی تجدید کی، اس کے مطالعے میں شامل کیا۔

الطاف حسن قریشی صاحب کو میرا سلام پیش کر دیں۔ اُردو ڈائجسٹ کا پودا انھوں نے ہی لگایا تھا، انھوں نے ہی اسے شجرِ سایہ دار بنایا، اس کی آبیاری میں متعدد ادیبوں کو شامل کیا اور ایک ادبی کنبے کی صورت دی جو سچی پاکستانیات کا نمائندہ ہے۔

(ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور)

## ''باقاعدگی سے لکھنے کی خواہش''

مجھے خود بھی تصوف کا شوق ہے۔ آپ کا مضمون بہت ہی اثر پذیر تھا۔ بانو آپا کا جو جملہ آپ نے لکھا، اس نے تو رُلا دیا۔ میں چاہتی ہوں کہ باقاعدگی سے لکھوں۔

(سیدہ عطرت بتول نقوی۔ لاہور)

(ضرور لکھیے۔ بس موضوع پہلے ہم سے پوچھ لیا کریں کیونکہ سیاسی مضامین اور ترے مضامین سے ہماری بھی جان جاتی ہے۔)

## ''زبردست شمارہ''

اپنی سکول لائف میں پھول پڑھتی اور زندگی سیکھتی تھی، اب اُردو ڈائجسٹ پڑھتی ہوں۔ اُردو ڈائجسٹ کا مدیر بننے کی مبارک۔ الکریمیہ جامعہ النور میں تجوید کلاس لے رہی ہوں۔ اپنی بچیوں کو بھی بتایا کہ اکتوبر کا شمارہ مجھے کس قدر زبردست لگا۔ چھوٹی چھوٹی اچھی تحریریں، سرخیاں اور فلرز بہت خوبصورت تھے۔

(نسیمہ۔ گوجرانوالہ)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## ''اپنا اپنا سا ڈائجسٹ''

''آپ نے پرچہ بہت اچھا بنا دیا ہے۔'' اب اُردو ڈائجسٹ کو Digest کرنا اور بھی آسان ہو گیا ہے اور جب سے آپ نے انتظام سنبھالا ہے، بالکل اپنا اپنا ہو گیا ہے۔

(فاطمہ فاروق۔ لاہور)

(یہ سن کر ہم نے شکریہ ادا کیا۔ پھر ان سے تعارف پوچھا۔ پتا چلا ملک کے نامور مصور اور ڈیزائنر محمد فاروق اصلاحی کی صاحبزادی ہیں۔)

## ''بہترین انتخاب''

پرچہ بہت اچھا لگا۔ پوری ادارتی ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے، بہت اچھا کر رہے ہیں۔

(افتخار ساجد۔ مدیر ریلوے میگزین لاہور)

(یہ سن کر ہم نے اپنے مولا کا شکر ادا کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ محبت اور اخلاص سے کیے گئے کاموں میں اللہ جی خود ہی برکت ڈال دیتے ہیں، دوسروں کے دل میں اس کی محبت ڈال دیتے ہیں۔)

## ''دلچسپ تحریریں''

میں یہاں فیڈرل گورنمنٹ کالج بہاولپور میں لائبریرین ہوں۔ تازہ پرچہ دیکھا تو حیران رہ گئی، خوشی ہوئی۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ تحریریں بے حد دلچسپ تھیں۔ میں نے تو حقانی نیٹ ورک والا تجزیہ بھی پورا پڑھ ڈالا، ساری باتیں دل کو لگیں۔

(مہوش اسد۔ بہاولپور)

(ہم نے ذاتی فیملی کا پوچھا۔ پتا چلا کہ میاں سید اسد کامران جیل پہ ہوتے ہیں۔ حسن اور ایان زینب بھرے آنگن کے دو پھول ہیں ماشاء اللہ۔ ان کی پوری فیملی اور ابو منور بخاری نے ایک بار ہمارے پورے وفد کی چولستان میں خوب دعوت کی تھی۔ قلعہ دراوڑ سے واپسی پہ چاندنی میں ہونے والا مشاعرہ تو ہم آج بھی نہیں بھولے)

## ''اُردو ڈائجسٹ کیوں ناگزیر ہے''

اُردو ڈائجسٹ بلاشبہ پاکستان کا ریڈرز ڈائجسٹ ہے۔ الحمدللہ، آپ کی ادارت میں سُرعت سے منزلیں طے کر کے علم و ادب کی مزید چوٹیاں سر کر رہا ہے۔ قریشی برادران کے انتخاب کی داد دینا ہم پر فرض ہے کہ

؎ قدر جوہر زرگر بداند یا بداند جوہری

مجھے اللہ کے فضل سے فخر ہے کہ ہر شعبہ زندگی میں اسے متعارف کراتا ہوں۔ منبر و محراب کے وارثوں کو قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ اصلاح امت کے لیے آپ کے مؤقر جریدے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دینی جامعات میں بلکہ ججوں اور پولیس آفیسران کو ہر کورس کے اختتام پر اُردو ڈائجسٹ پیش کرتا ہوں۔ اس سے نہ صرف ہمیں اسلاف کے کارناموں سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ دورِ جدید کی نفسیاتی، سائنسی اور تکنیکی موشگافیاں ہمیں اجنبی بننے سے محفوظ رکھتی ہیں۔ ہر ماہ چند نئے نئے پرچے احباب کو تحفے میں دیتا ہوں۔

(پروفیسر محمد مزمل احسن شیخ۔ لاہور)

## ''ایسے لوگ زندہ رہتے ہیں''

اگر اشفاق احمد نمبر بھی دیا جاتا تو کیا خوب ہوتا۔ ایسے لوگ مرتے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

(نقی حسین نقی امروہوی۔ کراچی)

## ''اپنی کہانی کی اصلاح پہ خوشی''

اُردو ڈائجسٹ میں سب کچھ ہی مل جاتا ہے۔ تجزیے، ترجمہ شدہ کہانیاں بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ ایم۔ اے اُردو کیا ہوا ہے۔ میری کہانیاں کئی جگہ چھپی ہیں مگر کسی نے اصلاح نہیں کی۔ اُردو ڈائجسٹ میں کہانی چھپی تو میری کہانی کی اتنی ساری غلطیاں نکال کر شائع کیا گیا۔ اصلاح کا بہت مزا آیا۔ جب آپ نے پھول چھوڑا تھا تو میں اور میری سسٹر ان لاء صفیہ نے بھی چھوڑ دیا تھا۔ آپ کا اداریہ بہت اچھا لگتا تھا۔

(کنول ریاض۔ منڈی بہاوالدین)

## ''قدرت اللہ شہاب پر کچھ دیجیے''

نئے مدیر کی آمد اُردو ڈائجسٹ کو بہت بہت مبارک ہو جنھوں نے شمارے کو ایک نیا رنگ دیا جو بہت بھایا۔ آپ سے درخواست ہے قدرت اللہ شہاب کا افسانہ ''ماں جی'' ضرور شائع کریں۔ گزشتہ دنوں شہاب نامہ پڑھنے کو ملا جس نے اک نئی دنیا کی سیر کروا دی اور ہم ورطہ حیرت میں ایک ایک لفظ اپنے اندر اتارتے رہے۔ ایسے ہی ممتاز مفتی کی کتاب ''لبیک'' نے بہت سے دن ہمیں اک نئے جہان میں رکھا۔ کہاں گئے وہ لوگ۔ کیا آج کے دور میں بھی کہیں اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی جیسے لوگ ہوں گے۔

(تاجیہ ملک فہاری۔ آزاد کشمیر)

(آنے والے مہینوں میں ان شاء اللہ آپ کی فرمائش پوری ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی دنیا وسیع اور نعمتوں سے بھری ہے، ڈھونڈیے ضرور ویسے لوگ مل جائیں گے۔)

## ''قلمی اُستاد''

میرے مضامین اپریل ۱۹۷۲ء اور مئی ۱۹۷۳ء کے اُردو ڈائجسٹ میں بھی چھپ چکے ہیں۔ گزشتہ آٹھ سالوں سے کالم نگاری کررہا ہوں۔ آج جو کچھ بھی ہوں، الطاف حسن قریشی کی تحریروں کے اسلوب اور اللہ کی خصوصی کرم نوازی کی وجہ سے ہوں۔ وہ میرے قلمی استاد ہیں اور راہنما بھی۔

(مشتاق احمد فاروقی۔ ملتان)

## ''مشینی ذبیحے کا مسئلہ''

میرے بچے کینیڈا میں ہیں۔ ''پاپائے ز'' کے نام سے میرا بزنس ہے۔ ہم حلال چکن دیتے ہیں۔ ۶ ماہ سے ہیڈ آفس والوں نے شروع کیا ہے کہ مشین سلاٹرڈ دیں گے۔ میرا دل نہیں مانتا۔ وہ کہتے ہیں ہم تکبیر پڑھ کر مشین چلاتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں پورا نظام بھی دکھایا ہے۔ آپ میری پریشانی حل کریں اور بتائیں کہ کیا تکبیر پڑھ کر کیا گیا مشینی سلاٹرڈ چکن جائز ہے۔ سنا ہے جامعہ ازہر والوں نے اس کو جائز قرار دے دیا ہے۔ انھوں نے حلال سمجھ کر اسی کو اپنایا ہوا ہے۔ ہم ۱۴ اسٹوروں نے اکٹھے ہو کر عدالت سے ''سٹے'' لے لیا ہے کہ ہمیں تو ہاتھ سے کیا ہوا سلاٹرڈ چکن ہی فراہم کیا جائے۔ شرعی طور پر یہ بتائیے کہ تکبیر پڑھ کر مشینی سلاٹرڈ جائز ہے یا نہیں۔

(خواجہ نصیر احمد۔ جہلم)

(ہم پہلے تو ان کا فون سن کر بہت ٹھٹکے کہ یہ کیا سمجھ کر فون کر رہے ہیں۔ پھر کہا کہ مسئلہ تو دل ماننے کا ہے، کسی مفتی صاحب کے پاس جانے کا نہیں۔ سو جگہ سے فتویٰ بھی لے لیں، اگر دل نہیں مانے گا تو مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ میرا ذاتی معمول تو یہ ہے کہ جہاں دل اٹکے، وہاں اللہ جی سے دعا مانگ کر راہنمائی کی درخواست کرتا ہوں، دل کے ٹھک جانے کی دعا کر لیتا ہوں ہمیشہ راہنمائی مل جاتی ہے)

## ''زندہ قوم کی لیڈر شپ''

گزشتہ دنوں مجھے الحمرا ہال میں محکمہ صحت پنجاب کے زیراہتمام ڈینگی کے حوالے سے سیمینار میں شرکت کا موقع ملا۔ میں نے ڈینگی کے حوالے سے ایسی معلومات حاصل کیں جو بہت مفید ثابت ہوئیں۔ اس سیمینار کے بعد میں اپنے مریضوں کا بہتر طریقے سے علاج کرسکتا ہوں۔ پروفیسر فیصل مسعود صاحب نے ایک مختصر سے لیکچر میں دریا کو کوزے میں بند کردیا۔ بہت سے ابہام دور ہوئے اور مکمل راہنمائی حاصل ہوئی۔ ڈینگی کے علاج کے متعلق کئی دشواریاں دور ہوئیں۔ اس پروگرام کے تمام منتظمین کا شکریہ، انڈونیشی وفد کا بھی بہت شکریہ۔ انھوں نے اس بیماری کو ہم سے پہلے سہا اور اب ان کے بنائے ہوئے پروٹوکول اور فلو چارٹ ہمارے لیے بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہورہے ہیں۔ وہ اس مشکل گھڑی میں بھی ہمارے ساتھ اسی طرح کھڑے ہیں جیسے انھوں نے ہر مشکل میں ہمارا ساتھ دیا۔ ہم پریکٹیشنرز اصل میں فلٹر کلینک ہیں کہ سب سے پہلے مریض نے ہمارے پاس ہی آنا ہے۔ اگر ہم ان کو صحیح علاج پہ لے جائیں تو مریضوں کا بہت فائدہ ہوسکتا ہے اور شرح اموات بھی کم ہوسکتی ہے۔ دو تین سال پہلے ہمیں علم ہی نہیں تھا کہ ہم کیا کریں یا کدھر جائیں لیکن اب میرے خیال میں ایسا نہیں۔ حکومت نے ایک کمال یہ کیا کہ آگاہی مہم گھر گھر اور سکول سکول پہنچادی ہے۔ زندہ قوم کی لیڈر شپ کو اسی جذبے سے کام کرنا چاہیے۔ حکومت پنجاب کو پریکٹیشنرز کے لیے ایک ماہانہ ٹیچنگ پروگرام منعقد کرنا چاہیے جس کے تحت ہر بیماری کے متعلق نئی تحقیقات سے آگاہ کیا جائے تاکہ مریضوں کا زیادہ بہتر علاج ہوسکے۔

(ڈاکٹر اصغر علی۔ لالہ زار، لاہور)

## ''تزئین و آرائش کا نیا انداز''

اُردو ڈائجسٹ کی ادارت مبارک۔ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ اس ادارے سے وابستہ ہوگئے۔ مضامین کا انتخاب اور پرچے کی تزئین و آرائش کا نیا انداز بے حد پسند آیا۔ اُمید کرتا ہوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مزید نکھار پیدا ہوگا جو اس ہر دلعزیز ماہنامے کی عزت و وقار کو مزید چار چاند لگائے گا۔

(ظفر اقبال بلوچ۔ شان اسلام گلبرگ، لاہور)

## ''لکھنے والوں کے فون نمبر''

میری تجویز ہے کہ مصنف کا فون/موبائل نمبر بھی شائع کردیا کریں۔ لکھنے والے کو قارئین کے ذریعے اپنی ''اوقات'' کا فوری پتا چل جائے گا۔

(اعجاز احمد۔ ڈنگہ)

(پہلے مرحلے میں اس ماہ سے ہم لکھنے والوں کے تعارف کا سلسلہ شروع کررہے ہیں تاکہ قارئین انھیں تو جان سکیں۔ نام سے آگے بھی تو ایک دنیا ہوتی ہے۔ طاہرہ کو مبارک ہو، اگلے ماہ اُس کا مضمون آرہا ہے۔)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## ''کیا کروں؟''

مجھے اُردو ڈائجسٹ اچھا لگتا ہے۔ مگر مجھے اُردو پڑھنی نہیں آتی، کیا کروں؟

(وزیر شاہ۔ لکی مروت)

(حضور! اُردو قاعدے سے سیکھنے کا آغاز کریں اور گھبرائیں مت۔ ان شاء اللہ جلد ہی مشکل آسان ہو جائے گی۔)

## ''جواب دیں''

اُردو ڈائجسٹ کا مطالعہ ہماری وراثت ہے۔ میرے بزرگ پڑھتے تھے سو ہم بھائی بھی پڑھتے ہیں۔ آپ اس بات کا ضرور جواب دیں کہ سپریم کورٹ نے کراچی کے ازخود نوٹس کا فیصلہ کیسا دیا ہے۔ اگر حکومت نے یہ کرنا تھا تو سپریم کورٹ نے نوٹس کیوں لیا۔

(ارشد محمود۔ چکوال)

(فیصلے پر سچے دل سے عمل میں ہی بہتری ہے اور دیکھیں کہ بہتری تو عملاً ہوگئی ہے۔ اتنی جلدی غصے میں آنا صحت کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ حضور! جواب جس سے لینا ہو، اسی کو لکھا کریں، اسی سے لیا کریں۔ میں تو کبھی سپریم کورٹ نہیں گیا؟)

## ''اگر بارشیں بحیرہ عرب پہ ہی برسادی جائیں''

ہماری ٹیم نے سندھ کے دیہی علاقوں میں ایک بڑی این۔ جی۔ او کے تعاون سے ۹۹ دیہات میں سورج اور ہوا کی مدد سے بجلی پہنچائی۔ یہ جو مون سون کی ہوا کے باعث بارشیں ہوئیں اور سیلاب آیا تو ان ہواؤں کو بحیرہ عرب پہ ہی برسایا جاسکتا ہے۔ بڑے شوق سے لکھتا ہوں، اپنے ابا کی وجہ سے شروع کیا۔

(محمود عدنان۔ کراچی)

(وہ کیسے! ہم نے اشتیاق سے پوچھا۔ محمود صاحب نے کہا جیسے چین میں کھیتوں پہ بارشیں برسائی جاتی ہیں)

## ''اے حمید کی یاد میں''

اے حمید کی یادیں بہت اچھی لگیں۔ ان کی یاد تازہ ہوگئی۔ ٹوٹکے شوق سے پڑھتے ہیں۔ تراجم اور ایڈونچر والی کہانیاں بھی اچھی لگتی ہیں۔

(عنبرین طاہرہ۔ منڈی بہاؤالدین)

## ''شمارہ وقت پہ ملا''

اس بار اُردو ڈائجسٹ وقت پہ ملا۔ پہلے بہت انتظار رہتا تھا۔ یکم کو مارکیٹ آگیا تھا۔ امید ہے کہ یہ روایت جاری رہے گی۔ بچوں کے صفحات بھی دینا شروع کریں۔ آپ اداریہ وغیرہ لکھا کریں۔ تبدیلی بہت اچھی ہے۔ آپ کی کہانی کی کمی ہے۔ کوشش نہیں کرتے، بس کریں۔ آپ کی کہانی ضرور پڑھنے کو ملنی چاہیے۔ کیریئر کے حوالے سے بھی دیا کریں۔

(صداقت حسین ساجد۔ شورکوٹ)

## ''خوشگوار اور مثبت''

شمارہ بہت اچھا لگا۔ پچھلے ماہ سے تبدیلی محسوس کی، پلیزنٹ ہے، بہت خوشگوار اور مثبت۔ پہلی نظر میں مضامین، ان کی سرخیوں نے متاثر کیا۔ جس قدر پڑھا عمدہ افسانے اور مضامین۔

(عزالہ رفیق۔ لیکچرار ایئر فورس کالج سرگودھا)

## ''ہلکی پھلکی بزنس''

۱۶۔۱۷ سال سے اُردو ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں۔ میری ''ہلکی پھلکی'' بزنس ہے۔ آپ کا حقانی نیٹ ورک والا تجزیہ بے حد عمدہ تھا، البتہ ایک دو باتیں توجہ کے ضمن میں ہیں، سمیع الحق اکوڑہ خٹک کا نام سمیع اللہ لکھا گیا۔ اس جنگ میں ہمارا ۹۱ء۶۸ بلین کا نقصان ہو چکا ہے۔ اس نقصان کا قومی طور پر ہمیں کوئی احساس نہیں ہے۔ ''وار آن ٹیرر'' نے ہمیں سالوں پیچھے پھینک دیا ہے۔ ہزاروں گھروں کے وارث اور سربراہ چھین لیے ہیں اور امریکہ کبھی کسی کا ہوا نہیں، ہمارا کیسے ہوسکتا ہے۔

(مشتاق احمد خاں۔ پشاور)

(خان صاحب اس قدر محبت سے فون کرنے اور تصحیح کرنے کا شکریہ۔ امریکی وفا تو اس تپتی ہوا جیسی ہے جو کسی کی نہیں ہوتی۔ آگئی تو اُڑا کے لے گئی، جلا کے پھینک دیا۔ نہ آئی تو مہینوں حبس سے دم گھٹتا رہے۔ آپ کی ضرورت سے نہیں، ہر جگہ اپنی پسند سے آتی جاتی ہے۔)

## ''دس برسوں کا ثمر''

اختر عباس تم وہ ہو! جس سے مجھے بہت پیار ہے، صحت و سلامتی سے رہو، اپنی دس برسوں کی محنت کا ثمر تمھیں دے رہا ہوں اس کا ذائقہ لینا اور مجھے بتلانا؟ کیسا ہے؟ یہ کوئی عام کتاب نہیں۔ یہ ایک فرہنگ ہے۔ نام اس کا ''ارشاد الاریب'' ہے۔ اگر تبصرہ کے لائق جانو تو تبصرہ کردینا۔ سب متعلقین کے لیے سلام رحمت۔

(اسد اریب۔ گلگشت، ملتان)

## ''بچوں کی چیزیں ضرور دیں''

اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ پرچہ ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ مجھے میرے ایک بہت ہی محترم ڈاکٹر اعجاز صاحب نے کہا ''پرچے کی نشاطِ ثانیہ ہو رہی ہے۔'' میری دعا ہے کہ اللہ مزید ہمت اور بصیرت عطا فرمائے۔ بچوں کی چیزیں ضرور دیا کریں۔

(پروفیسر محمد ظریف۔ کراچی)

## ''دو کام کرنے ہوں گے''

آپ کے توسط سے اُردو ڈائجسٹ کا نیا قاری بنا ہوں۔ یہ میری عمر سے بھی بڑا ڈائجسٹ ہے۔ نئے مدیر اور نئے قارئین سے مزین ہونا اس بابے ڈائجسٹ کو بھی یقیناً بھلا لگے گا۔ آپ جہاں جاتے ہیں اک نیا جہاں آباد کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں ناں کہ ڈیرے دار آدمی جنگل میں بھی اپنا ڈیرہ آباد کر لیتا ہے۔ آپ کو یہاں اس ڈائجسٹ میں انتہائی اہم دو کام کرنا ہوں گے۔ ایک تو پرانے قارئین کی پسند اور خواہشات کا خیال رکھنا ہوگا اور دوسرے ڈائجسٹ میں گنجائش پیدا کرنی ہوگی کہ اس میں نئے اذہان، نئے آئیڈیاز، نئی جہتیں اور نیا ٹیلنٹ اپنا ہنر آزما سکے۔ اکتوبر ۲۰۱۱ء کا شمارہ حقیقت میں ایک ہمہ رنگ اور وقار کا آئینہ دار شمارہ ہے۔ حالاتِ حاضرہ پر تجزیے، افسانے، مضامین اور تربیت ساز کتابوں کے ذکر نے بہت دیر اپنی طرف متوجہ کیے رکھا۔ ''ونگ لائن پر کون پہنچتا ہے؟'' کی اشاعت پر مبارک باد قبول فرمائیں۔

(خواجہ مظہر صدیقی۔ ملتان)

## ''بڑے لوگوں کو خراجِ تحسین''

شمارہ بہت اچھا لگا۔ مضامین کا انتخاب ہی نہیں پیش کش بھی قابلِ تعریف لگی۔ میری بیوی اور بیٹی کی بھی یہی رائے تھی۔ ہاں بائنڈنگ بہتر کریں۔ بڑے لوگوں کو جو ابھی زندہ ہیں، خراجِ تحسین پیش کرنے کی روایت ضرور ڈالیں۔ مختار مسعود، انتظار حسین، بانو قدسیہ، جمیل الدین عالی، مستنصر حسین تارڑ، عبداللہ حسین، الطاف فاطمہ، سوچیں گے تو کئی نام سامنے آئیں گے۔

(پروفیسر محمد ارشد جاوید۔ شادمان، لاہور)

(بہتری کا حل پروفیسر صاحب سے تفصیل سے زیرِ بحث رہا۔ ''ہم نے سنا اور کر ڈالا'' والا معاملہ آپ کے سامنے ہے۔)

## ''پہلے شمارے سے قاری''

اُردو ڈائجسٹ کی خوبصورتی اور معیار میں واضح فرق نظر آنے لگا ہے۔ رسالے کی جاذبیت میں اضافہ محسوس ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ آپ کی محنت رنگ لائے گی اور رسالہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے گا۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ قریشی برادران کا شکریہ کہ وہ آپ جیسی شخصیت ڈھونڈ لائے ہیں۔ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ جب سے اُردو ڈائجسٹ شروع ہوا ہے، میں اس کا قاری ہوں۔

(سید انعام علی رضا۔ احمد پور شرقیہ)

## ''اُردو ڈائجسٹ کی جوانی لوٹ آئی ہے''

بہت دل چاہ رہا ہے کہ آفس آ کر مبارک دوں۔ الطاف حسن قریشی صاحب کی بیماری کے دوران حاضری دیتا رہا۔ ان کو مبارک بھی دی اور شکریہ بھی کہا کہ اُردو ڈائجسٹ کو آپ جیسا مدیر دیا۔ اُردو ڈائجسٹ اصل میں کسی فرد کا ادارہ نہیں رہا اب یہ قوم کی امانت ہے۔ اس نے دو نسلوں کی ذہنی آبیاری کی۔ ان کی تربیت کی۔ اُردو سے ہی نہیں ملک سے بھی جوڑے رکھا۔ یہ فضیلت کہاں سب کو حاصل ہوتی ہے۔ سچ کہوں تو آپ کے آنے سے اُردو ڈائجسٹ کی جوانی لوٹ آئی ہے۔ وہ جو پیری کے آثار تھے وہ ختم ہو گئے۔ ایک ایک صفحہ پہ محنت، ایک ایک فلر کے لیے کی گئی جستجو اور سب سے اہم یہ کہ چمنِ خیال میں قارئین کے خطوط اور آراء۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ کس قدر خطوط آتے ہیں اور آپ ان میں سے اپنا ذکر کاٹ کر چھاپتے ہیں۔ اُردو ڈائجسٹ کی تحریریں آنکھوں کو راحت ہی نہیں دیتیں، روح کی تازگی کا بھی سامان ان میں خوب ہوتا ہے۔ طیب صاحب سے بھی کہیے کہ کسی روز میں خود حاضری دوں گا۔ سُنا ہے آفس بھی بڑا خوب صورت بنایا ہے۔

(رؤف طاہر۔ میڈیا ایڈوائزر، حکومتِ پنجاب)

## ''شاباش عمران بھائی! لگے رہو''

کچھ عرصہ قبل عمران نے الطاف حسین اور ایم۔کیو۔ایم کے خلاف خوب مہم چلائی اور اعلان کیا کہ میرے پاس ثبوت ہیں (جو مبینہ طور پر نصیر اللہ بابر نے مہیا کیے تھے) جس کی بنا پر میں برطانیہ میں الطاف کے خلاف مقدمہ قائم کروں گا۔ نصیر اللہ بابر نے عمران کو اول درجے کا بے وقوف اور جذباتی قرار دے ڈالا۔ عمران




Courtesy www.pdfbooksfree.pk


### اُردو ڈائجسٹ سے محبت کے اظہار کا راستہ ''ایک پڑھائے ایک اور''

قارئین محترم! آپ کے خطوط، ٹیلی فونز اور پیغامات کا بے حد شکریہ۔ یہ لکھے اور کہے لفظ بہت خوشی دیتے اور ہمت بندھاتے ہیں۔ کتنے ہی قارئین نے پوچھا ہے ہم اُردو ڈائجسٹ کے لیے کیا کریں۔

ہم نے سوچا کیوں نہ سب مل کر ایک مہم کا آغاز کرتے ہیں۔ ''ایک پڑھائے ایک اور'' یعنی ہر قاری اپنے کسی ایسے دوست یا عزیز کو اس ماہ سے اُردو ڈائجسٹ پڑھانے کا آغاز کرے جو پہلے سے قاری نہیں ہیں۔ انھیں سالانہ خریدار یا ماہانہ خریدار بنائیے۔ یوں ان شاء اللہ آنے والے تین ماہ میں اُردو ڈائجسٹ کے چاہنے والوں کے خاندان کو دگنا کرتے ہیں، ہم آپ سب مل کر۔ محبت تو ہمیشہ اپنے اظہار کا راستہ مانگتی ہے۔ لیجیے ایک راستہ تو مل گیا۔

فون کے لیے آپ پیر سے جمعہ دوپہر ۲ بجے سے ۵ بجے تک 042-35290738 پہ مجھ سے براہِ راست بات کر سکتے ہیں۔

اپنے مشوروں، تجاویز اور تنقیدی خیالات سے آگاہ کر سکتے ہیں۔

بے حد شکریہ
آپ کے مدیر
اختر عباس

خان کی امریکی سفیر سے ملاقات ہوئی اور چند دنوں کے اندر عمران نے الطاف بھائی کو فون کر کے ان کے ملکی مسائل پر ''جراتمندانہ موقف'' کی تائید کر دی۔ عمران کی اس ''تبدیلی کے نشان'' کے ساتھ ہی ایک اور ''تبدیلی'' آ گئی۔ اب ٹی۔وی پر ایم۔کیو۔ایم اور تحریک انصاف کے نمائندے اکٹھے ہو کے مسلم لیگ (ن) کے خلاف مہم چلانے میں مصروف ہو گئے۔

چند روز قبل عمران نے ایک بیان میں بتایا کہ میری پارٹی کے نوجوان مسلح ونگ بنانے کے حق میں ہیں جنھیں میں نے روکا ہوا ہے۔ یہ کیا کریں گے جس سے روکا ہوا ہے۔ حال ہی میں عمران کی پارٹی میں شامل ہونے والے لاہور شہر اور اس کے گرد و نواح کے پیپلز پارٹی اور ق لیگ کے کچھ سابق عہدیداران نہایت مجرمانہ ریکارڈ کے حامل ہیں۔ ان میں ایک ایسے لیڈر بھی ہیں جو لاہور میں ایم۔کیو۔ایم کا آفس بھی کھول رہے تھے۔ مگر بوجوہ اپنا ارادہ تبدیل کر کے تحریک انصاف میں شامل ہو گئے۔ شاید ایم۔کیو۔ایم سٹائل کی ''تبدیلی'' انھیں عمران کی پارٹی میں نظر آ گئی۔

چند روز قبل عمران نے لاہور میں جلسہ کیا اور فرمایا کہ اب معلوم ہوگا کہ ''لاہور کس کا ہے؟'' جلد باز عمران خان نے یہ راز کھول دیا ہے کہ اصل کہانی ملک کے نصیب بہتر بنانے کی نہیں بلکہ لاہور پر قبضے کی ہے۔

بھلا ہو ''تبدیلی کی نوید'' سنانے والوں کا کہ وہ لاہور کو بھی کراچی بنانا چاہتے ہیں۔ عمران خان کی اُٹھان الطاف حسین جیسی ہے۔ جذباتیت، مزاج کی گرمی، عدم برداشت اور پورے شہر پر قبضے کی خواہش عمران کو بالکل الطاف بھائی سے مماثل کرتی ہے اور جب فوج اور امریکہ بھی پشت پر ہو تو سونے پر سہاگہ۔ شاباش عمران بھائی، لگے رہو۔

(سکواڈرن لیڈر (ر) عبدالنعیم خاں۔ لاہور)

## ''روح تک راضی ہو گئی''

اُردو ڈائجسٹ دیکھ کر روح تک راضی ہو گئی۔ میں آپ کو ایڈیٹر کے علاوہ ایک اور حیثیت سے بھی جانتی ہوں۔ آپ ممتاز ناول اور افسانہ نگار نوشین ناز اختر کے میاں ہیں۔ ان کے افسانے تو زندگی سکھاتے ہیں۔ راہ دکھاتے ہیں۔ میں نے ان کے دونوں ناول ''آمرزش'' اور ''محرمِ دل'' پڑھ رکھے ہیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو ان سے اُردو کے لیے ضرور لکھوائیے۔ میں بھی لکھنا چاہتی ہوں، کیا کروں؟

(فریدہ خانم۔ چوبرجی، لاہور)

آنسوؤں کی فصلوں سے کھنڈر آباد نہیں ہوتے

# ڈینگی سے سو گنا بڑا مسئلہ

## ناشتا

مکمل ہو چکا تھا، آفس روانگی کے لیے اٹھنے ہی والا تھا جب اہلیہ نے بڑے مدھم سروں سے کچھ کہنا شروع کیا ''والدہ کی طبیعت سخت خراب ہے۔ دو دن سے بخار میں مبتلا ہیں۔ ہم انھیں ملنے اور دیکھنے کے لیے جا بھی نہیں سکے۔ آپ آفس سے ہی اس قدر لیٹ آتے ہیں کہ جانے اور بتانے کی نوبت ہی نہیں آسکی۔''

پھر اس نے بڑے رسان سے کہا: ''آپ کے لیے ممکن ہو تو ہم ابھی ہو آئیں، میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔'' اس کے جملوں کو والدہ کے لیے محبت، ملنے کی بے تابی اور جانے نہ جانے کی بے یقینی نے عجیب دھواں دھواں سا کر دیا تھا۔

در دِل پر دستک

اختر عباس

مجھے فیصلہ کرنے میں ایک لمحہ ہی لگا۔ ''چلیے ہم ہو آتے ہیں'' میں نے اہلیہ کی ڈھارس بندھائی۔ مگر دل ہی دل میں سخت پشیمانی سی ہوئی کہ ماں دو دن سے بیمار ہے اور بیٹے کو خبر نہیں۔ اپنی والدہ کو کھو دینے کے بعد میرے پاس تو ماں جیسی وہی واحد ہستی ہیں جو بے لوث اور غیر مشروط محبت کرتی ہیں۔ کسی مطالبے کی توقع اور کسی تمنا کے بنا۔ ایسی مائیں کم لوگوں کو میسر آتی ہیں۔ وہ میری ہی نہیں میرے بچوں کی بھی ''مم جی'' ہیں۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے جیسے وہ صرف محبت بھری دعاؤں سے گوندھی گئی کسی مٹی سے بنی ہیں۔ جگت ماں کی ساری خوبیاں اللہ جی نے ان کے وجود میں ودیعت کر دی ہیں۔

بچے سکول جا چکے تھے۔ ہم دونوں اقبال ٹاؤن میں والدہ کے پاس پہنچے۔ وہ بخار میں تپ رہی تھیں۔ ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر کمزوری سی مسکراہٹ نے ہمارا استقبال کیا۔ بیٹی مل کر رو دی اور میں ''خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زبان میری'' کا سہارا لے کر خاموشی سے انھیں دیکھتا اور دعائیں کرتا رہا۔

واپسی پہ گھر کے قریب پہنچے تو اہلیہ نے دھیرے سے کہا ''مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ امی کی بیماری کی وجہ سے نہ رات کھانا کھا سکی نہ صبح ناشتا کیا''۔ وہیں سے گاڑی موڑی اور سبزہ زار سوک سینٹر سے متصل ''فرائڈ چکس'' پہ جا پہنچے۔ ابھی ہم گاڑی سے اترے نہیں تھے کہ دکان کے دروازے کے ساتھ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکی پہ نظر پڑی۔ وہ بہت تیار ہو کر آئی تھی اور موبائل پہ کسی کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ دکان کے دائیں طرف ایک پٹرول پمپ ہے اور بائیں طرف جم۔ اہلیہ نے میری طرف دیکھا اور مجھے اُترنے سے روکا اور بولی میرے ساتھ ساتھ پڑھیے:

**اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِهٖ وَ فَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا ط**

ترجمہ ''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے اس حال سے بچایا جس میں تجھے مبتلا کیا۔ اس نے اپنی بہت سی مخلوق پر مجھے فضیلت دی۔''

دعا پڑھ کر ہم نیچے اترے اور دکان میں داخل ہو گئے۔ وہ لڑکی بھی ہماری آڑ لے کر ہمارے پیچھے پیچھے اندر آ گئی اور دروازے کے ساتھ رکھے پہلے ہی بنچ پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ کاؤنٹر تک جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہاں کھڑے دو سمارٹ سے لڑکوں نے دور سے ہی معذرت خواہانہ انداز میں کہا ''سر ابھی تو شاپ کھولی ہے۔'' تب ساڑھے دس بجے تھے۔ ''ایک گھنٹہ لگے گا تیاری میں، پھر پیش کر سکیں گے۔'' ہم الٹے قدموں لوٹ آئے۔ وہ اکیلی لڑکی وہیں گیٹ کے ساتھ سر جھکائے فون کے نمبر ڈائل کرنے میں مصروف تھی اور شاپ والے لڑکے اسے عجیب ندیدی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

گاڑی میں بیٹھ کر ہم دونوں ایک عجیب سی افسردگی کی لپیٹ میں تھے۔ جانے کس کی بیٹی تھی۔ گھر سے سکول، کالج یا کسی دفتر جانے کے لیے تیاری کر کے آئی تھی اور یہاں شاپ میں کسی ایسے لڑکے کی منتظر تھی جو وقت دے کر بھی نہیں پہنچا تھا۔ ایسی شناسائیوں کی عمر زیادہ لمبی نہیں ہوتی۔ یہ تعلق بھی دیرپا نہیں ہوتا مگر عمر بھر کا دکھ اور زخم ضرور دے کر جاتا ہے۔

کہنے کو اسے ڈیٹ پہ نکلنا کہیے یا خوش وقتی، جس تعلق کو اپنے پیاروں سے چھپانا پڑے۔ چھپ چھپ کر دکانوں، پارکوں اور ہوٹلوں پہ ملنا پڑے۔ اس تعلق میں خیر کیسے پڑ سکتی ہے۔ اس جیسی لڑکیوں کو انتظار میں کھڑے جتنے لوگ دیکھتے ہیں، وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی تعلق کی نوعیت کو جان رہے ہوتے ہیں۔

اور جب اُس جیسی بیٹی کی والدہ، والد یا بھائی کو کوئی جاننے والا وہاں سے گزرتا ہوا دیکھتا ہے تو کیا کیا گمان کرتا ہے، وہ بچی یہ جان بھی نہیں سکتی۔

صرف اپنی خوشی اور اپنی پسند کے لیے سوچنے اور جینے والے یہ بچے کبھی اس دکھ اور تکلیف کا احساس بھی نہیں کر پاتے جو انھیں اس خفیہ شناسائی کے نتیجے میں ملنے والی ہوتی ہے۔ اس تعلق کے افشا ہونے پر گھر والوں کو جس رسوائی اور بدنامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کی شدت کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔

''اللہ اس کی عزت اور شرم سلامت رکھے''۔ وہاں سے روانہ ہونے لگے تو اہلیہ نے بے ساختہ کہا۔ کاش ایسی اولاد کی وجہ سے گھر والوں کو کسی بڑے عذاب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس نے یہ دعا اس لیے پڑھی تھی۔ یہ دعا کسی کو ایسی حالت میں دیکھ کر پڑھی جاتی ہے جو آپ نہ چاہتے ہوں کہ آپ یا آپ کی اولاد کو اس کا سامنا کرنا پڑے۔

میں نے اس دعا کو حادثوں، بیماریوں اور دکھ دینے والے سانحات، سبھی میں موثر پایا۔ یہ منظر بھی کسی حادثے جیسا ہی تھا یا ممکن ہے ہم دونوں کو ہی ایسا لگا کہ اندر تک دہل گئے۔ اس لیے لوگ بیٹیوں کو آبگینہ جانتے ہیں اور ان کی حفاظت کے لیے پریشان پھرتے ہیں۔

کام پہ جاتے، شاپنگ یا سیر پہ نکلتے، گلی، بازار، ہوٹل، پارک، تعلیمی اداروں کے باہر حتیٰ کہ سڑکوں کے اوپر سے گزرنے کے لیے بنے پل بھی ایسے تکلیف دہ مناظر کے گواہ بنتے جا رہے ہیں جہاں ایسی ملاقاتیں ہوتی ہیں اور پھر اپنے انجام کو پہنچتی ہیں۔ چند روز پہلے ایک کم عقل لڑکے نے ایک گولی سے پہلے لڑکی کو دنیا سے رخصت کیا اور پھر خود کو گولی مار کر بدنامی اور بری موت کے حوالے کیا۔ کینیئرڈ کالج والوں نے خدا جانے خوف سے یا افسوس سے اگلے روز کالج ہی بند رکھا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں بظاہر ایک بے ضرر کیڑا ڈینگی کا اتنا بڑا عذاب بنا تو حکومت سے لے کر عام آدمی تک سب کی جان پہ بن آئی۔ سیمینار، پوسٹرز، اشتہار، ریلیاں، سپرے، ادویات، نئی مشینیں، صفائیاں، پلیٹ لیٹس کی بنانے والی مشینیں۔ ہسپتالوں میں بستر، ٹیسٹوں کو ۱۹۰۰ روپے کے بجائے عام آدمی کی سہولت کے لیے ۹۰ روپے تک اور آخر میں قانون سازی۔

کیونکہ اس مچھر کی وجہ سے ڈھائی تین سو جانیں ضائع ہو چکیں اور سیکڑوں بیمار ہسپتالوں کے در و دیوار کو تکتے، صحت یابی کی دعائیں کر کے پل پل جیتے مرتے، خوف اور بے یقینی کا عذاب سہتے نظر آئے۔

ایک مسئلے کو مسئلہ جانا گیا اور پھر حکومت پنجاب نے پوری سمجھداری اور دیانت کے ساتھ اپنے وسائل اور افرادی قوت اس میں جھونک دی۔ اچھی پلاننگ کے ساتھ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ عام لوگوں تک پیغام گیا۔ انھیں سمجھایا گیا، نفع و نقصان بتایا گیا۔ یہاں تک کہ پرانے کاٹھ کباڑ اور ٹائروں کی دکانوں پر پڑے ٹائروں تک کو کھنگال ڈالا گیا تاکہ لاروے کو تلف کیا جاسکے اور آنے والے دنوں میں ڈینگی سے بچا جاسکے۔

معاشرتی سطح پر غور کیجیے تو ممکن ہے آپ کا دل بھی مانے کہ لڑکے لڑکیوں کی یہ چھوٹی چھوٹی ملاقاتیں اصل میں لاروے جیسی کیفیت سی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کے اثرات میں پورے پورے خاندان کا قتل، چہروں پہ تیزاب کا گرایا جانا، شادی والے دن دولہے یا دولہن کی موت کا اہتمام، کتنے گھر، کتنے ماں باپ اور بہن بھائی اجڑتے ہیں، کتنی لڑکیاں اغوا ہوتی ہیں۔ خاندان بدنامی کا درد سہتے ہیں۔ رسوائی کا زہر پیتے ہیں اور اس بیماری کا ان لمحات میں نہ صرف کوئی علاج نہیں بلکہ کوئی غم خوار بھی نہیں ملتا۔

کیا اس موضوع پہ ہمیں اپنے بیٹے بیٹیوں سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ زندگی ان پہ آسان کرنی نہیں چاہیے۔ جیسے ہمارے ایک دوست صادق محمود ملک نے اپنی بیٹی کو جیل روڈ کے ایک مشہور کالج میں داخل کرایا تو پہلے روز جاتے ہوئے اپنا وزٹنگ کارڈ دیتے ہوئے کہا: ''جانِ پدر! دورانِ تعلیم اگر کبھی کوئی تمھارا پیچھا کرے، ملنے کے لیے اصرار کرے تو صرف اتنا کرنا کہ اسے یہ کارڈ دے دینا کہ میرے والد سے مل لو۔ اگر کوئی تمھیں پسند ہو تو خود ملنے کے بجائے مجھے بتا دینا۔ میں کوئی اعتراض کیے بنا تمھاری شادی کا اہتمام کرا دوں گا۔ اگر ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسری صورت ہوئی، کوئی خفیہ ملاقات، کوئی شناسائی، تو پیاری بیٹی پھر تمھاری جگہ زمین کے اوپر نہیں نیچے ہوگی''۔

وہ بیٹی آج سکھ، سکون اور عزت کے ساتھ دبئی میں اپنے میاں کے ساتھ جیتی ہے اور فخر سے کہتی ہے ''میرے والد نے جس قدر اعتبار اور مان سے مجھے کالج بھیجا تھا اور مجھے اپنی عزت کا احساس دلایا تھا۔ اس کی قوت اور تاثیر تھی کہ میرے رب نے مجھے کسی آزمایش میں مبتلا ہونے دیا نہ اپنے خاندان کے لیے آزمایش بنایا۔ میں بے شک اپنے باپ کی اچھی بیٹی تھی اور میں نے اپنے باپ کی صاف سوچ سے اچھی بیٹی بن کر بھی دکھایا..... یہ پرسکون اور شاندار زندگی مولا کی طرف سے بے شک ایک انعام ہے۔''

سیاسی بیماریاں، جسمانی بیماریاں بے شک اہم ہیں۔ وقت، توجہ سبھی مانگتی ہیں لیکن نقصانات پہ اگر تحقیق کی جائے تو شاید محسوس ہوگا کہ سماجی لاروے سب سے زیادہ انسانوں اور ان کے رشتوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ چلیے کچھ دیر کے لیے سب سے آسان شکار میڈیا، فلموں، رسالوں، ڈراموں کو برا بھلا نہیں کہتے، ان پر اخلاقی بے راہ روی پھیلانے کا الزام نہیں دھرتے، اس لیے بھی کہ الزام دھرنے اور شکایت کرنے سے تو مسائل کبھی حل نہیں ہوتے نہیں دیکھے۔ ہاں، نئے مسائل کو جنم لیتے ضرور دیکھا ہے۔ اگر تو یہ مسئلہ ہے اور ایسا مسئلہ کہ خوف اور ڈر سے آپ کے ہونٹ دعا پڑھنے، اور اپنی اولاد کے اس عذاب میں مبتلا ہونے کے خوف سے ہی ہلکنے لگیں، اور رب رحمان کے آگے ہاتھ جوڑنے کے علاوہ کوئی رستہ نظر نہ آرہا ہو تو کیا دل والوں کو اب بھی مسئلہ سمجھ نہیں آتا جو ڈینگی سے کئی سو گنا جانیں لے چکا، گھر اور زندگیاں برباد کر چکا ہے اور کہیں باہر نہیں ہوتا بلکہ گھر کو کھنڈر بنانے والا یہ مسئلہ گھر کے اندر بلکہ گھر کے افراد خانہ کے دلوں کے اندر اپنی جگہ بنا چکا ہوتا ہے۔ بظاہر کچھ دکھ کھنڈر نہیں ہوتے مگر کسی کو مل جائیں تو انسانی زندگیوں اور رشتوں کو کھنڈر بنانے میں دیر نہیں کرتے اور کھنڈروں میں آنسوؤں کی فصلیں بھی اُگ آئیں تو وہ آباد نہیں ہوتے۔ کبھی ان لاروؤں کو مسئلہ جانا جائے گا تو ہی ہم کھل کر ان پہ بات کر سکیں گے۔ اپنے بیٹے، بیٹیوں اور پھر عوامی سطح پہ، تعلیمی اداروں میں، میڈیا میں، سیمینار اور مضامین میں کھل کر ڈینگی سے کئی گنا بڑے وائرس پر، جو ہماری سوشل فیبرک کو تباہی کے دہانے پہ لیے جا رہا ہے اظہارِ خیال کرنے کا آغاز کر سکیں گے اور تبصرے مشورے تو تب ہی ہوتے ہیں جب کسی موضوع کو اہم بنایا جائے، یہاں تو اہمیت لفظوں سے بہت آگے نکلے جاتی ہے۔ بس ہماری نظر نہیں جاتی۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk